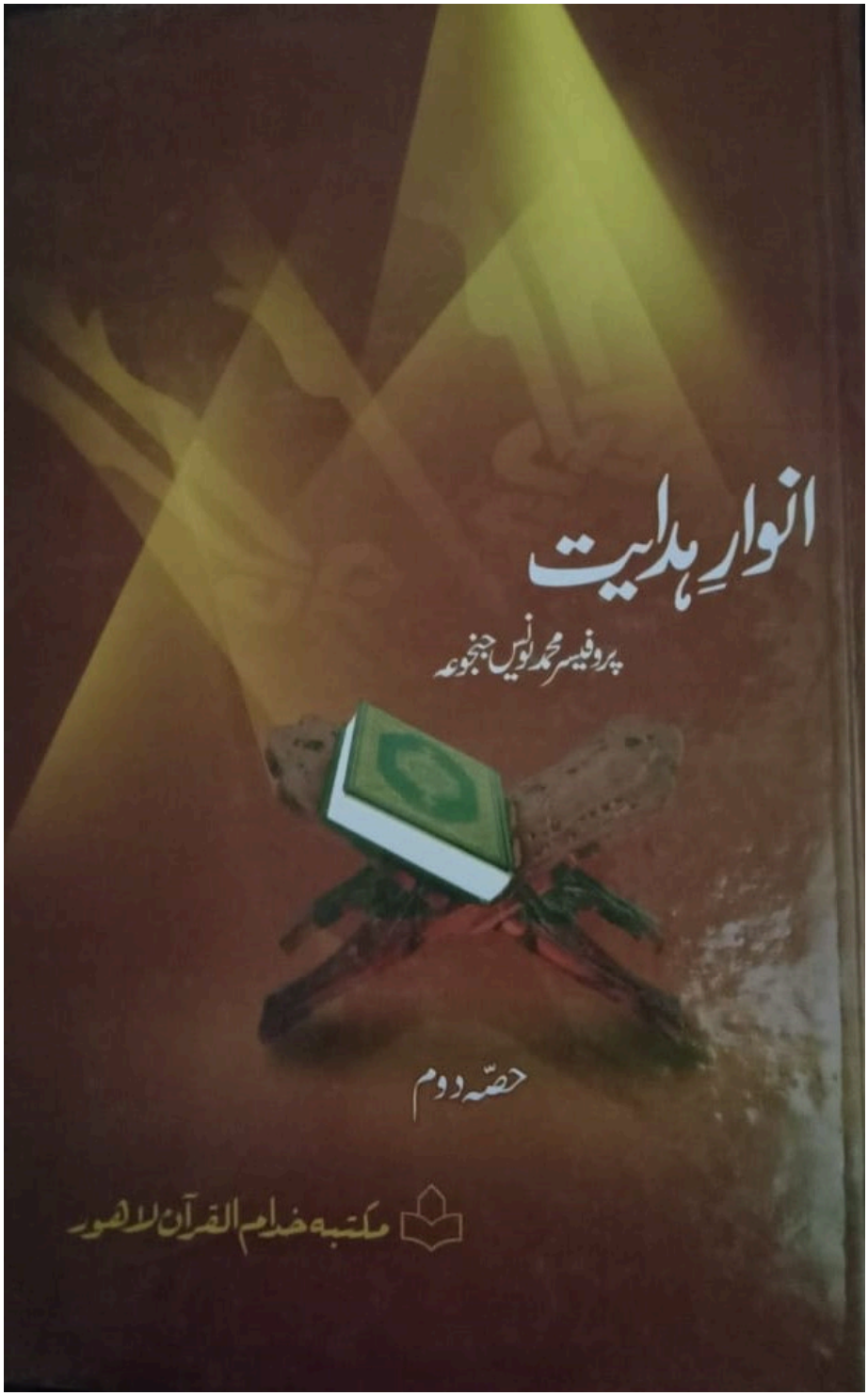


# انوارِ ہدایت (حصہ دوم)

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

# دیباچہ

میرے سادہ، آسان فہم، مختصر اور جامع مضامین مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام شائع ہونے والے جرائد میثاق، حکمت قرآن اور ندائے خلافت میں سالہا سال تک چھپتے رہے۔ مضمون عقل سلیم کو متاثر کرتے تھے، کیونکہ ان کی بنیاد قرآن مجید، مستند احادیث اور سیر صحابہؓ پر تھی۔ چنانچہ قارئین نے انہیں پسند کیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ دوست احباب کے مشورے سے میںنے ان مضامین کو اکٹھا کر کے کتابی شکل دے دی۔ ۳۷ مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ ''انوارِ ہدایت'' کے نام سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا۔ بعد ازاں ۲۰۱۱ء میں گیارہ مزید مضامین شامل کر کے اس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن شائع کیا گیا۔ اس کا تیسرا ایڈیشن ۲۰۱۴ء میں ''انوارِ ہدایت'' (حصہ اوّل) کے طور پر شائع ہوا۔

اس کے بعد سے تادم تحریر میرے مضامین دیگر اسلامی تعلیمات پر مبنی رسائل کے علاوہ مذکورہ رسائل میں بھی شائع ہوتے رہے اور ہو رہے ہیں۔ جب ان مضامین کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہوا تو انہیں بھی کتابی شکل میں اکٹھا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ ماہنامہ میثاق میں شائع شدہ یہ مضامین ''انوارِ ہدایت'' حصہ دوم میں جمع کر کے شائع کیے جا رہے ہیں۔

اُمید واثق ہے کہ ''انوارِ ہدایت'' حصہ اوّل کی طرح حصہ دوم کو بھی پذیرائی ملے گی اور باذوق قارئین کی طرف سے راقم کی حوصلہ افزائی ہو گی۔ پڑھنے والے قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی ان تحریروں کا بلاتعصب مطالعہ کریں گے تو وہ ضرور ان میں راہِ صواب پائیں گے۔ اللہ کرے میری یہ پرخلوص کوشش فہم دین کی چاہت رکھنے والوں کے ہاں قبولیت حاصل کرے۔

قارئین کی دعائوں کا طالب
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

مارچ ۲۰۱۷ء

عرضِ ناشر

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ حفظہ اللہ تمام عمر تدریس جیسے قابل احترام شعبہ سے وابستہ رہے ہیں۔ گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ صاحب میں سینئر' ورنیکلر ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا اور تعلیم و تعلّم کی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے ممتاز تعلیمی درسگاہ گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور سے بطور اسسٹنٹ پروفیسر (اسلامیات) ریٹائر ہوئے۔ علمی و ادبی حلقوں میں ان کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ علیہ سے موصوف کا تعلق بہت پرانا ہے اور ''میثاق'' سے ان کے قلمی تعاون کا آغاز ۷۹-۱۹۷۸ء سے ہو گیا تھا۔ جنوری ۲۰۰۱ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد قرآن اکیڈمی کے شعبہ تصنیف و تالیف سے وابستہ ہو گئے' جسے آج بھی ان کی اعزازی خدمات حاصل ہیں۔ قرآن اکیڈمی سے شائع ہونے والے جرائد بالخصوص ماہنامہ میثاق میں دینی و اخلاقی موضوعات پر محترم جنجوعہ صاحب کی آسان فہم اور مؤثر تحریریں سالہا سال سے متواتر شائع ہو رہی ہیں۔ چند سال قبل ان کے شائع شدہ مضامین کا مجموعہ ''انوارِ ہدایت'' کے نام سے شائع کیا گیا تھا۔ اب مزید ۶۵ مضامین پر مشتمل ضخیم کتاب ''انوارِ ہدایت'' حصہ دوم ہدیۂ قارئین کی جا رہی ہے۔

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید رحمہ اللہ علیہ کے الفاظ میں ''یہ کتاب ہر مسلمان گھرانے کے لیے ایسے قیمتی اثاثے کا درجہ رکھتی ہے جس کے انوار سے تمام افرادِ خانہ' خواہ بچے ہوں یا بوڑھے' مرد ہوں یا خواتین' والدین ہوں یا اولاد' یکساں طور پر اپنے ذہن و قلب کو منور کر سکتے ہیں''------- اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

حافظ خالد محمود خضر
مدیر شعبہ مطبوعات
قرآن اکیڈمی لاہور



# میری خوش نصیبی ... الحمد للہ

اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے خوش نصیب بنایا ‘اس اعتبار سے نہیں کہ میرے پاس وافر دولت ‘ زرعی زمین یا جائیداد ہے ‘یا میں کسی متمول گھرانے میں پیدا ہوا‘ بلکہ اس اعتبار سے کہ اللہ پاک نے مجھے فرمانبردار ‘سعادت مند‘ دیانت دار اور نیک اولاد سے نوازا ہے۔ میرے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔بیٹی تو شادی کے بعد اپنے میاں کے ساتھ امریکہ میں ہے اور اپنے بچوں کے ساتھ خوش باش زندگی گزار رہی ہے۔ اُس کا میاں وہاں ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ ہے۔ وہ انتہائی متقی ‘فرض شناس‘ محنتی اور دیانت دار ہے۔بیٹی اپنے میاں اور بچوں کے ساتھ پاکستان آتی رہتی ہے۔ میں بھی اُس کے پاس گیا اور تین ماہ گزار کر آیا ہوں۔ وہ خوشحال بھی ہیں اور عبادت گزار بھی۔ اُن کی بیٹیاں وہاں پڑھ رہی ہیں اور اکلوتا بیٹا قرآن حفظ کر رہا ہے۔ بچوں کو وہ وہاں کے تعلیمی اداروں میں نہیں پڑھا رہے‘ جہاں بہت کم فیس ہوتی ہے‘ بلکہ اُن کے بچے اسلامی سکول میں بڑی فیس کے ساتھ پڑھ رہے ہیں ‘کیونکہ وہاں دین اسلام کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ سیرت سازی پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔ میرے داماد کے حلقہ ٔاحباب میں وہ نیک مسلمان شامل ہیں جن کے ساتھ اُس کی دوستی مسجد میں پانچوں وقت کی نمازوں میں حاضر ہونے کی وجہ سے ہے۔ وہاں وہ اسلامی تعلیمات کو پھیلانے میں بھی کوشاہیں۔

میرے بیٹوں میں سب سے بڑا بیٹا محمود احمد ہے‘ اُس کو میں کالج کی تعلیم نہیں دلا سکا۔ اُس نے میٹرک کے بعد پرائیویٹ طور پر ایف اے کا امتحان پاس کر لیا اور ڈسپنسر کورس میں داخل ہو گیا اور پھر وہ دیہاتی ہسپتالوں میں کام کرتا رہا۔ وہ انتہائی فرض شناس ہے۔ کبھی اپنے فرائض منصبی سے غیر حاضر نہیں ہوا۔ ملازمت کے علاوہ گائوں میں اس کا میڈیکل سٹور تھا۔ دیہاتی لوگ معمولی فیس کے ساتھ چھوٹی موٹی بیماریوں میں اُس سے مشورہ لیتے‘ اللہ تعالیٰ نے اُس کے ہاتھ میں شفا رکھی ہے۔ ڈاکٹری کے ساتھ اُس کو اس قدر لگائو ہے کہ وہ بڑے زخموں کو ٹانکے لگا لیتا ہے اور پھوڑے پھنسیوں اور رسولی وغیرہ کا آپریشن بھی کر لیتا ہے۔ اکاؤنٹس کے کام کے ساتھ بھی اس کی دلچسپی ہے‘ اس معاملے میں وہ ساتھیوں کی مدد کے لیے تیار رہتا ہے۔

---



ان کے تنخواہوں کے بل اور اُن کی سروس بکس کے اندراجات کے سلسلہ میں ان کا مددگار رہتا ہے۔ چونکہ وہ فرض شناس اور دیانت دار کارکن تھا اس لیے اُسے مشکل اور نا خوشگوار ڈیوٹی دے دی جاتی۔ اس وجہ سے وہ نوکری سے

دل برداشتہ ہو گیا اور۵۳ سال کی عمر میں استعفا دے دیا اور نوکری چھوڑ دی ۔ اُس کی رہائش شیخوپورہ شہر میں ہے۔ وہ ہر روز صبح سویرے اپنے گائوں جنڈیالہ شیر خان میں اپنے میڈیکل سٹور پر جاتا ہے اور وہاں سے دوپہر کو واپس شیخوپورہ آ جاتا ہے' جہاں چھوٹے بھائی کے زیر انتظام ہسپتال کی فارمیسی میں کام کرتا ہے۔ وہ عبادت گزار اور ذکر اذکار میں مشغول رہتا ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت حسن صوت کے ساتھ کرنا اُس کا شوق ہے۔ وہ سالہا سال سے تہجد کی نماز کا پابند ہے ۔اُس کا کہنا ہے کہ جب اُسے کوئی حاجت ہوتی ہے وہ سحری کے وقت اپنے مالک سے دعا کرتا ہے اور وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ جنڈیالہ شیر خان میں محمود کا ایک پلاٹ تھا جو برلب سڑک اعلیٰ جگہ پر واقع تھا۔ اُس نے وہ مسجد کے لیے وقف کردیا۔ اب اُس پر مسجد تعمیر ہو چکی ہے 'جس کا نام مسجد کتاب و سنت ہے' جہاں قرآن و حدیث کی تعلیم ہوتی ہے اور اہل محلہ پنجگانہ نماز ادا کرتے ہیں ۔

محمود گائوں میں رہتا تھا۔ اس کی شہرت اچھی تھی۔ لوگ اس کے پاس نقدی امانت رکھتے تھے۔ ایک بوڑھی عورت کے پاس پانچ لاکھ روپے تھے۔ وہ محمود کے پاس آئی تاکہ وہ یہ رقم امانت کے طور پر رکھ لے۔ اسے اپنے بیٹوں پر اعتماد نہ تھا۔ محمود نے کہا کہ اماں جی بینک میں جمع کرا دو۔ مگر اس نے اصرار کیا تو محمود نے وہ رقم ڈاک خانے میں اپنے نام پر جمع کرا دی۔ چند سال بعد وہ بوڑھی عورت فوت ہو گئی۔ اس کے بیٹے بھی تھے اور بیٹیاں بھی جن کو اس معاملے کی کوئی خبر نہ تھی۔ محمود نے ان کو بتایا کہ تمہاری والدہ کی اتنی رقم میرے پاس امانت ہے اور ڈاکخانے میں جمع ہے۔ وہ تقاضا کرنے لگے۔ محمود نے کہا تم سب بیٹے بیٹیاں اکائونٹ کھلوائو میں بذریعہ چیک رقم آپ کے اکائونٹ میں جمع کرا دوں گا۔ چنانچہ اس نے بیٹے کے دو حصے اور بیٹی کا ایک حصہ کے حساب سے وہ رقم اماں جی کی اولاد کو دے دی۔

میرا دوسرا بیٹا مسعود احمد ہے۔ گائوں کے سکول میں اُس نے میٹرک تک تعلیم پائی۔ میٹرک کے امتحان میں آرٹس گروپ میں لاہور بورڈ میں اول پوزیشن حاصل کی اور گولڈ میڈل پایا۔ اس وقت تک میرے مالی حالات میں بہتری آچکی تھی۔ بیٹے کے نمبر بھی اعلیٰ تھے چنانچہ اُس کو گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل گیا' جہاں سے اُس نے ایف اے 'بی اے کے امتحانات امتیازی حیثیت سے پاس کیے۔ اور پھر وہیں سے انگریزی میں ایم اے کیا اور گورنمنٹ کالج



جھنگ میں لیکچرار لگ گیا ۔ آج کل گورنمنٹ کالج ٹائون شپ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہے اور ایم فل کرچکا ہے۔ لاہور کے کئی پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں بھی لیکچر دیتا ہے۔ اسلام آباد میںCSS کی ایک اکیڈمی میں بھی اُسے بلایا جاتا ہے۔ مسعود احمد کی دیانت کا یہ حال ہے کہ ایف اے کے امتحان میں خالی جگہ میں ایک لفظ لگنا تھا جو اُس کو یاد نہیں آرہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پاس کے ایک طالب علم نے وہ لفظ ذرا اونچی آواز میں بول دیا۔ مسعود کو بھی یاد آگیا

مگر اُس نے وہ لفظ اپنے پرچے میں نہیں لکھا کہ یہ بد دیانتی ہے ۔اگر وہ یہ لفظ لکھ لیتا تو اُسے ایک نمبر مل جاتا اوراُس کی پوزیشن آجاتی۔

اپنے کالج میں وہ سٹاف سیکرٹری ہے ‘باوجود اس کے کہ اُسے اس قسم کے عہدوں میں کوئی دلچسپی نہیں‘ لیکن سٹاف میں اُس کی لیاقت اور نیک نفسی کی بنا پر اُسے اصرار کر کے یہ ذمہ داری دی گئی ہے۔ اُس کے شاگرد جہاں اُسے ملتے ہیں اُس کے تدریسی اسلوب اور ہمدردانہ رویے کے سبب اُسے اپنا محسن سمجھتے ہیں اور جھک کر ملتے ہیں۔

مسعود احمد اپنی وسعت کے مطابق بے سہارا لوگوں کی مدد کے لیے تیار رہتا ہے۔ گھر کی خادمہ بیوہ ہے اور کئی سال سے اُن کے ہاں کام کر رہی ہے۔ مسعود نے کبھی اُس کو نہیں جھڑکا‘بلکہ اُس کو سہولت دے رکھی ہے کہ جتنا کام آسانی سے کر سکو کر لو‘ اپنا باقی وقت کسی اور گھر کے کام میں لگا لیا کرو۔ اُس بیوہ عورت کو بازار لے جا کر اُس کی پسند کا فریج خرید دیا اور یتیم بچوں کے لیے سہولت پیدا کر دی۔ دوست احباب میں کسی کو ضرورت ہو تو وہ بلا تکلف مسعود سے رقم مانگ لیتا ہے اور وہ استطاعت ہو تو کسی کو انکار نہیں کرتا۔ مسعود کے colleagues اُس کے حسن اخلاق سے متاثر ہیں اور پرنسپل تو اُس کے کام سے بہت خوش ہے۔

مسعود احمد سخاوت اور ایثار کے معاملات کی تشہیر نہیں کرتا ‘اس لیے میں بھی اس معاملہ سے بے خبر ہوں ۔ ادھر اُدھر سے کوئی بات پتا چل جائے تو چل جائے‘ ورنہ وہ اپنی یہ خوبی ظاہر نہیں کرتا۔ ایک بیوہ عورت کو سال بھر کے لیے گندم خرید کر دی تاکہ یتیم بچے سال بھر کے لیے روٹی کی فکر سے آزاد ہو جائیں۔ مسعود نماز پنجگانہ باقاعدگی سے ادا کرتا ہے اور اُس کے چھوٹے بڑے بچے بھی نماز کے پابند ہیں۔ مسعود کی طرح اس کے بچے بھی مثالی دیانت دار ہیں ‘کسی کا ایک روپیہ بھی ان کے پاس آجائے تو وہ واپس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بچے محلے کی مسجد میں نماز کے لیے جاتے ہیں تو نمازی اُن کے ساتھ پیار کرتے اور اُن کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور میرے سامنے ان کی تعریف کرتے ہیں۔

---

11

مسعود حقوق العباد کے سلسلہ میں انتہائی حساس ہے اور کسی کا معمولی سا حق بھی اپنے اوپر برداشت نہیں کرتا۔ کالج میں موجود ہو تو اپنی کلاس کو تنہا نہیں چھوڑتا اور اپنے سٹوڈنٹس کی مشکلات حل کرنے کے لیے کالج یا کالج سے باہر ہر وقت تیار رہتا ہے۔ مسعود کی دیانت کا یہ حال ہے کہ وہ یونیورسٹی امتحانات کے پیپر چیک نہیں کرتا اور نہ امتحانوں میں سپرنٹنڈنٹ کے طور پر ڈیوٹی لگواتا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ اساتذہ تو کوشش کر کے یہ ذمہ داری حاصل کرتے ہیں۔ ایک پرچہ چیک کرنے میں تین چار منٹ لگتے ہیں اور معاوضہ تقریباً چالیس روپے ملتا ہے۔ اُس کا جواب تھا کہ ان کاموں میں انصاف قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔

مسعود نے اپنے بیٹے کو LUMS میں داخل کرایا۔ بیٹے نے financial aid کے لیے درخواست دے دی۔ انتظامیہ کی طرف سے جائیداد کی تفصیل طلب کی گئی تو مسعود نے اپنے کنبے کے تمام افراد کے بینک اکاؤنٹ' نقدی اور دیگر اثاثہ جات کی تفصیل لکھ دی اس میں یہ بھی لکھ دیا کہ ہمارے پاس پانچ تولہ سونے کے زیورات بھی ہیں۔ کالج انتظامیہ نے یہ دیکھ کر financial aid کی درخواست مسترد کر دی۔ بیٹے کے دوستوں نے کہا زیورات لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن مسعود خوش تھا کہ سچ بولنا ضروری ہے۔

میرا تیسرا بیٹا دائود احمد ہے جو گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہے۔ شیخوپورہ کالج سے ہی اُس نے بی اے کیا تھا اور کالج میں اول رہا تھا۔بی اے کے بعد اس نے لاء کالج پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ابھی ایل ایل بی کی پڑھائی جاری تھی کہ اس نے ایم اے سیاسیات کا امتحان دے دیا۔ بہن کی شادی کے دن کی وجہ سے ایک پرچہ نہ دے سکا۔ اگلے سال اس پرچے کا امتحان دیا تو کامیاب ہو گیا۔ ایل ایل بی کے بعد لاء کی پریکٹس کی تیاری کر رہا تھا کہ پبلک سروس کمیشن کی طرف سے لیکچرار کی اسامیوں کا اعلان ہوا۔ دائود بھی امید وار ہوا اور کامیاب ہو گیا۔ اس کی تقرری گورنمنٹ کالج حافظ آباد میں ہوئی' جہاں وہ باقاعدہ حاضر ہوتا رہا۔ چند ماہ کے بعد اس کا تبادلہ ہو گیا اور اب وہ شیخوپورہ گورنمنٹ کالج میں ہے۔ کالج کے اساتذہ کے ہاں اس کی بڑی عزت ہے۔ وہ خیر خواہ اور اچھا مشیر ہے ۔اُس کے ساتھی اپنے خانگی معاملات تک میں بھی اُس سے مشورے لیتے ہیں۔ اُس کے طالب علم اُس کے مداح ہیں۔ دائود احمد کا مضمون سیاسیات ہے' مگر وہ کلاس میں لیکچر سے پہلے ایک حدیث ضرور سناتا ہے اور بچے اُسے دہراتے ہیں۔ اس طرح اُس کے طلبہ فرموداتِ رسول ﷺ سے واقف ہوتے ہیں اور اُن کے دینی علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ فرض شناس ہونے کے ناطے کوئی



پیریڈ ضائع نہیں کرتا اور اس کی کلاس ہمیشہ اعلیٰ نتائج دکھاتی ہے۔ قصے کہانیوں سے اُسے نفرت ہے۔ دلچسپی قرآن اور حدیث کے ساتھ ہے۔ وہ خود نماز کا پابند ہے اور چھوٹے بڑے سارے بچے بھی با جماعت نماز پڑھنے کے عادی ہیں۔ بڑا بیٹا حفظ مکمل کر چکا ہے۔ حفظ کے بعد اسی خوشی میں میاں بیوی حافظ بیٹے کو لے کر عمرہ کرنے گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ وہاں دائود حرم شریف میں بیٹھ کر بیٹے سے قرآن مجید سنتا۔ عربی لوگ یہ منظر دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ کئی لوگ خوش ہو کر بچے کو انعام بھی دیتے۔ ایک عرب تو ہمیں اپنے گھر لے گیا۔ کہنے لگا کہ میں اپنے بچوں کے سامنے آپ کے بیٹے سے قرآن سنوں گا اور اُن کو مثال دوں گا کہ تم بھی حافظ بنو۔ ہمیں وہاں معلوم ہوا کہ جس شخص کو کافی قرآن یاد ہو اُس کو حافظ کہتے ہیں اور جس کو پورا قرآن حفظ ہو اُسے حافظ کامل کہتے ہیں ۔اشعر کی عمر بمشکل سولہ سال ہے مگر حفظ کے بعد ہر سال تراویح میں قرآن سناتا ہے۔ اُس کی منزل پختہ ہے ۔ دائود ہر روز بلا ناغہ اُس سے ڈیڑھ دو سپارے سنتا ہے۔ بچے کے امتحان بھی ہوں تو بھی یہ معمول جاری رہتا ہے ۔دائود کے دوسرے

دونوں بیٹے بھی حفظ کر رہے ہیں۔ تینوں بیٹے ذہین ہیں اور سکول کی پڑھائی میں بھی ان کی کارکردگی اعلیٰ درجے کی ہے۔ بڑا بیٹا حافظ ڈاکٹر بننا چاہتا ہے۔ اُس نے میٹرک کا امتحان دے رکھا ہے۔ دائود کی دیانت داری کا یہ حال ہے کہ اُس کے بیٹے نے میٹرک کا امتحان دیا تو شہر میں ہی اُس کا مرکز امتحان تھا' مگر دائود اپنے بیٹے کو مرکز امتحان تک چھوڑنے نہیں جاتا تھا۔ اس لیے کہ امتحانی عملے کے سارے لوگ اس کے جاننے والے تھے' ایسا نہ ہو کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ لڑکا دائود کا بیٹا ہے اور اس ناطے وہ اُس کی ناجائز مدد کریں ۔ دائود کا بڑا بھائی محمود احمد حافظ بیٹے کو مرکز امتحان چھوڑ آتا اور واپس لاتا۔

دائود کی اہلیہ ڈاکٹر ہے۔ ہماری خواہش نہیں تھی کہ وہ پریکٹس کرے مگر وہ چاہتی تھی کہ میں اپنی صلاحیت کو ضائع نہ کروں 'چنانچہ پہلے پہل وہ دوسرے پرائیویٹ ہسپتالوں میں آپریشن کے لیے جاتی 'پھر اُس نے اپنا ہسپتال بنا لیا۔ وہ بھی خدا ترس اور ہمدرد ہے۔ وہ گائنی کی کامیاب ڈاکٹر ہے 'لالچی نہیں ہے۔ وہ صرف چند گھنٹے ہسپتال میں بیٹھتی ہے اور باقی وقت اپنے بچوں کو پڑھائی میں مدد دیتی ہے۔ ڈاکٹر بیٹی ہر مہینے کے پہلے اتوار مریض خواتین کا مفت معائنہ کرتی ہے اور اپنے پاس سے دوائی بھی دیتی ہے ۔اُس دن مریضوں کے کھانے کا بندوبست بھی ہسپتال میں کیا جاتا ہے 'جہاں مریضوں اور مریضوں کے ساتھ آنے والوں کو مفت دوپہر کا کھانا دیا جاتا ہے۔ اس روز اوسطاً ۸۰ کے قریب مریض ہوتے ہیں۔ ہسپتال میں لکھ کر لگا رکھا



ہے کہ کسی بیوہ عورت سے معائنہ فیس نہیں لی جائے گی ۔اسی طرح کسی عالم دین یا امام مسجد کی بیوی ہو یا ہسپتال کے سامنے گرلز ہائی سکول کی کوئی ٹیچر ہو تو اُس سے بھی فیس نہیں لی جائے گی۔ ان اقدامات کی وجہ سے زینب ہسپتال قرب وجوار میں نیک نام ہے۔ دائود اپنے سابقہ گائوں میں ایک پرائمری سکول کا سرپرست ہے۔ وہاں ایک نیک دل خاتون پرنسپل ہے' جو بڑی محنت کے ساتھ سکول چلا رہی ہے۔ سکول کی اتنی اچھی شہرت ہے کہ داخلے کے لیے سفارشیں بھی رد کرنی پڑتی ہیں 'کیونکہ سکول کی عمارت میں زیادہ گنجائش نہیں ہے' اگرچہ عمارت دو منزلہ ہے ۔

دائود نے وہاں لکھ کر لگا رکھا ہے کہ کوئی ہونہار بچہ جس کے والدین اُس کی اعلیٰ تعلیم کا بوجھ نہ اٹھا سکتے ہوں' وہ میرے ساتھ رابطہ کرے' جہاں تک وہ پڑھنا چاہے اُس کی تعلیم کے اخراجات میرے ذمہ ہوں گے۔ دائود خود بھی فی سبیل اللہ خرچ کرنے میں آگے آگے ہے۔ یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کی مدد اُس کو خوش کرتی ہے۔ اس کی تفصیلات وہ مجھ سے بھی پوشیدہ رکھتا ہے۔ مقامی طور پر ایک ادارہ بن رہا ہے' جہاں یتیم بچوں کی کفالت کی جائے گی' اُس کی عمارت بن رہی ہے۔ وہاں دائود نے پانچ لاکھ کا عطیہ دیا ہے ۔دیگر فی سبیل اللہ کاموں کی طرح اس کا بھی کوئی چرچا نہیں کرتا۔ کالج کے چھوٹے ملازمین کو خوش رکھنا دائود کو پسند ہے۔ اُن کی مدد کرنا اور اُن کو

آسائش دینا بھی اُس کے روز مرہ پروگرام میں ہے۔ لبھی لبھی دائود چھوٹے ملازمین کی دعوت کرتا ہے اور ان سے پوچھتا ہے کہ کیا کھانا پسند کرو گے؟ جو کھانا وہ چاہیں ان کو کھلایا جاتا ہے جو حقیقی خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ دائود کی طبیعت میں لالچ نام کی کوئی چیز نہیں ہے' پھر بھی اللہ تعالیٰ اُسے فراخ روزی دے رہا ہے۔ وہ کسی سے قرض لینا پسند نہیں کرتا بلکہ با اخلاق اور خوش کردار لوگوں کو ادھار دینا اچھا جانتا ہے۔ کسی ملازم سے مفت کام کروانا اُس کے مزاج کے خلاف ہے۔ وہ چھوٹے ملازموں کو خوش کر کے خوش ہوتا ہے۔

میرا سب سے چھوٹا بیٹا ظفر احمد ہے ۔پرائمری تک گائوں کے سکول میں پڑھا۔ پھر سکول چھوڑ کر قریبی مدرسے میں داخل ہوکرقرآن مجید حفظ کرنے لگا 'ساڑھے تین سال میں حفظ مکمل کیا ۔اس وقت کوئی سکول اس کو داخلہ دینے کو تیا رنہ ہواکہ یہ پڑھائی میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔چنانچہ اس نے پرائیویٹ طور پر میٹرک کی تیاری شروع کردی ۔میٹرک کا امتحان ہوا تو اس نے اتنے اچھے نمبر لیے کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل گیا اور ویسے بھی یہ اپنے ان ہم جماعتوں سے جا ملا جن کو چھوڑ کر اس نے حفظ شروع کیا تھا ۔گورنمنٹ کالج لاہور سے فارغ



ہوکراس نے ہیلے کالج سے بی کام کیا اور پھر امتیازی حیثیت سے ایم کام کیا ۔بعد ازاں پنجاب کالج میں لیکچرار ہوگیا۔ پنجاب یونیورسٹی میں کامرس کی سیٹوں کا اشتہار شائع ہواتو یہ بھی امیدوار تھا ۔اس کی تقرری ہیلے کالج آف کامرس پنجاب یونیورسٹی میں ہوگئی اور اب تک وہیں پڑھا رہاہے۔ اس نے پی ایچ ڈی کا ارادہ کیااور تین چار سال کی سخت محنت کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرلی ۔اب وہ ہیلے کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر ہے اور دیگر کلاسز کے علاوہ پی ایچ ڈی کے طالب علموں کو بھی پڑھاتا ہے ۔وہ اپنے طالب علموں میں ہردلعزیز ہے۔ اس کا پڑھانے کا انداز بڑا مؤثر اور سمجھانے کا طریقہ خوب ہے ۔وہ لاہور کے مشہور تعلیمی اداروں میں CA کے طلبہ کو بھی پڑھاتا رہا ہے ۔لاہور میں جگہ جگہ اس کے شاگرد پھیلے ہوئے ہیجو جب ملتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور جذبہ تشکر کا اظہار کرتے ہیں ۔

پرنسپل نے ظفر کو کہا کہ ایک سیکشن کا استاد نہیں آرہا۔ اس سیکشن کے طلبہ کو بھی آپ اپنی کلاس کے ساتھ بٹھا لیا کریں۔ چنانچہ ظفر نے ایسا ہی کیا ۔ سمسٹر کے خاتمے پر ظفر کو اپنی کلاس کے علاوہ دوسری کلاس کے پڑھانے کا علیحدہ چیک دیا گیا۔ جو ظفر نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں اضافی کلاس کو الگ سے وقت نہیں دیتا رہا۔ پرنسپل کے اصرار کے باوجود ظفر نے وہ چیک قبول نہ کیا۔

ظفر کے درجنوں تحقیقی آرٹیکل ملکی اور غیر ملکی رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں ۔کالج سٹوڈنٹس کے لیے اس کی کتاب Cost Accounting طلبہ اور اساتذہ میں مقبول ہے۔ وہ پاکستان سے باہر کئی بین الاقوامی یونیورسٹیوں میں تحقیقی پیپر پڑھنے جاچکا ہے ۔امریکہ پانچ دفعہ جا چکا ہے۔حال ہی میں اجمان یونیورسٹی کا دورہ کیااور بین الاقوامی کانفرنس میں مقالہ پڑھا ۔

ظفر کشادہ دست ہے ۔ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا اور بچوں اور بڑوں کو کھانا کھلانا اس کا دل پسند مشغلہ ہے ۔کالج کے غریب بچوں کی فیس کی مد میں اور دیگر ضروریات میں مدد کرنا اس کو پسند ہے ۔کالج کے گارڈ اور دوسرے چھوٹے ملازمین اپنی ضروریات کے لیے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ظفر ان لوگوں کی پر خلوص دعائیں لیتا ہے ۔ظفر کا لاہور میں ایک کنال کا ڈبل سٹوری مکان ہے ۔اس کی خوشی ہے کہ کوئی شاگرد یا colleagueیہاں اپنا کوئی فنکشن کرلے ۔دو دفعہ یہاں اس کے شاگردوں کی شادی کی تقریب منعقد ہوئی ہے ۔

ظفر مہمان نواز ہے ۔کوئی مہمان آجائے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کو عمدہ سے عمدہ

---



کھانا کھلایا جائے اور ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے ۔اس سلسلے میں وہ اپنے بجٹ کا بھی خیال نہیں رکھتا ۔ اس کا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ مہمان کا اکرام روزی میں فراخی دلاتا ہے ۔ایک عمر رسیدہ مسکین حافظ قرآن تو ہر روز اس کے ہاں کھانا کھانے آتا ہے۔ اس کے بڑے بھائی محمود کی دو بیٹیاں اس کے ہاں مہمان رہیں' وہ یکے بعد دیگرے یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کرکے جاچکی ہیں۔اور اب اس کی تیسری بیٹی یہاں رہ کر پنجاب یونیورسٹی سے ماسٹر کرکے کالج میں جاب کررہی ہے۔جبکہ محمود کا بیٹا یہاں رہ کر ایف ایس سی کررہا ہے ۔ بھتیجوں اور بھتیجیوں کی خدمت وہ کھلے دل سے کرتا اوران کو ہر سہولت دیتا ہے اور ڈھیروں ثواب کماتا اور عزت حاصل کرتا ہے ۔

ظفر حافظ قرآن ہے۔ اتنی مصروف زندگی کے باوجود اسے منزل اچھی طرح یاد ہے۔تقریباً ہر سال تراویح میں قرآن سناتا ہے ۔اس کا قرآن پڑھنے کا انداز سامعین کو بڑا پسند ہے 'کیونکہ تیز نہیں پڑھتا 'بلکہ اس کو سننے والے قرآن کی سماعت سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ بھی میری خوش بختی ہے کہ اس کو قرآن مجید اچھا یا دہے'ورنہ والدین بڑی چاہت کے ساتھ اپنے بچوں کو حفظ کرواتے ہیں مگر وہ جلد ہی بھول جاتے ہیں اورنا م کے حافظ رہ جاتے ہیں۔اِلاماشاء اللہ !

میرے چاروں بیٹوں کے ذاتی مکان ہیں۔ دو بیٹے شیخوپورہ میں قریب قریب رہتے ہیں اور دو لاہور میں ہیں 'جن کے مکان پیدل پانچ منٹ کی واک پر ہیں۔ بیٹوں کا آپس میں سلوک مثالی ہے۔ میری چاروں بہویں سلیقہ شعار' صفائی پسند اور خانگی امور میں ماہر ہیں۔ اپنے شوہروں کی تابع فرمان اور نماز روزے کی پابند ہیں۔ میری مستقل رہائش ڈاکٹر حافظ ظفر احمد کے پاس ہے مگر میں دوسروں کے ہاں بھی جاتا رہتا ہوں 'جہاں میرا حد درجہ اکرام کیا جاتا ہے۔ اُن کے بچے اصرار کرتے ہیں کہ ہمارے پاس رہیں' مگر میں اپنی مصروفیات نہیں چھوڑ سکتا' لہٰذا اکثر اوقات ظفر کے ہاں ہی رہتا ہوں۔ ۲۰۰۱ء میں جب ریٹائر ہوا تو میں نے اپنی مختصر جائیداد اور نقد رقم اولاد میں برابر تقسیم کر دی' کیونکہ زندگی میں اولاد کو حصہ دیا جائے تو لڑکے لڑکیوں سب کو برابر ملتا ہے۔ اگر وفات ہو جائے تو پھر وراثت ہوتی ہے جو لڑکے کو لڑکی سے دوگنی ملتی ہے۔ میری تقسیم پر سب نے رضا مندی کا اظہار کیا۔

مجھے خوشی ہے کہ (میرے چاروں بیٹے اللہ کے فضل و کرم سے رزق حلال پر کاربند ہیں) اور اپنی آمدنی میں خوش ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی جائز کمائی میں برکت دے رکھی ہے اور خوش



حال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میرے بیٹوں میں سے کوئی سگریٹ نہیں پیتا اور نہ ہی اُن کی اولاد میں سے کوئی سگریٹ پیتا ہے' بلکہ سب کوsmoking سے انتہائی نفرت ہے۔ بہویں اور پوتیاں فیشن کی دل دادہ نہیں۔ ستھرا صاف اچھا اور سادہ لباس ان کو اچھا لگتا ہے۔ چاروں گھروں میں بڑے چھوٹے سب باقاعدہ تلاوت کرتے اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ اُن کی دعائیں اور نیک خواہشات ان شاء اللہ میرے لیے بھی اجر کا باعث ہوں گی۔ یہ بھی میری خوش بختی ہے کہ خاندان کے سب لوگ توحید پرست ہیں' کسی کے ہاں بھی کوئی بدعت نہیں ملتی۔ غیر شرعی رسومات سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ قرآن وحدیث' سیرت رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طرزِ زندگی نمونہ سمجھتے ہیں۔ کسی فرقے میں شامل نہیں' اپنے آپ کو مسلمان سمجھنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ نماز ہر مسلمان امام کے پیچھے پڑھ لیتے ہیں۔ کسی مسلمان کو کافر کہنا تو دور کی بات ہے قابل نفرت بھی نہیں سمجھتے۔ چاروں بیٹے اور بہویں حج کر چکے ہیں۔ ان کے بچوں میں سے بھی کچھ حج اور عمرے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں ۔ میرے علم کی حد تک میرے بیٹے تقویٰ شعار ہیں ۔ بعض کاموں میں مجھے صحیح مشورہ دیتے ہیں جو میں قبول کرتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں۔ نماز کی پابندی تو کرتے ہی ہیں' زکوٰۃ بھی ہر سال پور احساب کر کے ادا کرتے ہیں ۔

مجھے معلوم ہے کہ میرے کسی بیٹے کے پاس بے انداز دولت نہیں ہے ۔ہاں ان کی زندگی آسودگی اور خوش حالی میں گزر رہی ہے۔ اُن میں دولت اکٹھی کرنے اور جائیداد بنانے کی دھن نہیں ہے۔ میں اور میرا کوئی بیٹا مقروض نہیں ہے ۔ہم سب اپنے وسائل میں رہ کر گزارا کر رہے ہیں۔ دنیا یہ سمجھتی ہے کہ ہم امیر کبیر ہیں' جبکہ ایسا نہیں۔ میرے بیٹوں کی یہ وہ خوبیاں ہیں جو میرے مشاہدے میں آئیں یا وہ leakہو کر مجھ تک پہنچیں' ورنہ وہ نیکی کے کام ریا کاری سے بچ کر کرتے ہیں اور مجھے بھی خبر نہیں ہوتی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے نیک اعمال کو قبول فرمائے' زیادہ سے زیادہ اجر سے نوازے' اُن کو برائیوں سے بچائے اور لغزشوں 'غلطیوں اور گناہوں کو معاف فرمائے۔ انہیں حاسدوں کے حسد سے' بد خواہوں کی بدخواہی سے اور نظر بد سے بچا کر رکھے۔آمین ثم آمین۔ اللہ تعالیٰ میری خطاؤں کو بھی معاف فرمائے اور میرے والدین جو فوت ہو چکے ہیں انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جن کی تربیت نے مجھے نیک نامی سے نوازا ۔

[میں نے اپنی معلومات اور مشاہدات پوری دیانت داری کے ساتھ قلم بند کیے ہیں۔]

* * *

# ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃاللہ علیہ
# کے ساتھ میری رفاقت کا سفر

میرے ماں باپ دونوں نا خواندہ تھے۔ مسلمانوں اور ہندوئوں کی ملی جلی آبادی تھی' ہر فریق دوسرے فریق کے خیالات سے متاثر تھا۔ ہندوئوں کے رسم و رواج مسلمان خاندانوں میں عام تھے۔اسی ماحول میں میری پیدائش ' پرورش اور ابتدائی تعلیم ہوئی۔ میری والدہ تو سادہ اور بھولی بھالی خاتون تھی جبکہ والد نا خواندہ ہونے کے باوجود باشعور' سمجھدار'روشن خیال اور فطرت ِسلیمہ کے مالک تھے۔ جس دیہاتی آبادی میں میں جوان ہوا مسلمان نمازروزے کو ہی اسلام سمجھتے تھے۔یہ آبادی تعلیم کی اہمیت سے بڑی حد تک نابلد تھی۔ میں پہلا شخص تھا جس نے وہاں بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ میں سکول میں ٹیچر تعینات ہو گیا۔ وہاں دیگر پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت ملی تو شعور میں پختگی آئی۔ قرآن مجید کی اہمیت کا پتا چلا کہ یہ ہماری مذہبی کتاب ہے جو ہر قسم کے تغیروتبدل سے محفوظ ہے'یہی اسلامی تعلیمات کا اولین ماخذ ہے۔ چنانچہ میں چاہتا تھا کہ قرآن مجید پڑھوں اور اس کو سمجھوں تاکہ پتا چلے کہ شریعت اسلامیہ کے کیا تقاضے ہیں۔ اس مقصد کے لیے میں نے عربی زبان سیکھنے کی کوشش کی اور جلد ہی مجھے عربی کی کچھ شد بد حاصل ہو گئی۔

مجھے شوق ہوا کہ بڑے بڑے دینی علوم کے ماہرین کے خیالات معلوم کروں اور اس سیدھے راستے پر چلوں جو صحیح اسلامی تعلیمات کا حامل ہو۔ اس سلسلہ میں میں نے چاہا کہ بڑے بڑے علماء اور سکالرز کے خطابات سنوں۔ اس مقصد کے لیے میں جن حضرات کو ملا اور اُن کے خیالات معلوم کیے اُن میں سے چند یہ ہیں: مفتی محمد شفیع ' مولانا ابوالاعلیٰ مودودی' قاری محمد طیب' مولانا احتشام الحق تھانوی' مولانا محمد عمر اچھروی'مولانا احمد رضا کاظمی' علامہ پرویز' مرزا ناصر الدین' احسان احمد شجاع آبادی اور علامہ دوست محمد۔ اس کے علاوہ مختلف علماء کی



کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ ان دنوں میں لاہور میں تھا اور تلاشِ حق میں سرگرم تھا۔ ایک دن اخبار میں اشتہار دیکھا کہ اتوار کے دن ڈاکٹر اسرار احمد سمن آباد میں درس قرآن دیں گے۔ میں وہاں پہنچ گیا اور سامعین میں شامل ہو گیا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب کا درس منفرد نوعیت کا تھا' اس میں قرآن

فہمی کا انداز سادہ ‘مؤثر اور دل نشین تھا۔ ایک گھنٹے سے زیادہ کے درس میں کوئی جملہ ایسا نہ تھا جو زیر درس آیات کی تشریح میں زائد یا غیر متعلقہ ہو۔ اسی طرح گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب موضوع سے ذرا اِدھر اُدھر نہ ہوئے۔ پھر کیا تھا ‘میں آپ کے ہر درس میں شامل ہونے کی کوشش کرتا ۔کئی درس سننے کے بعد بھی مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ ڈاکٹر صاحب کس مسلک سے تعلق رکھتے ہیں‘ کیونکہ وہ قرآنی آیات کی توضیح دوسری قرآنی آیات سے کرتے یا پھر رسول اللہ ﷺ کے فرمودات بیان کرتے۔ فقہی مسائل پر کم گفتگو کرتے۔ وہ قرآن فہمی کے لیے سیرت النبی ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تعامل کو بنیادی حیثیت دیتے۔ آپ صحابہ کرامؓ کے اقوال اور بزرگانِ دین کی کاوشوں کا بڑی عقیدت کے ساتھ ذکر کرتے۔ آپ کے درس میں کوئی غیر مستند بات نہ ہوتی اور نہ ہی آیات کی تشریح میں اپنی طرف سے کوئی رائے قائم کرتے۔ فقہی مسائل میں وہ فقہائے اربعہ کی آراء کو اہمیت دیتے اور ان کے فتاویٰ کی قدر کرتے۔

ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے خطابت اور تحریر دونوں اعلیٰ اوصاف سے نوازا تھا۔ اس سلسلہ میں اُن کے خطابات کی cassettes اور درجنوں کتب شاہد عادل ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میری گہری عقیدت ہو گئی ۔اُن کے خیالات سن کر میرا دل کہتا کہ جا ایں جاست ! میری محکمانہ ترقی ہوئی تو مجھے شیخوپورہ کے ایک گائوں میں تعینات کیا گیا۔ میں وہاں چلا گیا ‘مگر ڈاکٹر صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقعہ ختم ہو گیا۔ میں دعا کرتا کہ میرا تبادلہ لاہور میں ہو جائے۔ اس سلسلہ میں میںنے کچھ سوچے سمجھے بغیر ڈاکٹر صاحب کو خط لکھ دیا کہ وہ میرا تبادلہ لاہور کروانے کی کوشش کریں تاکہ مجھے پھر سے آپ سے استفادہ کرنے کا موقعہ مل سکے‘ مگر ڈاکٹر صاحب اس معاملے میں بے نیاز تھے۔ بہرحال ایک وقت ایسا آیا کہ میرا تبادلہ لاہور ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ کا انتہائی کرم یہ ہوا کہ مجھے ماڈل ٹائون کے قریب جوہر ٹائون میں اپنا ذاتی مکان مل گیا۔ میں یہاں منتقل ہو گیا اور ڈاکٹر صاحب کی صحبت سے فائدہ اٹھانے اور آپ کے



درسِ قرآن کے سامعین میں شامل ہونے کا موقعہ مل گیا۔ میں کچھ مضامین لکھتا جو عام طور پر عقائد اور اصلاحِ اخلاق سے متعلق ہوتے۔ یہ مضامین ماہ نامہ میثاق میں شائع ہوتے رہتے۔ بعدازاں وہ مضامین ’’انوارِ ہدایت‘‘ کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو گئے‘ جس کا دیباچہ محترم حافظ عاکف سعیدؔ نے تحریر کیا۔میثاق میں میرے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے اور اب تک ’’انوارِ ہدایت‘‘ (حصہ دوم) کا مواد جمع ہو چکا ہے۔

میں نے دو دفعہ ڈاکٹر صاحب کو اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ آپ نے دونوں دفعہ میری خواہش کو پذیرائی بخشی اور اپنے صاحبزادوں سمیت میرے ہاں تشریف لائے۔ جس ہفتے آپ کا انتقال ہوا اُن دنوں پھر اُن کا میرے ہاں پروگرام تھا‘ مگر ہوتا تو وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنے درس کا آغاز ۱۹۶۶ء میں کیا ‘جو بعدازاں بہت مقبول ہوا اور لاہور میں آپ کئی جگہ درسِ قرآن دیتے رہے ۔اس سلسلہ میں آپ کے درس قرآن کو بہت پذیرائی ملی اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ نے پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں کے سفر کیے اور قرآن کے درس دیئے۔ پاکستان سے باہر بھی آپ کو بلایا جاتا جہاں آپ کمزور صحت کے باوجود لمبے سفر کرتے۔ امریکہ میں تو آپ کے لیکچرز کا خصوصی اہتمام ہوتا۔ ڈاکٹر ذاکرنائیک عالم اسلام کے ایک منفرد مقرر ‘خطیب اور مناظرہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو عجیب قسم کا حافظہ عطا کیا ہے۔ قرآن کی اکثر آیات کا وہ آیت نمبر بتا کر حوالہ دیتے ہیں۔ قرآن کے علاوہ دیگر الہامی اور غیر الہامی کتب کے اقتباسات اُن کو یاد ہیں۔ دنیا بھر کے لوگوں میں قرآن کی حقانیت ثابت کرنا اور پھیلانا اُن کا مشن ہے۔ ڈاکٹر ذاکرنائیک ڈاکٹر اسرار احمد کے خطیبانہ انداز اور قرآن فہمی سے بڑے متاثر تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان کی دعوت پر بھارت گئے‘ جہاں ڈاکٹر ذاکر نائیک نے بے تحاشا اخراجات کر کے جدید وسائل مہیا کیے اور ڈاکٹر صاحب کے دروس کا بڑے پیمانے پر اہتمام کیا۔ ان دروس میں لاکھوں لوگوں نے شرکت کی‘ جن میں مسلمانوں کے علاوہ لاتعداد غیر مسلم بھی ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہ شہرۂ آفاق دروسcassettes میں محفوظ ہیں اور ان میں سے بعض کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کے نام سے ایک انقلابی جماعت کی بنیاد



رکھی جس کا مقصد قرآن حکیم کی تعلیمات عام کرنے کے علاوہ نظامِ خلافت کے قیام کی جدوجہد ہے۔ اس سلسلہ میں اُن کی کوشش کامیابی سے ہم کنار ہوئی اور اب اس جماعت کے رفقاء و احباب پاکستان اوربیرون پاکستان لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ جنرل ضیاء الحق نیک آدمی تھا مگر وہ اقتدار کے دھوکے میں آگیا۔ اُس نے ڈاکٹر صاحب کو مجلس شوریٰ میں شمولیت کی پیشکش کی۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض احباب نے انہیں یہ پیشکش قبول نہ کرنے کا مشورہ دیا مگر آپ کا کہنا تھا اگر کوئی اچھے کام کی طرف بلائے تو بدظنی کرتے ہوئے اُسے قبول نہ کرنا درست نہیں۔ ان کا موقف تھا کہ میں حکومت وقت کو اچھے کاموں کا مشورہ منبر سے بھی تو دیتا ہوں‘ اگر اس کے لیے کوئی باقاعدہ فورم میسر آ رہا ہے تو اس سے استفادہ کرنا چاہیے ۔چنانچہ ڈاکٹر صاحب مجلس شوریٰ میں شریک ہوئے مگر چند ماہ کے بعد ہی مستعفی ہو گئے کہ جب شرعی مشورے لیے جائیں مگر قبول نہ کیے جائیں تو ایسی مجلس میں شمولیت نرا وقت کا ضیاع ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایک ہر دل عزیز پروگرام ’’الہدیٰ‘‘ کے نام سے ٹیلیویژن سے نشر ہوتا تھا ۔اس میں ڈاکٹر صاحب نے قرآن حکیم کی روشنی میں ستر و حجاب اور بے پردگی کے سلسلہ میں اسلامی احکام کی وضاحت کی تو مغرب زدہ خواتین جن کو اسلامی تعلیمات کا کوئی احترام نہ تھا‘ نے احتجاج کیا اور یہ ہر دل عزیز پروگرام ختم کر دیا گیا۔

ڈاکٹر اسرار احمدؒ شادی بیاہ کی ایسی کوئی دعوت قبول نہ کرتے جس میں اسلامی تعلیمات کے

برخلاف ہندوانہ رسم و رواج پر عمل کیا جاتا۔ جہیز اور بارات کو وہ خلافِ اسلام سمجھتے تھے۔ وہ ہر کام میں اسلامی سادگی ہی کو پسند کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے بیٹیوں کی شادیاں سادگی کے ساتھ اسلامی تعلیمات کے مطابق انجام دیں۔ آپ نکاح کی تقریب مسجد میں پسند کرتے تھے' تاکہ نکاح پاکیزہ ماحول میں ہو اور اسی مقدس ماحول میں اس نکاح کی کامیابی کی دعا کی جائے ۔آپ نے نکاح کی مجلس مسجد میں منعقد کرنے کی سنت کو رواج دیا۔ آپ لڑکی والوں کی طرف سے دعوت کو بہت بُرا جانتے تھے۔ لڑکے کی شادی میں دعوتِ ولیمہ کا انتظام کرنا عین سنت ہے' چنانچہ وہ اس پر کاربند تھے۔ ڈاکٹر صاحب راقم آثم کی عزت افزائی کرتے تھے۔ حافظ عاکف سعید صاحب کے ولیمے میں مجھے بھی دعوت دی۔ یہ ان کی عظمت کا مظہر ہے' ورنہ میں کہاں اور ڈاکٹر صاحب کہاں ! یہ وہی شادی ہے جو ۸ محرم الحرام کو منعقد ہوئی اور مخصوص

---



لوگوں نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ مگر جب ڈاکٹر صاحب کی طرف سے وضاحت کی گئی تو اُن کے علماء نے اعتراف کیا کہ ان دنوں شادی ممنوع نہیں مگر نا مناسب ہے۔ اس خاندان کے الطافِ کریمانہ ہیں کہ عاکف سعید صاحب کے صاحبزادے حسین عاکف اسرار کی شادی ہوئی تو اُن کے ولیمے میں بھی میں مدعو تھا۔

ڈاکٹر صاحب ''محاضراتِ قرآنی'' کا انعقاد کراتے جو عام طور پر جناح ہال لاہور میں ہوتے۔ ان محاضرات میں ڈاکٹر صاحب ان علماء کو بھی اظہارِ خیال کی دعوت دیتے جو آپ کے بعض نظریات سے متفق نہیں ہوتے تھے۔ دوست احباب نے مشورہ بھی دیا کہ ان لوگوں کو ان محاضرات میں نہیں بلانا چاہیے' مگر ڈاکٹر صاحب کا جواب تھا کہ حاضرین اُن کی باتیں بالمشافہ سنیں تو بہتر ہے کہ وہ صحیح اور غلط کو سمجھ سکیں ۔ عرصہ تک ڈاکٹر صاحب مسجد شہداء میں درسِ قرآن دیتے رہے ۔یہ درس منفرد نوعیت کا ہوتا تھا جس کا دورانیہ ڈھائی گھنٹے کا ہوتا تھا۔ یہ تفصیلی درس عالمانہ معلومات پر مشتمل ہوتا۔ قرآنی الفاظ کا مفہوم اور مطلب آپ اس دل کشی اور صحت کے ساتھ بیان کرتے کہ سامعین ہمہ تن توجہ کے ساتھ سنتے اور کوئی شخص بھی اکتا کر مجمع سے نہ نکلتا۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں آپ کا خطابِ جمعہ برسوں چلتا رہا۔ جب آپ پر علالت اور کمزوری کا غلبہ ہوا تو معذرت کر دی اور آپ کی طرف سے کوئی اور صاحب وہاں خطبہ دیتے۔ آپ کا یہ خطاب جمعہ اس قدر مؤثر ' دلکش اور مستند معلومات پر مشتمل ہوتا تھا کہ لوگ دور و نزدیک سے جوق درجوق مسجد میں اکٹھے ہوتے اور آغازِ خطاب سے قبل ہی مسجد کا ہال اور صحن کا کافی حصہ سامعین سے بھر جاتا ۔ رمضان المبارک کی راتوںمیں آپ تراویح کی نماز کے دوران پڑھی جانے والی آیات کا ترجمہ اور تشریح بیان کرتے۔ اس طرح تراویح کی نماز کا دورانیہ آدھی رات سے بھی زیادہ ہو جاتا۔ آپ کے اس پروگرام میں شرکت کے لیے دور و نزدیک سے شائقین آتے۔ آپ کا یہ پروگرام اس قدر مقبول ہوا کہ دوسری مساجد میں بھی اس کا اہتمام ہونے لگا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ رمضان المبارک میں ''دورۂ ترجمہ قرآن'' لاہور

لی درجنوں مساجد میں ہورہا ہے۔ لاہور کے علاوہ یہ دورئہ ترجمہ قرآن کراچی اور دوسرے چھوٹے بڑے شہروں کی کئی مساجد میں ہورہا ہے۔

۱۹۹۷ء میں نواز شریف کو انتخابات میں عدیم النظیر کامیابی ملی۔ وہ اپنے والد محمد شریف



اور بھائی شہباز شریف کے ساتھ ڈاکٹر صاحب سے ملنے قرآن اکیڈمی آئے۔ دورانِ گفتگو ڈاکٹر صاحب نے نواز شریف سے کہا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے انتخابات میں کامیابی دی اور اقتدار سے نوازا۔ یہ آپ کا بہت بڑا امتحان ہے۔ دوسری باتوں کے علاوہ آپ نے نواز شریف سے پر زور مطالبہ کیا کہ ملک سے سود کی لعنت کو ختم کیا جائے۔ نواز شریف کا کہنا تھا کہ ٹھیک ہے ‘میں ایک سال تک سود ختم کر دوں گا۔ اُن کے والد میاں شریف بولے کہ ایک سال کیوں‘ صرف چھ ماہ میں ختم کرو! لیکن ع ’’اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!‘‘ اب نواز شریف کے اقتدار کی تیسری باری ہے مگر سود ہے کہ سود مرکب کی طرف بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب قرآن اکیڈمی ماڈل ٹائون کی عمارت کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ اُن کی زندگی سادگی کی علامت تھی۔ اُن کے پاس تھوڑے سے کپڑے اور تین واسکٹیں تھیں جن کو بدل بدل کر پہن لیتے تھے۔ انجمن خدام القرآن کی طرف سے انہیں صرف رہائش‘ علاج معالجہ اور آمد و رفت کی سہولیات میسر تھیں۔ وہ اپنے کام کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ ان کا موقف تھا کہ دین کی دعوت و تبلیغ اور نشرو اشاعت ہمارا فرض ہے‘ اس پر معاوضہ لینا جائز نہیں۔ اُن کی بے شمار cassettes اور بیسیوں کتابیں ہیں‘ مگر ان کی آمدنی پر وہ کوئی رائیلٹی نہیں لیتے تھے ‘بلکہ اُن کا منافع انجمن کے کھاتے میں جاتا تھا اور اب بھی جاتا ہے‘ ان کے بیٹوں کو بھی اس آمدنی کے ساتھ کچھ سروکار نہیں۔

ڈاکٹر صاحب علامہ اقبال کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ وہ اقبال کو ’’ترجمان القرآن‘‘ اور ’’بشر پاکستان‘‘ کہتے تھے۔ وہ کہتے تھے پاکستان کا نظریہ اقبال ہی کا دیا ہوا ہے تاکہ برصغیر کے مسلمانوں کو ایسا خطہ زمین ملے جہاں وہ اسلامی شریعت کا نفاذ کر سکیں۔ جناح صاحب تو برصغیر کی سیادت سے بد دل ہو کر انگلستان چلے گئے تھے۔ علامہ سر محمد اقبال نے اُن کو یہاں بلایا اور اُنہوں نے قائداعظم بن کر برصغیر کے مسلمانوں کو انگریزوں سے آزادی دلائی۔ ڈاکٹر صاحب کو اقبال شناسی میں ایک مقام حاصل ہے۔ آپ علامہ اقبال کے اشعار موقعہ کی مناسبت سے بیان کرتے تھے۔ علامہ اقبال کو امتِ مسلمہ کا حدی خواں کہتے تھے۔ یہ اشعار اکثر اُن کی زبان پر ہوتے ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

لی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں !
وہ معزز تھے زمانے میں مسلمان ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر !

کُرتو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جزبہ قرآں زیستن

وقت فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے !

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے !

اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ ''ڈاکٹر صاحب کی دل پسند نظم تھی جس کی تشریح میں وہ بتاتے تھے کہ ابلیس کس طرح امت مسلمہ کے زوال کا خواہاں ہے اور وہ کس طرح اُن شیاطین کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو مسلمانوں میں انتشار پھیلاتے ہیں اور اُن کی گمراہی کا باعث بنتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ۲۰۰۲ء میں جب تنظیم اسلامی کی امارت چھوڑی تو ان کے بعد ان کے خلف الرشید حافظ عاکف سعید تنظیم کے امیر مقرر ہوئے۔ اگرچہ ضابطے کے مطابق ارکان تنظیم اس بات کے پابند تھے کہ وہ امیر تنظیم کا فیصلہ بخوشی قبول کریں، تاہم ڈاکٹر صاحب نے اس ضمن میں تنظیم کی مجلس شوریٰ اور رفقاء کے کئی اجلاس بلائے اور طویل مشاورت کے بعد حافظ عاکف سعید صاحب کو امیر تنظیم اسلامی مقرر کیا۔

ڈاکٹر صاحب کا پورا خاندان نیک سیرت ، خدا پرست اور اسلامی انقلاب کا خواہاں ہے۔ اسلامی تعلیمات میں ان کی دلچسپی اُن کے اعمال سے ظاہر ہے۔چاروں بیٹے آپ کے مشن میں آپ کے دست و بازو بنے اور آپ کی وفات کے بعد انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی میں فعال ذمہ داریاں ادا کر رہے ہیں اور ڈاکٹر

صاحب کے مشن کو پوری استعداد کے ساتھ آگے بڑھا رہے ہیں۔ قرآن مجید میں تفکر و تدبر ڈاکٹر صاحب کی سرشت میں تھا۔ دروسِ قرآن



کے ذریعے انہوں نے لاتعداد تعلیم یافتہ لوگوں کو فہم قرآن کی راہ پر لگایا۔

۲۰۰۱ء میں میری ریٹائرمنٹ ہونے والی تھی۔ حافظ عاکف سعیدصاحب نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد میں قرآن اکیڈمی کے سٹاف میں شامل ہوجائوں۔ میرے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا ‘چنانچہ میں اکیڈمی میں خدمات انجام دینے لگا۔ اوّل اوّل مجھے معمولی سا مشاہرہ ملتا رہا ‘مگر جلد ہی میں بلا معاوضہ کام کرنے لگا اور آج تک کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب اپنی صحت کے بارے میں محتاط نہ تھے۔ اُن کا انگ انگ بیمار تھا مگر وہ استقامت کا پہاڑ تھے۔ انجمن ‘تنظیم اور درس قرآن کے سلسلہ میں وہ اندرون ملک اور بیرون ملک لمبے سفر کرتے۔ جہاں انہوں نے ضرورت محسوس کی وہاں جانے کے لیے تیار ہو گئے اور جہاں سے انہیں درس قرآن کی دعوت ملی انہوں نے قبول کی۔ ان کو فعال دیکھ کر لوگ یہی سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب صحت مند ہیں‘ مگر اُن کے قریبی ساتھی اور اہل خاندان جانتے تھے کہ وہ مجموعۂ اسقام ہیں۔ وہ اپنے لیے زیادہ غذائی پرہیز کے قائل نہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب صبر و استقامت کے ساتھ اپنے مشن میں لگے رہے اور علالت کی پروانہ کی۔ آخری دم تک اَن تھک محنت کرتے رہے۔ وفات سے تین دن قبل فیصل آباد میں تنظیم اسلامی کی مرکزی شوریٰ کا اجلاس تھا ‘اس میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے اور فرمایا شاید میں آپ سے آخری ملاقات کے لیے آیا ہوں ۔میرا پیغام یہ ہے کہ اس ظالمانہ نظام کے خلاف اپنے جذبات کو سرد نہ ہونے دینا اور دین حق کی سربلندی کے لیے اپنی جدوجہد کو تیز تر کرنا۔ موت ایک قطعی اور اٹل حقیقت ہے ع ’’جب احمدِ مرسل نہ رہے کون رہے گا ! ‘‘

۱۳/ اپریل کو عشاء کی نماز کے بعد آپ کو تیز بخار تھا۔ بڑے بیٹے ڈاکٹر عارف رشید نے ہسپتال لے جانے کو کہا تو آپ نے انکار کیا اور چارپائی پر دراز ہو گئے۔ رات کے تیسرے پہر آپ کے خادم عبد الغفور نے دیکھا کہ آپ چارپائی پر بے حس ہیں ۔ڈاکٹر عارف رشید کو بلایا‘ وہ آئے۔دیکھا تو آپ رحلت فرما چکے تھے۔ ۱۴ / اپریل ۲۰۱۰ء کو علی الصبح ٹیلیویژن پر ڈاکٹر صاحب کی رحلت کی خبر نشر ہوئی ‘مجھے میرے بھائی نے ٹیلیفون پر یہ خبر بتائی۔ میں تو گم سم ہو گیا۔ اُسی وقت قرآن اکیڈمی پہنچا ۔ ڈاکٹر صاحب کی چارپائی کمرے میں پڑی تھی۔ آنسو بہاتے ہوئے میں نے اُن کو دیکھا۔ چہرے پر نہ تھکاوٹ کے آثار تھے نہ بیماری کے ‘بلکہ چہرے سے

اُن کا روایتی رعب و جلال اور وقار جھلک رہا تھا۔ میں نے جی بھر کر ڈاکٹر صاحب کی زیارت کی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب پر وفات طاری نہیں ہوئی بلکہ وہ گہری اور خوشگوار نیند میں ہیں۔ اُنہیں دیکھ کر علامہ اقبال کا شعر یاد آیا جو حسب حال تھا۔ ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب او است !

اُسی روز بعد نمازِ عصر سنٹرل ماڈل ٹاؤن پارک میں ڈاکٹر صاحب کا جنازہ ہوا۔ مقامی اور دور دراز سے آئے ہوئے لوگ ڈاکٹر صاحب کا چہرہ دیکھنے کے مشتاق تھے' لیکن جم غفیر کا یہ عالم تھا کہ جنازے کے بعد یہ ممکن نہ رہا کہ میت کو دیدار کے لیے رکھا جائے ۔چنانچہ قریبی قبرستان میں آپ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کا جنازہ لاہور سے اٹھنے والے چند پر ہجوم جنازوں میں سے ایک تھا۔ آپ کی ساری زندگی قرآن مجید کی تعلیم و تبلیغ میں گزری ۔آپ نے اپنی حیاتِ مستعار سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ دل کی گہرائی سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین !
[اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ وَاَدْخِلْہُ فِیْ رَحْمَتِکَ وَحَاسِبْہُ حِسَابًا یَّسِیْرًا]

* * *



# ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
# پیکرِ صدق و صفا

۱۹۶۷ء میں میرا قیام اسلامیہ پارک لاہور میں تھا۔ مجھے قرآن فہمی کا شوق تھا ۔ لاہور میں جہاں کہیں درسِ قرآن کا پتا چلتا میں وہاں حاضر ہوتا اور پہلی صف میں بیٹھ کر انہماک سے مدرس کی بات سنتا۔ ایک دن اخبار میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درس قرآن کا اشتہار دیکھا۔ اتوار کے دن درس سننے کے لیے میں سمن آباد کی کوٹھی نمبر ۲۱۱۔این میں پہنچ گیا ۔ ڈاکٹر صاحب نے وقت مقررہ پر درس شروع کیا اور اعلان کے مطابق پابندیٔ وقت کے ساتھ درس ختم

لیا۔ مجھے بے انتہا حیرت اور خوشی ہوئی کہ اس انداز کا درس میں نے اس سے پہلے کہیں نہیں سنا تھا۔ زیر درس آیات کی تشریح کے دوران ڈاکٹر صاحب نے ایک جملہ بھی ایسا نہ بولا جو غیر متعلقہ اور بھرتی کا ہو۔ آیات کی تشریح اس انداز سے کی کہ ''از دل خیزد بر دل ریزد ''والا معاملہ ہو گیا۔ پھر کیا تھا 'میں باقاعدگی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے درس میں حاضر ہوتا۔ کچھ ہی دنوں میں کوٹھی کی جگہ تنگ پڑ گئی اور حاضرین کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ درس کے لیے کسی کشادہ جگہ پر انتظام کرنا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب کافی عرصہ تک مسجد خضراء سمن آباد اور مسجد شہداء ریگل چوک میں درس دیتے رہے اور لوگوں میں قرآن فہمی کا ذوق پیدا کرتے رہے۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں تو سالہا سال تک آپ خطابِ جمعہ کی ذمہ داری ادا کرتے رہے' جہاں مسجد کی کشادگی سامعین کی کثرت کے باعث تنگ پڑ جاتی تھی۔

درس قرآن کے ذریعے میرا ڈاکٹر صاحب کے ساتھ قریبی تعلق پیدا ہو گیا۔ ایف سی کالج سے بطور اسسٹنٹ پروفیسر ریٹائر ہونے کے بعد میں ڈاکٹر صاحب کے زیر انتظام قرآن اکیڈمی میں کام کرنے لگا جو اب تک جاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو انتہائی مدلل اور پرتاثیر ہوتی تھی۔ الفاظ کا موزوں انتخاب ان کی تحریر و تقریر کا طرۂ امتیاز تھا۔ وہ کسی خاص مکتب فکر کے

---



نمائندے نہ تھے۔ وہ ''خُذ ما صَفا ودَع ما کدر'' کے قائل تھے'جہاں سے اچھی بات ملتی قبول کر لیتے۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ خواہ مخواہ دوسروں پر تنقید نہ کرتے۔ البتہ اگر کسی کا موقف قرآن و سنت سے متصادم ہوتا تو اس کی نشاندہی کرتے۔ وہ اپنے ہم عصر علمائے حق کی قدر کرتے بلکہ اُن سے راہنمائی حاصل کرنے میں بھی فراخدلی کا مظاہرہ کرتے۔ مولانا حامد میاں ؒ(جامعہ مدنیہ لاہور)اور مولانا محمد یوسف بنوری ؒ(کراچی)کے ساتھ ان کا مسلسل رابطہ رہتا۔

ڈاکٹر صاحب کی ایک خوبی یہ تھی کہ درس قرآن کے دوران اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے لیے انوکھی باتیں نہ کہتے بلکہ اُن کا سارا زور اس بات پر ہوتا کہ قرآن کریم کی آیات کی تشریح کرتے وقت وہ قرآن و سنت اور آثارِ صحابہ کو بنیاد بنائیں ۔وہ مشاہیر سلف صالحین کی تفاسیر سے بھی فائدہ اٹھاتے۔ بزرگ علمائے دین کی تعریف و توصیف میں فراخدلی کا مظاہرہ کرتے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ' شیخ الہند مولانا محمود حسن ؒاور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ؒکا ذکر تو انتہائی عقیدت کے ساتھ کرتے۔ فقہائے کرام کی خدمات کا اعتراف کرتے اور ان کا نام احترام سے لیتے۔ ان کی تحقیق کی قدر کرتے تھے۔آپ انبیاء کے علاوہ کسی انسان کو معصوم عن الخطا نہ سمجھتے۔ وہ اپنی بات کو کبھی حرفِ آخر نہیں سمجھتے تھے بلکہ جہاں مضبوط دلائل کے ساتھ اُن سے اختلاف کیا جاتا وہ فوراً تسلیم کر لیتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کو جاہلانہ تقلید اور ہندووانہ رسم و رواج سے نفرت تھی۔ شادی بیاہ کے ضمن میں فضول رسومات کو ختم کرنے کو انتہائی ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا آغاز اپنی ذات سے کیا ‘اپنی بیٹیوں کو جہیز نہیں دیا اور نہ ہی بیٹوں کے سسرالیوں سے جہیز قبول کیا۔ بارات کی صورت میں ایک لشکر لے کر جانا اور لڑکی والوں کے گھر سے دعوت کھانے کو کمینگی اور خست جانتے تھے۔ ہاں دعوتِ ولیمہ کو مسنون سمجھ کر اس کا اہتمام کرتے اور شرکت کو ضروری قرار دیتے تھے۔ اسی طرح شادی غمی یا دوسرے موقعوں پر عورتوں مردوں کی مخلوط محافل کو ناجائز قرار دیتے اور کسی ایسی محفل میں شریک نہ ہوتے جہاں عورتوں کے لیے پردے کا اہتمام نہ ہوتا۔ انہوں نے مسجد میں نکاح کا اعلان کر کے بڑے بڑے علماء کو حیرت میں ڈال دیا‘ کیونکہ معاشرے میں اس پر کہیں عمل نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن اس کی بنیاد حدیث اور سنت سے واضح کی تو

---



لوگوں میں مسجد میں نکاح کرنے کا رواج عام ہوتا گیا۔ آپ شرعی پردے کے سختی سے قائل تھے اور اپنے گھروں میں آپ نے اس کا اہتمام کر رکھا تھا۔ عام طو رپر دیکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے علماء اورصوم و صلوٰۃ کے پابند مسلمان بھی معاشرے میں موجود غیر اسلامی رسومات کو شادی بیاہ اور موت کے موقع پر اختیار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب میں یہ کمزوری نہ تھی‘ بلکہ جس چیز کو خلافِ سنت سمجھتے تھے اس کو کبھی اختیار نہ کرتے اور پھر دوسروں کو بھی اس سے روکتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب عالم باعمل تھے۔ ان کی زندگی ایک پکے سچے مسلمان کی زندگی تھی۔ وہ آخری دم تک اپنے مشن کے ساتھ مخلص رہے۔ ان کی زندگی کا مقصداور نصب العین دین اسلام کی سربلندی اور دنیا میں نظامِ خلافت کے قیام کی جدوجہد کے ذریعے رضائے الٰہی کا حصول تھا۔ چنانچہ انہوں نے قرآنی تعلیمات کو عام کرنے اور نفاذِ شریعت اسلامی کے نفاذ کے لیے شبانہ روز محنت کی‘ اندرونِ ملک اوربیرونِ ملک کے لاتعداد سفر کیے۔ جب تک ممکن ہو سکا وہ یورپ اور امریکہ جاتے رہے اور وہاں قرآن و سنت کی تعلیمات کا پرچار کرتے ہوئے وہاں کے مسلمانوں کو صحیح مسلمان بننے کی تلقین کرتے رہے۔

ہر چھوٹا بڑا شخص اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی پیشہ اپناتا ہے ۔اگر وہ اپنے پیشے سے مطمئن ہوتا ہے تو اپنے بچوں اور وابستگان کو وہی پیشہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے‘ بصورتِ دیگر وہ اپنے بچوں کو اس پیشے سے دور رکھتا ہے۔ ڈاکٹر حضرات عام طور پر اپنے بچوں کو ڈاکٹر بناتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب خود ایم‘بی بی ایس ڈاکٹر تھے‘مگر انہوں نے میڈیکل پروفیشن کو خیر باد کہہ کر قرآن کی خدمت کو اختیار کیا اور اسی پر اپنی زندگی گزار دی۔ دین کی خدمت کے اس کام سے ڈاکٹر صاحب اس قدر مطمئن تھے کہ انہوں نے اپنی اولاد کو بھی اسی کام پر لگا دیا۔ چنانچہ ان کے چاروں بیٹے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد دین کے کام میں پورے خلوص کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ یہ

ایک بڑا حقیقت نما ٹیسٹ ہے۔ کتنے ہی تنخواہ دار عالم دین ہیں کہ جنہوں نے اپنی اولاد کو دین کی خدمت میں نہیں لگایا بلکہ ان کے لیے دوسرے پیشے پسند کیے' حتیٰ کہ اچھی تنخواہ کے لالچ میں انہیں ناجائز کاروبار میں داخل کردیا۔ڈاکٹر صاحب کے چاروں بیٹے عالم دین اور پرہیزگار ہیں اور دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں ۔گویا ایں خانہ ہمہ آفتاب است !

---



ڈاکٹر صاحب کا نظریہ تھا کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ دین کا علم سیکھیں اور دین کی نشرواشاعت میں اپنی پوری زندگی وقف کر دیں ۔ ایسے لوگوں کی کفالت معاشرے کے ذمے ہے' مگر عوام کے اس فنڈ سے وہ صرف اپنی ضروریات پوری کرسکتے ہیں'کوئی جائیداد وغیرہ نہیں بنا سکتے۔ مشکل سے ہی کوئی عالم دین اس معیار پر پورا اتر سکا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ڈاکٹر صاحب میڈیکل کی تعلیم کے دوران ہی قرآنی تعلیمات پھیلانے میں لگ گئے تھے۔ میڈیکل پروفیشن کے دوران آپ کے حلقہ ہائے دروس میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ جلد ہی انہوں نے عہد کر لیا کہ وہ پوری زندگی خدمت دین کے لیے وقف کر دیں گے۔ چنانچہ وہ ساری زندگی قرآنی تعلیمات عام کرنے اور خدمت دین میں لگے رہے۔ نہ کوئی بینک بیلنس چھوڑا ' نہ کوئی جائیداد 'اور اسی حال میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔مرکزی انجمن خدام 'القرآن کی طرف سے آپ کو رہائش کے لیے چھوٹا سا ایک کوارٹر اور علاج معالجے کی سہولت حاصل تھی۔

دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی ہوشربا سانحات سے گزرنا پڑا۔ آپ نے زندگی پھولوں کی سیج پر نہیں گزاری ۔جب آپ نے خدمت دین کی بھرپور جدوجہد کا آغاز کیا تو تمام رشتہ دار مخالف ہو گئے (اگرچہ بعد میں سب آپ کے اعوان و انصار بن گئے۔) آپ کی ایک بیٹی کو خلع لینا پڑا' ایک داماد سڑک کے حادثے میں وفات پا گیا' ایک پھول سا کمسن پوتا بجلی کا کرنٹ لگنے سے فوت ہو گیا۔بیماریوں نے آپ کو گھیرے رکھا ۔کونسی بیماری تھی جو آپ کو نہ تھی۔ گھٹنے آپ کے مصنوعی تھے' ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف کی وجہ سے آپریشن ہوا اور اس میں لوہے کی پلیٹیں ڈالی گئیں' شوگر آپ کو تھی' بلڈ پریشر کے آپ مریض تھے' پتے کا آپریشن آپ کا ہو چکا تھا' لیکن ڈاکٹر صاحب مردِ آہن تھے۔ یہ ساری تکلیفیں آپ کے عزم و استقلال کو متزلزل نہ کر سکیں اور آپ اپنے مشن میں اس قدر سرگرم رہے کہ کسی دیکھنے اور سننے والے کو اس بات کا احساس نہ ہوا کہ اس شخص کو اس قدر پریشانیوں نے گھیر رکھا ہے۔ اُن کی وفات کے بعد لوگ پوچھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب بیمار تھے؟ گویا ڈاکٹر صاحب کی اپنے مشن کے ساتھ ایسی وابستگی تھی کہ گھر سے باہر کے سب لوگ یہی سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب صحت مند اور توانا ہیں۔ مگر حال یہ تھا کہ ؎

---

کُو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا !

سفر سے کبھی آپ نہیں گھبرائے ؛بیماری آپ کو آرام کرنے پر مجبور نہ کر سکی۔ کثرت کے ساتھ دوائیاں استعمال کر کے آپ اپنے آپ کو درس و تدریس اور تبلیغ و تعلیم کے لیے ہر وقت تیار پاتے۔ وقت کی پابندی کا یہ حال تھا کہ چند منٹوں کی تقدیم و تاخیر آپ کو گوارا نہ تھی۔ اسی لیے آپ کے پروگراموں میں لوگ قبل از وقت پہنچ جاتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاص قسم کا رعب و دبدبہ عطا فرمایا تھا ۔ آپ کبھی کسی حکمران یا معروف سیاسی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوئے' بلکہ بڑے بڑے صاحبانِ اقتدار اور مالکانِ جاہ و جلال آپ کے پاس آتے تھے اور کھری کھری سن کر جاتے تھے۔ کسی کو آپ کے سامنے استدلال کرنے کا یارا نہ ہوتا۔ ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ میں آپ شامل ہوئے مگر دوماہ بعد ہی واپس آ گئے کہ جب کوئی مشورہ مانا نہیں جانا تو فضول وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟ جبکہ بہت سوں نے اسے اپنے لیے بڑا اعزاز سمجھا۔ جو بھی بڑا آدمی آپ کے پاس آتا آپ اس کو اسلامی نظام کے نفاذ کی جدوجہد میں شامل ہونے کی دعوت دیتے اور کسی سے کسی طرح کی ہمدردی اور تعاون کا مطالبہ نہ کرتے اور نہ کوئی اُمید رکھتے۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی ایک صحیح مسلمان کی زندگی تھی جس میں معروف پر عمل اور اس کی تبلیغ تھی' منکرات سے نفرت تھی۔ گویا آپ {وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ}(الحشر:۷)کی سچی تصویر تھے۔آپ کو اطمینانِ قلب کی بیش بہا دولت میسر تھی۔اسی کے سہارے آپ اپنے مشن کی تکمیل کے راستے کی ہر رکاوٹ کو پائوں کی ٹھوکر سے ہٹادیتے تھے۔

۱۴/اپریل ۲۰۱۰ء کی شب طلوعِ سحر سے قبل آپ نے جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ ایک عالم کو آپ سوگوار چھوڑ گئے۔آپ کے فراق میں آپ کے عقیدت مند غم و اندوہ کی گھاٹیوں میں اتر گئے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اہل و عیال' عقیدت مندوں' خیر خواہوں اور وابستگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مگر جس دن یہ اندوہناک واقعہ پیش آیا وہ ڈاکٹر صاحب کے لیے یومِ نجات تھا۔ اس دن آپ کے سارے دکھ درد 'غم و اندوہ' پریشانیاں اور بیماریاں دور ہو



گئیں۔ آپ اپنے خالق حقیقی کے پاس چلے گئے جس کی رضا کے حصول کی خاطر آپ نے پوری زندگی وقف کر رکھی تھی ۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اب آپ کی قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔ آپ غلبۂ دین حق کی کھیتی کی آبیاری کرتے رہے' آپ کی وفات کا دن اس کھیتی کی پیداوار کے حاصل کرنے کا دن ہے۔ جس ربّ کریم کی رضا

حاصل کرنے میں آپ نے شبانہ روز محنت کی، آج بقول اقبال ع ''خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے'' کے مصداق آپ کو بے حد و حساب انعامات سے نواز کر خوش کر دیا جائے گا۔

میں نے وفات کے بعد آپ کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو چہرے پر بے بسی اور مردنی کے آثار نہ تھے، بلکہ وہی رعب و دبدبہ اور جلال نمایاں تھا جو زندگی میں ان کے چہرے پر ہوتا تھا۔ لگ رہا تھا گویا گہری نیند سو رہے ہیں۔ چہرے کی یہ تازگی اور تمتماہٹ ہر دیکھنے والے کو متاثر کر رہی تھی، بقول اقبال ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست !

اللہ تعالیٰ آپ کی لغزشیں اور خطائیں معاف فرمائے اور بلند درجات سے نوازے، آمین ۔ ع
''آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے !''

* * *



# قرآن : معیارِ حق و باطل
# اور
# سنت : صراطِ مستقیم کا عملی نمونہ

قرآن پاک ۲۳ سال کے عرصہ میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتا رہا۔ خالق ارض و سما نے جن جن چیزوں کو پسند کیا ان کے اختیار کی انسان کو ترغیب دی اور جن جن چیزوں کو ناپسند کیا ان سے رک جانے کو کہا۔ گویا قرآن پاک کو غلط اور درست، حق و باطل، مفید و مضر، حرام و حلال، ناقص اور کامل میں تمیز کا معیار قرار دیا۔ چونکہ قرآن پاک محدود ضخامت کی ایک کتاب ہے جس میں زمانے بھر کے تقاضوں کی شناخت بتائی گئی ہے، تو صاف ظاہر ہے کہ اس کی جامعیت اصولوں کی حد تک ہی ہو سکتی ہے۔ آج قرآن پاک سے کئی گنا زیادہ ضخیم کتب موجود ہیں، جن میں زندگی کے کسی ایک پہلو یا علم کے کسی معمولی سے شعبے پر بحث کی گئی ہے مگر جزئیات پر حاوی وہ

بھی نہیں ہیں۔

قرآن حکیم میں اصولوں اور ضابطوں کی تھیوریٹیکل تعلیم ہے اور انسان کی سہولت اور امتحان کے پیش نظر اس کو ناقابل تغیر بنا دیا گیا ہے۔ سہولت یہ کہ وہ آسانی سے اصولی راہ نمائی تو قرآن سے لے اس یقین کے ساتھ کہ یہ کتاب واقعی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اور امتحان اس لیے کہ آیا انسان قرآنی حقائق کو خدائی تعلیم سمجھنے کے باوجود ---اس کے فیصلوں کو اٹل، غیر متبدل، بہترین اور اپنے حق میں معیاری سمجھتا ہے یا اِدھر اُدھر کے پراز شکوک و شبہات ذرائع و وسائل سے متاثر ہو کر ان کی راہنمائی قبول کرتا ہے۔

چاہیے تو یہ تھا کہ مسلمان جس طرح قرآن پاک کو منزل من اللہ اور لاریب سمجھتا ہے وہ



اس کی تعلیمات کو بھی حتمی جانتا ،لیکن بد قسمتی سے وہ بھی فریب نفس میں مبتلا ہو گیا اور قرآنی تعلیمات کی من مانی تاویلات کرنا شروع کردیں اور سیرت النبی ﷺ کی روشنی سے منہ پھیر لیا۔حالانکہ خود قرآن میں سیرت النبی ﷺ کو اپنانے کی تعلیم ہے۔ مثال کے طور پر قرآن شریف میں نماز قائم کرنے کا حکم ہے ،لیکن رکوع و سجود اور قیام کے اشاروں کے سوا رکعات کی تعداد، اوقات کی حدبندیاں، اذان کے الفاظ، نماز باجماعت کے مسائل کے متعلق بحث نہیں کی گئی۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ قیامِ نماز کی اہمیت اور حکم کے پیش نظر پیغمبر اسلام ﷺ اس کو عملی طور پر اختیار کریں گے اور ان کے ساتھی ان کو دیکھ کر قیامِ نماز میں ان کے ساتھ شامل ہوجائیں گے۔ اس طرح وقتاً فوقتاً نماز میں پیش آنے والے استفسارات خود بزبانِ نبویؐ حل ہوتے چلے جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل کو قرآن پاک میں اُسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے، اس لیے نماز کی ادائیگی کی جو جزئیات آپ ؐ سے عملاً ظاہر ہوں گی وہی امت کے لیے معیار ہوں گی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے وفات تک قیامِ نماز کا سختی کے ساتھ اہتمام کیا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی اسی طرزِ عمل کو اپنایا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد نبوی میں کوئی مسلمان بے نماز نظر نہیں آتا۔ اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی کو سمجھئے کہ عہد نبویؐ میں کوئی مسلمان صاحب نصاب زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا نظر نہیں آتا، اور بالفرض اگر کوئی مسلمان قیام الصلوٰۃ اور ایتاء الزکوٰۃ کی پابندی نہ کرتا تو اسے جماعت مسلمین سے الگ تصور کیا جاتا۔ یہ ہے عملی نمونہ قرآن کو معیارِ حق و باطل سمجھنے اور آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو اُسوۂ حسنہ جاننے کا۔

اب بھی اصولی طور پر مسلمان قرآن کو معیارِ حق و باطل اور سنت کو صراطِ مستقیم سمجھتے ہیں، لیکن عملی طور پر گریز اور فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں ،اور اس کے باوجود خود کو محب نبی اور عاشق رسول کا نام دیتے ہیں۔ نماز کا اہتمام، اکل حلال کی تلاش، ارکانِ اسلام کی پابندی ، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا احساس، خوفِ خدا، فکر آخرت اور دیگر اخلاقی تقاضوں کی پابندی تو ان کے پروگرام میں شامل نہیں ،اور اگر شامل ہیں تو صرف نظری

اور سطحی طور پر ‘لیکن وہ خود ساختہ رسومات جن کا اُسوۂ حسنہ میں ذکر تک نہیں ان میںشمولیت کو فرضِ اوّلین اور ترک کو گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ ان رسومات کو دین بتاتے اور حب نبی اور نجاتِ اُخروی کے لیے انہیں ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان رسومات کو جن کا وجود اُسوۂ حسنہ اور عہد خلفائے راشدین میں



نہیں ہے‘ بدعات کہا جاتا ہے اور بدعات کو شریعت ِاسلامیہ میں سخت مذموم سمجھا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے فرمان کے مطابق دین تو اُسوۂ حسنہ یعنی سنت اور طریق صحابہ ؓہی میں محدود ہے۔ جو رسم و رواج عہد نبویؐ اور دورِ صحابہ کرامؓ میں مفقود تھے ان کی مشروعیت کا کیا ثبوت ہے؟ اور اگر ہماری یہ خود ساختہ رسومات مشروع ہوں تو صحابہ کرامؓ کی زندگیاں تشنہ ماننا پڑیں گی‘ حالانکہ صحابہ کے طریقے کو خود آنحضرت ﷺ نے قابل اعتماد تصور کرتے ہوئے ((عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَائِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ)) فرمایا اور اپنے طریقے کے ساتھ صحابہ کرامؓ کے طریقے کو بھی پوری امت کے لیے لازم قرار دیا۔

اصول سے انحراف کی اس غلطی کا سبب ہے کہ دین کے نام پر فرقہ وارانہ رسومات اور اجتماعات میں کردار کے اعتبار سے رسوائے زمانہ لوگوں کو نمایاں جگہ پر دیکھا جاتا ہے۔ایک نام نہاد مذہبی جلوس میں فحش فلموں کا دھندا کرنے والے آدمی کو قیادت کے منصب پر دیکھا گیا۔ وجہ ظاہر ہے کہ جب کوئی بدکردار آدمی نماز کی امامت کے لیے کھڑا ہو گا تو لوگ حدیث نبویؐ اور عمل صحابہ کی روشنی میںایسے شخص کی امامت پر معترض ہوں گے ‘لیکن خود ساختہ جلوس کی قیادت کرنے والے ایسے شخص پر سنت اور عمل صحابہ کی روشنی میں کیا اعتراض ہو گا جب کہ ایسے جلوس کی نظیر ہی قرونِ اولیٰ اور خیرالقرون میں نہ ملے گی؟ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ تن آسان لوگ جو حقیقی سنتوں پر عمل کر کے صدقہ اور خیرات یعنی مالی اور بدنی قربانیوں سے فرار چاہتے ہیں انہیں خود ساختہ‘ وقتی‘ عارضی اور ہنگامی پروگراموں میںشرکت کر کے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کا جھوٹا فریب حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی فریب نفس کی بنا پر ہمارے ہاں جرائم اور بے راہ روی کی شرح حد سے زیادہ ہے‘ حالانکہ اسلامی معاشرے میں جرائم کا وجود نہ ہونے کے برابر ہونا چاہیے۔

قرآن و سنت کے احکام کو ٹال کر چند نمائشی نعروں اور جذباتی جلوسوں سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو راضی کرنے کا طریقہ عہد رسالت اور دورِ صحابہؓ میں رائج نہ تھا۔ وہاں الفت تھی تو سنت کے اپنانے میں‘ محبت تھی تو احکامِ قرآنی پر عمل کرنے سے۔ لیکن اب مسلمانوں کی کثیر تعداد نے مسلمان ہونے کے باوصف اپنے طریق کو تبدیل کر لیا ہے۔ سنت ِنبوی کے نمونے پر شریفانہ زندگی کے خلاف جس مسلمان نے رشوت‘ چور بازاری‘ حقوق العباد کی پامالی اور لوٹ کھسوٹ کا دھندا شروع کر رکھا ہے‘ اس سے بات کرو تو وہ بھی نجاتِ اُخروی کا

امیدوار نظر آئے گا ‘کیونکہ دورانِ سال چند مخصوص دنوں میں ہونے والے خود ساختہ اور نام نہاد اسلامی پروگراموں میں وہ بڑی مستعدی سے حصہ لیتا ہے‘ اور وہ مسنون کاموںاور ارکانِ اسلام کی طرف سے اعراض کی کوئی اہمیت نہیں سمجھتا۔ گویا حقیقت کو چھوڑ کر سراب پر مطمئن ہے۔ قرآن اس کیفیت کو {تِلکَ اَمَانِیُّھُمْ} کہتا ہے۔

یہ صرف سنتِ نبوی علی صاحبہ الصلوۃ والسلام کو اپنانے اور قرآن پاک پر عمل کرنے کا نتیجہ ہے کہ مسلمان کی زندگی معصیت کی آلودگی سے پاک ہو جاتی ہے۔ نماز بے حیائی اور برائی کے کاموں سے روکتی ہے‘ حج شعائر اللہ سے محبت اور خدا کی راہ میں مال و دولت اور وقت خرچ کرنے کا سبق دیتا ہے۔ ذکر اللہ یعنی تلاوت قرآن قلوب و اَذہان میں صفائی پیدا کرتا ہے۔ سنت کی پیروی کرنے والے بزرگانِ دین کی صحبت ‘اخلاق کی بلندی‘ کردار کی پختگی‘ توحید پر یقین محکم‘ سنت کو اپنانے کا شوق اور دین اسلام کی حقانیت سکھاتی ہے۔

کیا یہ لمحہ فکریہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کی کثیر تعداد ارکانِ اسلام سے غافل اور اصولی اسلامی تعلیمات سے منہ موڑے ہوئے ہے ‘لیکن فلاح وکامیابی کو اپنا مقدر سمجھتی ہے؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر شخص اپنا بلاتعصب محاسبہ کرے ‘اور قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے کردار کا جائزہ لے۔ اس طرح راہِ راست پر آنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ نیز قرآن و سنت کی اہمیت کا صحیح فکر رکھنے والے افراد پرلازم ہے کہ وہ قرآن پاک اور سنت نبوی علی صاحبہ الصلوۃ والسلام کی تعلیم عام کریں‘ اور اس کام میں اپنا زر ومال اوروقت بے دریغ خرچ کریں۔

* * *



# کفر اور اسلام
# انجام کے اعتبار سے

زمین پر انسانوں کا پہلا جوڑا حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حوا کا تخلیق ہوا‘ جن کی اولاد ہوئی اور کرۂ ارضی پر پھیل گئی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بھی عبث پیدا نہیں کی اس لیے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنی

شاہکار مخلوق بے مقصد پیدا کی ہو۔ انسان کی پیدائش کا مقصد واضح کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشادِ ربانی ہے :

{وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿ ٥٦ ﴾} (الذّٰریٰت)

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا۔''

اس طرح انسان کو امتحان میں ڈال دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کرتا ہے یا اپنی مرضی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ اللہ کا بندہ بن کر رہتا ہے یا حرص و ہوا کا۔ یہ امتحان زیادہ سخت اس طرح ہو گیا کہ انسان کا بدترین دشمن شیطان پیدا کر کے اسے انسان کے پیچھے لگا دیا گیا' جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

{اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿ ٥ ﴾} (یوسف)

''بے شک شیطان انسان کا واضح دشمن ہے۔''

چنانچہ انسان کے لیے ضروری ہو گیا کہ وہ امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے شیطان کی ترغیبات اور تحریصات سے بچ کر زندگی گزارے۔ شیطان کو قرآن مجید میں "الغَرود" یعنی بڑا دھوکے باز کہا گیا ہے۔ وہ انسان کو گمراہ کرنے کے لیے بڑی چابکدستی کے ساتھ برائی پر آمادہ کرتا ہے ۔ شیطان ہر شخص پر وار کرتا ہے' اس کے وار سے صرف وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جو اس احساس کے ساتھ زندگی بسر کرے کہ اسے بہرحال اللہ کا بندہ بن کر رہنا ہے اور اس کی نافرمانی سے بچنا ہے۔

---



اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء ورسل علیہم السلام کے ذریعے اپنی مرضیات انسانوں تک پہنچا دیں۔ یہ مرضیات انسان کی فطرت میں بھی رکھ دیں 'یعنی برائی کا برا اور اچھائی کا اچھا انجام بھی اسے ودیعت کر دیا 'جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

{فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ۪ ﴿ ٨ ﴾} (الشمس)

''پھر اس کو نافرمانی اور فرمانبرداری کی پہچان کرا دی۔''

انسان کو دنیا کی زندگی میں طرح طرح کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں اپنی زندگی کو سہل بنانے کے لیے مختلف چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر معاشرے کے خوشحال اور آسودہ لوگوں کو دیکھ کر انسان کا دل چاہتا ہے کہ وہ ان کی طرح بلکہ ان سے بہتر آسائشیں حاصل کرے۔ اس موقع پر شیطان اپنے مکرو فریب کے ذریعے انسان کو سبز باغ دکھاتا اور برائی پر آمادہ کر لیتا ہے ۔ سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ انسان اپنے خالق سے ناطہ توڑ لے ' دنیا کی زینت اور دلفریبیوں میں اس قدر مگن ہو جائے کہ وہ دنیا ہی کا ہو کر رہ جائے ' خالق کے حقوق پس پشت ڈال دے اور انبیاء کی تعلیمات سے دور ہو کر اپنی مرضی کی زندگی گزارنا پسند کر لے۔ اس طرح انسان دو قسموں میں تقسیم ہو گیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا :

{ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ فَمِنۡکُمۡ کَافِرٌ وَّ مِنۡکُمۡ مُّؤۡمِنٌ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲﴾} (التغابن)

''وہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ' پھر کوئی تم میں کافر ہے اور کوئی مؤمن۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھتا ہے۔''

مؤمن وہ ہوئے جنہوں نے انبیاء کی تعلیمات کو سچ جانا اور اس کے مطابق ایمانیات کی تکمیل کی ' توحید کا اقرار کیا اور رسولوں کی تصدیق کی ' آخرت کو سچ جانا اور قیامت کے محاسبے پر ایمان لائے ' نیز ان ایمانیات کو ان کی تمام فروعات کے ساتھ تسلیم کیا۔ اور جن لوگوں نے رسولوں کے پیغام کی تصدیق نہ کی ' نہ توحید کا اقرار کیا اور نہ رسالت کو مانا ' اور موت کے بعد کی زندگی کو بھی افسانہ قرار دیا ایسے لوگ کافر ٹھہرے۔

قیامت کے روز سب لوگوں کو اپنے خالق کے سامنے پیش ہو کر دنیا کی زندگی میں کیے گئے اعمال کا بدلہ پانا ہے۔ برے اعمال کا بدلہ برا اور اچھے اعمال کا بدلہ اچھا ہو گا۔ کوئی چھوٹے



سے چھوٹا عمل بھی بے نتیجہ نہ ہو گا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

{فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ ﴿۷﴾ وَ مَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ﴿۸﴾} (الزلزال)

''تو جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا۔''

آدمی جو اعمال اپنے ہاتھ پائوں سے کرتا ہے یا زبان سے اچھی یا بری بات کرتا ہے وہ سب اللہ کے مقرر کردہ کراماً کاتبین ریکارڈ کر رہے ہیں اور انسان کا نامہ ٔاعمال تیار ہو رہا ہے۔ اس نامہ ٔاعمال میں چھوٹے سے چھوٹا اور باریک سے باریک عمل بھی درج ہو گا۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَ وُضِعَ الۡکِتٰبُ فَتَرَی الۡمُجۡرِمِیۡنَ مُشۡفِقِیۡنَ مِمَّا فِیۡہِ وَ یَقُوۡلُوۡنَ یٰوَیۡلَتَنَا مَالِ ہٰذَا الۡکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیۡرَۃً وَّ لَا کَبِیۡرَۃً اِلَّاۤ اَحۡصٰىہَا ۚ وَ وَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا ؕ وَ لَا یَظۡلِمُ رَبُّکَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾} (الکہف)

''اُس وقت کتاب (نامہ ٔاعمال) کھول کر رکھ دی جائے گی تو تم گناہگاروں کو دیکھو گے کہ جو کچھ اس میں (لکھا) ہو گا وہ اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے ہائے ہماری شامت یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے اور نہ بڑی کو مگر اسے لکھ رکھا ہے ' اور انہوں نے جو عمل بھی کیے ہوں گے سب موجود پائیں گے ' اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔''

جب انسان اپنا نامہ ٔاعمال دیکھے گا اور اس کی نظر اپنے گناہوں پر پڑے گی تو وہ کسی طرح کا ردّعمل ظاہر نہیں کر سکے گا ' کیونکہ وہاں ہر عمل انتہائی صحت کے ساتھ درج ہو گا اور مجرموں کو اعترافِ جرم کے سوا چارہ نہ رہے گا۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

{فَاعۡتَرَفُوۡا بِذَنۡۢبِهِمۡ ۚ فَسُحۡقًا لِّاَصۡحٰبِ السَّعِيۡرِ ﴿۱۱﴾} (الملک)

''پس وہ اپنے گناہ کا اعتراف کریں گے ‘پھر (کہا جائے گا) اب دفع ہو جائیدوزخ والے ۔''

تاہم اتمامِ حجت کی یہ صورت بھی ہو گی کہ انسان کے اَعضاء وجوارح خود اس کے گناہوں کی شہادت میں بول اٹھیں گے جو ان کے ساتھ کیے گئے ہوں گے۔ اُس وقت انسان



کی حسرت ویاس دیدنی ہو گی کہ یہ میرے جسم کے اعضاء بھی میرے خلاف بول رہے ہیں جن کی پرورش کے لیے میں نے یہ سب کچھ کیا۔ ارشادِ ربانی ہے:

{اَلۡيَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰٓى اَفۡوَاهِهِمۡ وَتُكَلِّمُنَآ اَيۡدِيۡهِمۡ وَتَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۶۵﴾} (یٰس)

''آج ہم مہر لگا دیں گے ان کے مونہوں پر اور کلام کریں گے ہم سے ان کے ہاتھ اور گواہی دیں گے ان کے پائوں جو کچھ وہ کماتے تھے (یعنی عمل کرتے تھے) ۔''

معلوم ہوا کہ انسان کے لیے انتہائی لازم ہے کہ وہ اپنے اعمال پر نظر رکھے‘ اللہ تعالیٰ کی رضا والے کام کرے‘ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا اہتمام کرے‘ دنیا کی زیب و زینت سے دھوکا نہ کھائے‘ شیطان کے بہکاوے میں نہ آئے‘ قناعت کی زندگی پر اکتفا کرے اور ہر وقت آخرت کے حساب وکتاب کا منظر نظروں کے سامنے رکھے۔ ''اَلدُّنۡيَا سِجۡنُ الۡمُؤۡمِنِ ''کا یہی مطلب ہے کہ انسان دنیا کو عارضی ٹھکانہ سمجھے اور اقوال و افعال میں اپنے آپ کو آزاد نہیں بلکہ احکامِ الٰہی کا پابند سمجھے اور ایسے عمل کرے کہ اس فانی زندگی کے بعد غیر فانی اور ابدی زندگی کے لیے اچھا گھر حاصل کر سکے۔ اپنے آپ کو ہمہ وقت امتحان میں سمجھے کہ دنیا کی زندگی عاقبت کی تیاری کا وقفہ ہے ‘یہاں کے اچھے برے اعمال نتیجہ خیز ہوں گے۔ چنانچہ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر عمل کرتے وقت دھیان رکھے کہ یہ عمل عاقبت میں اُس کے لیے مفید ہو گا یا مضر۔ قرآن مجید میں دعوتِ فکر دی گئی ہے :

{وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ ۚ} (الحشر:۱۸)

''اورہر شخص نظر رکھے کہ وہ کل کے لیے کیا آگے بھیج رہا ہے ! ''

انسان کے اعمال اس کو کامیابی سے ہمکنار کریں گے یا ناکام و نامراد ٹھہرائیں گے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :

{الَّذِىۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَيٰوةَ لِيَبۡلُوَكُمۡ اَيُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ}(الملک:۲)

''اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔''

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے !

اگرچہ دنیا میں تقویٰ کی زندگی بسر کرنا آسان کام نہیں ،مگر اس کا خوش کن انجام سامنے ہوتو پھر آسانی ہو جاتی ہے۔ دنیا کی زندگی میں لوگ حسین مستقبل کی خاطر کس قدر محنت کرتے ،اور مشقت جھیلتے ہیں تو پھر ابدی راحت حاصل کرنے کے لیے دین کے احکام پر چلنے کی پابندی قبول کرنا کونسا مشکل کام ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین پر چلنے کی پابندیاں بالکل سہل رکھی ہیں ،کیونکہ اللہ انسانوں کے لیے آسانی پسند کرتا ہے تنگی نہیں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

{یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَ لَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ ۫} (البقرۃ:۱۸۴)

''اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے دشواری نہیں چاہتا۔''

اللہ تعالیٰ رحمن اور رحیم ہے۔ اس کی رحمت کی کوئی حد نہیں ۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

{وَ رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ ؕ} (الاعراف:۱۵۶)

''اور میری رحمت ہر چیز پر حاوی ہے۔''

ہمارے رسول رحمۃ للعالمین ہیں ،انہیں یہ ہرگز پسند نہیں کہ ان کے امتی مشقت میں پڑیں۔ اہل ایمان کی تکلیف انہیں بے چین کر دیتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اس حقیقت کا اظہار اس طرح کرتا ہے :

{لَقَدۡ جَآءَکُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ عَزِیۡزٌ عَلَیۡہِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِیۡصٌ عَلَیۡکُمۡ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۲۸﴾} (التوبۃ)

''(لوگو!) تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں ،تمہاری تکلیف ان کو گراں معلوم ہوتی ہے جبکہ وہ تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں ،مؤمنوں پر نہایت شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔''

جب ہمار اخالق اور مالک اتنا مہربان ہے کہ دنیا کی زندگی میں ہمارے لیے وہ نہایت آسان پابندیاں لگاتا ہے اور اس نے جو رسول بھیجا ہے وہ بھی رؤف ورحیم ہے تو یہ کتنی ناشکری کی بات ہے کہ انسان شریعت کی پابندیوں کی پاسداری نہ کرے اور اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو پسند کرے ،جو یقینا انجام کے اعتبار سے انتہائی خطرناک ہے۔

؎

یارب تو کریمی و رسولِ تو کریم  صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم



''اے پروردگار! تو کریم ہے اور تیرا رسول بھی کریم ہے ۔ سو بار شکر ہے کہ ہم دو کریموں (مہربانوں) کے درمیان ہیں۔''

اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے والوں کو اگلی اور حقیقی زندگی میں نعمتوں والے باغات کی

خوشخبری دی گئی ہے اور نافرمانوں کو سخت عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ اوّل الذکر اہل ایمان ہیں جبکہ دوسرے کافر۔ انبیاء و رسل کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی نبی آخر الزماں محمد ﷺ تھے۔ اب آپؐ کے بعد کوئی نبی یا رسول مبعوث نہ ہو گا۔ اللہ نے آپؐ پر قرآن مجید نازل فرمایا جس نے پہلی تمام الہامی کتابوں کو منسوخ کر دیا اور ان کی صحیح باتوں کی تائید اور تصدیق کر دی۔ چنانچہ اب اہل ایمان وہی لوگ ہوں گے جو توحید خداوندی کے اقرار کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار کریں۔ اب رسول اللہ ﷺ کا دیا ہوا دین اسلام ہی قیامت تک قابل قبول دین رہے گا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

{اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ۟} (آل عمران:۱۹)

''اللہ کے ہاں (قابل قبول) دین تو صرف اسلام ہے۔''

مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

{وَ مَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ} (آل عمران:۸۵)

''اور جو کوئی اسلام کے علاوہ دین اختیار کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''

پس اب انسانی آبادی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی 'ایک مسلم اور دوسرے کافر۔ مسلم وہ ہیں جنہوں نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا دل اور زبان سے کیا اور پہلے گزرے ہوئے تمام انبیاء و رسل کو برحق جانا۔ اُن انبیاء و رسل کا دور اور اُمتیں گزر گئیں رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں اور انہی کی نبوت اور رسالت قیامت تک رہے گی ۔ مسلمان کے لیے لازم ہے کہ قرآن اور سنّت رسولؐ کے مطابق اپنے ایمان کو مضبوط کرے اور اس کے مطابق عمل کرے۔

انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے 'جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:{وَ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ ضَعِیۡفًا ﴿۲۸﴾} (النسائ:۲۸) چنانچہ مسلمان اگر احکامِ شریعت کے مطابق عمل کرنے کی پوری کوشش کرے گا تو بھی اس سے عملی کوتاہیاں سرزد ہوں گی جن کے لیے وہ اللہ تعالیٰ سے بخشش کی استدعا کرتا رہے گا' اس امید پر کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے گناہوں اور تقصیرات کو معاف



کر دے گی ۔ روزِ قیامت مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ چاہے گا تو بعض کو بلاحساب کتاب بخش دے گا اور چاہے گا تو حساب لے گا۔ حساب کی صورت میں یا تو بخشش ہو جائے گی یا پھر نافرمانیوں کے بقدر سزا ملے گی اور پھر ایمان کی بدولت اس کی نجات ہو جائے گی۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی توحید اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا اقرار نہ کیا تو وہ کافر قرار پائیں گے۔ ان کے لیے قیامت میں میزان کھڑی نہیں کی جائے گی' کیونکہ ایمان کے بغیر ان کے وہ اعمال بھی اکارت جائیں گے جو بظاہر اچھے تھے ۔اگرچہ وہ سمجھیں گے کہ انہوں نے بہت سے نیک کام کیے

ہیں' بنی نوع انسان کی خدمت میں وقت اور پیسہ لگایا ہے مگر بنیادی خامی کی وجہ سے ان کی یہ خدمات کوئی صلہ نہیں پائیں گی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

{قُلۡ ہَلۡ نُنَبِّئُکُمۡ بِالۡاَخۡسَرِیۡنَ اَعۡمَالًا ﴿۱۰۳﴾ اَلَّذِیۡنَ ضَلَّ سَعۡیُہُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ ہُمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّہُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا ﴿۱۰۴﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ وَ لِقَآئِہٖ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ فَلَا نُقِیۡمُ لَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَزۡنًا ﴿۱۰۵﴾ ذٰلِکَ جَزَآؤُہُمۡ جَہَنَّمُ بِمَا کَفَرُوۡا وَ اتَّخَذُوۡۤا اٰیٰتِیۡ وَ رُسُلِیۡ ہُزُوًا ﴿۱۰۶﴾} (الکہف)

''کہہ دو کیا ہم تمہیں بتائیں کہ کون عملوں کے لحاظ سے بڑے نقصان میں ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سعی دنیا کی زندگی میں برباد ہو گئی اور وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیات اور اُس کی ملاقات کا انکار کیا تو ان کے اعمال ضائع ہو گئے اور ہم قیامت کے دن ان کے لیے کچھ بھی وزن قائم نہیں کریں گے۔ یہ ہے ان کی سزا جہنم' اس لیے کہ انہوںنے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں اور ہمارے پیغمبروں کی ہنسی اڑائی۔''

دوسری جگہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ روزِ محشر مجرموں سے کہا جائے گا:

{ہٰذِہٖ جَہَنَّمُ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۶۳﴾ اِصۡلَوۡہَا الۡیَوۡمَ بِمَا کُنۡتُمۡ تَکۡفُرُوۡنَ ﴿۶۴﴾} (یٰسٓ)

''یہ رہی دوزخ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ جاپڑو اس میں آج کے دن اس کفر کے بدلے جو تم (دنیا میں) کرتے تھے۔''

کفر کی حالت میں مرنے کا نتیجہ جہنم کی آگ ہے' اور اس آگ سے بچنے کے لیے کفر سے نکل کر اسلام میں آنا ضروری ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں تلقین فرمائی گئی ہے:



{وَ لَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۰۲﴾} (آل عمران)

''اور تمہیں موت ہرگز نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو!''

قیامت کے روز جب کافر کو اپنا خوفناک انجام سامنے نظر آئے گا تو وہ حسرت و یاس کے ساتھ مٹی میں مل جانے کی خواہش کرے گا۔

{وَیَقُوۡلُ الۡکٰفِرُ یٰلَیۡتَنِیۡ کُنۡتُ تُرٰبًا ﴿۴۰﴾} (النباء)

''اور کافر کہے گا کاش میں مٹی ہوتا!''

یعنی کاش میں انسان نہ ہوتا بلکہ مٹی ہوتا یا اب میں مٹی کر دیا جاؤں اور عذاب سے بچا لیا جاؤں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن جب جانوروں کو زندہ کر کے پھر مٹی میں ملا دیا جائے گا اور ان کو کسی طرح کا عذاب نہ دیا جائے گا تو کافر یہ منظر دیکھ کر کہے گا کاش میں بھی انسان کے بجائے جانور ہوتا اور کفر یہ انجام سے بچ کر مٹی ہو گیا

ہوتا۔

وہ لوگ جو توحید و رسالت پر ایمان نہیں لاتے اور اپنے کفر پر اَڑے رہتے ہیں ' اسلام کی آفاقی تعلیمات سے نفور رہتے ہیں' خاص طور پر رسول اللہ ﷺ کو خاتم النبیین تسلیم نہیں کرتے اور قرآن کو اللہ کا کلام نہیں مانتے وہ پکے کافر ہیں۔ ایسے لوگ اگلی زندگی میں اللہ کی رحمت سے دور ہوں گے ' ان پر اللہ کی لعنت ہو گی۔ قرآن مجید میں ان کا انجام بایں الفاظ مذکور ہے:

{اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ مَاتُوۡا وَ ہُمۡ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ لَعۡنَۃُ اللّٰہِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنۡہُمُ الۡعَذَابُ وَ لَا ہُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ﴿۱۶۲﴾ } (البقرۃ)

''یقیناجو لوگ کافر ہوئے اور کافر ہی مرے ایسوں پر اللہ کی ' فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ وہ ہمیشہ اسی (لعنت) میں رہیں گے 'ان سے نہ تو عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں کچھ مہلت ہی ملے گی۔''

اسی لیے مسلمانوں کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ دین اسلام کو اس قدر پھیلائیں کہ قیامت کے دن کوئی فردِ بشریہ نہ کہہ سکے کہ مجھ تک تو اسلام کا پیغام پہنچا ہی نہیں تھا۔پھر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اگر مسلمان کا یقین ہے کہ نجات کے لیے اسلام میں داخل ہونا ضروری ہے تو اچھے اخلاق کا بنیادی تقاضا ہے کہ ہر مسلمان پورے درد اور خلوص کے ساتھ غیر مسلموں کو اسلام کی



دعوت دے تاکہ وہ انجام کے اعتبار سے اللہ کے غضب کا شکار نہ ہوں۔ غیر مسلموں کو بھی چاہیے کہ وہ اسلام کی آفاقی تعلیمات کو قبول کریں اور دین حق میں داخل ہو کر ابدی عذاب سے نجات حاصل کر لیں 'ورنہ کافروں کا ٹھکانہ تو جہنم ہی ہو گا۔ قرآن مجید میں خبردار کیا گیا ہے:

{فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُہَا النَّاسُ وَ الۡحِجَارَۃُ ۖ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۴﴾ }(البقرۃ)

''پس ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے' وہ تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے ۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

{وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡۤ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۱۳۱﴾} (آل عمران)

''اور بچو اُس آگ سے جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

اس ساری وضاحت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر مسلمان خود پورے کا پورا اسلام میں داخل ہو جائے 'جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:{یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً ۪}(البقرۃ:۲۰۸) ''اے اہل ایمان ! داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے کے پورے''۔ اور پوری ذمہ داری کے ساتھ خود اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو اور کفار کے ساتھ حقیقی ہمدردی کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دو۔ رسول اللہ ﷺ اسی مشن کی تکمیل میں

لگے رہے کہ لوگوں کو کفر سے نکال کر اسلام میں لے آئیں تاکہ وہ آخرت کے عذاب سے بچ سکیں۔ قرآن مجید میں ہے:

{وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا} (آل عمران:۱۰۳)

''تم لوگ آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے تو اللہ نے تم کو بچا لیا۔''

یعنی تم کفر کی وجہ سے جہنم کی آگ کے مستحق ہو رہے تھے۔ اللہ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا ‘انہوں نے تمہیں دین میں داخل کر کے آگ کے عذاب سے بچا لیا۔اور یہی مشن ہر مسلمان کا ہونا چاہیے کہ وہ خود بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی گزارے اور غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دیتا رہے ‘کیونکہ نجات صرف دین اسلام میں منحصر ہے۔ یہ بات خوش آئند ہے کہ آج کفر کی دنیا میں اس اعتبار سے بیداری کی لہر دیکھنے میں آرہی ہے کہ غیر مسلم بڑی تیزی کے ساتھ اسلام قبول کر رہے ہیں۔

---



# اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کلمہ شکر ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ تعریف بھی عربی زبان کا لفظ ہے۔ اصولاً کسی زبان کے دو الفاظ بالکل ہم معنی نہیں ہوتے‘ان کے معنی اور مفہوم میں ضرور کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حَمد کا معنی صرف تعریف نہیں بلکہ شکر بھی ہے۔ چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کا جامع ترجمہ ہوگا ہر طرح کی تعریف اور شکر اللہ ہی کے لیے ہے۔ الحَمد صرف اللہ کے لیے ہے ‘کیونکہ وہی ایسی ذات ہے جو ہر قسم کی تعریف کے لائق ہے اور وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ اُس کا شکر ادا کیا جائے۔ جب مخلوقات کے کسی فرد کی تعریف کی جاتی ہے تو وہ دراصل اللہ کی تعریف ہوتی ہے‘ اس لیے کہ ہر شے کو قابل تعریف بنانے والا وہی ہے اور پھر عقل سلیم کا تقاضا ہے کہ جو احسان کرے اس کے ساتھ بھی احسان کا رویہ رکھا جائے ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے : {هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿٦٠﴾} (الرحمن)''احسان کا بدلہ احسان کے سوا کیا ہے؟'' چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:''جس نے انسانوں کا شکر ادا نہ کیا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا''۔ اس حقیقت کا اعتراف ہر باشعور انسان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو بے نیاز ہے‘اُس کے احسان کے بدلے میں احسان تو ممکن نہیں‘البتہ شکر کے جذبات کا اظہار کیا جا سکتا ہے ۔ اس طرح کہ سب کی سب تعریف بھی اللہ کی ہے اور سرتاسر شکر کے لائق بھی وہی ہے۔ چونکہ اس کلمے میں ایک واقعی حقیقت کا اعتراف ہے ‘اس لیے اس کی بڑی

فضیلت ہے۔

اللہ کی تعریف اور شکر کے دو اظہار ہیں' ایک زبانی اور دوسرا عملی۔ زبانی تو یہ ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کا کثرت سے ذکر کیا جائے اور حدیث میں وارد ثواب حاصل کیا جائے۔ جبکہ اس کا عملی پہلو یہ ہے کہ ہر قابل تعریف شے کو دیکھ کر اللہ کی عظمت کا اقرار کیا جائے کہ اصل تعریف اُسی کی ہے۔ کسی انسان کو حسین و جمیل دیکھا جائے تو سمجھ لیا جائے کہ اس کا یہ حسن وجمال عطیۂ



خداوندی ہے۔ اگر کسی کو علوم و فنون سے آراستہ دیکھا جائے تو اللہ کی تعریف کی جائے کہ وہی واحد ذات ہے جو ہر طرح کی صلاحیت عطا کرتا ہے۔

جب کوئی بندہ پورے شعور کے ساتھ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہہ رہا ہوتا ہے تو وہ اس بات کا اعتراف کر رہا ہوتا ہے کہ جہاں ہر قسم کی تعریف کا سزاوار اللہ واحد ہے اسی طرح وہی اس قابل ہے کہ اس کے سامنے نیازمندی کے ساتھ سر جھکایا جائے کہ اس نے حق گوئی کی توفیق دی اور طرح طرح کی صلاحیتوں کے ساتھ نوازا۔ یہ کلمہ ایک اٹل اور صحیح ترین حقیقت ہے۔ واقعی سب تعریف اللہ کی ہے اور وہی اس قابل ہے کہ اس کا شکر ادا کیا جائے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کا عملی اظہار یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی صلاحیت اور قابلیت کو اس کی رضا کے مطابق خرچ کیا جائے' کیونکہ جو نعمتیں انسان کو دی گئی ہیں ان کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ ان کا شکر ادا کیا یا نہیں؟ یعنی ان کو اللہ کے حکم کے مطابق استعمال کیا یا اس کی نافرمانی میں خرچ کیا؟ پھر اللہ تعالیٰ شکر ادا کرنے والے سے راضی ہوتا ہے اور اپنی نعمت اس کے حق میں زیادہ کرتا ہے۔ شکر ادا کرنے والا اپنا ہی فائدہ کرتا ہے' اللہ تعالیٰ تو بے نیاز ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: {لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ وَ لَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ ﴿ ۷ ﴾} (ابرٰھیم) ''اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں ضرور زیادہ دوں گا' اور اگر ناشکری کرو گے تو (یاد رکھو) میرا عذاب شدید ہے۔''

قرآن مجید میں اس کلمے کا اکثر ذکر ہے۔ پانچ سورتیں تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہ سے شروع ہوتی ہیں: الفاتحہ' الانعام' الکہف' سبا اور فاطر۔ اور سورتوں کے اندر اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کا بار بار ذکر ہے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑھاپے میں حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق علیہما السلام جیسے صالح فرزند عطا ہوئے جو آگے چل کر منصب نبوت پر سرفراز کیے گئے تو اس نعمت پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرح شکر کے جذبات کا اظہار کیا: {اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِىۡ وَهَبَ لِىۡ عَلَى الۡكِبَرِ اِسۡمٰعِيۡلَ وَ اِسۡحٰقَ‌ؕ اِنَّ رَبِّىۡ لَسَمِيۡعُ الدُّعَآءِ ﴿ ۳۹ ﴾} (ابرٰہیم) ''کل تعریف اور شکر اللہ کے لیے ہے' جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسمٰعیل اور اسحٰق عطا فرمائے' یقینا میرا ربّ دُعا کا سننے والا ہے''۔ یعنی دعا قبول کرتا ہے۔ جب اہل ایمان کو حساب کتاب کے بعد جنت میں بھیجا جائے گا تو شکر و سپاس کا یہ ترانہ ان کی

زبان پر جاری ہوگا : { اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ہَدٰنَا لِہٰذَا ۟ وَمَا کُنَّا لِنَہْتَدِیَ لَوْ لَآ اَنْ ہَدٰنَا اللّٰہُ } (الاعراف:۴۳)''کل تعریف اور شکر اُس اللہ کے لیے ہے



جس نے ہمیں ہدایت فرمائی ۔ہم ہدایت نہ پا سکتے اگر اللہ ہی ہماری راہنمائی نہ فرماتا''۔اسی طرح جنتی جنت میں داخل ہوں گے تو کہیں گے : {اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْہَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ} (فاطر:۳۴)''ہر طرح کی تعریف اور شکر اس ذات کا ہے جس نے ہم سے غم دُور کردیا''۔ہر شخص خواہ کتنا ہی نیکوکار ہو اس فکر میں رہتا ہے کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔مگر اہل ایمان جب جنت میں داخل ہوں گے تو وہ اسے سراسر اللہ تعالیٰ کی مہربانی جانیں گے اور اس کا شکر ادا کریں گے کہ اس نے غیر یقینی کیفیت سے نجات عطا فرمائی ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ وہ جملہ ہے جو عرش کے گرد کے فرشتے دہراتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے اور ساری خوبیاں اُسی کے لیے ہیں ۔ سورۃ الزمر کی آخری آیت ہے :{وَتَرَی الْمَلٰٓئِکَۃَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّہِمْ ۚ}(الزمر:۷۵) ''اور تم دیکھو گے فرشتوں کو کہ وہ عرشِ الٰہی کو گھیرے ہوئے ہوں گے'اپنے رب کی تسبیح بیان کررہے ہوں گے اُس کی حمد کے ساتھ۔''

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے بھی کلمہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کو اکثر وظائف کا جزو قرار دیا ہے ۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے فرمایاجب کوئی بندہ نیند سے بیدار ہو تو کہے : اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرِ یعنی ''کل شکر اور تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں زندہ کیا اس کے بعد کہ اُس نے ہم پر موت طاری کر دی تھی اور (ایک دن اسی طرح) اُس کی جانب لوٹ جانا ہے''۔اسی طرح کھانا کھایا جائے' پانی پیا جائے تو ان الفاظ میں اللہ کا شکر ادا کیا جائے : اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ یعنی ''کل شکر اورثنا اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور ہمیں مسلمانوں میں شامل فرمایا''۔اسی طرح لباس پہننے کی دعا بھی ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَسَانِیْ ھٰذَا الثَّوْبَ وَرَزَقَنِیْہِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّۃٍ (حِصنُ المسلِم) یعنی ''ہر قسم کی تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے مجھے یہ لباس پہنایا اور مجھے میری ذاتی قوت اور طاقت کے بغیر یہ عطا کیا''۔ الغرض ہمیں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جب بھی اللہ کی دی ہوئی نعمت حاصل کرو یا اس سے فائدہ اٹھاؤ یا اپنی کسی تکلیف سے نجات پاؤ تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش کا اعتراف کرو۔اللہ تعالیٰ کی حمدبیان کرنا اور جذباتِ شکر کا اظہار خالق کائنات کو اس قدر پسند ہے کہ سورۃ الفاتحہ جو اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے کو نماز کا لازمی جزو قرار دے دیا کہ اس کی تلاوت کے بغیر نماز

نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اپنا یہ معمول تھا کہ کثرت کے ساتھ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہا کرتے اور ہر نعمت پانے پر اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہتے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہنا گویا اس امر کی شہادت ہے کہ کہنے والا یہ اقرار کر رہا ہے کہ جو بھی نعمت اُسے ملی ہے اور ملتی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا اور فضل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے : {ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ ۝ ﴿ ۸ ﴾} (التکاثر) ''پھر اُس دن تم سے ضرور پوچھا جائے گا نعمتوں کے بارے میں''۔یعنی یہ کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتیں تم نے بے دریغ اور بے دردی سے استعمال کیں یا ان کی قدر و قیمت کو پہچانا اور انہیں اللہ تعالیٰ کی دین سمجھا !

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما ابوالہیثم رضی اللہ عنہ نامی صحابی کے مکان پر دعوت میں گئے۔ وہاں تازہ کھجوریں کھائیں' اس کے بعد گوشت کھایا اور ٹھنڈا پانی پیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہی ہیں وہ نعمتیں جن کے متعلق قیامت کے دن تم سے سوال کیا جائے گا''۔ یہ بات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بڑی دشوار محسوس ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تمہیں ایسی چیزیں (کھانے کو) ملا کریں تو بِسْمِ اللّٰہِ وَعَلٰی بَرَکَۃِ اللّٰہِ پڑھ لیا کرو اور سیر ہونے کے بعد ان الفاظ میں شکریہ ادا کر لیا کرو تو تمہاری یہ (شکرگزاری) اس نعمت کا بدل ہو جائے گی اور حق نعمت ادا ہو جائے گا : اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھُوَ اَشْبَعَنَا وَاَرْوَانَا وَاَنْعَمَ عَلَیْنَا وَاَفْضَلَ (حِصن حصین) ''اُس اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہمیں سیر کیا اور سیراب کیا اور ہم پر فضل و انعام فرمایا''۔گویا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہنا اللہ تعالیٰ کے لیے ہر قسم کی تعریف کا اقرار کرنا بھی ہے اور اس کا شکر ادا کرنا بھی ہے کہ وہی نعمتیں عطا کرنے والا ہے اور وہی مصائب اور پریشانیاں دور کرنے والا ہے۔

مخلوق کا ہر فرد' خواہ جاندار ہو یا بے جان' اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہے' کیونکہ اُس کا وجود اُسی کا مرہونِ منت ہے اور اسے جو بھی صلاحیت عطا ہوئی ہے وہ اُسی اللہ کی دین ہے۔ پس ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بنے' اپنی ہر صلاحیت اور خوبی اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق خرچ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا مطلوب اور محمود ہے اور بڑے اجر کا باعث ہے۔ اور اگر کوئی فرد اُس کے انعامات کا اعتراف نہیں کرتا اور شکر گزار نہیں بنتا تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا نشانہ بنے گا' کیونکہ یہ واضح ترین حقیقت کو جھٹلانا ہے۔

* * *



# اَللّٰہُ الصَّمَد

اَللّٰہُ الصَّمَد کا مطلب ہے کہ اللہ بے نیاز ہے ‘یعنی اس کو کسی طرح کی کوئی حاجت اور ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آپ میں کامل ‘مکمل اور پورا ہے۔ وہ ستودہ صفات ہے ‘ وہ جو چاہے کرتا ہے اور کر سکتا ہے۔ کسی کام کے کرنے میں نہ اسے کسی کے مشورہ کی ضرورت ہے اور نہ تعاون کی۔ موجودات کی ہر چیز ‘جاندار یا بے جان ‘اُسی کی پیدا کردہ ہے اور اُسی کی محتاج ہے۔

اللہ کی مخلوق میں انسان اشرف ہے اور یہ اس کی شاہکار تخلیق ہے ۔جس طرح دوسری تمام مخلوق اس کے سامنے عاجز اور بے بس ہے‘ اسی طرح انسان بھی اپنی خواہشات اور ضروریات کے لیے اللہ کا محتاج ہے۔ کوئی انسان بھی ایسا نہیں جو اس کا محتاج نہ ہو۔ وہی زندگی دیتا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں موت ہے۔ خوشی ہو یا غمی وہی طاری کرتا ہے ۔بیماری اور صحت بھی اس کے قبضہ میں ہے۔

اللہ جو کچھ کرتا ہے وہ صحیح اور اچھا ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی کو غربت دے تو اس کی مہربانی ہے اور اگر وہ کسی کو امارت دے تو بھی اس کا کام قابل تعریف ہے۔ اگر وہ بارش برساتا ہے تو کبھی سمجھا جاتا ہے کہ بہت اچھا ہوا بروقت بارش ہوئی مگر اسی بارش میں کسی کا نقصان ہو جاتا ہے تو وہ سمجھتا ہے ہے کہ بارش نہ ہوتی تو اچھا تھا۔ انسان کے یہ تاثرات اس کی ناقص سوچ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن میں اتنی صلاحیت نہیں کہ کسی خدائی فیصلے کی حکمت سمجھ سکے جبکہ اللہ تعالیٰ کا ہر کام مبنی بر حکمت ہے۔ بارش ہو یا کوئی کام وہ ہمیشہ بروقت ہوتا ہے۔ انسانوں کی اکثریت کو اللہ کی معرفت حاصل نہیں۔وہ اسباب اختیار کرتے اور ان پر بھروسہ کر لیتے ہیں اور یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اسباب بھی وہی پیدا کرتا ہے۔ اس کے ہاں کوئی بڑا نہیں مگر جس کو وہ بڑا کرے۔ اللہ نے اپنے کچھ بندوں کو برگزیدہ کر کے دنیا میں لوگوں کی اصلاح کے لیے بھیجا۔ وہ سراپا نیکی اور اچھائی تھے اور ان کو خالق کائنات کی معرفت حاصل تھی۔ لہذا انہوں نے کبھی بڑا بول نہیں بولا بلکہ وہ ہر وقت ‘ہر حالت میں اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے رہے اور اپنی حاجات اس



کے سامنے رکھتے رہے اور اس کی مدد کے طالب رہے۔

اللہ تعالیٰ کی صمدیت اٹل حقیقت ہے اور وہی بااختیار ہے۔ کوئی انسان چھوٹا ہو یا بڑا کسی اختیار کا مالک نہیں۔ اللہ کے نبیوں کے حالات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی برگزیدگی کے باوجود وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سرنگوں رہے ۔ اس کی مدد طلب کرتے رہے ‘اس کی رضا والے کام کرنے اور اس کی بندگی کے باوجود اس کی مغفرت کے طالب رہے اور معافی مانگتے رہے۔

انسان دھوکے میں آکر دوسرے انسانوں کو بڑا سمجھ بیٹھتا ہے اور اپنی حاجات اور ضروریات میں ان کی طرف رجوع کرتا ہے۔ انسان تو یہاں تک غافل ہو جاتا ہے کہ جانوروں ‘پتھروں اور کئی دوسری حقیر چیزوں کو اپنی قسمت کا مالک سمجھنے لگتا ہے۔ انسان کی اس بے سمجھی کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ {وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖٓ} (الانعام: ۹۱) ’’ لوگوں نے اللہ کی قدر کو نہیں پہچانا۔‘‘

اللہ اکیلا ہی الصمد ہے۔ کوئی جاندار یا بے جان چیز اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ جو چاہے کرے اس پر کوئی نگران نہیں۔ مخلوق میں کوئی فرد ایسا نہیں جو اپنی مرضی اُس پر مسلط کر سکے بلکہ جس انسان کو جتنی زیادہ معرفت خداوندی حاصل ہو گی وہ اتنا ہی بندگیٔ رب میں آگے ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ عبدیت کا جو مقام انبیاء کرام علیہم السلام کو حاصل تھا اور کسی کو حاصل نہیں ہوا۔ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول تھے بلکہ رسولوں میں بھی اُن کا درجہ سب سے بلند تھا۔ وہ بھی اللہ کے حضور اپنی بے چارگی‘ کمزوری او ر بے بسی کا اظہار کرتے تھے۔ چونکہ آپؐ کا منصب ہی یہ تھا کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی معرفت سکھائیں ‘اس لیے انہوں نے خود اپنے عمل سے لوگوں کو عبدیت کا نمونہ دیا اور تعلیم دی کہ اللہ کے سامنے جتنا کوئی نیچا ہو گا اتنا ہی پسندیدہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کو یہ سبق نہیں دیا کہ اگر تعاون کی ضرورت ہو تو کسی دوسرے انسان کو اللہ کے ہاں سفارشی بنا کر پیش کریں‘ بلکہ یہ بتلایا کہ وہ خود بے کس اور لاچار بن کر اللہ کے ہاں پیش ہوں اور اپنی حاجت اُس کے سامنے رکھیں اس لیے کہ وہ ہر کسی کی دعا سنتا ہے۔

قرآن مجید میں بہت سی دعائیں اللہ تعالیٰ نے سکھائی ہیں مگر کسی دعا میں کسی نبی یا ولی یا کسی فوت شدہ کو سفارشی کے طور پر پیش کرنے کی تعلیم نہیں دی۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ خود دعائیں کرتے رہے اور لوگوں کو دعائیں سکھائیں ‘مگر کسی دعا میں آپؐ نے کسی دوسرے کو دعا



کی قبولیت کے لیے سہارا اختیار کرنے کی تعلیم نہیں دی ۔بلکہ یہ سکھایا کہ اللہ تعالیٰ پر مخلوق کا کوئی فرد اثر انداز نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی مرضی کو بدلوا سکتا ہے۔ ہاں اس کے سامنے اپنی عاجزی اور بے بسی کا اظہار کر کے اپنی حاجت پیش کر سکتا ہے اور قبولیت کی اُمید کر سکتا ہے۔ کوئی شخص استحقاق یا دلائل کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ سے اپنی بات نہیں منوا سکتا۔ انسان کے دلائل ناقص ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کی حقیقت کو جانتا ہے ‘وہ جانتا ہے انسان کا نفع کس میں ہے اور نقصان کس میں ہے؟ خود انسان کو اس کا پتا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صمدیت یہ ہے کہ انسان اللہ سے اس طور پر مانگے کہ اس کے سامنے اپنے آپ کو ذرہ بے مقدار کر دے بلکہ اس کی مرضی پر راضی ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ الصمد ہے۔ کوئی شخص اگر کسی وجہ سے اس سے ناراض ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کا مخلص بندہ بن جاتا ہے تو وہ رب تعالیٰ کا کسی طرح کا کوئی فائدہ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کو

نہ کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع۔ وہ ہر کسی کی حمایت اور حمد سے بے نیاز ہے۔

اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے وہ عین صواب ہے اور وہ مخلوق کے کارخانے کو عدل سے چلا رہا ہے۔ جس طرح اس کی ہر صفت کو ہم نہیں سمجھ سکتے اس طرح صفت عدل بھی ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس کی حکمرانی عدل پر مبنی ہے جس کو چاہے گا بخشے گا ‘جس کو چاہے گا سزا دے گا ۔اس کے فیصلے پر کوئی اثرانداز نہیں ہو سکتا۔ وہ خود چاہے تو اپنا فیصلہ بدل دے لیکن مخلوق میں سے کسی کی طاقت نہیں کہ وہ اس کو فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دے۔ اُس کو کسی طرح کی مجبوری نہیں یہی اس کی صمدیت ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی ہے کہ اُس پر کسی بڑے سے بڑے کی آرزو یا خواہش پوری کرنا لازم نہیں۔ وہ چاہتا ہے تو کسی ادنیٰ اور حقیر سے فرد کی تمنا پوری کر دیتا ہے‘ اس کا ہر فیصلہ اعتراض سے بالاتر ہوتا ہے۔ وہ موت و حیات کا مالک ہے ‘کسی کو مختصر زندگی دیتا ہے ‘کسی کو لمبی عمر دیتا ہے اور کسی کو ارذل العمر تک پہنچا دیتا ہے ۔جب کسی کے ہاں فوتگی ہوتی ہے تو لوگ تعزیت کے لیے اس کے ہاں جاتے ہیں اور اکثر کہتے ہیں :’’بڑا افسوس ہے‘‘۔ یہ جملہ درست نہیں۔ وفات دینے والے کا دوسرے کاموں کی طرح یہ کام بھی صائب ہوتا ہے اس لیے اس کے کسی کام پر اظہارِ افسوس کرنا درست نہیں۔ ہاں یہ کہا جائے کہ اللہ کا حکم ایسا ہی تھا۔



نیز وفات پانے والے کے حق میں بخشش کی دعا کرنا مناسب ہے۔

اس کی صفت بے نیازی دوسری صفات کی طرح ناقابل فہم اور بے انتہا ہے۔ دیکھئے اگر ہمارے باپ ‘دادا ‘پردادا اب تک زندہ رہتے تو صورت حال کیا ہوتی۔ وہ خود بیمار کمزور اور اٹھنے بیٹھنے ‘ چلنے پھرنے سے معذور ہوتے اور نوجوانوں پر بوجھ ہوتے ‘ نوجوان اُن کی خدمت میں لگے رہتے تو افرادخانہ کی معاشی جدوجہد کون کرتا۔ یہ حقیقت تو اظہر من الشمس ہے اور انسانی فہم کی گرفت میں ہے مگر اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی علت سمجھنا انسان کے بس کی بات نہیں اور نہ ہی وہ اس کا مکلف ہے۔ اسی طرح کسی کا چھوٹا بچہ ماں باپ کو غمزدہ چھوڑ جاتا ہے تو رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق یہ بچہ ماں باپ کی بخشش کا سبب بن جائے گا ‘پس اللہ کی بے نیازی کا احاطہ کرنا انسانی استطاعت سے بلند ہے۔ جو شخص راضی برضا ہو گا وہی سکون اور اطمینان کی زندگی گزارے گا۔دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نہ الوہیت کو مانتے ہیں نہ توحید کو‘ بلکہ شیطان کی پیروی کرتے ہوئے شرکیہ کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان بدعقیدہ اور بدعمل لوگوں کی اللہ کو کوئی پروا نہیں۔ وہ انہیں بھی روزی دے رہا ہے‘ اولاد دیتا ہے ‘دُنیوی نعمتوں سے نوازتا ہے ۔وہ کسی کی بدعملی اور اسلام دشمنی کی بنا پر نہ اس کی روزی بند کرتا ہے اور نہ اسے دُنیوی نعمتوں سے محروم کرتا ہے ۔ اس کا ظرف بے حد کشادہ ہے۔ اس کی صمدیت نے تمام مخلوق کا احاطہ کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صمدیت یعنی بے نیازی کا تصور اس سے ہو سکتا ہے کہ اگر روئے زمین کے تمام انسان

دشمن خدا ہو جائیں یا یہ تمام انسان اعلیٰ درجہ کے بندۂ خدا بن جائیں تو کسی صورت میں بھی نہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان ہو سکتا ہے نہ نفع۔ وہ ہر طرح کے نفع و نقصان سے مبرا ہے۔

* * *





# حقوقِ انسانی کا جامع منشور

حج ارکانِ اسلام میں سے ایک رکن ہے۔ ارکان اسلام وہ ستون ہیں جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے۔ حج ایک عظیم عبادت اور اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر خصوصی رحمت کا مظہر ہے۔ اللہ کے بندے ہمہ وقت اللہ کی رحمت کے محتاج ہیں۔ خاص طور پر گناہوں کی بخشش تو ہر شخص کی دلی تمنا ہے۔ انسان کی اس خواہش کی تکمیل کے لیے مہربان رب نے ۹ذوالحجہ کے دن کو ادائیگی حج کے ساتھ وابستہ کردیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''جس آدمی نے حج کیا اور اس میں نہ تو کسی شہوانی بات کا ارتکاب کیا اور نہ اللہ کی کوئی نافرمانی کی تو وہ گناہوں سے ایسا پاک و صاف ہو کر واپس ہو گا جیسا اُس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا تھا''۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اور جو مسلمان استطاعت ہوتے ہوئے بھی اتنی بڑی نعمت سے فائدہ نہ اٹھائے اُس کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس کے پاس سفرِ حج کا ضروری سامان ہو اور اس کو سواری میسر ہو جو اسے بیت اللہ تک پہنچا سکے اور پھر وہ حج نہ کرے تو کوئی فرق نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔ اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے: ''اللہ کے لیے بیت اللہ کا حج فرض ہے اُن لوگوں پر جو اس تک جانے کی استطاعت رکھتے ہوں''۔ (جامع ترمذی)

حج کی فرضیت کا حکم راجح قول کے مطابق ۹ھ میں آیا اور اس کے اگلے سال ۱۰ھ میں اپنی وفات سے صرف تین مہینے پہلے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی کثیر تعداد کے ساتھ حج فرمایا جو ''حجۃ الوداع'' کے نام سے مشہور ہے۔ آپ ﷺ نے ذو القعدہ میں حج کے ارادہ کا اعلان کر دیا جس سے پورے عرب میں جوش و خروش کی لہر دوڑ گئی اور ہر مسلمان کی خواہش ہوئی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی معیت میں فریضۂ حج ادا کرے۔ چنانچہ ایک جم غفیر



رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں مکہ کی جانب روانہ ہوا۔ ذوالحلیفہ پہنچ کر آپؐ نے عصر کی نماز پڑھی۔ اگلے دن ظہر کی نماز کے بعد آپ ﷺ نے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے احرام باندھا اور ۴ذوالحجہ کو مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ جب آپؐ کی نظر بیت اللہ پر پڑی تو آپؐ نے فرمایا: ''اے اللہ تو اس گھر کو زیادہ عزت و شرف عطا فرما''۔ پھر آپؐ میدانِ عرفات میں تشریف لائے اور اپنی ناقہ قصواء پر سوار ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا جو خطبۃ حجۃ الوداع کہلاتا ہے۔ یہ خطبہ قیامت تک یادگار رہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''لوگو! تمہارے خون اور تمہارے مال تم پر حرام ہیں' بالکل اس طرح جس طرح آج کے دن (یوم العرفہ) اور (ذوالحجہ کے) اس مبارک مہینے اور اس مقدس شہر مکہ مکرمہ کی حرمت ہے! (تم اس مینا حق کسی کا خون کرنا اور کسی کا مال لینا حرام جانتے ہو) خوب ذہن نشین کر لو کہ جاہلیت کی ساری چیزیں میرے دونوں قدموں کے نیچے دفن اور پامال ہیں اور زمانۂ جاہلیت کے خون بھی معاف ہیں (یعنی اب کوئی مسلمان زمانۂ جاہلیت کے کسی خون کا بدلہ نہیں لے گا) اور سب سے پہلے میں اپنے گھرانے کے ایک خون ربیعہ بن الحارث بن عبدالمطلب کے بیٹے کے خون کی معافی کا اعلان کرتا ہوں جو قبیلہ بنی سعد کے ایک گھر میں دودھ پینے کے لیے رہتا تھا' اس کو قبیلہ ہذیل کے آدمیوں نے قتل کر دیا تھا۔ اور زمانۂ جاہلیت کے تمام سودی معاملات بھی میں ختم کر رہا ہوں اور اس باب میں بھی سب سے پہلے اپنے خاندان کے سودی مطالبات میں سے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کے سودی تقاضوں کی معافی کا اعلان کرتا ہوں۔

اے لوگو! عورتوں کے حقوق اور ان کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں خدا سے ڈرو۔ اس لیے کہ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر لیا ہے اور اللہ کے حکم اور اس کے قانون سے اُن کے ساتھ تمتع تمہارے لیے حلال ہوا ہے۔ اور تمہارا خاص حق اُن پر یہ ہے کہ جس آدمی کا گھر میں آنا اور تمہاری جگہ او رتمہارے بستر پر بیٹھنا تم کو پسند نہ ہو وہ اس کو اس کا موقع نہ دیں' لیکن اگر وہ یہ غلطی کریں (تو اصلاح کی خاطر) اُن کو کوئی ہلکی سی سزا دے سکتے

ہو۔ اور ان کا خاص حق تم پر یہ ہے کہ اپنے مقدور اور حیثیت کے مطابق ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ اور میں تمہارے لیے وہ سامانِ ہدایت چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم اس سے وابستہ رہے اور اس کی پیروی کرتے رہے تو پھر تم کبھی گمراہ نہ ہو گے، وہ ہے کتابُ اللہ !

---



قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم سے میرے متعلق پوچھا جائے گا (کہ میں نے تمہیں اللہ کے احکام پہنچائے یا نہیں) تو بتائو کہ وہاں تم کیا کہو گے اور کیا جواب دو گے؟'' حاضرین نے عرض کیا کہ ہم گواہی دیتے ہیں اور قیامت کے دن بھی گواہی دیں گے کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام اور اس کے احکام ہمیں پہنچا دیے ہیں اور راہنمائی اور تبلیغ کا حق ادا کر دیا اور نصح و خیر خواہی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اس پر آپ نے اپنی شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے اور لوگوں کے مجمع کی طرف اس سے اشارہ کرتے ہوئے تین دفعہ فرمایا: ''اے اللہ تو گواہ رہ ! اے اللہ تو گواہ رہ ! اے اللہ تو گواہ رہ !''

پھر حضرت بلالؓ نے اذان کہی پھر اقامت کہی، اور آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی۔ اس کے بعد حضرت بلالؓ نے اقامت کہی اور آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھائی۔ (صحیح مسلم)

عرفہ کا یہ دن جمعہ کا دن تھا۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے جمعہ کی نماز کی بجائے ظہر کی نماز پڑھی اور پھر ساتھ ہی عصر کی نماز بھی پڑھ لی۔ یعنی جو خطبہ اس دن آپ نے دیا وہ جمعہ کا خطبہ نہ تھا بلکہ حج کا خطبہ تھا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے ایک سے زائد خطبے دیے جن کے الفاظ حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ یہ خطبات حقوقِ انسانی کا خوبصورت گلدستہ ہیں۔ اگر ان کے الفاظ کو سمجھ کر اُن پر عمل ہونے لگے تو انسانیت امن و سکون کا سانس لے۔ عین اُس وقت جب آپ میدانِ عرفات میں لوگوں سے مخاطب تھے تو تکمیل دین کے یہ الفاظ بصورت وحی نازل ہوئے :

{اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا} (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین منتخب کر لیا''۔

آپ ﷺ نے یہ آیت بھی وہاں پڑھ کر سنا دی اور تکمیلِ دین کا اعلان کر دیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ گہری وابستگی پیدا کی جائے اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے مطابق حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا شعور پختہ کیا جائے۔ ہر انسان اپنے اعمال کا جائزہ لے اور ہدایت کی راہ سے ادھر ادھر نہ ہو تو دنیا امن کا گہوارہ بن جائے۔ اس خطبے کو بجا طور پر حقوق انسانی کا جامع منشور کہا جاتا ہے۔

* * *

## دُعا کی حقیقت اور اہمیت

اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے ایک حق یہ ہے کہ اپنی ہر ضرورت کے لیے اس کے سامنے دست سوال دراز کیا جائے ‘کیونکہ ہر ضرورت وہی پوری کرنے والا ہے۔ وہی دعائوں کو قبول کرنے والا اور بندوں کی حاجات کو برلانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوق کے کسی فرد سے دعا کرنا شرک کے زمرے میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے کہ وہ بندوں کی دعائوں کو سنتا اور قبول کرتا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات میں لاشریک ہے اسی طرح بندوں کی دعائوں کو سننے اور قبول کرنے میں وہ یکا اور تنہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے خزانے بے انتہا ہیں اور ان کی وسعت انسانی عقل و فکر میں نہیں آسکتی۔ اگر وہ دنیا کے ہر جن اور انسان کو اتنا کچھ دے دے جتنا وہ مانگے تو بھی اس کے خزانے میں ایک ذرہ بھر بھی کمی نہیں آئے گی ۔یہی وجہ ہے کہ وہ اس بات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور پسند کرتا ہے کہ لوگ اس سے مانگیں۔ دنیا کا معاملہ ہمارے سامنے ہے کہ بڑے سے بڑا سخی بھی مانگنے والوں کو اپنے خزانے سے ایک حد تک دے سکتا ہے اور اکثر مانگنے والوں کو انکار بھی کر دیتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ جو بے حساب خزانوں کا مالک ہے وہ پسند کرتا ہے کہ اس کے بندے صبح و شام اس سے مانگیں ‘بلکہ نہ مانگنے والوں سے ناراض ہوتا ہے۔ سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے ارشاد فرمایا:{قُلۡ مَا يَعۡبَؤُا بِكُمۡ رَبِّيۡ لَوۡلَا دُعَآؤُكُمۡ ۚ}(آیت ۷۷) ’’آپ فرما دیجیے اگر تم دعا نہ کرو تو میرا رب بھی تمہاری کچھ پروا نہیں کرے گا۔‘‘

اپنی ضروریات اور حاجات کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے دست سوال دراز کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے ۔ وہ انسانوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ اس سے مانگیں۔ نیز اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ سے ارشادفرماتا ہے:{وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيۡ عَنِّيۡ فَاِنِّيۡ قَرِيۡبٌ ؕ اُجِيۡبُ دَعۡوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ}(البقرۃ:۱۸۶)’’ جب آپؐ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں (کہ میں دور ہوں یا نزدیک ہوں) تو آپؐ بتا دیجیے کہ میں قریب ہی ہوں۔ دعا مانگنے



والے کی دعا قبول کرتا ہو جب بھی وہ مجھ سے دعا مانگے۔‘‘

انسان عبد ہے اور اللہ تعالیٰ معبود۔ دونوں کے درمیان رشتہ عبادت ہے۔ جب بندہ اللہ تعالیٰ

کے سامنے سوال کرتا ہے تو گویا وہ اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اس رشتے اور تعلق کا اظہار کرتا ہے۔ چونکہ یہ تعلق ایسی سچائی ہے کہ اس میں کسی طرح کا شک نہیں' لہٰذا پروردگار اس بندے سے خوش ہوتا ہے جو اس صداقت کا اظہار کرتا ہے اور اس کے سامنے عبد اور سوالی بن کر پیش ہوتا ہے۔ گویا اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی داد و دہش کا اقرار کر رہا ہوتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے آپ کو جتنا بے بس پیش کرتا ہے اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہوتا ہے کہ اس عمل میں سچائی کے علاوہ کچھ نہیں۔ انسان نماز میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے اور اس کی تعریف کرتا ہے۔ پھر رکوع میں جاتا ہے تو اُس کی عظمت بیان کرتا ہے۔ سجدے میں پیشانی زمین پر رکھ کر اس کی بڑائی بیان کرتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے سامنے نیچے سے نیچا ہوتا جاتا ہے اور بندے کا یہ انداز اللہ تعالیٰ کو پسند ہے 'کیونکہ وہ ایک اٹل حقیقت کا اظہار کر رہا ہوتا ہے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اللہ تعالیٰ میرا مالک ہے 'اس کے علاوہ میری بندگی کا حقدار کوئی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سجدے کی حالت میں انسان اللہ تعالیٰ کے قریب ترین ہوتا ہے۔

بندہ جس قدر عاجز ہو کر اللہ کے حضور پیش ہو گا اتنا ہی وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرے گا۔ اپنی تمنائوں ' حاجتوں اور ضرورتوں کا سوال کرتے وقت بندے کو چاہیے کہ وہ پرامید ہو کر مانگے اور اپنی بے بسی' بے بضاعتی اور بے قراری کا پورے خلوص کے ساتھ اظہار کرے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:{اُدۡعُوۡا رَبَّکُمۡ تَضَرُّعًا وَّ خُفۡیَۃً ؕ}(الاعراف:۵۵) ''لوگو! اپنے رب سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعا کیا کرو''۔ دعا مانگتے وقت انسان کو پرامید ہونا چاہیے کہ وہ واقعی اُس ہستی کے سامنے اپنی ضرورت پیش کر رہا ہے جو ہر شے پر قادر ہے۔ گویا وہ دعا کی قبولیت کے ضمن میں پرامید ہو ۔ہاں ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اُس کا جلال بھی پیش نظر ہو 'اس کے انداز میں بیم و رجا کا پہلو ہو 'یعنی وہ دعا مانگتے وقت اپنا حق نہ جتا رہا ہو بلکہ سراسر اُس کی رحمت کا امیدوار ہو اور اس کی جلالت سے خوفزدہ ہو۔ اسی حقیقت کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں دی ہے :{وَ ادۡعُوۡہُ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا ؕ }(الاعراف:۵۶) ''اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اور رحمت کی امید رکھتے ہوئے دعا کیا کرو۔''



عبد اور معبود کے رشتے کو دعا ہی مضبوط کرتی ہے:{اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ ﴿۴﴾}کا یہی مطلب ہے۔ نماز کی ہر رکعت میں اس حقیقت کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ جس طرح ہم عبادت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے اسی طرح اپنی ضرورتوں کے لیے بھی کسی دوسرے کی طرف رجوع نہیں کرتے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:((اَلدُّعَاءُ ھُوَ الۡعِبَادَۃُ)) (الترمذی) ''دعا ہی عبادت ہے۔''بندہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے بیم و رجا کے ساتھ دست سوال دراز کرتا ہے تو یہی عبودیت کا اظہار ہے۔ نماز بہت بڑی اور اہم عبادت ہے بلکہ مسلمان کی شناخت نماز ہے۔ اور نماز کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور دعائوں کا مجموعہ 'نیز اپنی بندگی 'کمزوری اور بے بسی کا اعتراف ۔ نماز کی فضیلت مسلمہ ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ عبد اور معبود کے رشتے کا اظہار ہے ۔

اسی لیے فرمایا گیا کہ جس نے نماز چھوڑی اس نے کافرانہ کام کیا۔ جب بندگی کا مستند اور محکم انداز چھوڑا تو وہ بندہ کیسے رہا۔

بندوں کو قرآن و سنت میں بتایا گیا ہے کہ وہ قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کو یاد رکھیں، گھر سے نکلیں تو اللہ کو یاد کریں، گھر میں داخل ہوں تو اللہ کو یاد کریں، بازار جاتے وقت، سوتے وقت، نیند سے بیدار ہوتے وقت، بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت، نکلتے وقت، سواری پر بیٹھ کر، کھانا شروع کرتے وقت اور فارغ ہوکر، غرض ہر اچھا اور جائز کام شروع کرتے وقت اللہ کو یاد کریں۔ رسول اللہ ﷺ کے لیے بلندی درجات اور تمام مسلمانوں کے لیے بخشش کی دعا کریں۔ قبرستان جائیں تو فوت شدگان کی سلامتی کی دعا کریں۔ مختصراً اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اس کا بندہ ہر وقت اس کا سوالی رہے، اپنی ہر حاجت، ضرورت اور مشکل کے وقت اسی کو پکارے۔

دعا بندے کا اور اس کے مالک کا معاملہ ہے۔ دنیا میں تو سفارشیں چل جاتی ہیں مگر دعا تو عبادت ہے، اس میں کسی تیسری ہستی کی مداخلت جائز نہیں۔ کسی صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے کہہ دیا: مَاشَاءَ اللّٰہُ وَمَاشِئْتَ ''جو کچھ اللہ چاہے اور جو کچھ آپ چاہیں''۔ اس پر آپ ﷺ نے فوراً فرمایا: ''کیا تم نے مجھے اللہ کا شریک ٹھہرادیا!'' دُعا بلااستثناء، صرف اللہ کا حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ معصوم تھے۔ اس کے باوجود آپؐ ہر روز ستر مرتبہ یا سو مرتبہ استغفار کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ''استغفار'' صرف گناہ بخشوانے کی دعا نہیں، بلکہ دعا ہونے کے ناطے یہ اللہ کی غفاریت کا اقرار ہے جو اٹل حقیقت ہے۔ اسی لیے استغفار کے الفاظ عبادت کے مظہر



ہیں اور عبادت اللہ تعالیٰ کو پسند ہے تو آپ ﷺ کا استغفار کرنا اظہارِ عبدیت اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے تھا، نہ کہ اپنے گناہ بخشوانے کے لیے۔ استغفار عبادت ہے اور عبادت آپ ﷺ کو مرغوب تھی۔

بندے کا اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے وقت کسی زندہ یا فوت شدہ ہستی کی بندگی کا سہارا لینا درست نہیں۔ قرآن مجید اور سنت میں درجنوں دعاؤں کے الفاظ ہیں، کسی دعا میں کسی دوسرے کا سہارا اختیار کرنے کا ذکر نہیں، بلکہ تمام دعائیں رَبَّنَا اور اَللّٰھُمَّ سے شروع ہوتی ہیں۔ یعنی اے ہمارے رب، اے اللہ... کسی دعا میں اس طرح کے الفاظ نہیں ہیں کہ اے اللہ! فلاں کے حق کی وجہ سے میری دعا قبول فرما۔ قرآن مجید کی کسی دعا میں اور رسول اللہ ﷺ کی کسی دعا میں گزرے ہوئے پیغمبروں یا اللہ کے نیک اور مقبول بندوں (زندہ یا فوت شدہ) کو دعا میں سہارا نہیں بنایا گیا۔ خلوص فی العبادۃ کا مطلب یہی ہے کہ بندے کی عبادت بس اللہ ہی کے لیے ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام درودِ ابراہیمی میں مذکور ہے۔ درود پڑھنے والا جہاں رسول اللہ ﷺ کے لیے رحمت کی دعا کرتا ہے وہاں ابراہیم علیہ السلام کے لیے بھی رحمت کی دعا کرتا ہے۔ یہ ہرگز نہیں کہ درود پڑھنے والا ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو دعا کی قبولیت کے لیے سہارا تسلیم کرتا ہو یا گنہگاروں کو بخشوانا ابراہیم علیہ السلام کا حق مانتا ہو۔ مستحق

بن کر اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے یا کسی دوسرے کے لیے مانگنا جائز نہیں۔ کوئی بڑا ہو یا چھوٹا ‘معصوم ہو یا گناہ گار سب کے سب خَوْفاً وَّطَمَعًا اپنے لیے اور دوسروں کے لیے اللہ تعالیٰ ہی سے مانگتے ہیں۔

* * *

60

## حب ِرسول ﷺ کی اہمیت

محبت اس جذبے کا نام ہے جو کسی چیز یا شخص کے ساتھ گہری وابستگی کے سبب پیدا ہوجائے۔ محبت کا یہ جذبہ دو طرح کا ہوتا ہے ‘ایک فطری اور دوسرا شعوری۔ فطری جذبے کا مظہر وہ محبت ہے جو چرندوں‘ پرندوں‘ درندوں اور انسانوں میں پیدائشی طور پر ودیعت کر دی گئی ہے۔ اس محبت کا ظہور بڑا واضح ہے کہ انسان اپنی اولاد کے ساتھ ‘ اولاد اپنے ماباپ کے ساتھ ‘بہن بھائی اور اقربا آپس میں محبت رکھتے ہیں۔اسی طرح جانور بھی اپنے بچوں کے ساتھ محبت رکھتے اور انہیں حفاظت فراہم کرتے ہیں۔

شعوری محبت وہ ہے جو انسان ان ہستیوں کے ساتھ کرتا ہے جن کا احسان‘ حسن سلوک‘ نیکی اور عمدہ اخلاق و کردار اسے متاثر کرتے ہیں۔ انسان کا سب سے بڑا محسن تو خود اللہ تعالیٰ ہے جس نے اسے تخلیق کیا‘ اس کی ضروریات کا انتظام کیا‘ ماں باپ کے دل میں اولاد اور اولاد کے دل میں ماں باپ کی محبت پیدا کی ---- انسان دنیا میں آزمائش کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے احسان فرمایا کہ انسان کو اس امتحان میں کامیاب ہونے کا طریقہ بتا دیا۔شیطان انسان کا واضح دشمن ہے ‘لہٰذا اس کی ہمہ وقت یہ کوشش ہوتی ہے کہ انسان کو اس راستے سے بچلا دے جو اُس کی نجات کا باعث ہے۔ شیطان کی اس کوشش کو کامیاب بنانے میں دنیائے فانی کی نقد لذات‘ یہاں کی رنگینیاں اور عیش و عشرت کے سامان بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔ شیطان کے حملوں سے بچائو اور نجات کی راہ سجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے وقتاً فوقتاً انبیاء و رسل علیہم السلام بھیجے جنہوں نے انتہائی ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچایا اور انہیں صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے والے اعمال بتائے‘ نیز اپنی زندگیوں کا نمونہ بھی پیش کیا۔

اللہ تعالیٰ کے یہ فرستادہ انسان‘ انسان ہونے کے باوصف مثالی کردار کے حامل تھے۔ وہ فضائل

اخلاق سے ہمہ تن مزین ؛اور رذائل اخلاق سے نفور تھے۔ اللہ کے ان برگزیدہ بندوں میں سے بھی بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔انبیاء و رسل علیہم السلام کے اس سلسلے کے آخر میں محمدؐ رسول



اللہ ﷺ کو بھیجا گیا۔ آپ ﷺ کو رحمۃ للعالمین کی صفت کے ساتھ سرفراز کیا گیا اور آپ کو اس کلام سے نوازا گیا جو کمال کی انتہائی بلندی پر ہے۔ پھر اس کلام کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا۔ لہٰذا اب نہ کسی نبی اور رسول کے آنے کی حاجت رہی اور نہ ہی کسی نئے کلام کی ۔ چنانچہ انسان کی سب سے زیادہ محبت کی حق دار تو خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے انسان پر گوناگوں نعمتوں کے علاوہ انبیاء و رسل علیہم السلام کے ذریعے اس کی ہدایت کا انتظام کیا--- ہر کوئی قدر شناس نہیں ہوتا' اس لیے دنیا میں بہت کم لوگوں نے اس احسان کا احساس کیا ۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے : {وَ قَلِیۡلٌ مِّنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ ﴿۱۳﴾} (سبا)''اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی ہیں۔''

ناشکر گزار لوگ وہ ہیں جنہوں نے اللہ کی عطا کردہ فطری ہدایت کھو دی اور اللہ کے سوا دوسروں کی محبت میں گرفتار ہو گئے اور حق سے دور نکل گئے۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: {وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَہُمۡ کَحُبِّ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ} (البقرۃ:۱۶۵)''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدمقابل بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ کے ساتھ ہونی چاہیے' حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ انسان کی حقیقی محبت صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے' باقی جتنی بھی محبتیں ہیں وہ اُس ذات کی محبت کے تابع ہیں۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اہلِ ایمان جس قدر اللہ سے محبت رکھتے ہیں اتنی زیادہ کامل اور عظیم محبت کوئی کسی مخلوق سے نہیں کرتا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کائنات میں کوئی ایسا ہے کہ ہر اعتبار سے اس کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے اس سے محبت کی جائے۔''(۱)

گویا محبت کا سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ سے محبت اللہ ہی کے لیے کی جائے گی اور قرآن مجید کا ادب و احترام بھی اللہ سے محبت کی وجہ سے ہو گا۔ سابقہ انبیاء و رسل علیہم السلام کا زمانہ تو گزر گیا 'اب قیامت تک نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کا ہی زمانہ ہے۔ لہٰذا انسانوں کی کامیابی کا دار و مدار اسی بات پر ہے کہ وہ کسی اور ہادی یا کسی اور آسمانی ہدایت کا انتظار نہ کریں بلکہ قرآن کو ضابطہ حیات ' رسول اللہ ﷺ کو اُسوۂ حسنہ جان کر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت کا حق ادا کریں۔ گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہی رسول

اللہ ﷺ کی محبت کا باعث ہے اور یہ اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر اہل ایمان کی جماعت میں شریک ہونے کا کوئی



جواز نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

{قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾} (التوبۃ)

''کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ 'تمہاری اولاد 'تمہارے بھائی 'تمہاری بیویاں' تمہارے کنبے قبیلے والے 'تمہارے کمائے ہوئے مال 'اور وہ تجارت جس کی کمی سے تم ڈرتے ہو 'اور وہ حویلیاں جنہیں تم پسند کرتے ہو 'اگر یہ (سب چیزیں) تمہیں اللہ ' اُس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو تم انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ سنا دے ۔ اور اللہ تعالیٰ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

گویا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت ایمان کا جزوِ لاینفک ہے ۔اگر کسی مؤمن کا رویہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس طرح کی محبت کا نہیں ہے تو وہ فاسق اور ہدایت سے دور ہے۔ صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ)) (۲) ''تم میں سے کوئی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ' اُس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔'' اس حوالے سے ایک اور حدیث ملاحظہ ہو جو حضرت عبداللہ بن ہشام رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

'' ایک دفعہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور آپؐ عمر بن خطاب کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے یارسول اللہ ! آپ مجھے میری جان کے علاوہ ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں۔ آپؐ نے یہ سن کر فرمایا :''نہیں ! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے (اس وقت تک تمہارا ایمان کامل نہیں ہو سکتا) جب تک تم مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ سمجھو''۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا :اب آپ میرے نزدیک میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے عمر! اب (تمہارا ایمان کامل ہوا ہے)۔'' (۳)

یہ حدیث گویا تفسیر ہے سورۃ الاحزاب کے ان الفاظ کی: {اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ

اَنْفُسِهِمْ} ''پیغمبر مؤمنوں پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ بنی نوعِ انسان کے ہمدرد اور غم خوار تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی فردِ بشر ہدایت سے محروم نہ رہ جائے۔ انہوں نے ہدایت کا پیغام لوگوں تک پہنچانے میں بے حد محنت ' مشقت اور جدوجہد کی۔ قرآن مجید میں ربّ السّمٰوٰت والارض نے آپ ﷺ کی اس جانفشانی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

{لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿ ١٢٨ ﴾} (التوبۃ)

''لوگو! تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں جن پر تمہاری تکلیف گراں گزرتی ہے' وہ تمہاری بھلائی کے بہت خواہش مند ہیں اور مؤمنوں پر نہایت شفقت کرنے والے مہربان ہیں۔''

جو ہستی انسانوں کی اس قدر ہمدرد ہو اُس کی قدر ناشناسی' واقعی انتہائی سنگ دلی اور کٹھور پن ہے۔ قرآن مجید میں ہے:{هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿٦٠﴾} (الرحمٰن) ''احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا''۔ یوں احسان فراموشی بہت بڑا عیب اور گناہ ہے۔ فریضہ رسالت کی ادائیگی میں آپؐ کی مشغولیت اس حد تک تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

{فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ﴿ ٦ ﴾} (الکہف)

''(اے پیغمبر!) اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید آپ ان کے پیچھے رنج کر کے اپنے تئیں ہلاک کر دیں گے۔''

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ ہر شخص کفر سے نکل کر اسلام میں داخل ہو اور اُخروی نجات کا امیدوار ہو جائے' چنانچہ آپ ﷺ دن رات اس بات کے درپے رہے کہ لوگوں کو صراطِ مستقیم کی دعوت دیں۔ آپؐ نے گلیوں اور بازاروں میں دعوت دی' محفلوں اور مجلسوں میں دعوت دی' گھروں میں جا کر دعوت دی' فرداً فرداً دعوت دی اور بار بار تذکیر کا حق ادا کیا۔ اس کیفیت کا ذکر نبی مکرم ﷺ نے خود ان الفاظ میں فرمایا ہے:

''میری اور لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے (اندھیرے میں) آگ جلائی۔ جب ارد گرد روشنی پھیل گئی تو پتنگے اور کیڑے مکوڑے جو آگ میں گرتے ہیں' آگ پر



گرنے لگے۔ وہ شخص انہیں آگ میں گرنے سے روکنے لگا' لیکن وہ اس پر غالب آ کر آگ میں گرتے پڑتے رہے۔ (یہی مثال میری اور تم لوگوں کی ہے) کہ میں تمہیں کمر سے پکڑ کر آگ سے باہر کھینچتا ہوں (لیکن تم لوگ مجھ پر غالب آئے جا رہے ہو) اور آگ میں کود رہے ہو۔'' (۴)

یہ تو آپ ﷺ کا مشن تھا' لیکن آپؐ کا اسی پر اکتفا نہ تھا' بلکہ آپؐ اپنی اُمت کی جہنم سے نجات کے اس قدر خواہاں تھے کہ راتوں کو جاگ جاگ کر ان کی ہدایت اور بخشش کے لیے دعائیں مانگتے تھے۔ حضرت ابوذر

غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ تہجد کی نماز میں صبح تک (ہر رکعت میں صرف سورۃ المائدۃ کی آیت): {اِنۡ تُعَذِّبۡہُمۡ فَاِنَّہُمۡ عِبَادُکَ ۚ وَ اِنۡ تَغۡفِرۡ لَہُمۡ فَاِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۱۸﴾} ''اگر تو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے ہی بندے ہیں' اور اگر تو انہیں بخش دے تو تو بڑا زبردست' حکمت والا ہے'' پڑھتے رہے اور اس پر رکوع اور سجدہ کر لیتے۔ جب صبح ہوئی تو میں نے آپؐ سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپؐ ہر رکعت میں صرف یہی ایک آیت پڑھتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی؟ تو آپؐ نے فرمایا:

((اِنِّیۡ سَاَلۡتُ رَبِّیۡ عَزَّوَجَلَّ الشَّفَاعَۃَ لِاُمَّتِیۡ فَاَعۡطَانِیۡھَا وَھِیَ نَائِلَۃٌ اِنۡ شَاءَ اللّٰہُ لِمَنۡ لَا یُشۡرِکُ بِاللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ شَیۡئًا)) (۵)

''میں اُمت کے لیے شفاعت کا سوال کر رہا تھا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا اور یہ شفاعت ان شاء اللہ میری اُمت کے ہر اس شخص کو ملنے والی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کچھ بھی شرک نہ کرے۔''

اسی طرح ایک رات رسول اللہ ﷺ اپنے ہاتھ اٹھائے اَللّٰھُمَّ اُمَّتِی ' اُمَّتِی کہتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے ۔ اس حال میں اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کو بھیجا اور انہوں نے آپؐ کے رونے کا سبب پوچھا ۔ آپؐ نے بتایا (کہ اُمت کی بخشش چاہتا ہوں) تو حضرت جبریل امین نے واپس جا کر اللہ تعالیٰ کو اس کی خبر دی 'حالانکہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی جانتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جبریل! جاؤ اور محمد ﷺ سے کہہ دو کہ ہم آپ کو آپ کی اُمت کے بارے میں خوش کر دیں گے 'آپ کو آزردہ نہیں کریں گے۔'' (٦)

نبی اکرم ﷺ اُمت کے درد میں نہال تھے اور اللہ تعالیٰ سے اُمت کے لیے کثرت کے ساتھ بخشش کی دعا کیا کرتے تھے۔ صحیحین کی ایک روایت 'جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں



کے الفاظ اس طرح ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لِکُلِّ نَبِیٍّ دَعۡوَۃٌ مُسۡتَجَابَۃٌ یَدۡعُوۡ بِھَا وَاُرِیۡدُ اَنۡ اَخۡتَبِیَٔ دَعۡوَتِیۡ شَفَاعَۃً لِاُمَّتِیۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ))(۷)

''ہر نبی کی ایک دعا ضرور قبول کی جاتی ہے (تمام انبیاء علیہم السلام نے اس دعا کو استعمال کر لیا ہے) اور میں چاہتا ہوں کہ اس دعا کو آخرت میں اپنی اُمت کی شفاعت کے لیے چھپا رکھوں۔''

یہ تھی رسول اللہ ﷺ کی اپنی اُمت کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی۔ ان حقائق کو جان لینے کے بعد ہر اہل ایمان کی پوری کوشش ہونی چاہیے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی محبت میں مخلص ہو اور آپؐ کے فرامین پر خوش دلی کے ساتھ عمل کرنے کا ارادہ کر لے۔ جن کاموں سے آپؐ ناراض ہوتے ہیں ان کے قریب بھی نہ جائے ۔ حب رسول زبانی عقیدت کا نام نہیں اور نہ ہی چند نمائشی کام کر لینا کافی ہے ۔ حب رسول تو یہ ہے کہ جہاں رسول اللہ ﷺ کا حکم آ جائے وہاں اہل ایمان کا سر جھک جائے اور وہ فرمانِ رسول کے مقابلے میں کسی دوسرے کی رائے کو قطعاً کوئی اہمیت نہ دیں۔ انسان اپنے کردار و عمل کا جائزہ لے کر خود اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اسے رسول اللہ ﷺ

کے ساتھ کتنی محبت ہے۔ اگر کوئی شخص ہر پیش آنے والی صورت حال میں فرمانِ نبویؐ پر عمل کرنے کو ضروری سمجھتا ہے، آپؐ کی نافرمانی سے خوف کھاتا ہے، اور اس حوالے سے نفع اور نقصان کو کوئی اہمیت نہیں دیتا تو اس کی محبت کا دعویٰ سچا ہے۔ اور اگر ایک شخص اپنے کردار و عمل میں اپنی خواہش نفس کا غلام ہے، خود بھی رسول اللہ ﷺ کے احکام توڑ رہا ہے اور دوسروں کو بھی خلافِ سنت رسول کام کرنے سے اس کے دل پر چوٹ نہیں لگتی تو وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔

حواشی

(۱) بحوالہ محبت رسول ،از مقصود الحسن فیضی، ص ۴۵۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وجوب محبۃ رسول اللہ ﷺ اکثر من الاھل والولد والوالد۔

(۳) صحیح البخاری، کتاب الایمان والنذور، باب کیف کانت یمین النبی ﷺ۔

(۴) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الانتہاء عن المعاصی۔

(۵) مسند احمد، کتاب مسند الانصار، باب حدیث ابی ذر الغفاری ص، ح ۲۰۳۶۵۔

(۶) صحیح مسلم، کتاب الایمان ، باب دعاء النبی ﷺ لامتہ وبکائہ شفقۃ علیھم۔

(۷) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب لکل نبی دعوۃ مستجابۃ۔



# رسولِ اکرم ﷺ -- نبی رحمت

رسول اللہ ﷺ تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں۔ آپ کی زندگی رأفت و رحمت، شفقت اور محبت کی زندگی تھی۔ رحیم و کریم ہونا انسانیت کی معراج ہے۔ یہی وہ صفت ہے جو انسانی رویے کو حیوانی رویے سے ممتاز کرتی ہے۔ دوسرے جاندار اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں مگر انسان میں رحمت و رأفت کی صفت اسے دوسرے تمام

ہم جنسوں بلکہ تمام مخلوق کے ساتھ بھلائی اور ہمدردی کی تعلیم دیتی ہے۔

ویسے تو ہر انسان کا مزاج فطری ہوتا ہے ‘یعنی کوئی شخص فطرتاً نرم مزاج ہوتا ہے اور کوئی سخت مزاج ‘مگر پسندیدہ رویہ رأفت اور نرمی کا ہے۔اگر کسی شخص کو بس اپنے فطری مزاج کے مطابق ہی زندگی بسر کرنا ہوتی تو انبیاء و رسل کی بعثت کی کیا ضرورت تھی ؟اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً انبیاء بھیجے۔اللہ کے ان برگزیدہ بندوں نے انسان کے مزاج میں اعتدال کی تعلیم دی۔ نرمی کو اس طرح کنٹرول کیا کہ بے حمیتی اور بے غیرتی تک نہ چلی جائے اور درشت مزاجی کو اس حد تک نہ جانے دیا کہ دوسروں کے حقوق تلف ہوتے رہیں۔

رسول اللہ ﷺ نہ صرف انسانوں بلکہ اللہ کی تمام مخلوق سے رتبے میں بلند و برتر ہیں ۔ آپؐ کے اندر تمام اخلاقی خوبیاں درجہ کمال تک موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آپؐ کی شان میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے:{وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ﴿۴﴾}(القلم)’’بے شک آپ بلند اخلاق کے مالک ہیں‘‘۔پھر خود آپؐ نے احقاقِ حق اور تحدیثِ نعمت کے طور پر فرمایا:((اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ))(۱) ’’مجھے تو تمام اخلاقی خوبیوں کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے‘‘۔چنانچہ آپؐ کے رویے میں مخلوقِ خدا کے حق میں اس قدر رحمت و رأفت تھی کہ قرآن مجید میں آپ کو رحمۃ للعالمین (جہانوں کے لیے رحمت) کے لقب سے نوازا گیا۔(الانبیائ:۱۰۷)

---



حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ مشرکین کے لیے بددعا کیجیے۔ آپؐ نے فرمایا : مجھے بہت لعنت کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا ‘مجھے تو صرف رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے(۲)۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مرد عورت‘ بچے بوڑھے ‘امیر غریب‘ اپنے پرائے ‘ عربی عجمی پر بلا تفریق مہربانی فرماتے تھے۔ سب کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک کرتے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا تھا ‘نہ کسی عورت کو نہ کسی خادم کو‘ سوائے اس کے کہ آپ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے تھے‘ اور آپؐ کو جب کبھی کسی سے تکلیف پہنچی آپؐ نے کبھی بھی بدلہ نہ لیا۔ ہاں اگر اللہ کے حرام ٹھہرائے ہوئے کاموں میں سے کوئی کام کیا جاتا تو آپؐ اللہ تعالیٰ کی خاطر اس حرام فعل کا ارتکاب کرنے والے سے انتقام لیتے(۳)۔

رسول اللہ ﷺ کا فرض منصبی تھا کہ آپ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں ‘ان کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین کریں اور ان کو اللہ کا پیغام پہنچائیں تاکہ وہ اس پر عمل کر کے موت کے بعد کی ابدی زندگی سنوار لیں۔ قرآن مجید میں آپ کو حکم خداوندی ہے : {یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ؕ وَ اِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ ؕ}(المائدۃ:٦٧)’’اے رسول ! آپ کے رب کی طرف سے جو پیغام آپ پر نازل کیا گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچائیں ‘اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو گویا حق رسالت ادا نہ کیا‘‘۔چنانچہ آپؐ نے حکم خداوندی پر عمل کرنے کا حق ادا کرنے

میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا بلکہ پوری ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ لوگوں کو اسلام کی تعلیم دی تاکہ وہ ابدی سکھ حاصل کر سکیں اور دوزخ کی آگ سے بچ سکیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ میری اور لوگوں کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے آگ سلگائی۔ پھر جب اس آگ نے اس کے ماحول کو روشن کر دیا تو پتنگے اور آگ میں گرنے والے کیڑے اس آگ میں گرنے لگے۔ وہ شخص انہیں کھینچ کھینچ کر باہر نکالنے لگا مگر وہ اس پر غالب آنے لگے اور اس آگ میں گرتے رہے۔ پس (وہی حال میرا اور تمہارا ہے کہ) میں تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر تمہیں آگ سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں مگر تم ہو کہ اس میں گرے جا رہے ہو(۴)۔

---



یہ حقیقی انسانی ہمدردی ہی تھی جس کے نتیجے میں آپ ﷺ نے حد درجہ سختیاں برداشت کیں مگر کسی وقت بھی کفار اور مشرکین کو چھوڑ کر الگ نہ ہوئے' بلکہ جان کے دشمنوں سے بھی اس قدر ہمدردی کی کہ ان کو راہِ راست پر لانے کے لیے ہر طرح کی کوشش کرتے رہے اور تکالیف اٹھاتے رہے۔ آپ ﷺ نے دوست اور دشمن سب کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ اختیار کیا اور کسی مخالف کی حد درجہ مخالفت سے خفا ہو کر اُس کے حق میں بددعا کے لیے ہاتھ نہ اٹھائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ طفیل بن عمر دوسی اور ان کے ساتھی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا یارسول اللہ ! دَوس کے لوگوں نے نافرمانی کی پس آپؐ ان کے لیے اللہ سے بددعا کریں ۔ اس پر لوگ کہنے لگے اب قبیلہ دوس ہلاک ہو جائے گا (کیونکہ حضور ﷺ نے بددعا کر دی تو وہ ضرور قبول ہو جائے گی) مگر حضور ﷺ نے (ان کے لیے بددعا نہ کی بلکہ یہ) دعا کی کہ اے اللہ ! دوس والوں کو ہدایت دے اور انہیں (اسلام میں) لے آ(۵)۔

رسول اللہ ﷺ کو دنیا کے ہر انسان کے ساتھ ہمدردی تھی۔ جو آپؐ کے ساتھی بن گئے' ان کے ساتھ تو آپ کی اُلفت دیدنی تھی' مگر کافروں' مشرکوں اور منافقوں کے ساتھ بھی آپ کا رویہ اخلاق کی اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے۔ آپؐ کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ کیونکہ ان کو نظر آتا تھا کہ اس قدر اونچے اخلاق کا حامل عام انسان نہیں ہوسکتا۔ عبداللہ بن اُبی آپ ﷺ کے وقت کا منافق اعظم تھا ۔یہی وہ شخص ہے جو غزوہ اُحد کے موقع پر اپنے تین سو ساتھیوں کو ساتھ لے کر واپس ہو گیا' گویا اسلامی لشکر کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ عبداللہ بن اُبی کا بیٹا عبداللہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا جاں نثار صحابی تھا۔ عبداللہ بن اُبی کی موت پر آپ کا حسن سلوک ملاحظہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ جب عبداللہ بن اُبی نے وفات پائی تو اس کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ آپؐ کی خدمت میں آئے۔ حضور ﷺ نے انہیں اپنی قمیص دی اور فرمایا کہ عبداللہ بن اُبی کو اس میں دفن کیا جائے۔ پھر آپؐ اس کی نماز جنازہ پڑھنے کے لیے

اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کا دامن پکڑ لیا اور عرض کیا کہ آپؐ اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے ! حالانکہ وہ منافق تھا اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے استغفار کرنے سے منع فرمایا ہے۔آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اختیار دیا ہے اور فرمایا ہے تم ان لوگوں کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو (برابر ہے)



اگر تم ان کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کرو گے تو بھی اللہ انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔ (التوبہ:۸۰) یہ آیت پڑھ کر آپؐ نے فرمایا کہ میں اس کے لیے ستر بار سے زیادہ استغفار کرلوں گا۔ پھر آپؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھی اور ہم نے بھی آپؐ کے ساتھ پڑھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ ؐپر یہ حکم نازل فرمایا کہ آئندہ ان میں سے جو کوئی مرے اس کی نماز جنازہ تم ہرگز نہ پڑھنا اور نہ کبھی اس کی قبر پر کھڑے ہونا' کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور وہ اس حال میں مرے ہیں کہ وہ فاسق تھے(٦)۔ (سورۃ التوبہ:۸۴)

رسول اللہ ﷺ ہر ماہر نفسیات سے زیادہ انسانوں کی نفسیات سے آگاہ تھے۔ آپؐ لوگوں کی ضروریات اور حاجات کو سمجھتے تھے لہٰذا کسی آدمی پر اُس کی استطاعت سے زیادہ ذمہ داری نہ ڈالتے 'البتہ دوسروں کے حقوق درجہ بدرجہ ادا کرنے کی تلقین کرتے ۔ ماں باپ' رشتہ داروں اور ہمسایوں کے ساتھ حسن سلوک کی خاص طور پر ہدایت فرماتے۔ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم کچھ ہم عمر نوجوان رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور بیس راتیں آپؐ کے پاس ٹھہرے۔ پھر آپؐ نے محسوس کیا کہ ہم (اداس ہیں اور) اپنے گھر والوں کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ پس آپؐ نے ہم سے پوچھا کہ تم کن کن اہل خانہ کو پیچھے چھوڑ آئے ہو تو ہم نے آپؐ کو بتایا۔ آپؐ بڑے نرم مزاج اور رحم دل تھے۔ آپؐ نے فرمایا :(اچھا) تم اپنے گھر والوں کے پاس واپس جائو اور جا کر انہیں تعلیم دو ۔ انہیں نیک کام کرنے کا حکم دو اور نماز پڑھو جیسے کہ تم نے مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے ۔جب نماز کا وقت آجائے تو تم میں سے ایک تمہارے لیے اذان دے اور جو تم میں سے سب سے بڑا ہو وہ تمہاری امامت کرائے(۷)۔

حضور اکرم ﷺ کو اپنی اُمت کے ساتھ بے پناہ محبت تھی ۔وہ چاہتے تھے کہ اُمت کا کوئی فرد بھی آخرت کے عذاب میں مبتلا نہ ہونے پائے اور کسی نہ کسی طرح اس کی بخشش ہو جائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :ہر نبی کی ایک (مقبول) دعا ہوتی ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اگر اللہ کو منظور ہو تو میں اپنی (اس مقبول) دعا کو قیامت کے دن اپنی اُمت کی شفاعت کرنے کے لیے محفوظ رکھوں(۸)۔ رسول اللہ ﷺ نے سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۱۸ کی تلاوت کی۔ اس آیت میں بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت کے دن اپنی اُمت کی سفارش کرتے ہوئے اللہ کے حضور عرض کریں گے : ''(اے اللہ) اگر آپ

انہیں سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف فرمادیں تو آپ غالب اور حکیم ہیں''۔ یہ آیت پڑھ کر رسول اللہ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا اللّٰھُمَّ اُمَّتِیْ ، اُمَّتِیْ اور آپؐ رونے لگے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبریل ! محمد (ﷺ) کے پاس جائو اور تمہارا رب خوب جانتا ہے تاہم ان سے پوچھو کہ آپ کس بات پر روتے ہیں؟ پس جبریل آپؐ کے پاس آئے اور آپؐ سے (رونے کا سبب) پوچھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ کہا تھا وہ حضرت جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو بتا دیا حالانکہ اللہ تعالیٰ خود خوب جانتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے جبریل ! محمد (ﷺ) کے پاس جائو اور (اُن سے) کہو کہ ہم آپ کو آپ کی اُمت کے بارے میں خوش کر دیں گے اور آپ کو رنجیدہ نہیں کریں گے(۹)۔

قرض لینا آپ پسند نہیں کرتے تھے۔ تاہم دنیاوی ضروریات کے تحت قرض لینا پڑ جاتا ہے اور اس کی اجازت بھی ہے ،مگر اس بات کی سختی کے ساتھ ہدایت کی گئی ہے کہ مقروض قرض کی ادائیگی میں مقدور بھر جلدی کرے تاکہ موت کے وقت اُس پر قرضے کا بار نہ ہو۔ قرض کی ادائیگی اس قدر ضروری ہے کہ شہید پر بھی اگر قرض کا بوجھ ہو گا تو اس کی ادائیگی تک وہ جنت میں نہ جا سکے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی ایسی میت لائی جاتی جس پر قرض ہوتا تو آپؐ دریافت فرماتے کہ کیا اس شخص نے اپنے قرض کے لیے فالتو مال چھوڑا ہے؟ اگر آپ کو بتایا جاتا کہ اس نے اتنا مال چھوڑا ہے جس سے اس کا پورا قرض ادا ہو جائے گا تو حضور ﷺ اس کی نماز جنازہ پڑھا دیتے ،ورنہ مسلمانوں سے فرماتے کہ تم اپنے ساتھی کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر اموالِ غنیمت کھول دیے تو آپؐ نے فرمایا کہ میں مؤمنوں کا خود ان کی ذات سے بھی زیادہ خیر خواہ ہوں۔ پس مؤمنوں میں سے جو کوئی وفات پا جائے اور قرض چھوڑے تو اس قرض کو ادا کرنا میرے ذمہ ہے اور جو کوئی مال چھوڑجائے وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے(۱۰)۔ یوں اُمت کے زیر بار افراد کے ساتھ آپ کی ہمدردی واضح ہے۔

بچوں ،بڑوں ،خدمت گزاروں ،زیردستوں ،عورتوں الغرض سب کے ساتھ آپؐ رحم دل اور محبت کرنے والے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر گرفت کرنا آپ کے ہاں نہ تھا ،بلکہ آپؐ قصوروں کی معافی پر فراخ دل تھے۔ منافق جھوٹے بہانے بنا کر آپؐ سے مراعات حاصل کر



لیتے مگر آپؐ درگزر فرماتے اور سختی کا برتائو نہ کرتے۔ زیردستوں اور بچوں پر تو آپ کی شفقت دیدنی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کے پاس کوئی خادم نہ تھا ،(میرے سوتیلے باپ) حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ میرا ہاتھ پکڑکر مجھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئے اور

عرض کیا: یارسول اللہ ! انس ایک سمجھدار لڑکا ہے' یہ آپ کی خدمت میں رہے گا۔ حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ پھر میں نے سفر اور حضر میں حضور ﷺ کی خدمت کی (حضورؐ اس قدر نرم مزاج اور شفیق تھے کہ) اگر میں نے کوئی کام کیا تو آپؐ نے کبھی مجھے یہ نہ فرمایا کہ تو نے یہ کام اس طرح کیوں کیا ؟اور اگر میں نے کوئی کام نہ کیا تو آپؐ نے کبھی مجھے یہ نہ فرمایا کہ تم نے یہ کام اس طرح کیوں نہیں کیا؟(۱۱)

حضرت رافع بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں انصار کے کھجور کے درختوں پر ڈھیلے مارا کرتا تھا ۔ لوگوں نے مجھے پکڑا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے رافع ! تم ان کے کھجور کے درختوں پر ڈھیلے کیوں مارتے ہو؟ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ بھوک (کے باعث)۔ آپؐ نے فرمایا :ڈھیلے نہ مارا کرو۔ جو (کھجور) خود ہی گر جائے وہ کھالیا کرو۔ اللہ تمہارا پیٹ بھرے اور تمہیں سیراب کرے۔ (۱۲)

رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر مرد بھی بیعت کرتے تھے اور عورتیں بھی۔ عورتوں سے بیعت لیتے وقت آپؐ ان سے ہاتھ نہیں ملاتے تھے بلکہ زبان سے فرما دیتے کہ میں نے تم سے بیعت کر لی۔ حضرت امیمہ بنت رقیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں انصار کی کچھ عورتوں کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی تاکہ ہم آپؐ سے بیعت کریں۔ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ! ہم آپؐ سے بیعت کرتی ہیں اس پر کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی' اور چوری نہیں کریں گی 'اور بدکاری نہیں کریں گی' اور کوئی بہتان نہیں لگائیں گی جسے ہم نے اپنے ہاتھ پائوں کے سامنے گھڑا ہو اور کسی نیکی کے معاملے میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی(ہماری یہ بات سن کر) حضورؐ نے فرمایا: (ان کاموں کا وعدہ کرتے ہوئے ساتھ یہ بھی کہو کہ) جہاں تک ہم سے ہو سکے گا اور جہاں تک ہم میں طاقت ہو گی۔ حضرت امیمہؓ کہتی ہیں کہ (آپؐ کی یہ ہمدردانہ بات سن کر) ہم بول اٹھیں کہ اللہ اور اس کا رسولؐ ہم پر بہت مہربان ہیں(۱۳)۔ گویا آپؐ نے خود عورتوں کو یاد دلایا کہ حسب استطاعت کے الفاظ بھی کہو کیونکہ کون ہے جو بیعت



کے ان الفاظ پر کماحقہ عمل کر سکتا ہو ! جب بندے نے حسب استطاعت کے الفاظ کہہ دیے تو گویا اُس نے اللہ کے حضور اپنی بے بسی اور کمزوری کا اظہار کر دیا جو کہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اور یہ بات خود رسول اللہ ﷺ خواتین کو یاد دلا رہے ہیں۔ دیکھئے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ' کو بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ فرمایا ہے۔ (سورۃ التوبہ:۱۲۸)

عبادت کے معاملے میں بھی آپؐ اعتدال اور نرمی پسند کرتے تھے۔ تلاوت قرآن کے بارے میں آپ کی ہدایت ہے کہ جس وقت تک طبیعت میں چاہت اور آمادگی ہو اس وقت تک تلاوت کرتے رہو' جب کسل پیدا ہونے لگے یا نیند کا غلبہ ہو جائے یا تکان محسوس ہونے لگے تو تلاوت موقوف کر دو۔ اسی طرح نماز میں بھی قابل

برداشت مشقت اٹھائی جائے۔ آپؐ نے نماز پڑھانے والوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ لوگوں کو ہلکی نماز پڑھائیں جو نمازیوں کے لیے سہولت کا باعث ہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو اسے ہلکی نماز پڑھنی چاہیے' کیونکہ نمازیوں میں کمزور' بیمار اور بوڑھے (سبھی طرح کے لوگ) ہوتے ہیں۔ ہاں جب تم میں سے کوئی تنہا نماز پڑھے تو جتنی چاہے لمبی پڑھے(۱۴)۔

رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا رہے ہوتے اور خواتین بھی جماعت میں شامل ہوتیں تو بچوں والی خواتین کی خاطر آپ قراءت مختصر کر دیتے۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ اسے لمبا کروں مگر پھر کسی کے بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو اپنی نماز مختصر کر لیتا ہوں 'کیونکہ مجھے یہ پسند نہیں کہ (میں لمبی قراءت کر کے) اُس کی ماں کے لیے تکلیف کا باعث بنوں(۱۵)۔

رسول اللہ ﷺ کی تواضع اور شفقت کا یہ عالم تھا کہ ہر کوئی آپؐ سے بے تکلف بات کر لیتا اور اپنا مسئلہ بیان کر کے آپ سے تعاون حاصل کر لیتا' کیونکہ لوگ آپؐ کی نرمی اور رأفت سے واقف تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عورت کی عقل میں کچھ فتور تھا۔ وہ (آپؐ کے پاس آکر) کہنے لگی :یارسول اللہ ! مجھے آپؐ سے کوئی کام ہے (وہ عورت اپنی بات صحابہ کرامؓ کے سامنے نہ بتانا چاہتی تھی) آپؐ نے اس سے فرمایا :اے ام فلاں جو گلی چاہے دیکھ لو (اوروہاں مجھے اپنا کام بتا دو) میں تمہارا کام کر دوں گا۔ پس آپؐ کسی راستے میں اسے تنہا ملے یہاں تک کہ اس



کام ہو گیا(۱۶) ۔ آپ نے اس کی بات بھی اُس کی خواہش کے مطابق سن لی اور حل بھی بتا دیا۔

رسول اللہ ﷺ اپنی اُمت کے حق میں انتہائی مہربان' رؤف ورحیم بلکہ فکرمند تھے۔ آپؐ کی خواہش تھی کہ میری اُمت نافرمانی والے کام نہ کرے اور اُمت کا کوئی فردبشر آخرت کے عذاب کا نشانہ نہ بنے۔

انسان تو انسان 'آپ ﷺ کسی جانور کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے ۔ جانوروں کے بارے میں بھی آپؐ نے ہدایات دی ہیں کہ اُن کے کھانے پینے کا پورا دھیان رکھا جائے۔ ان پر اتنا بوجھ لادا جائے جسے وہ برداشت کر سکیں اور ان کی تکلیف کا باعث نہ ہو۔ جانوروں سے اتنا کام نہ لیا جائے کہ وہ نڈھال ہو جائیں۔ جن جانوروں سے کام لیا جائے ان کے آرام کا بھی خیال رکھا جائے۔ جانوروں کے گھروں کو نہ جلایا جائے اور پرندوں کے بچے گھونسلوں سے نہ اٹھائے جائیں۔ جانوروں کو باہم لڑایا نہ جائے۔ حضرت عبدالرحمن بن عبداللہ رضی اللہ عنہما اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ رفع حاجت کے لیے گئے تو ہم نے سرخ سر والی ایک چڑیا دیکھی جس کے ساتھ اس کے دو بچے تھے۔ ہم نے اس کے بچے لے

لیے۔ پھر چڑیا آگئی اور زمین پر بازو بچھانے لگی۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ آگئے۔ آپؐ نے دیکھا تو فرمایا کہ کس نے اس کا بچہ لے کر اسے دکھ پہنچایا ہے؟ اس کا بچہ اسے لوٹا دو۔ پھر آپؐ نے چیونٹیوں کا ایک سوراخ دیکھا جسے ہم نے جلا دیا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: اسے کس نے جلایا ہے؟ ہم نے عرض کیا ہم نے جلایا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: آگ سے عذاب دینا کسی کو درست نہیں سوائے آگ کے مالک (یعنی اللہ) کے(۱۷)۔

ایک دن رسول اللہ ﷺ کسی انصاری کے باغ میں گئے تو وہاں ایک اونٹ آگیا۔ اس نے حضور ﷺ کو دیکھ کر درد بھری آواز نکالی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضور ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کے کانوں کی جڑوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ چپ ہو گیا۔ آپؐ نے پوچھا یہ اونٹ کس کا ہے؟ ایک انصاری جوان نے عرض کیا یارسول اللہ میرا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ کیا تو اس جانور کے بارے میں اللہ سے ڈرتا نہیں جس کا اللہ نے تمہیں مالک بنایا ہے۔ اس نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تو اسے بھوکا رکھتا ہے اور (زیادہ کام لے کر) اسے تھکاتا ہے (۱۸)۔

الغرض رحم دلی اور ہمدردی اخلاقیات کی نمایاں صفات ہیں۔ ہر اچھے انسان میں یہ

---



صفات پائی جاتی ہیں۔ یوں سمجھئے کہ کسی شخص کے اچھا ہونے کے لیے دیکھا جائے گا کہ اس کے دل میں دوسروں کا درد کس قدر ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں!

اللہ کے احکام کی کماحقہ اطاعت تو اللہ کے مقرب فرشتے کر بھی رہے تھے۔ انسان کو تخلیق کیا گیا کہ دیکھیں وہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ انسانیت کے گل سرسبد تھے اس لیے آپؐ میں رحم دلی اور ہمدردی کی صفات درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھیں، جن کی چند مثالیں آپ نے اوپر دیکھیں۔

البتہ یہ بات بھی ذہن میں مستحضر رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رحم دلی کی بھی حدود و قیود تھیں۔ آپؐ نے جان کے دشمنوں پر بھی رحم کیا، اُن سے کسی طرح کا انتقام نہ لیا، مگر اللہ تعالیٰ کے احکام کی تنفیذ کے معاملہ میں کسی طرح کی رعایت نہ کی۔ جب کفار صف بستہ ہو کر مسلمانوں کو ختم کرنے اور اسلام کو مٹانے کے لیے میدان میں آتے تو پھر اُن کے ساتھ کسی طرح کی نرمی نہ کی جاتی اور ایسا کرنا اللہ کے حکم کی تعمیل تھی، کیونکہ اللہ کے دین کو مٹانے کی جدوجہد کرنے والوں کے ساتھ آہنی ہاتھوں سے نبٹنے کا حکم تو اللہ نے دے رکھا تھا، لہٰذا اس کو تو کسی طور چھوڑا نہیں جا سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ ؕ} (التوبۃ:۷۳)

''اے پیغمبر! کافروں اور منافقوں سے لڑو اور ان پر سختی کرو۔''

پس حربی کافر ہر طرح کا رحم اور ہمدردی کھو بیٹھتے ہیں اور وہ مسلمانوں کے مدمقابل آکر سختی کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ان پر رحم کرنا خود اسلام کو نقصان پہنچانا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِیْنَ یَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَ لْیَجِدُوْا فِیْكُمْ غِلْظَةً ؕ} (التوبۃ:۱۲۳)

''اے اہل ایمان! لڑائی کرو اپنے نزدیک کے کافروں سے اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔''

---



یعنی جنگ کے وقت دشمنانِ اسلام کے ساتھ اس طرح بے جگری سے لڑو کہ ان پر تمہاری جرأت' بہادری 'جاں نثاری اور مقصدیت واضح ہو جائے۔ چنانچہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے کفر کے مقابلے میں جرأت اور بہادری کے وہ کارنامے دکھائے کہ تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اسی طرح اسلامی معاشرے میں جس شخص پر جرم ثابت ہوجائے اس پر اللہ کے حکم کے مطابق سزا دیتے وقت بھی کسی طرح کا رحم کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ کیونکہ اللہ کے حکم کی تنفیذ میں کسی طرح کی مداہنت کی اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{اَلزَّانِیَةُ وَ الزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّ لَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ} (النور:۲)

''زانی مرد اور زانی عورت دونوں میں سے ہر ایک کو سو درّے مارو 'اور اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے حکم کی تنفیذ میں تمہیں ان پر ہرگز ترس نہ آئے۔''

اسی طرح چور مرد ہو یا عورت اُس کی سزا یہ ہے کہ اُس کا ہاتھ کاٹ ڈالا جائے (دیکھئے سورۃ المائدۃ آیت ۳۸) ۔ظاہر ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹتے وقت اگر رحم دلی در آئے تو یہ سزا نافذ نہیں ہو سکتی۔ رسول اللہ ﷺ نے صفت رحمت کے ساتھ حد درجہ متصف ہونے کے باوجود ان سخت سزائوں پر عمل درآمد کیا اور کفار کے ساتھ جب وہ مقابلے پر آئے تو کسی قسم کی رعایت نہ کی بلکہ پوری قوت سے ان کے ساتھ قتال کیا۔ پس رسول اللہ ﷺ کی رحم دلی ہر اُس فرد بشر کے لیے تھی جو امن پسند ہو اور اسلام کو نقصان پہنچانے والا نہ ہو۔ چنانچہ امن پسند کافروں کے ساتھ بھی آپ کا رویہ رحم دلانہ تھا۔ اسلام کا یہ واضح حکم ہے کہ اسلامی سلطنت کی غیر مسلم رعایا کو ہرگز نہ ستایا جائے بلکہ اُن کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے' جس سے غفلت برتنے کی اجازت نہیں 'یہاں تک کہ کافر و مشرک اسلامی سلطنت کی رعایا ہوتے ہوئے اپنے عبادت خانے تعمیر کر سکتے ہیں اور اپنے عقیدے کے مطابق وہاں عبادت بھی کر سکتے ہیں۔

## حواشی

(۱) مجمع الزوائد للهیثمی : ۹/۱۸۔ ومختصر المقاصد للزرقانی : ۱۸۴۔ سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ للالبانی : ۴۵۔

(۲) حدیث حسن صحیح' سنن الترمذی' ابواب الاستیذان والآداب' باب ما جاء فی





(۳) صحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب خروج النساء الی المسجد...

(۴) سنن الترمذی' ابواب الاستیذان والآداب' باب ما جاء فی طیب الرجال والنسائ۔

(۵) حدیث حسن صحیح غریب' سنن الترمذی' ابواب الزھد' باب ما جاء فی اعلام الحب۔

(۶) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب قول النبیﷺ الدین النصیحۃ...

(۷) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب قول النبیﷺ الدین النصیحۃ...

(۸) سنن الترمذی' ابواب البر والصلۃ' باب ما جاء فی رحمۃ الصبیان۔

(۹) صحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابۃ' باب من اخاۃ النبیﷺ۔

(۱۰) صحیح مسلم' کتاب الذکروالدعائ' باب فضل الدعاء للمسلمین بظھر الغیب۔

(۱۱) حدیث حسن صحیح' سنن الترمذی' ابواب الاستیذان والآداب' باب ما جاء فی کراھیۃ خروج النساء متعطرۃ۔

(۱۲) صحیح مسلم' کتاب الجنۃ' باب جھنم اعاذنا اللہ عنھا۔

(۱۳) صحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابۃ رضی اللہ عنھم ' باب مواخاۃ النبیﷺ...

(۱۴) صحیح مسلم'کتاب صلاۃ المسافرین' باب استحباب صلوۃ الضحٰی۔

(۱۵) سنن ابی داوٗد' کتاب الحدود' باب عفو النساء عن الدم۔

(۱۶) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب من الایمان ان یحب لاخیہ ...

(۱۷) صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب فضل ازالۃ الاذی عن الطریق۔

(۱۸) سنن ابی ابوداوٗد' کتاب الجھاد' باب مایؤمر بہ من القیام علی الدواب۔

* * *

# سنتِ رسول ﷺ کی اہمیت

ربّ العالمین نے انسانوں کی ہدایت و راہنمائی کے لیے وقتاً فوقتاً اپنے برگزیدہ بندوں کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور اُن کے اختتام پر سید المرسلین ﷺ کو مبعوث فرمایا ‘اور ان پر اپنا کلام بصورتِ قرآن مجید نازل کیا۔ قرآن پاک فیصلہ کن کتاب ہے اور رسول اللہ ﷺ کی عملی زندگی قرآنی تعلیمات کے موافق اور منشاء الٰہی کے مطابق تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب آنحضرت ﷺ کے اخلاق کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے یہی فرمایا تھا کہ آپؐ کا اخلاق قرآن کریم ہی تو ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اوامر و نواہی کے ذریعے انسانوں کو اپنی پسند اور ناپسند سے آگاہ کر دیا ہے۔ لیکن انسان ان احکام پر عملی اعتبار سے کئی قسم کے عذر پیش کر سکتا تھا ‘اس لیے اللہ تعالیٰ نے حامل قرآن ﷺ کو قرآن پر عملی نمونہ کے طور پر پیش کر دیا‘ اس طرح ثابت ہو گیا کہ قرآن کی تعلیمات سے روگردانی پر کوئی عذر قابل قبول نہیں۔ محبوبِ ربّ العالمین ﷺ نے افلاس و تونگری‘ صحت و بیماری‘ سفر و حضر ‘کمزوری و غلبہ‘ شوہر اور حاکم‘ سپہ سالار اور منتظم‘ غرض ہر قسم کے حالات میں معیاری طرزِ عمل چھوڑا ہے جو قرآنی منشاء کو بھی پورا کرتا ہے اور بنی نوع انسان کے لیے بہترین نمونہ بھی ہے۔ خود قرآن حکیم میں {لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ} (الاحزاب:۲۱) کہہ کر رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو بہترین نمونہ بتایا گیا ہے۔

اب تک کے بیان سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جو شخص اپنی زندگی کو خالق کائنات کی منشاء کے مطابق گزار کر اللہ تعالیٰ کی لافانی نعمتوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے طریق نبویؐ کو اپنانے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ سچ فرمایا ہے حضرت سعدی شیرازیؒ نے ؎

خلافِ پیمبرؐ کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں آنحضرت ﷺ کی زندگی سے عملی نمونہ نہ ملتا ہو۔ اس لحاظ

سے آپؐ کی پوری زندگی میں انسانی حیات کے تمام تقاضوں کا مکمل اور کامل جواب موجود ہے۔ آپ ﷺ کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوئیں' لڑکے پیدا ہوئے' آپؐ نے ان کی پیدائش پر جس طرزِ عمل کو اختیار کیا یقینا وہی بہترین ہے۔ لیکن حضور ﷺ کے اُسوہ کے باوجود اگر کوئی شخص بیٹی کی پیدائش پر دل تنگ اور بیٹے کی پیدائش پر دل شاد ہوتا ہے تو ایسے شخص پر سنت کی اہمیت اور رسالت کا مقام واضح نہیں ہے۔ آپ ﷺ کی بیٹیاں جوانی کی عمر کو پہنچیں' آپ ؐنے ان کے نکاح کیے۔ لڑکیوں کی شادیاں کرنے والے طریق نبویؐ کو اپنانا چاہیں تو بخوبی اپنا سکتے ہیں۔ آپ ﷺ کے بچے چھوٹی عمر میں فوت ہوتے رہے۔ اس پر آپ ؐنے جس صبر و تحمل کا نمونہ پیش کیا' وہ آج اور رہتی دنیا تک اچھے لوگوں کے لیے راہ نمائی ہے۔بیٹیوں کے نکاح کے موقع پر بے سروپا رسوم کی پابندی اور نام و نمود کی خاطر بے جا تبذیر سنت ِرسول میں مفقود ہے۔ اسی طرح عزیزوں کی وفات پر مختلف ناموں سے دعوتوں کا انعقاد سنت ِرسول میں ہرگز نظر نہیں آتا۔ مردے کو تجہیز و تکفین کے بعد قبر میں اتارنا' پھر قبر بنانا آنحضرت ﷺ سے سیکھنا چاہیے۔ آپؐ نے قبریں پختہ بنانے اور ان پر عمارت کھڑی کرنے سے روکا ہے۔ اس کے باوجود قبریں پختہ بنانے اور ان پر عمارتیں بنانے کو باعث ناراضی ٔرسول نہ سمجھنا بھی عجیب منطق ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس میں بزرگوں کا اکرام ملحوظ ہے' لیکن وہ لوگ یہ چیز بھول جاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی اکملیت اور جامعیت کے بلند ترین درجے پر واقع ہے'اگر بزرگوں (زندہ اور فوت شدہ) کا اکرام ملحوظ ہے تو وہ بھی آپؐ ہی سے سیکھنا ہے۔کیا یہ آپ ﷺ کا فرمان نہیں ہے کہ ''جس نے ہمارے بڑوں کی توقیر نہ کی اور چھوٹوں پر رحم نہ کیا وہ ہم میں سے نہیں ؟''کیا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ ؐکے اس فرمان سے بے خبر تھے؟ ۳ھ میں جنگ اُحد کے موقع پر آپؐ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ آپؐ کی پرنم آنکھوں کے سامنے اُن کا کفن دفن کیا گیا اور قبر بنائی گئی' وہ قبر نہ پختہ ہوئی اور نہ اس پر عمارت بنی۔ حضرت حمزہؓ کو آپؐ نے سید الشہداء قرار دیا۔ کیا حضرت حمزہؓ سے بڑھ کر کوئی اکرام کا مستحق ہے؟

زندگی کا کون سا گوشہ ہے جہاں آپ ﷺ کی ذاتِ والا صفات سے راہ نمائی نہیں مل سکتی؟ آپؐ نے اپنے پروردگار کی عبادت رات کو خلوت میں اور دن کو لوگوں کے سامنے کی۔ رات کی عبادت کی کیفیت ازواجِ مطہرات ا کی زبانی ہم تک پہنچ چکی ہے اور دن کی



عبادات چشم دید گواہوں نے بتائی ہیں۔ فرض نمازوں کے لیے مسجد اور نفل نمازوں کے لیے گھر کو اختیار کرنا سنت نبویؐ ہے۔ پھر مراسم عبودیت قیام' رکوع' سجود 'قعدہ میں بالترتیب قرآن کی تلاوت' بندگی کا اقرار' خدا کی کبریائی اور عظمت کا اعتراف اور دعائیں ہیں۔ یہ طریق نبوی ؐہے۔ جنگل میں جا کر عبادت' مسجد اور جماعت کے بغیر نماز' پھل اور اچھی غذائیں چھوڑ کر نمکی اور بھدی غذائوں کا استعمال' جسم کو گندا اور غلیظ رکھنا' الجھے ہوئے بال اور میلے

کچیلے کپڑے پہننا' پائوں میں گھونگھر و باندھنا' تجرد کی زندگی گزارنا' پانی میں کھڑے ہو کر اوراد و وظائف کرنا' قبر پر مجاورت کرنا اور اس کے علاوہ دوسری مصنوعی عبادتیں جب پیغمبر ﷺ کے اُسوۂ حسنہ میں نہیں ہیں تو ان میں نفع کی بجائے سراسر نقصان اور خسران ہے۔ کیونکہ ناقص اور ادھوری چیز میں تو اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن مکمل' کامل اور جامع ترین شے میں اضافہ اُس کے حسن و کمال میں نقص کا باعث ہو گا۔ کوئی ایسی خیر' بھلائی یا خوبی نہیں ہے جو پیغمبر ﷺ کے اُسوہ میں نہ ملتی ہو۔

اُسوۂ حسنہ کا جواب تو ملنا محال ہے۔ آپ ﷺ کی زندگی کمال کے اُس مقام پر ہے کہ کوئی دوسرا وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ البتہ آپؐ کے پیروکاروں نے بھی اس درجہ آپؐ کی اتباع کی ہے کہ خود آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگو! تم پر میرے طریقے کی پیروی اور میرے حق پرست خلفاء کے طریقے کی پیروی لازم ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کے اس فرمان کی روشنی میں جب ہم خلفائے راشدین کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ ان بزرگوں کی زندگی بھی اُن ہی نقوش کا مجموعہ ہے جو اُسوۂ حسنہ میں پائے جاتے تھے۔ شادی بیاہ' پیدائش و وفات' خوشی اور غمی' جنگ اور امن میں جو طریقہ آپ ﷺ نے اپنایا وہی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے۔ عبادت جس طرح آپؐ نے کی اُسی طرح صحابہ نے۔ الغرض خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دین کی اُس کامل اور مکمل صورت کو جو انہوں نے آنحضرت ﷺ سے سیکھی بالکل اُسی طور پر اپنا لیا اور اس طرح آپؐ کی نظروں میں قابل اعتماد ٹھہرے۔ انہوں نے اپنی پسند و ناپسند کو قطعاً معیار نہ بنایا بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ کے اسوۂ حسنہ ہی کی پیروی کی اور اس میں کچھ کمی یا زیادتی نہ کی۔

آج کل مادی ترقی کا دور ہے۔ ایجادات نے بود و باش کو بہت متاثر کیا ہے۔ اس دور کے کچھ چیلنجز ہیں ،لیکن اسلام میں ہر دور کے چیلنجز قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ علمائے وقت ایسے مسائل میں اجتہاد کر سکتے ہیں ۔مثال کے طور پر ریل گاڑی یا ہوائی جہاز میں



سفر کے دوران نماز کی ادائیگی کیسے کی جائے۔ ٹیلیفون پر ایجاب و قبول کا انعقاد وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو زمانہ نبوی اور خلفائے راشدین ؓ کے عہد کے بعد کی پیداوار ہیں۔ چنانچہ علمائے عصر حاضر جن کو قرآن و حدیث اور ان سے متعلقہ علوم میں دسترس حاصل ہو' ان مسائل کا حل بتائیں گے ۔علماء کے اجتہادی اختلاف کی صورت میں کسی مجتہد کا فیصلہ اقرب الی الصواب سمجھ کر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن طریق ِعبادت اور دوسری تمام باتیں جن میں دربارِ نبویؐ کا فیصلہ پہلے سے موجود ہو' ان میں کوئی دوسری راہ اختیار کرنا تو سراسر خسرانِ مبین ہے۔

سنت ِرسول ﷺ اور طریق صحابہ ؓ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا طریقہ معیار قرار نہیں پا سکتا' کیونکہ اُسے کوئی سند حاصل نہیں۔ سنت ِرسول تو اللہ کی طرف سے ہے اور طریق صحابہ کو خود رسول اللہ ﷺ نے

معیار قرار دیا ہے۔ اب تو وہی شخص اللہ کا مقرب بندہ اور ولی اللہ ہو گا جس کا راستہ بس سنتِ رسول ؐ اور طریق صحابہ ؓ کے مطابق ہو۔ لیکن ایسا شخص بھی اُمت کے لیے مطاع نہیں ہو گا' بلکہ پسندیدہ ہو گا ۔وجہ اُس کی یہ ہے کہ جزئیات تک کامل نمونہ حیات تو صرف انبیاء کرام علیہم السلام ہوتے ہیں 'جن کو معصوم رکھنا مشیت ایزدی سے ہوتا ہے۔

شروع سے یہ دستور رہا ہے کہ لوگ اپنے ابنائے جنس کے کچھ افراد سے اچنبھے اور نرالے کام دیکھ کر ان کے ساتھ اظہارِ عقیدت شروع کر دیتے ہیں 'اور آہستہ آہستہ یہی جذبہ شخصیت پرستی تک لے جاتا ہے۔ اس طرزِ عمل کی شناعت واضح ہے کہ معیاری زندگی تو اتباعِ رسول ﷺ میں ہی ہو سکتی ہے۔ اگر نرالے اور اچنبھے کام کر گزرنا بزرگی کی علامت ہے تو یہ علامت سامری میں بھی موجود ہے اور بہت سے غیر مسلم جوگی ' راہب' جادوگر اور شعبدہ باز خوارقِ عادات کے لیے آج بھی مشہور ہیں' جن کی زندگیوں میں لہو و لعب کے علاوہ خدا پرستی بھی مفقود ہے۔ پھر ایسے افراد میں بزرگی کس بنیاد پر تسلیم کی جائے؟

شخصیت پرستی گمراہی کی جڑ ہے۔ ہر قسم کی گمراہیاں اور توحید کی خلاف ورزی اسی سے جنم لیتی ہے۔ ابلیس لعین لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے شروع سے آج تک اس ہتھیار کو بڑی کامیابی سے استعمال کر رہا ہے۔ لوگ کسی شخص میں نرالا پن اور شعبدہ بازی دیکھ کر اُسے بزرگ سمجھنے لگتے ہیں اور پھر اُس کے طور و اطوار کو بنگاہِ عقیدت دیکھنے لگتے ہیں 'یہاں تک کہ اُس بزرگ کی پسند ناپسند کو معیاری قرار دے لیتے ہیں۔ مسلمان بھی اس مرض کا شکار نظر آتے ہیں جب وہ اظہارِ



عقیدت میں غلو کرتے ہوئے بعض لوگوں کے طرزِ عمل کو معیاری قرار دے لیتے ہیں اور اس طرح آنکھیں بند کر کے مطاعِ حقیقی کو بھول جاتے ہیں۔ کوئی مجاورت برقبور کو صائب سمجھنے لگتا ہے تو کسی کی نظر میں قوالی بھلی معلوم ہوتی ہے 'کوئی جنگل میں عبادت کو تقرب اِلی اللہ کا ذریعہ سمجھتا ہے تو کوئی مجرد رہنے میں بھلائی خیال کرتا ہے۔ گویا پہلے بوجوہ ایک شخصیت کو بھلا سمجھ لیا اور بعدازاں اُس کے افعال کو معیاری قرار دیا 'حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص بھی خلافِ سنتِ رسول ﷺ عمل کر کے پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔ کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ مطاع بن کر لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لے' بلکہ اب ہر شخص کی بھلائی اسی میں ہے کہ معراجِ انسانی کی انتہا تک پہنچ جانے والی ہستی (ﷺ) کی پیروی کرے۔

کسی شخص کے حق میں رائے عامہ ہموار ہو جاتی ہے 'جبکہ لوگ کسی کی مخالفت پر کمر بستہ ہوجاتے ہیں۔ کسی کو حالات سازگار ملتے ہیں اور کسی کی زندگی الجھنوں اور مصیبتوں کا شکار ہوجاتی ہے۔ کوئی عرصۂ دراز تک بیمار رہتا ہے 'کسی کو عمر بھر بیماری نہیں آتی۔ کوئی خوبصورت ہوتا ہے اور کوئی بدصورت 'لیکن ان میں سے کسی

کو بھی خدا رسیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں البتہ ان میں سے جو شخص بھی سنت رسول کی پیروی کو مضبوطی سے اختیار کیے ہوئے ہے وہ بہرحال نیکوکار اور ولی اللہ ہے' خواہ اُس کی مخالفت ہو رہی ہے یا موافقت' خواہ اُس کے شب و روز بیماری میں گزر رہے ہیں یا صحت میں ۔ الغرض معیارِ حق پرستی نہ رنگ و نسل ہے 'نہ دکھ تکلیف' نہ آرام و سکون' نہ دولت و غربت' نہ قبولِ عام نہ عدمِ قبولِ عام 'نہ ظہور خوارق نہ عدم ظہورِ خوارق' بلکہ معیار ہے تو صرف اتباعِ طریق نبوت ہے اور بس۔ اور یہ معیار کسی انسان 'جن یا فرشتے کا بنایا ہوا نہیں' بلکہ خود خالق دو جہاں کا بنایا اور بتایا ہوا ہے۔ اس معیار کے قیام و بقا کے لیے پیش بندی کے طور پر قرآن میں دین کی بتمام و کمال جامعیت کے ساتھ پسندیدگی کا اعلان کیا گیا اور پیغمبر اسلام ﷺ نے دین میں کمی بیشی کرنے والوں کو مردود گردانا۔ یہی سبب ہے کہ حق شناس مسلمان بزرگوں نے جو کچھ عمل کیا اتباعِ سنت میں کیا اور اپنی کسی بات یا کسی عمل کو حجت نہ ٹھہرایا جو سنت میں موجود نہ ہو۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول بڑا معروف ہے کہ اگر میری کوئی بات صحیح حدیث کے خلاف ہو تو اُسے دیوار کے ساتھ دے مارو۔

یوں سمجھئے کہ دین حق اور سنت ِرسول ﷺ دونوں ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ سنت رسول کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ خواہ کس قدر چمکدار اور مزین نظر آئے' وہ سراب اور دھوکا



ہے۔ صراطِ مستقیم صرف ایک ہی ہے اور وہ سنت ِرسول ﷺ ہے۔ جس طرح دین کے مقرر کردہ کاموں میں کمی کرنا مذموم ہے اسی طرح زیادتی کرنا بھی ناجائز ہے۔ کمی کرنے کی برائی تو واضح ہے 'لیکن زیادتی کرنا اس لیے مذموم ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی سنت کمال کی انتہا پر تو پہلے ہی موجود ہے۔ زیادتی یا اضافے کا جواز تو وہاں ہے جہاں پہلے نقص ہو اور اس کو دور کرنا مقصود ہو یا خوب کو خوب تر کرنا منظور ہو۔ لیکن جو چیز خوب ترین ہو اور اُسے خوب ترین بھی خود خدائے بزرگ و برتر نے بنایا ہو اُس میں اضافے کی گنجائش تسلیم کرنا تو سراسر جہالت اور خسران ہے۔ مثال کے طور پر درود شریف کے الفاظ خود آنحضرت ﷺ نے سکھلا دیے ہیں۔ اب اپنی طرف سے اگر کسی انسان نے کچھ کلمات تصنیف کر لیے اور ان کو درود کا نام دے دیا اور اس کے وظیفے کو مفید تر بتایا تو یہ صرف گمان ہے۔ دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے ہزاروں اور لاکھوں کلمات برکت اور فائدے کے اعتبار سے سرورِ کائنات ﷺ کے بتائے ہوئے ایک کلمے کے برابر تو کجا عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی بات پیدا کرے کہ جو اس میں نہیں ہے تو وہ رد ہے ۔پس دین میں نئی بات پیدا کرنا اور اُسے بدعت حسنہ کہنا دوہرا جرم ہوا۔ اذان کے الفاظ کے اول و آخر الفاظ کا اضافہ اور نمازِ جمعہ کے بعد کھڑے ہو کر ''صلوٰۃ و سلام'' کا التزام وغیرہ نہ سنت میں موجود ہے نہ خلفائے راشدین کے عمل میں' لہٰذا یہ سب کچھ بدعت ہوا۔ دین اسلام یعنی اللہ کا پسندیدہ دین وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے کامل صورت میں نبی اکرم

ﷺ پر نازل فرمایا اور اُسوہ رسولؐ کی صورت میں لوگوں پر مبرہن کر دیا۔ وہی آسان ترین اور سادہ ترین دین ہے۔
کچھ لوگ پوچھیں گے کہ پھر تو ریل اور ہوائی جہاز کا سفر اور جنگ میں توپ' بندوق اور جدید اسلحہ کا استعمال بھی ناجائز ہوا ؟ لیکن یہ بات درست نہیں۔ ان چیزوں کا تعلق ایجادات سے ہے۔چونکہ ان کا وجود ہی دورِ نبویؐ اور خلافت راشدہ میں نہیں ملتا اس لیے علمائے مجتہدین کا قول قابل قبول ہو گا جو وہ قرآن اور سنت کی روشنی میں دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے امت ان کے استعمال کو متفقہ طور پر جائز قرار دیتے ہیں۔ اُس وقت اونٹوں اور گھوڑوں کا سفر تھا تو اب جدید ذرائع کے استعمال نے سفر کی سہولتوں کو بہتر اور رفتار کو تیز کر دیا ہے۔ جنگ میں اُس وقت تیر اور تلوار ہوتے تھے' اب دشمن کے پاس زیادہ مہلک ہتھیار ہیں تو مسلمان کو بے خبر



رہنا اور صرف تیر اور تلوار پر اکتفا مناسب نہیں ۔لیکن ۱۲ ربیع الاول کو عید میلاد النبی ﷺ کا نام دے کر اپنی مرضی کے مطابق اس دن کا پروگرام بنانا یقینا دین میں اضافہ ہے 'کیونکہ ۱۲ ربیع الاول کا دن نبوی زندگی میں ۲۳ دفعہ آیا اور خلفائے راشدین کے عہد میں ۳۰ مرتبہ آیا 'لیکن نہ سنت سے اُسے منانا ثابت ہے اور نہ خلفائے راشدین نے اُسے منایا۔ اگر اس عید کے ایجاد میں حب نبی ﷺ کارفرما ہے تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس سے کیوں غافل رہے جو نبی مکرم ﷺ کے ساتھ حد درجہ محبت رکھتے تھے۔ معلوم ہوا کہ حب نبیؐ کا بہترین مظاہرہ صحابہ ؓ نے کیا۔ وہاں نام و نمود' شور و شغب اور دکھلاوے کی خاطر کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا۔ پس محبت کا نو ایجاد مظاہرہ یقینا ناقص ہے اور اسی لیے اس کے نتائج میں مفاسد کا ظہور لازمی ہے۔
آج ہمارے لیے بھی صحیح راہ یہی ہے کہ سنت رسول ﷺ اور سنت خلفائے راشدینؓ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑیں اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ محبت کرنے کا وہی طریقہ اپنائیں جو تن من دھن کی بازی لگا کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنایا۔

* * *

# رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں جامعیت

انسان اللہ تعالیٰ کی شاہکار تخلیق ہے۔ یہ مکلف ہے اور اسے نیکی اور بدی کا شعور ہے۔ دنیا کی زندگی میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ بھلائی کی طرف جائے یا بدی کی طرف ۔ اُسے بتا دیا گیا ہے کہ دنیا دارالعمل ہے اور آخرت دارالجزا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ رحمن اور رحیم ہے' اگرچہ اس نے انسان کی فطرت میں نیکی اور بدی کا شعور رکھ دیا ہے' تاہم اُس نے گاہے گاہے انسانوں میں پیغمبر بھیجے جو انہیں صحیح اور غلط کی نشان دہی کرتے رہے۔ اچھے کاموں کا اچھا انجام اور برے کاموں کا برا انجام واضح کرتے رہے۔ پیغمبروں کا یہ سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور عیسیٰ علیہ السلام تک چلتا رہا۔ پھر اس سلسلہ کے آخر میں ختم المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ مبعوث ہوئے۔ اُن پر قرآن کریم کا نزول ہوا جو ساری الہامی کتب کا مہیمن (نگران) ہے اور قیامت تک انسانوں کے لیے مکمل ضابطہ حیات اور آخرت کی فلاح کا موجب ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے اُسوۂ حسنہ قرار دیا' بالفاظِ قرآنی: {لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ}(الاحزاب:۲۱) ''رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے''۔ اللہ تعالیٰ اُس شخص کو پسند کرتا ہے جو قرآنی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے عین منشائے خداوندی کے مطابق قرآن کی متابعت میں زندگی گزاری۔ یوں سمجھئے کہ آپؐ چلتا پھرتا قرآن تھے۔ ایک صاحب نے آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ سے آپ ؐ کے معمولات کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپؐ کی زندگی تو بس قرآن کی تعلیمات کے مطابق تھی۔ گویا قرآن تھیوری ہے اور رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ پریکٹیکل ۔ چونکہ آپ ﷺ کی زندگی تمام انسانوں کے لیے مثالی زندگی تھی 'لہٰذا جب ہم آپ ؐ کے شب و روز کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ؐ نے ایسی بھرپور زندگی گزاری ہے کہ ہر فرد بشر کے لیے آپ ﷺ کی زندگی اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ یعنی ہر انسان اپنے مخصوص حالات میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے نمونہ حاصل کر سکتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ آپ کی زندگی میں اعلیٰ



درجے کی جامعیت تھی۔ کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ میں جن حالات میں ہوں یہ حالات حضور ﷺ کو پیش نہ آئے اور اس معاملے میں آپ کی زندگی سے راہ نمائی نہیں ملتی۔

انسانی زندگی میں خوشی' غمی' حادثات' بیماریاں اور صدمات ناگزیر ہیں' ہر انسان کو ان حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بھی یہ سارے مرحلے آئے اور ان مراحل میں سے گزرنے کا انداز

نبوی زندگی میں موجود ہے۔ جن کاموں کو معاشرے میں گھٹیا سمجھا جاتا ہے' رسول اللہ ﷺ نے وہ کام کر کے انسانیت کے اُس طبقے کے لیے مثال قائم کر دی تاکہ کوئی بھیڑ بکریاں چرانے والا یا مزدور' موچی اپنے آپ کو کم تر نہ سمجھے اور نہ ہی معاشرے میں اُسے نیچ سمجھا جائے۔ آپ ﷺ نے لڑکپن میں بکریاں بھی چرائیں۔ گھر کے کام خود کیے ۔ اپنے جوتوں کو مرمت بھی کیا۔ بلکہ دوسرے ضرورت مندوں کے بھی کام کیے۔

آپ ﷺ نے نا داری کا زمانہ بھی دیکھا اور بڑے صبر وثبات کے ساتھ وقت گزارا۔ کبھی آپ ؐ کے ہاں کھانا پکتا اور کبھی فاقہ ہوتا۔ ہر تنگ دست کے لیے ناداری شکوے اور شکایت کا باعث نہیں کہ یہ صورت حال آپ ﷺ پر بھی آئی اور ان حالات میں آپؐ کا اندازِ حیات نا دار لوگوں کے لیے احساس کمتری نہیں بلکہ راضی برضائے ربّ کا مظہر ہے۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ آپ ﷺ کے پاس مالِ غنیمت کے ڈھیر لگ گئے۔ ایسے وقت میں آپ ؐ کے گھر والوں نے گھریلو اخراجات کے لیے پیسے مانگ لیے مگر آپ ؐ نے فقر و فاقہ کو تونگری پر ترجیح دی اور اپنے اہل بیت کو صبر کی تلقین کر کے مطمئن کر دیا۔ اگر کبھی سفر درپیش ہوتا 'سواریاں کم ہوتیں تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین باری باری سواریوں سے فائدہ اٹھاتے۔ اگرچہ صحابہ کرامؓ کو یہ گوارانہ تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ اُن کے ساتھ پیدل چلیں' مگر آپؐ کسی امتیاز کو پسند نہ کرتے اور اپنی باری پر سواری پر بیٹھتے اور دوسروں کے ساتھ پیدل بھی چلتے جبکہ بعض صحابہ ؓسواریوں پر ہوتے۔ سفر کے دوران کہیں پڑاؤ کرتے۔ کھانے پکانے کی نوبت آتی تو آپ ؐدوسروں کے ساتھ مساوی کام کرتے۔ کبھی چولہا جلانے میں مدد دیتے اور کبھی آگ جلانے کے لیے لکڑیاں اکٹھی کر کے لاتے۔آپؐ کی زندگی میں اجتماعی خوشی کے مواقع بھی آئے۔ غزوہ بدر میں کامیابی بہت بڑی خوشی تھی جس میں مٹھی بھر مسلمانوں نے کفار کے کیل کانٹے سے لیس بڑے لشکر کا مقابلہ کیا اور فتح یاب ہوئے' مگر اس موقع پر آپ ﷺ نے کسی جشن کا اہتمام نہ کیا ۔ اسی طرح



کتنی ہی جنگوں میں کفار کے ساتھ آپؐ کا مقابلہ ہوا اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ فتح مکہ وہ موقع تھا کہ آپ ﷺ جانی دشمنوں کی موجودگی میں اُس شہر میں داخل ہو رہے تھے 'جہاں آپ کا رہنا محال کر دیا گیا تھا اور آپ کو وہاں سے ہجرت کرنا پڑی تھی۔ اس موقع پر بھی عاجزی اور انکساری کی مثال قائم کر دی اور بڑی وسعت قلبی کے ساتھ بدترین دشمنوں کو معاف کر دیا۔ گویا فتح یاب ہونے والے مسلمان حکمرانوں کو یہ سبق دیا کہ وہ شکست کھا جانے والوں کے حق میں نرمی کا رویہ اختیار کریں اور کسی طرح کی انتقامی کارروائی نہ کریں۔

جنگ خندق کے موقع پر مدینہ شہر کے اطراف میں خندق کھودنے کا فیصلہ ہوا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو کھدائی کرنے کے لیے جتنی جتنی زمین دی گئی آپ ؐ نے بھی بنفس نفیس اتنی زمین کی کھدائی کی' بلکہ دوسروں سے بڑھ کر کام کیا۔ اس موقع پر ایک صحابی نے بھوک کی شدت کا اظہار کیا اور پیٹ سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ

اُس نے پیٹ پر ایک پتھر باندھ رکھا ہے تاکہ جسم کا توازن برقرار رہ سکے۔ یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے اپنے پیٹ پر سے کپڑا اٹھا کر دکھایا تو وہاں دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ گویا آپ ﷺ کے اُسوہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ اللہ کی رضا میں کام کرتے ہوئے اگر مشکلات آئیں تو اُن کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہے' بددل ہو کر ہمت نہیں ہارنی۔

مکی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی کی گئی۔ دشمنوں نے آپؐ کو زخمی کیا' بُرا بھلا کہا۔ آپؐ کو ہر ممکن طریقے سے ستایا اور مطالبہ کیا کہ آپ اسلام پھیلانے سے باز رہیں' مگر آپؐ کے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آئی۔ نہ ہی آپ ؐ نے گالی کا جواب گالی سے دیا اور نہ دل شکستہ ہو کر اپنا مشن چھوڑا۔ گویا حق کی حمایت کرنے والوں کو سبق دیا کہ وہ کسی طرح کی مخالفت سے دل برداشتہ نہ ہوں' بلکہ پوری ہمت اور کوشش کے ساتھ ناموافق حالات کا صبر و استقلال کے ساتھ مقابلہ کریں اور بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ کفار کو دین اسلام کی طرف بلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ گویا دین کی سربلندی میں جدوجہد کرنے والے پوری پامردی کے ساتھ حق کی حمایت جاری رکھیں۔

کفارِ مکہ نے آپ ﷺ کا معاشرتی مقاطعہ کر دیا اور آپ کو شعب ابی طالب میں محصور ہونا پڑا۔ آپ ؐ کے ساتھ چند صحابہؓ بھی تھے اور کچھ آپ ؐ کے خاندان کے لوگ بھی تھے جو ابھی اسلام نہ لائے تھے۔ یہ بڑا کڑا وقت تھا۔ کھانے پینے اور استعمال کی کوئی چیز آپ ﷺ تک نہ



پہنچ پاتی۔ چھوٹے بچے بھوک سے بلبلاتے رہے مگر ظالموں کو رحم نہ آتا۔ آخر اس مقاطعے کی تحریر کو کیڑا کھا گیا اور مقاطعہ ختم ہو گیا۔ اس میں اُن بے گناہ قیدیوں کے لیے اطمینان کا سامان ہے کہ جس طرح وہ ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہے ہیں اس طرح اللہ کے آخری رسول ﷺ کو بھی قید میں ڈال دیا گیا اور انہوں نے اپنے ساتھیوں سمیت اس اذیت ناک صورت حال کو بڑی پامردی کے ساتھ برداشت کیا اور بے صبری کا مظاہرہ نہ کیا۔

اللہ کے رسول ﷺ تبلیغی سفر پر طائف پہنچے جہاں آپ ؐ کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھا گیا۔ آپؐ کی بات نہ سنی گئی' بلکہ آبادی کے غنڈوں کو آپ ؐ کے پیچھے لگا دیا گیا' جنہوں نے تاک تاک کر آپ ؐ کے ٹخنوں اور پائوں پر پتھر مارے۔ آپ ﷺ کے پائوں لہولہان ہو گئے اور اس اذیت سے آپ زمین پر گر گئے۔ یہی وہ موقعہ تھا کہ ملک الجبال نے آپؐ سے اجازت مانگی کہ آپ ؐ کہیں تو اس وادی کو دونوں پہاڑوں کے درمیان پیس ڈالا جائے' مگر آپ ؐ نے اجازت نہ دی' بلکہ فرمایا کہ یہ لوگ نہیں تو ان کی اولاد سے توقع ہے کہ وہ ایمان لے آئیں گے۔ اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ حق کی نشر و اشاعت کے نتیجے میں مخالفت ہو گی' مشکلات آئیں گی' اذیتیں دی جائیں گی' مگر اُسوۂ حسنہ یہ ہے کہ صبر و سکون اختیار کیا جائے اور دشمنوں کے حق میں بددعا بھی نہ کی جائے۔

اپنے ذاتی کاموں کے لیے خادم رکھنے کی اجازت ہے' مگر خادم کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا سلوک کرنے کی

ہدایت ہے۔ آپ ﷺ خادم سے وہ کام کرواتے جو اگر خود کو کرنا پڑے تو اس میں عار محسوس نہ ہو۔ نیز آپ ؐخادم کو وہی کھلاتے جو خود کھاتے اور وہی پہناتے جو خود پہنتے۔ خادم سے ہونے والی کوتاہیوں اور غلطیوں کو بڑی فراخ دلی سے برداشت کر لیتے اور خادم کو برا بھلا نہ کہتے۔ کسی نے پوچھا کہ خادم کو کہاں تک معاف کیا جائے ؟آپ ﷺ نے فرمایا ستر بار۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ آپ ؐکے خادمِ خاص تھے۔ ابھی لڑکپن میں تھے۔ آپ ؐنے کسی کام کے لیے انہیں گھر سے باہر بھیجا تو وہ دیر تک واپس نہ آئے۔ آپ ؐانتظار کرتے رہے' بالآخر آپ ؐخود ان کے پیچھے چلے۔ دیکھا تو وہ راستے میں ایک کھیل تماشہ دیکھنے میں مشغول تھے ۔ آپ ؐنے انہیں نہ جھڑکا' نہ برا بھلا کہا۔ حضرت انس کہتے ہیں میں نے دس سال آپ ﷺ کی خدمت کی مگر آپؐ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا یا کیوں نہیں کیا؟ آپ ﷺ کا اپنے خادم زیدؓ کے ساتھ حسن سلوک کا یہ عالم تھا کہ آپؐ نے انہیں اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ زید کے والد اور چچا آپؐ



کے پاس آئے اور زید کو ساتھ لے جانے کی اجازت مانگی۔ آپؐ نے فرمایا یہ زید ہے 'اگر یہ آپ کے ساتھ جانا چاہے تو لے جائو اور اگر یہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں اسے تمہارے ساتھ جانے پر مجبور نہیں کروں گا۔ چنانچہ زید نے آپ ﷺ کے حسن سلوک کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہنا پسند کیا اور اُن کے والدین کو خالی ہاتھ جانا پڑا۔ یہ وہ سلوک ہے جو آپؐ کی تعلیم ہے کہ خادموں اور نوکروں کے ساتھ کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے گیارہ نکاح کیے اور اپنی تمام بیویوں کے ساتھ یکساں حسن سلوک کے ساتھ رہے۔ کسی بیوی کو آپؐ سے کسی طرح کی شکایت نہ تھی۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا ہے' اور دیکھو میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تم سب سے زیادہ حسن سلوک کرنے والا ہوں۔ اسی حسن سلوک کو آپ ؐپسند کرتے تھے کہ دوسرے مرد بھی اختیار کریں۔ ایک مسلمان مرد چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ سب کے ساتھ انصاف کا سلوک کرے۔ رسول اللہ ﷺ کے ہاں ایک وقت میں نو بیویاں تھیں۔ آپ ؐنے نو کے درمیان عدل کر کے دکھا دیا۔ پس جو مسلمان ایک سے زیادہ بیویاں رکھتا ہو اس کے لیے آپؐ کی زندگی سے راہنمائی مل سکتی ہے۔

شادی کا موقع گھر میں خوشی کا وقت ہوتا ہے 'اس وقت آپ ﷺ نے بچیوں کو خوشی کے گیت گانے کی اجازت دی' البتہ وہ گانے ممنوع قرار دیے جو تہذیب و اخلاق سے ہٹ کر ہوں۔ ہاں ایسے اشعار پڑھے جائیں جن میں قومی بہادروں کے کارناموں کا ذکر ہو ۔رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں کیں 'جو سادگی کا نمونہ تھیں۔ جہیز اور بارات کا کوئی سوال نہ تھا ۔شادی کے موقع پر صرف لڑکے والوں کی طرف سے دعوتِ ولیمہ کے انعقاد کی اجازت ہی نہیں حکم ہے 'تاکہ لڑکے والے اپنی خوشی میں عزیز و اقارب اور دوست احباب کو شامل کر کے

اپنی خوشی کو دوبالا کر سکیں۔ ایسے موقعہ پر کسی قسم کی رسومات اور فضول چیزیں نہ تھیں ۔نہ لڑکی والوں کے گھر دعوت کا اہتمام تھا۔ بیٹی کی شادی ماں باپ پر کسی طرح کا بوجھ نہ تھی۔ آج بھی مسنون سادگی اپنا کر بیٹیوں کی شادیاں ہر طرح کے بار کے بغیر کرنا مسنون ہے۔ شادی کے موقع پر آپ ﷺ کے ہاں کسی طرح کی نمائش و نمود نہ تھی، نہ فضول روشنیاں تھیں، نہ دعوت کے اہتمام کے لیے گلیاں بازار بند کیے جاتے تھے۔



رسول اللہ ﷺ کے ہاں انتہا پسندی کا کوئی سوال نہ تھا ۔ہر کام میں آپ ؐاعتدال کی روش پسند کرتے تھے ،حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بھی آپ ؐنے غلو کی اجازت نہ دی۔ جب آپ ؐکو پتا چلا کہ ایک صحابی نے رات بھر جاگ کر نفل نمازیں پڑھنے کا ارادہ کیا ہے، دوسرے نے لگاتار روزے رکھنے کا ارادہ کیا ہے، ایک نے کہا ہے کہ میں شادی نہیں کروں گا تاکہ خاندانی زندگی سے دور رہ کر بس نیک کاموں میں لگا رہوں تو آپ ﷺ نے ان تینوں کو تنبیہ فرمائی اور بتایا کہ میرا طریقہ دیکھو ،رات کو سوتا بھی ہوں اور جاگ کر نماز بھی پڑھتا ہوں۔ لگاتار نفلی روزے نہیں رکھتا، بلکہ کبھی رکھتا ہو کبھی چھوڑتا ہوں۔ میرے بیوی بچے ہیں ،ان کے حقوق بھی ادا کرتا ہوں۔
ایسا بچہ جو یتیم رہ گیا ہو، اُس کے ماں باپ وفات پا چکے ہوں، اُس کے لیے بھی آپؐ کی زندگی میں مثال موجود ہے کہ وہ بددل نہ ہو اور اللہ کے فیصلے پر ناخوش نہ ہو بلکہ تسلی رکھے کہ رسول اللہ ﷺ پر یہ مشکل وقت آیا تھا جو آپؐ نے صبر کے ساتھ گزارا۔

ایسا نہیں ہوا کہ آپ ؐکبھی بیمار ہی نہ ہوئے ہوں ۔ جب آپ ؐبیمار ہوتے تو دعائیہ کلمات پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکتے اور وہ ہاتھ تمام جسم پر پھیر لیتے ۔بیماری کی دوا لینے سے بھی آپؐ نے نہیں روکا بلکہ دوا لینے کی حوصلہ افزائی کی۔ آپ ؐنے بیماروں کی تیمارداری کی۔ تیمارداری کو اجر وثواب کا باعث بتایا ۔آپ ؐبیمار کو یہ کہہ کر تسلی دیتے کہ یہ بیماری تمہارے گناہ مٹا دے گی۔ جہاں بیمار کے لیے آپ کی زندگی میں اُسوہ حسنہ ہے وہاں تیمار داری کو بھی اعلیٰ درجے کا نیک عمل قرار دیا گیا ہے۔ تیمار داری کرنے والے کے لیے فرشتے رحمت و مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ اگر کسی کا بچہ فوت ہو جائے تو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اُسے صبر و سکون کا نمونہ ملے گا۔ آپ ؐکے بیٹے چھوٹی عمر میں ہی فوت ہو گئے اور آپ ؐکو غم زدہ کر گئے۔ آپؐ کی تین شادی شدہ بیٹیاں آپؐ کے سامنے فوت ہو گئیں۔ آپؐ نے صبر کا مظاہرہ کیا۔ نہ آپ ؐروئے پیٹے اور نہ جزع فزع کی، بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی رضا اور فیصلہ گردانا۔
ایک دکھ آپ ﷺ کو یہ ہوا کہ آپؐ کی دو بیٹیاں ، ابولہب کے بیٹوں کے ساتھ بیاہی ہوئی تھیں ۔ آپ ؐنے اعلان نبوت کیا تو آپؐ کا چچا ابولہب آپؐ کا شدید دشمن ہو گیا( اس کی مذمت میں سورۃ اللہب نازل ہوئی۔) اُس کے بیٹوں نے آپؐ کی بیٹیوں کو طلاقیں دی دیں۔ بیٹیوں کی طلاق کا یہ صدمہ آپ ؐکو برداشت کرنا پڑا۔ آج جس کی بیٹی طلاق یافتہ ہو جائے تو وہ کس قدر غم زدہ ہوتا ہے۔ اگر وہ رسول اللہ ﷺ کے

دکھ کو دیکھے گا تو اُس کا غم ہلکا ہو جائے گا کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی یہ صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

جنگ اُحد میں جب فتح شکست میں بدل گئی تو دشمن نے زوردار حملہ کیا۔ اس موقع پر آپؐ کے دانت شہید ہو گئے اور آپؐ زمین پر گر گئے۔ اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد میں جو بھی تکلیفیں آئیں وہ ایسی ہیں کہ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی زخم کھائے اور دشمن کے ہاتھوں ظلم کا نشانہ بنے۔ گویا حق کی حمایت میں ایسے مواقع آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔

جہاں آپ ﷺ نے مدنی زندگی کے دوران جنگوں میں کامیابیاں حاصل کیں وہاں ہزیمت کا بھی نشانہ بنے۔ نہ آپ ؐ نے ان خوشیوں پر شادیانے بجائے اور نہ ناکامیوں پر بددل ہوئے' بلکہ اللہ کے فیصلوں کو خوش دلی کے ساتھ قبول کیا اور اُمت کے لیے اُسوۂ حسنہ چھوڑ گئے کہ زندگی میں فتح اور شکست ساتھ ساتھ ہیں ۔ایسا نہیں تھا کہ کسی شخص کو زندگی میں کبھی ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ انسان پر لازم ہے کہ وہ حق کا ساتھ دینے میں کبھی سستی کا مظاہرہ نہ کرے' بلکہ ناکامیوں سے سبق سیکھے اور کامیابیوں کی توقع رکھے۔

بشری تقاضے کے تحت آپ ﷺ پر ہر وہ صورت پیش آئی جو کسی دوسرے انسان پر گزری۔ ایک دفعہ آپؐ نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک بچھو نے آپ کو کاٹ لیا۔ آپ ؐ نے درد محسوس کی اور فرمایا اللہ کی لعنت ہو بچھو پر کہ نہ نمازی کو چھوڑتا ہے نہ بے نمازی کو۔ آپ ؐ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر اسے حرم میں پاؤ تو بھی اسے قتل کر دو۔

وفات کسی اپنے کی ہو یا پرائے کی آپؐ حکم خالق سمجھ کر صبر کے ساتھ برداشت کرتے۔ کسی عزیز کی وفات ہوتی تو آپؐ آبدیدہ ہو جاتے۔ اس صدمے کو اللہ کی رضا سمجھتے اور متعلقین کو صبر کرنے کو کہتے۔ آپؐ کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بچہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ وہ آپؐ کی گود میں دے دیا گیا۔ اُس کا حال دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ جب آپؐ سے پوچھا گیا کہ آپؐ تو میت پر گریہ و زاری سے منع کرتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا یہ رحمت کے اس جذبے کا اثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں پر رحم کرتا ہے جن کے دلوں میں رحم کا جذبہ آتا ہے۔جو شخص فوت ہو جاتا اُس کو پورے احترام کے ساتھ قبر میں اتار دیا جاتا ۔ قبر کو زیادہ اونچا نہ کیا جاتا اور نہ اُس پر پھول چڑھائے جاتے۔ قبر پختہ نہ بناتے اور نہ ہی چونا گچ کے ساتھ اُسے مضبوط کرتے۔ اُس وقت یا بعد میں کسی وقت کوئی رسم



ادا نہ کی جاتی بلکہ فوت شدہ کے لیے پورے خلوص اور ہمدردی کے ساتھ بخشش کی دعائیں کی جاتیں۔جس طرح دنیا میں حلال جانور بھی ہیں اور حرام بھی 'حلال جانوروں کا گوشت کھانا جائز ہے اور حرام جانوروں کا گوشت کھانا منع ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کئی علوم پیدا کیے ہیں' اُن میں بعض کا حاصل کرنا جائز ہے اور بعض سے اجتناب

ضروری ہے۔ ان ممنوع علوم میں جادو، کہانت ، دست شناسی اور نجوم وغیرہ ہیں۔ اگرچہ ان علوم میں تاثیر بھی ہے۔

آپ ﷺ کی شخصیت کے دو پہلو ہیں، ایک بحیثیت رسول اور ایک بطور انسان۔ چنانچہ آپ ﷺ پر جو بھی تکلیفیں آئیں ان سے آپؐ کا بشری وجود متاثر ہوتا۔ آپؐ پر یہودیوں نے کئی مخالف ہتھکنڈے استعمال کیے۔ ایک دفعہ آپؐ پر جادو کیا گیا جس نے آپ کو جسمانی طور پر متاثر کیا۔ کوئی کام کر چکے ہوتے تو خیال ہوتا کہ نہیں کیا اور ایک کام نہ کیا ہوتا تو خیال ہوتا کہ کرلیا ہے۔ چند دن تک یہ اثر رہا، پھر اُس کے تدارک کے لیے معوذتین کا نزول ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی راہنمائی کی اور اس جادو کا اثر آپ ؐسے زائل ہو گیا۔ جادو کا یہ اثر آپ پر رہا مگر کسی طور پر آپ کی نبوی زندگی اس سے متاثر نہ ہوئی۔

آپ ﷺ کے رشتہ داروں اور ہمسایوں کی طرف سے آپؐ کو از حد تکلیفیں پہنچیں۔ آپؐ کو تنگ کیا گیا، کئی طریقوں سے ستایا گیا، راستے میں کانٹے بچھائے گئے، طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا۔ ابو لہب کا مکان آپ ؐکے گھر کے ساتھ تھا، وہ اور اُس کی بیوی آپ ؐکے ہمہ وقت دشمن تھے، مگر آپؐ نے کبھی کوئی انتقامی کارروائی نہ کی بلکہ اُن کی بد سلوکی کا جواب خوش اخلاقی سے دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ضرورت کے وقت دوسروں سے قرض بھی لیا ۔یوں اگر کسی شخص کو ناگزیر ضرورت کے لیے قرض لینا پڑ جائے تو اُسوۂ حسنہ میں اس کی بھی گنجائش ہے۔

آپ ﷺ کی شخصیت میں انتہا درجے کی جامعیت ہے اور ہر شخص کے لیے آپؐ کی زندگی اُسوۂ حسنہ ہے۔ ایک عام انسان کو حیاتِ دُنیوی میں جس قسم کے حالات سے سابقہ پڑے، رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں وہ نمونہ پائے گا۔ چونکہ خود اللہ تعالیٰ نے آپ کی زندگی کو اُسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری لی کہ وہ آپؐ کی زندگی کے حالات کو محفوظ بنا دے۔ لیکن آپؐ کے اسوۂ حسنہ یہ حفاظت قرآنی الفاظ کی طرح نہیں ہو گی جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ{اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾}(الحجر)بلکہ اُسوۂ حسنہ



کی حفاظت انسانی ہاتھوں کے ذریعے کی گئی۔ آج آپ کی زندگی کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا واقعہ بھی کتابوں میں محفوظ ہے۔ چونکہ یہ کام انسانوں نے کیا لہٰذا کچھ برے لوگوں نے اس کو مشکوک بنانے کی کوشش کی مگر وہ خدائی فیصلے کو بدل نہ سکے۔ جن لوگوں نے آپؐ کی احادیث میں جعل سازی کو داخل کرنا چاہا اللہ تعالیٰ نے ان کی غلط کارروائیوں کی قلعی کھول دی اور راسخ العلم متقی لوگوں نے کھرے کو کھوٹے سے الگ کر دیا اور آج رسول اللہ ﷺ کی زندگی بھرپور انداز اور خالص حالت میں انسانوں کے ہاتھوں میں ہے۔

آپ ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ واقعی آپ بنی نوع انسان کے لیے مثالی انسان تھے۔ آپؐ کی زندگی میں غریب، امیر، سوگوار، مظلوم، مسافر، یتیم، بیمار، فاتح، مفتوح، خاوند، باپ، سپہ

سالار‘ سربراہ مملکت‘ مزدور‘ چرواہے‘ جادو زدہ ‘ بھوکے پیاسے‘ مصیبت زدہ غرض ہر شخص کے لیے نمونہ اور اطمینان و تسلی کا سامان موجود ہے۔ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ جن کڑے حالات کا مجھے سامنا ہے حضور ﷺ ان سے نہیں گزرے‘ بلکہ قیامت تک کے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے مشکل حالات میں رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل سے راہ نمائی لیں اور راضی برضائے ربّ کے جذبے کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

* * *



# حبِ رسول ﷺ

حب رسول ﷺ وہ جذبہ ہے جس کے نتیجے میں ایک مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ہر عمل بلکہ ہر ادا پر دل و جان سے فدا ہو۔ اُسے کسی دوسرے شخص کے ساتھ روحانی یا جسمانی طور پر رسول اللہ ﷺ کی طرح محبت نہ ہو۔ اُسے رسول اللہ ﷺ کا ہر طریقہ اور عمل سب لوگوں سے اور اُن کے ہر عمل سے زیادہ محبوب ہو۔ اگر کسی مسلمان کو اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ایسی محبت نہیں تو اسے اس کی فکر کرنا چاہیے‘ کیونکہ اس طرح اُس کے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ))(۱)

’’تم میں سے کوئی ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے باپ‘ بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔‘‘

ہر انسان کو اپنے بیٹے سے بہت محبت ہوتی ہے۔ یہ اولاد ہی ہے جس کی خاطر وہ اپنا راحت اور آرام چھوڑ کر تکالیف برداشت کر لیتا ہے۔ اسی طرح اپنے باپ کے ساتھ ہر کسی کو محبت ہوتی ہے اور ہر سعادت مند شخص اپنے باپ کی خدمت ضروری سمجھتا ہے۔ یہاں باپ اور اولاد کے ساتھ ’’وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ‘‘ بھی فرمایا کہ اُس کی محبت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دوسرے تمام انسانوں سے زیادہ ہونی چاہیے‘ خواہ وہ ماں ہو یا بیوی‘ بھائی بہن‘ عزیز و اقارب‘ دوست احباب ہو یا کوئی اور۔ گویا مؤمن ہونے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس درجہ کی محبت ضروری ہے۔ دنیا میں انسان طرح طرح کی محبتوں میں گرفتار ہوتا ہے‘ یہ اُس کی طبیعت کا تقاضا ہے۔ اُسے

اپنے ماں باپ‘بیوی بچوں ‘ مکان ‘ جائیداد‘ مال ودولت ‘بھائی ‘ بہن‘عزیز و اقارب ‘ دوست احباب سے محبت ہوتی ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ ان چیزوں کی محبت اللہ کے رسول ﷺ کی محبت سے زیادہ تو نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو وہ بڑے خسارے میں ہے‘بلکہ اُسے تو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :



{قُلۡ اِنۡ کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَ اَبۡنَآؤُکُمۡ وَ اِخۡوَانُکُمۡ وَ اَزۡوَاجُکُمۡ وَ عَشِیۡرَتُکُمۡ وَ اَمۡوَالُ اقۡتَرَفۡتُمُوۡہَا وَ تِجَارَۃٌ تَخۡشَوۡنَ کَسَادَہَا وَ مَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَہَاۤ اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ جِہَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۴﴾} (التوبۃ)

’’(اے نبی ﷺ ! ان سے)کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ ‘تمہارے بیٹے‘تمہارے بھائی‘تمہاری بیویاں (اور بیویوں کے لیے شوہر)‘تمہارے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بہت محنت سے کمائے ہیں ‘اور وہ تجارت جس کے مندے کا تمہیں خطرہ رہتا ہے‘ اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں ‘(اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ ‘اس کے رسول ؐاور اس کے راستے میں جہاد سے ‘تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے۔اور اللہ ایسے فاسقوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔‘‘

یعنی اگر رسول اللہ ﷺ کی محبت کا تقاضا پورا کرنے میں کنبہ برادری حائل ہو‘ یا تجارت کے مندہ پڑ جانے کا خطرہ ہو ‘یا آمدنی کم ہو جانے کا خوف ہو‘ یا اچھی رہائش چھوٹ جانے کا ڈر ہو تو پھر خدا کی طرف سے سزا کا انتظار کرو۔

قرآن اور حدیث کی یہ واضح ‘ٹھوس اور لاریب تعلیم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جو مخلص مسلمان تیار کیے اگر اُن کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ وہ ایمان میں کامل تھے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اُن کو سچی محبت تھی جو ہر دوسری چیز سے بڑھ کر تھی۔ ان کا ہر عمل حب رسول کا مظہر تھا۔ جنگ اُحد کے دن خبر اڑ گئی کہ حضور ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ مدینہ کی عورتیں آہ و نالہ اور فریاد کرتی ہوئی مدینہ منورہ سے باہر نکلیں۔ انصار کی ایک عورت جس کا بھائی ‘باپ‘شوہر اور بیٹا جنگ میں شامل تھے‘ اُس کو بتایا گیا کہ وہ سب شہید ہو چکے ہیں‘ مگر وہ پوچھتی رہی کہ رسول اللہ ﷺ کہاں ہیں؟ لوگوں نے بتایا وہ آگے ہیں۔ وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گئی اور آنحضرت ﷺ تک پہنچ گئی اور آپؐ کا دامن تھام کر کہنے لگی :یا رسول اللہ ﷺ ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ۔ میرا باپ‘ شوہر‘ بھائی اور بیٹا اس جنگ میں شہید ہو چکے ہیں‘ مجھے ہرگز کوئی غم و فکر نہیں ہے اس لیے کہ آپ زندہ و سلامت ہیں۔ آپؐ خیریت سے ہیں تو ہر مصیبت میرے لیے آسان ہے !

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا آخری وقت آپہنچا‘تو اُن کی بیوی فرطِ غم سے آنسو بہانے لگی۔

حضرت

بلالؓ نے کہا کہ یہ تو خوشی کا موقع ہے تم بھی خوش ہو جائو کہ کل صبح کے وقت میں اپنے محبوب سید المرسلین ﷺ، آپؐ کے صحابہ اور دوسرے احباب جو پہلے رخصت ہو چکے ہیں، اُن سے جا ملوں گا۔

قبیلہ عضل اور قارہ کے وفد نے غلط بیانی کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ اسلام لے آئے ہیں، اسلام کی تعلیم سکھانے کے لیے ہمارے ساتھ کچھ قاری بھیج دیجئے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں قاریوں کا ایک گروپ اُن کے ساتھ بھیج دیا۔ راستہ میں مقام رجیع پر انہوں نے تمام قاریوں کو شہید کر دیا۔ صرف حضرت خبیب اور حضرت زید بن دشنہ رضی اللہ عنہما بچ گئے، جنہیں اسیر بنا لیا گیا ۔ مشرکین انہیں رسیوں میں جکڑ کر مکہ لائے۔ حضرت زید کو صفوان بن امیہ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ صفوان کا باپ اُمیہ بن خلف حضرت زید کے ہاتھوں ایک غزوہ میں قتل ہو چکا تھا، صفوان نے باپ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے زید کو بر سر عام قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ قتل گاہ میں ابوسفیان سمیت قریش کے تمام بڑے بڑے سردار موجود تھے۔ اس موقع پر ابوسفیان نے پوچھا: زید تمہیں خدا کی قسم، سچ سچ بتانا کہ اگر تمہاری جگہ محمد (ﷺ) ہوں اور ہم ان کی گردن ماریں اور تم اپنے گھر میں محفوظ رہو، تو کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو؟ حضرت زید نے جواب دیا: اللہ کی قسم مجھے یہ بھی منظور نہیں کہ محمد ﷺ کو کانٹا چبھے اور میں اپنے گھر بیٹھا رہوں۔ ابوسفیان یہ جواب سن کر دنگ رہ گیا۔ کہنے لگا: محمدؐ کے اصحاب ان سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ دنیا میں کسی کے دوست ایسے جاں نثار نہیں ۔چنانچہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا۔

ایک موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے کہا: ''آپؐ مجھے میری ہر چیز اور ہر شخص سے زیادہ محبوب ہیں''۔ آپؐ نے فرمایا: ''اپنی جان سے بھی؟'' حضرت عمر فاروقؓ نے ایک لمحہ توقف کیا اور عرض کیا: ''اس ذات کی قسم جس نے آپؐ پر اپنی کتاب نازل فرمائی، آپؐ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں''۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اے عمر! اب تم مؤمن اور مخلص بنے ہو۔''

حضور اکرم ﷺ کی سچی محبت آخرت کی فلاح پر منتج ہو گی۔ ایک شخص آنحضرت ﷺ کی محفل میں بیٹھا لگاتار آپؐ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا ۔آپ ﷺ نے اس سے پوچھا: تمہارا کیا حال ہے؟ اُس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان، میں آپؐ کے جمال جہاں آفرین سے لذت حاصل کر رہا ہوں، لیکن فکر مند ہوں کہ قیامت کے دن



اللہ تعالیٰ مجھے حضور ﷺ کی زیارت نصیب کرے گا یا نہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جو مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ میرے ساتھ جنت میں ہو گا''۔ ایک شخص آپؐ کی

خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا :یا رسول اللہ ﷺ ! آپ مجھے میری جان و مال اور اہل وعیال سے بڑھ کر محبوب ہیں ۔جب آپؐ کی یاد آتی ہے تو صبر نہیں کر سکتا جب تک حاضر ہو کر آپؐ کی زیارت نہ کر لوں ۔ جب مجھے اپنے مرنے کی اور حضور ﷺ کے وصال کی یاد آتی ہے تو پریشان ہو جاتا ہوں کہ آپؐ تو بہشت کے اعلیٰ مقام پر ہوں گے۔ اگر میں جنت میں بھیجا بھی گیا تو مجھے آپؐ کی زیارت کیسے میسر ہو گی؟ آپ ﷺ نے اُسے خوشخبری سنائی کہ جو مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ میرے ساتھ جنت میں ہو گا۔ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کا واقعہ آپ ﷺ کے غلام ثوبانؓ اور دوسرے بعض اصحابؓ سے بھی منقول ہے۔

محبت کا تقاضا ہے کہ جس چیز کو نبی مکرم ﷺ پسند کرتے ہوں ‘آپؐ سے پیار و محبت اور الفت رکھنے والے بھی اسے پسند کریں۔ ایک صاحب نے چھوٹی سی ڈبیہ میں کچھ سفوف رکھا ہوا تھا‘ جب بھی کھانا کھاتے ڈبیہ سے تھوڑا سا سفوف نکالتے اور اپنے سالن میں ڈال لیتے۔ کسی نے پوچھا یہ کیا چیز ہے جو تم اپنے سالن میں ڈال لیتے ہو؟ کہنے لگے میں نے کدو کو سکھا کر پیس کر اس ڈبیہ میں ڈال رکھا ہے اور جب بھی کھانا کھاتا ہوں تو تھوڑا سا کدو کا سفوف اپنے سالن میں ڈال لیتا ہوں ‘اس لیے کہ حضور ﷺ کو کدو بہت پسند تھا۔ اور میری خواہش ہے کہ میرے ہر کھانے میں کدو شامل ہو۔

ایک صحابیؓ اپنی قمیص میں بٹن نہیں لگاتے تھے ۔کسی نے پوچھا کہ آپ اپنی قمیص کو بٹن نہیں لگاتے؟ کہنے لگے جب میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تھا اُن کا گریبان کھلا تھا ‘تو میں بھی بٹن نہیں لگاتا اور گریبان کھلا رکھتا ہوں۔ اگرچہ گریبان کھلا رکھنا آپ ﷺ کا حکم نہیں اور کسی وقت آپؐ کا گریبان کھلا رہ گیا ہو گا ‘لیکن اس دیکھنے والے نے جب آپؐ کو اس حالت میں دیکھا تو قمیص کو بٹن نہ لگائے ---- ایک شخص کو آپ ﷺ نے دیکھا کہ سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئے ہے۔ آپؐ نے اس کو اچھا نہ سمجھا اور اُس کی انگوٹھی پرے پھینک دی۔ محفل ختم ہو گئی اور انگوٹھی زمین پر پڑی رہی۔ ایک شخص نے انگوٹھی کے مالک سے کہا کہ انگوٹھی اٹھا کر کسی اور مصرف میں استعمال کر لو۔ اُس نے کہا کہ جس شے کو رسول اللہ ﷺ نے پھینک دیا ہو اسے میں کیسے اٹھا



لوں ! ---- رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے ‘اژدہام کی وجہ سے کچھ لوگ کھڑے تھے ‘آپؐ نے فرمایا جو لوگ کھڑے ہیں وہ بھی بیٹھ جائیں۔ ایک صاحبؓ آ رہے تھے اُن کا ایک قدم مسجد کے اندر اور دوسرا باہر تھا۔ جب انہوں نے آپ ﷺ کی آواز سنی تو وہیں اُسی جگہ بیٹھ گئے۔ پوچھا گیا آپ دونوں پائوں اندر کر کے بیٹھ جاتے۔ کہنے لگے کہ جب میں نے سن لیا کہ آپؐ بیٹھ جانے کا کہہ رہے ہیں تو میں اسی حالت میں بیٹھ گیا اور فوراً آپ ﷺ کے فرمان کی اطاعت کی اور قدم اندر کرنا بھی جائز نہ سمجھا۔

آپؐ کے فرمان کی یہ اہمیت ہے کہ اگر کوئی صاحب نماز پڑھنے میں مشغول ہوتے اور رسول اللہ

ﷺ اُسے بلاتے تو اُس کے لیے ضروری تھا کہ وہ نماز چھوڑ کر آپؐ کو لبیک کہے۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے انہیں آواز دی' وہ جلدی جلدی نماز پڑھ کر متوجہ ہوئے تو آپ ؐ نے فرمایا: تم نے فوراً جواب نہیں دیا ؟کہنے لگے میں نماز میں مصروف تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا: {یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَجِیۡبُوۡا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوۡلِ اِذَا دَعَاکُمۡ لِمَا یُحۡیِیۡکُمۡ } (الانفال:۲۴)''اے ایمان والو! لبیک کہا کرو اللہ اور رسولؐ کی پکار پر جب وہ تمہیں پکاریں اُس شے کے لیے جو تمہارے لیے زندگی بخش ہو''۔ اس پر اُبی بن کعب ؓ نے عرض کیا کہ آئندہ اس حکم کی اطاعت کروں گا 'اگر بحالت نماز بھی آپؐ بلائیں گے تو فوراً حاضر ہو جائوں گا۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کو '' غسیل الملائکہ ''کہا جاتا ہے۔ وہ جنگ بدر میں شریک نہ ہو سکے۔ اگلے سال اُحد کی جنگ کے لیے آپ ﷺ نے جہاد کی ندا دی تو حنظلہ پر غسل فرض تھا۔ آپ ﷺ کی پکار سن کر وہ اسی حالت میں میدانِ جہاد میں پہنچ گئے۔ آپ ؓ نے معرکہ میں بڑی بہادری دکھائی اور وہیں شہید ہو گئے۔ اُن کو غسل دینے کے لیے فرشتوں کی ایک جماعت آئی۔ حضور ﷺ نے یہ دیکھا تو معلوم کیا کہ ایسا کیوں ہے ؟تو ان کی بیوی نے بتایا کہ اُن پر غسل فرض تھا۔ اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسی وجہ سے اُسے فرشتے غسل دے رہے تھے۔ چنانچہ اُن کا لقب ''غسیل الملائکہ'' پڑگیا۔ بعدازاں آپ کا بیٹا عبد اللہ پیدا ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کے حکم یا فیصلے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ آپ ﷺ کی ردّ کی ہوئی چیز ہرگز قبول نہ کرتے تھے۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے



درخواست کی کہ وہ اس کے رزق میں برکت کے لیے دعا کریں۔ آپؐ نے اُسے صبر کی تلقین کی' مگر اس کے اصرار پر آپؐ نے دعا کر دی۔ آپؐ کی دعا مستجاب ہوئی اور اُس کے ریوڑ بڑھتے گئے اور وہ مدینہ کے حوالی میں چلا گیا۔ حضور ﷺ نے زکوٰۃ کے محصلین کو اس کے پاس بھیجا تو اُس نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ جب اُس کے پاس حضور ﷺ کی ناراضگی کی خبر پہنچی تو بادلِ نخواستہ زکوٰۃ لے کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مگر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے تمہاری زکوٰۃ لینے سے منع فرما دیا ہے۔ اُس نے بہت واویلا کیا مگر اس کی زکوٰۃ قبول نہ ہوئی۔ پھر آپؐ کے بعد وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس زکوٰۃ لے کر گیا مگر انہوں نے بھی زکوٰۃ قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ جس کی زکوٰۃ رسول اللہ ﷺ نے قبول نہ کی 'ابوبکر کیسے قبول کر سکتا ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہکے عہد میں زکوٰۃ پیش کی مگر انہوں نے بھی قبول نہ کی۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اس کی زکوٰۃ قبول نہ کی۔ ہر ایک نے یہی کہا کہ جسے رسول اللہ ﷺ نے رد کر دیا ہم کس طرح اُسے قبول کر سکتے ہیں؟ بالآخر حضرت عثمانؓ کے عہد میں وہ مر گیا۔

اسلامی تعلیم میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کا تاکیدی حکم ہے۔ اگر والدین فوت ہو

جائیں تو اُن کے عزیز و اقارب اور دوست احباب کے ساتھ اچھے تعلقات رکھے جائیں۔ حضور ﷺ کے عزیز و اقارب کا درجہ تو ان سے بہت بڑا ہے' اور پھر آپؐ نے بھی اپنے اہل بیت اور اصحاب کی عزت و احترام کو لازمی قرار دیا ہے اور اُن کے ساتھ بغض وعناد رکھنے سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے نواسے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کے متعلق ارشاد فرمایا کہ جو شخص ان سے محبت رکھتا ہے وہ مجھ سے محبت رکھتا ہے اور مجھ سے محبت رکھنے والا بالیقین اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتا ہے۔اور ان سے دشمنی رکھنے والا مجھ سے دشمنی رکھتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ دشمن رکھتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا :فاطمہؓ میرے گوشت کا ٹکڑا ہے 'اس کو غضب میں لانے والی چیز مجھے بھی غضب میں لاتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا :انصار کے ساتھ محبت رکھو' ان کے ساتھ عداوت نفاق کی علامت ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام ( رضوان اللہ علیہم اجمعین)کے متعلق فرمایا :جو ان سے محبت کرتا ہے وہ مجھ سے محبت کے باعث ان سے محبت کرتا ہے' اور جو مجھ سے دشمنی رکھے وہ اس کی بنا پر ان سے بھی دشمنی رکھتا ہے۔ جو ان کو تکلیف دیتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو ایذا دینے والا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو ایذا دیتا ہے قریب کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور اس



کے عذاب میں گرفتار ہو۔ صحابہ کرام کی جماعت نے اسلام کی خاطر اور اللہ اور رسول ﷺ کی رضا جوئی میں اپنے عزیز و اقارب' باپ' بھائیوں' بیٹوں اور دوستوں کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی نے ایک موقع پر کہا کہ اگر ہم مدینہ واپس گئے تو عزت والے ان ذلیلوں کو وہاں سے نکال دیں گے۔ اس منافق نے اپنے آپ کو عزت والا اور صحابہ کرام کو ذلیل کہا۔ جب وہ مدینہ واپس آ گئے تو اسی منافق کا فرزند عبد اللہ ( رضی اللہ عنہ)تلوار کھینچ کر شہر کے دروازے پر کھڑا ہو گیا اور اپنے باپ کو کہنے لگا کہ خود اپنے آپ کو سب سے ذلیل کہو اور کہو کہ سب سے زیادہ عزت والے رسول اللہ ﷺ خود اور ان کے صحابہ ہیں' ورنہ ابھی تمہارا سر قلم کر دوں گا۔ چنانچہ اُس نے اپنی زبان سے کہا: انا ارذل الناس واصحاب محمد اعز الناس ''میں سب لوگوں سے ذلیل اور محمد ﷺ کے اصحاب سب لوگوں سے زیادہ عزت والے ہیں''۔ اس پر عبد اللہؓ نے اپنے باپ کی جان بخشی کی۔

رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کو قرآن مجید میں اہل ایمان کی مائیں کہا گیا ہے۔ لہٰذا اہل ایمان پر لازم ہے کہ وہ اُن کی عزت و احترام اپنی حقیقی مائوں سے زیادہ کریں۔ آپ ﷺ نے ان کی نام بنام تعریف کی ہے۔قرآن کے الفاظ میں رسول اللہ ﷺ اہل ایمان کے لیے اُن کی جانوں سے بھی زیادہ عزیز ہیں 'پس اُن کی عزت و تکریم ہر دوسری چیز سے بالاتر ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ ﷺ کے ساتھ ادب و احترام کی عظیم مثالیں قائم کی ہیں ۔ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد ابوقحافہ رضی اللہ عنہ ایمان لائے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں کہا کرتے تھے: اللہ کی قسم جس نے آپؐ کو

حق کے ساتھ بھیجا ‘بالیقین ابوقحافہ کی بجائے اگر ابوطالب ایمان لاتے تو میری آنکھوں کے لیے ٹھنڈک اور روشنی ہوتی ‘کیونکہ ابو طالب کا اسلام لانا آپؐ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتا۔ اسی طرح حضرت عمر‘ حضرت عباس رضی اللہ عنہماکو کہا کرتے کہ میرے والد خطاب مسلمان ہوجاتے پھر بھی آپ کا اسلام لانا میرے لیے زیادہ پسندیدہ ہوتا ‘کیونکہ آپ کے اسلام لانے کو رسول اللہ ﷺ زیادہ محبوب رکھتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت کی محبت تو رسول اللہ ﷺ کی محبت کا لازمہ ہے۔ اسی طرح اصحاب رسولؐ کی محبت بھی رسول اللہ ﷺ کی محبت کی دلیل ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت کے درخشاں نقوش چھوڑے ہیں۔ وہ دل و جان سے



رسول اللہ ﷺ پر فدا تھے۔ اسلام کا غلبہ قائم کرنے کے لیے وہ رسول اللہ ﷺ کے دست و بازو بنے تو اللہ نے اُن کو اپنی رضا سے نوازا ۔ نبی اکرم ﷺ پر درود و سلام پڑھنا اللہ تعالیٰ کا حکم اور رسول اللہ ﷺ کی محبت اور قربت کا سبب ہے۔ آپؐ نے فرمایا :’’قیامت کے دن مجھ سے قریب ترین اور مجھ پرزیادہ حق رکھنے والا میرا وہ امتی ہو گا جو مجھ پر زیادہ درود بھیجنے والا ہو گا۔‘‘ رسول اللہ ﷺ کی محبت میں زیادہ سے زیادہ درود شریف پڑھنا ہمیشہ سے اُمت کے متقی ‘ عبادت گزار‘ راتیں اللہ کی یاد میں گزارنے والے بزرگوں کا وظیفہ رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ جب وضو فرماتے تو آپؐ کے صحابہ وضو کا پانی لے لے کر اپنے جسموں اور چہروں پر ملنے لگتے ۔آپ ؐنے فرمایا کہ تم کو کیا چیز اس فعل پر آمادہ کرتی ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت ۔ ان کا یہ جواب سن کر آپ ﷺ نے فرمایا :’’جس شخص کی یہ خوشی ہو کہ اس کو اللہ اور رسول سے حقیقی محبت ہو یا یہ کہ اللہ اور رسول اس سے محبت کریں تو اُسے چاہیے کہ جب وہ بات کرے تو سچ بولے۔ اور جب کوئی امانت اس کے پاس رکھی جائے تو ادنیٰ خیانت کے بغیر اس کو ادا کرے۔ اور جس کے پڑوس میں اس کا رہنا ہو اس کے ساتھ بہتر سلوک کرے‘‘۔ گویا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سچی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی آپ ﷺ کی تعلیمات کو اپنائے۔ اگر یہ نہیں تو محبت کا دعویٰ ایک بے جاجسارت اور ایک طرح کا نفاق ہے۔

واضح ممنوعات اور منکرات پر جمے رہنے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی محبت کا دعویٰ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ آپؐ سے محبت رکھنے والے کو آپؐ کی پسند اور نا پسند کو ملحوظ رکھنا ہو گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپؐ کی محبت کا دعویٰ بھی کرے اور بے نماز بھی ہو‘ سود بھی کھائے‘ جھوٹ بولے اور وعدہ خلافی کرے۔ ہر انسان سے گناہ کا صدور ناگزیر ہے۔ گناہ کے بعد نیکی کرنا اور بخشش چاہنا اللہ کو خوش کرتا ہے۔ لیکن کسی گناہ کو بطور پیشہ ہمیشہ کے لیے اپنائے رکھنے کا تو ہر گز کوئی جواز نہیں۔ جھوٹ بول کر تجارت کرنا‘ سودی کا روبار میں لگے رہنا اور پھر حضور ﷺ کے ساتھ محبت کا دعویٰ منافقت نہیں تو اور کیا ہے !

* * *



# اسلام ۔ دین وسط

وسط عربی زبان کا لفظ ہے جو اردو میں عام استعمال ہوتا ہے اور اس کا مطلب ہے درمیان۔ چونکہ ہر چیز کا درمیانی حصہ عمدہ ہوتا ہے اس لیے وسط کا لفظ عمدہ اور اعلیٰ کے معنوں میں بھی عام استعمال ہوتا ہے۔ پیدائش سے وفات کے عرصے کو دیکھا جائے تو عمر کا ابتدائی حصہ کمزوری اور بے سمجھی میں گزرتا ہے۔ آخری عمر میں انسان کا بچپنا عود آتا ہے' اس کے اعضاء کمزور اور جسم مضمحل ہو جاتا ہے۔ عمر کے پہلے اور آخری دور کے درمیان کا زمانہ عنفوانِ شباب کا ہوتا ہے جس میں انسان جوبن پر ہوتا ہے' کمزوری نہیں رہتی 'قوتِ کار بڑھ جاتی ہے۔ عمر کا یہ وسطی حصہ ہی عمدہ ہوتا ہے۔ سورۃ القلم میں اُن بیٹوں کا ذکر ہے جن کا باپ اپنے باغ کی پیداوار کا کچھ حصہ نادار اور مسکین لوگوں میں بانٹ دیا کرتا تھا۔ جب وہ فوت ہو گیا تو بیٹوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ باغ کی پیداوار میں سے کچھ بھی غریبوں مسکینوں کو نہیں دیں گے۔ چنانچہ اندھیرے منہ باغ میں گئے تو باغ تباہ ہو چکا تھا۔ اُن میں سے ایک نے کہا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ تم اللہ کی پاکی کیوں نہیں بولتے؟ لیکن تم نے میری بات نہ مانی اور غریبوں مسکینوں کو باغ کے پھل میں سے کچھ نہ دینے کا ارادہ کیا ۔بھائیوں میں سے جس نے اچھا مشورہ دیا تھا قرآن مجید میں اُسے "اَوْسَطُھُمْ " کہا گیا ہے' یعنی اُن میں کا اچھا انسان۔ اسی طرح ہر نبی کی ایک اُمت تھی مگر قرآن مجید میں نبی آخر الزماں ﷺ کی امت کو ''اُمت وسط'' کہا گیا ہے' یعنی اچھی امت۔ اسی مناسبت سے وسط اعتدال کے معنوں میں آتا ہے اور اسلام دین وسط ہے۔ اس کے ہر حکم میں اعتدال ہے۔ اس اعتدال کی وجہ سے ہر حکم میں عمدگی اور آسانی ہے۔

فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی بڑی فضیلت ہے مگر اس میں بھی اعتدال اور آسانی کا پہلو ملحوظ رہنا چاہیے ۔ زکوٰۃ جو لازمی ہے وہ ایک سال کے بعد جمع پونجی کا چالیسواں حصہ ہے جو انتہائی معمولی ہے جو مال دار آسانی سے دے سکتے ہیں ۔ اس کے علاوہ صدقہ خیرات دینے میں بھی اُس حد تک اجازت ہے کہ خود تنگی میں نہ پڑ جائے۔نبی اکرم ﷺ نے اُس شخص کو اچھا فرمایا

جو اپنے بچوں کے لیے کچھ چھوڑ کر مرے بہ نسبت اس شخص کے جو سب کچھ خیرات کر دے اور وارثوں کے لیے کچھ نہ چھوڑے۔ پس آپؐ نے ہر معاملے میں معتدل رویے کو پسند کیا ہے اور اعتدال کی راہ چھوڑنے کو اچھا نہیں سمجھا۔ مال دار لوگ زکوٰۃ کی رقم غریبوں مسکینوں کو دیں مگر اس طرح کہ ان کی انا کو ٹھیس نہ پہنچے۔ ان پر نہ احسان جتایا جائے نہ اُن سے بیگار لی جائے۔ ان کی عزتِ نفس کا خیال رکھا جائے۔ ہمارے ماحول میں مسجدوں میں امام اور خطیب مقرر ہیں' ان کی تنخواہیں مقرر کی جاتی ہیں۔ انہیں نماز اور اذان کے اوقات کی سختی سے پابندی کرنا ہوتی ہے۔چونکہ وہ مسجد کی خدمت کے علاوہ روزی کمانے کے لیے کوئی پیشہ اختیار نہیں کر سکتے اور عام طور پر ان کی تنخواہ قلیل ہوتی ہے 'مگر ان کو بھی ہر طرح کی ضروریات ہوتی ہیں' انہیں صاف ستھرا لباس پہننا ہوتا ہے' قلیل تنخواہ میں بمشکل گزارہ کرتے ہیں' کسی سے مانگتے نہیں' لہٰذا اُن کی مدد کرنا بھی کارِ ثواب ہے۔ اُن پر یہ ضابطہ لاگو نہیں ہوتا کہ وہ یہ کام مفت کریں۔ اسلام سکھاتا ہے کہ جو لوگ ہمہ تن دین کے کام میں لگ جائیں دوسرے لوگ اُن کی ضروریات پوری کریں' ورنہ دین کی خدمت کا کام کوئی نہ کر سکے گا۔ اسلام سکھاتا ہے کہ اپنے نا دار رشتہ داروں کا خیال رکھو۔ صدقات اور خیرات کے اولین مستحق وہ ہیں۔ اگر تمام صاحب ثروت اپنے غریب اور مسکین رشتہ داروں کو سنبھال لیں تو معاشرے سے گداگری ختم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہے۔ بندوں کا فرض ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور مراسمِ عبادت بجا لائیں۔

رات اور دن کے دوران پانچ فرض نمازیں ہیں جن کی ادائیگی آسان ہے اور اوقات مقرر ہیں۔ ہر نماز کے لیے اذان ہوتی ہے جو مسجد کے قریب رہنے والوں کو نماز کا بلاوا ہوتا ہے۔ فرائض کے علاوہ نوافل کی بھی ترغیب دی گئی ہے' لیکن وہ اُس شخص کے لیے ہے جس کو ادا کرنے میں آسانی ہو' ہر کسی کے لیے ضروری نہیں ۔ جو نفل پڑھے گا وہ ثواب کی صورت اجر پائے گا۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ عبادت میں مشقت نہیں رکھی گئی۔ راتوں کو جاگ کر نفلی عبادت کی بڑی فضیلت ہے لیکن ساری رات یا رات کا بیشتر حصہ عبادت میں کھڑے رہنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ خود حضور ﷺ کو حکم تھا کہ رات کا کچھ حصہ عبادت میں کھڑے ہوں۔ چنانچہ آپ ؐرات کو عبادت بھی کرتے اور آرام بھی فرماتے ۔ چونکہ عبادت انسانوں کا مقصد تخلیق ہے اس لیے باشعور لوگ زیادہ سے زیادہ عبادت کرنا چاہتے ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ذوق و شوق سے



عبادت میں لگ جاتے تھے' مگر رسول اللہ ﷺ نے ایک حد سے زیادہ عبادت سے روک دیا۔ حضرت ابوالدرداء اور حضرت عبد اللہ بن عمروبن العاص رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق آپؐ کو بتایا گیا کہ وہ رات کا بیشتر حصہ عبادت میں گزارتے ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے ان دونوں کو اس عمل سے روک دیا اور فرمایا کہ رات اور دن کے اوقات

میں اہل خانہ ' مہمان اور ملاقاتی کا بھی حق ہے' تمہارے اپنے جسم کا بھی حق ہے۔ پس ان حقوق کا ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ نے ہر روز لگاتار نفلی روزے رکھنے کا ارادہ کیا۔ آپ ﷺ کو معلوم ہوا تو فرمایا: تمہیں یہ بات کافی ہے کہ ہر مہینے میں تین روزے رکھو' اس لیے کہ تمہیں ہر نیکی کے بدلے دس گنا ثواب ملے گا' اس طرح تم ہمیشہ روزہ رکھنے والے کے برابر ہو جاؤ گے۔ عبادت میں میانہ روی کی اہمیت واضح کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''اُس شخص کا کوئی روزہ نہیں جس نے ہمیشہ روزہ رکھا۔''

مشہور حدیث ہے کہ تین صحابہؓ نے نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہراتؓ سے آپؐ کی نفلی عبادت کے بارے میں دریافت کیا۔ اُن کو بتایا گیا تو انہوں نے آپؐ کی عبادت کے معمول کو قلیل جانا اور کہنے لگے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ہماری کیا حیثیت ہے؟ آپؐ کی شان تو یہ ہے کہ آپؐ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی گئی ہیں۔ یہ جواب سن کر ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ساری رات نماز میں مشغول رہا کروں گا۔ دوسرے نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی روزہ نہیں چھوڑوں گا۔ تیسرے نے کہا میں عورتوں سے علیحدگی اختیار کروں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپؐ کو اس کے بارے میں بتایا گیا۔ آپ ﷺ نے ان تینوں حضرات کو بلایا اور ان سے فرمایا: ''کیا تم نے ایسا ایسا کہا ہے؟ سنو' میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تقویٰ رکھتا ہوں' اس کے باوجود میں (نفلی) روزہ رکھتا بھی ہوں' چھوڑتا بھی ہوں۔ رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ (یہ میرا طریقہ ہے) پس جس نے میرے طریقے سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں''۔ یعنی میری جماعت سے خارج ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ راتوں کو تادیر قیام کی وجہ سے آپؐ کے پائوں میں ورم آجاتا تھا تو یہ کبھی کبھی کی بات ہے' آپؐ کا معمول نہیں تھا۔ آپؐ نے تو عبادات میں بھی بلکہ ہر کام میں میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''شدت اور سختی کرنے والے ہلاک ہو گئے''۔ آپؐ نے یہ الفاظ تین مرتبہ دہرائے۔ بلاشبہ عبادت اعلیٰ



درجے کا نیکی کا کام ہے لیکن اس میں بھی میانہ روی اختیار کرنا ضروری ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضور ﷺ میرے پاس تشریف لائے جب کہ میرے پاس ایک عورت بیٹھی تھی۔ آپؐ نے پوچھا یہ کون عورت ہے؟ میں نے کہا یہ وہ عورت ہے جس کی نماز کا بہت تذکرہ ہوتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''ٹھہرو! تم پر اتنا ہی واجب ہے جس کی تم طاقت رکھتے ہو... اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ترین دین وہ ہے جس کا کرنے والا ہمیشگی اور مداومت کرے۔''

قرآن مجید کی تلاوت بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ قرآن مجید کا ایک حرف پڑھنا دس نیکیاں کمانے کے برابر ہے۔ آپ ﷺ نے واضح فرمایا کہ الٓمٓ تین حروف ہیں' اس کی تیس نیکیاں ہیں۔ اتنے بڑے اجر و

ثواب کے عمل میں بھی آپؐ نے غلو کی اجازت نہیں دی۔ بعض صحابہؓ روزانہ ایک پورا قرآن پڑھنا چاہتے مگر آپؐ تین دن سے کم میں پورا قرآن ختم کرنے کی اجازت نہ دیتے۔ آپؐ نے فرمایا: نفل نماز اور تلاوتِ قرآن میں اتنی دیر مشغول رہو جب تک آمادگی رہے' اور جب تھکاوٹ اور اکتاہٹ ہو جائے یا نیند آنے لگے تو تلاوت یا نماز چھوڑ دو۔

حضرت ابو عبداللہ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نمازیں پڑھا کرتا تھا تو آپؐ کی نماز درمیانی ہوتی تھی۔ اسی طرح آپؐ کا خطبہ بھی مختصر ہوتا تھا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دین آسان ہے۔ میانہ روی اختیار کرو اور دین پر قوت کے موافق عمل کرو۔ میانہ روی اختیار کرو' میانہ روی اختیار کرو''۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کسی پر نیند کا غلبہ ہو اور وہ نماز میں ہو تو اس کو سو جانا چاہیے' یہاں تک کہ نیند اس سے چلی جائے' اس لیے کہ جب کوئی نماز پڑھتا ہے اور اونگھتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ اپنی زبان سے کیا الفاظ ادا کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ مغفرت طلب کر رہا ہو لیکن اس کی زبان سے بددعا نکل رہی ہو۔''

اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہیں کہ انسان عبادت میں سخت مشقت برداشت کرے۔ وہ عبادت میں اتنا ہی وقت لگائے جتنی اس میں استطاعت ہو۔ اگر کوئی زیادہ وقت عبادت کرنے کا شوق رکھتا تو آپؐ میانہ روی اختیار کرنے کی نصیحت فرماتے۔ بعض نیک اعمال میں خاص حالات میں نرمی اور رخصت دی گئی ہے۔ مثلاً پانی نہ ملے تو تیمم کر لے۔ انسان سفر میں ہو اور نماز کا



وقت آجائے تو نماز قصر کرے' یعنی چار رکعتوں کے بجائے دو پڑھے۔ مسنون سفر میں پوری نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے' قصر پڑھنا ضروری ہے۔ اگر موسم شدید ہو یا بارش ہو اور مسجد میں جانا مشکل ہو تو گھر میں نماز کی اجازت ہے۔ مخصوص حالات میں ظہر اور عصر ملا کر یا مغرب اور عشاء ملا کر پڑھنے کی اجازت ہے۔ جہاں جہاں رخصت دی گئی ہے وہاں رخصت کو چھوڑ دینا اور اسے عزیمت سمجھنا درست نہیں۔ رخصت کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھ کر اُس سے فائدہ اٹھانا ہی پسندیدہ ہے۔

سخت سردی میں وضو کرنا اور بار بار پائوں دھونا تکلیف دہ امر ہے' چنانچہ شدید موسم میں ایک دفعہ وضو کر کے موزے پہن لیے جائیں تو بار بار وضو کرتے وقت پائوں پر مسح کر لینا کافی ہے' پائوں دھونا ضروری نہیں۔ ایک دفعہ وضو کر کے موزے پہن لیے جائیں تو ایک دن اور رات کے لیے پائوں دھونے کی بجائے موزوں پر مسح کر لیا جائے۔ حالت سفر ہو تو موزوں پر مسح تین دن رات تک کیا جا سکتا ہے۔ قربانی اسی شخص پر لازم ہے جو اس کی استطاعت رکھتا ہو' لہٰذا نادار پر قربانی واجب نہیں۔ غریب کے لیے مناسب نہیں کہ وہ ادھار لے کر قربانی کرے' یہ خود اپنے آپ کو مشکل میں ڈالنا ہے۔ اگر نادار آدمی نے ادھار لے کر قربانی خرید لی مگر وہ گم ہو گئی تو اُسے نیا جانور لے

کر لازماً ذبح کرنا ہو گا ۔یہ اس لیے کہ اُس نے قربانی خود اپنے اوپر لازم کی تو اب بہر حال اُسے قربانی کرنا ہو گی۔ اسی طرح غریب آدمی پر حج فرض نہیں' اگر وہ بھیک مانگ کر حج پر جانے کی کوشش کرے تو درست نہیں۔ ایسے آدمی کو چاہیے کہ وہ حج کا شوق ضرور رکھے۔ اللہ تعالیٰ اُسے زندگی میں استطاعت دے تو حج کر لے' ورنہ چاہت اور نیت کی بنا پر اُسے حج کا ثواب مل جائے گا۔

نبی اکرم ﷺ نے نماز پڑھانے والوں کو نماز میں ہلکی قراءت کرنے کا حکم دیا تا کہ کمزور اور بیمار آسانی کے ساتھ باجماعت نماز پڑھ سکیں اور دقت محسوس نہ کریں۔ البتہ اکیلا شخص اگر نفل نماز پڑھے تو اُس کے لیے لمبی قراءت پسندیدہ ہے۔ جمعہ کی نماز کے لیے مسجد میں جلدی آنے کا حکم ہے۔ مگر جب نماز پڑھی جا چکے تو مسجد سے نکل کر روزی کمانے کی خاطر کاروبار میں لگ جانے کا کہا گیا ہے۔ گویا اسلامی تعلیمات میں کسی وقت بھی عقل سلیم کے مخالف چلنے کو پسند نہیں کیا گیا۔ جو بندہ محنت کے ساتھ رزقِ حلال کماتا ہے اُسے اچھا کھانے پینے' پہننے' اچھی



رہائش اختیار کرنے اور عمدہ سواری رکھنے سے روکا نہیں گیا۔ اُس پر یہی لازم ہے کہ وہ اپنے مال سے زکوٰۃ ادا کرے یعنی اس کا ایک معمولی حصہ ناداروں اور غریبوں میں تقسیم کرے۔

اگر کسی شخص کا معمول ہو کہ وہ ایک وظیفہ ہر روز معین تعداد میں کرتا ہو مگر کسی دن وہ بیماری کے سبب وہ ذکر نہ کر سکے تو اللہ تعالیٰ اُس کے عذر کو تسلیم کرتا ہے اور ناغے کے دن کا بھی اُسے اجر دیتا ہے۔ اسی طرح کوئی آدمی سویا ہوا ہو اور نیند کے دوران اُس کی نماز کا وقت گزر جائے تو اُس کو رعایت ہے کہ جب اُس کی آنکھ کھلے تو نماز ادا کر لے۔ نیند کی غفلت کی وجہ سے اسے معذور سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کی خطا معاف کر دی جاتی ہے۔ ایک شخص سالہا سال برائیوں میں گھرا رہتا ہے اور اپنے نامہ اعمال میں ڈھیروں گناہ اکٹھے کر لیتا ہے۔ مگر اچانک اُسے گناہوں پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا خیال آتا ہے تو سچی توبہ کر کے معصیت کی زندگی کو مکمل طور پر ترک کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے پچھلی زندگی کے گناہ معاف کر دیتا ہے' بلکہ محکم خلوصِ نیت پر برائیوں کو نیکیوں میں بھی بدل دیتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک شخص ننانوے قتل کر چکا تھا' اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور راہ راست پر آنے کا خیال آیا۔ وہ کسی راہب کے پاس گیا اور پوچھا کہ کیا اس کے لیے توبہ کا کوئی امکان ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ وہ طیش میں آیا اور اس راہب کو بھی قتل کر دیا۔ پھر تلاشِ حق میں نکلا' ایک عالم سے ملا اور اُس سے وہی سوال کیا۔ عالم نے کہا کہ تمہارے اور تمہاری توبہ کے درمیان کون حائل ہو سکتا ہے؟ سچی توبہ کرو گے تو سارے گناہ بخشش دیے جائیں گے...(بخاری و مسلم)

عائلی زندگی گزارنا انسان کی ضرورت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نکاح میری سنت

ہے ''۔میاں بیوی مل کر ایک خاندان کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ایک مرد کے لیے ایک عورت ہے 'اگر وہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا چاہے تو اس کے لیے چار تک جواز کی سہولت ہے اگر وہ ان میں انصاف کر سکے۔ اگر میاں بیوی کا گزارہ نہ ہو سکے تو طلاق یا خلع کے ذریعے نکاح کو ختم کیا جا سکتا ہے' لیکن اس option کو ناگزیر صورت میں اختیار کیا جا سکتا ہے' ورنہ مصالحت کی ہر ممکن صورت سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے۔

صفائی' ستھرائی اور سادگی دین اسلام کی اہم تعلیم ہے۔ گھر میں شادی ہو تو خوشی منائی جائے' کیونکہ یہ فطری عمل ہے۔ لیکن اس موقعہ پر فضول خرچی اور نمود و نمائش والے کام اسراف



و تبذیر کے زمرے میں آتے ہیں اور گناہ کے کام ہیں۔ اکثر اوقات یہ فضول کام کرنے کے لیے قرضہ لیا جاتا ہے جو گناہ کو اور بھی سنگین کر دیتا ہے۔ شادی کے موقعہ پر خوشی تو لڑکے والے کے گھر ہوتی ہے جہاں خانہ آبادی ہو رہی ہوتی ہے۔ لہٰذا ولیمہ کرنا اور اس خوشی کے موقعہ پر دوست احباب اور عزیز رشتہ داروں کو دعوت پر بلانے کا حکم ہے' تاکہ خوشی دوبالا ہو جائے۔ مگر شادی کے ضمن میں لڑکی والوں پر کسی طرح کے اخراجات کا بار نہیں ہے' نہ دعوت' نہ جہیز' نہ بارات کی آمد۔ لڑکی والے سادگی کے ساتھ اپنی پیاری اور لاڈلی بیٹی کو رخصت کریں اور اپنی ذمہ داری سے فارغ ہوں ۔ لیکن آج کل ایسا نہیں کیا جاتا' اسی لیے بیٹی کی پیدائش پر غم اور ناخوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

اسی طرح موت بھی اٹل حقیقت ہے ۔جس گھر کا کوئی فرد فوت ہو جائے تو اس موقعہ پر پس ماندگان کو نہ جزع فزع کی اجازت ہے نہ رونے پیٹنے کی 'بلکہ اس صدمے کو اللہ کا فیصلہ سمجھ کر صبر کے ساتھ برداشت کرنا اجر عظیم کا باعث ہے۔ کئی دن تک سوگ منانے اور غم کی یاد میں فضول رسمیں اسلام میں نہیں ہیں۔ تعزیت کے لیے آنے والے بھی اسے اللہ کا حکم سمجھیں ۔یہ نہ کہیں کہ بڑا افسوس ہے 'بلکہ انا للہ و انا الیہ راجعون کہیں' پس ماندگان کو صبر کی تلقین کریں اور اجر کی خوشخبری سنائیں۔ کسی کی وفات پر نمازِ جنازہ اور کفن دفن کے علاوہ کچھ مسنون نہیں۔ ہاں فوت ہو جانے والے کے لیے 'بلا تعین اوقات 'مغفرت کی دعا کرنا مسنون اور مفید ہے۔ الغرض دین اسلام کے تمام احکام میں سہولت ، سادگی اور خوبی پائی جاتی ہے۔ اگر معاشرہ ان احکام پر عمل پیرا ہو تو ہر سو امن و سلامتی کا دور دورہ ہو۔ اسی لیے دین اسلام کو ''دین وسط'' یعنی افضل دین کہا گیا ہے۔

* * *

# شہادت فی سبیل اللہ
# ضرورت، اہمیت اور فضائل

اسلام چند مذہبی رسومات کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ دین ہے ،جس کی تعلیمات انسانی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں۔ صرف ارکانِ اسلام پر عمل کر لینا اور دوسری اخلاقی اچھائیوں کو اختیار کر لینا کافی نہیں ،بلکہ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ بنی آدم کا ہر فردیہ حیاتِ مستعار اس طرح گزارے کہ وہ حقیقی کامیابی سے ہمکنار ہو کر ابدی راحت پا لے۔ یہ ابدی راحت اس شخص کو ملے گی جو اول ایمان لا کر اسلام میں داخل ہو اور پھر رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو مثال بنا کر اس کی پیروی میں اپنے شب و روز بسر کرے اور جان جان آفرین کے سپرد کر کے اگلی زندگی کا آغاز کرے۔

چونکہ نجات صرف اسلام میں منحصر ہے ،اس لیے ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے ہر فرد کے بارے میں دلگیر اور فکرمند ہو اور کوشش کرے کہ وہ ایمان کی سلامتی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے تن تنہا اس مشن پر کام شروع کیا اور زندگی کے آخری سانس تک اس میں مصروف رہے۔ اس سلسلے میں جب آپ ﷺ نے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں نجات کا راستہ دکھایا تو وہ آپ ﷺ کو خوش آمدید کہنے کے بجائے آپؐ کے جانی دشمن بن گئے۔ مگر آپؐ نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ میں چند ساتھی مل گئے ،مگر کفار کی سختیاں اس قدر شدید تھیں کہ اہل ایمان کا مکہ میں رہنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو مدینہ منورہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا اور خود بھی وہاں تشریف لے گئے۔ یہاں آ کر بھی آپؐ نے اپنا مشن جاری رکھا، جس کے نتیجے میں معتدبہ تعداد میں لوگ آپ کے ساتھی بن گئے اور مدینہ میں مسلمانوں کا غلبہ ہو گیا۔ یوں مسلمان مدینہ کے اندر اسلامی تعلیمات کے مطابق آزادی کے ساتھ عبادات بجالانے لگے، مگر یہ کافی نہ تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ارد گرد کے قبائل کو نجات کے راستے کی



طرف دعوت دی اور ان کو اسلام پیش کیا ،جن میں سے بیشتر نے اسلام قبول کر لیا۔ دوسروں کو آپ ﷺ نے فرمایا اگر اسلام قبول نہیں کرتے تو تمہیں ہماری سیادت میں چھوٹے بن کر رہنا ہو گا، ہم تمہارے مال و جان کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے ،اور اگر یہ بھی قبول نہیں تو ہم یہ ہرگز گوارا نہیں کرتے کہ تم لوگ کفر کی حالت میں دنیا

سے چلے جائو اور آخرت میں عذابِ الیم کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے آگ میں جلتے رہو۔

رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھی اس مشن پر لگاتار شب و روز کام کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مدنی زندگی کے دس سال میں پورے جزیرہ نمائے عرب پر اسلام کا علم لہرانے لگا اور کفر دُم دبا کر بھاگ گیا۔ مگر یہی مطلوب نہ تھا' بلکہ مطلوب و مقصود یہ تھا کہ نجات کا یہ نسخہ ہر فردِ بشر پر واضح کر دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ اسی مشن کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔ چنانچہ ۱۱ھ میں آپؐ کی وفات کے ساتھ اسلام کی پیش قدمی رکی نہیں' بلکہ آپؐ کے خلفائے راشدین اس مشن کو لے کر آگے بڑھتے گئے اور موجود دنیا کے بیشتر حصے پر اسلام کو غالب کر دکھایا۔ یہ کامیابی جہاد و قتال کے ذریعے عمل میں آئی۔ جب کفر کو اسلام کی سبقت نہ بھائے اور وہ اسلام کو مٹانے کے درپے ہو جائے تو کفر کی اس یلغار کو روکنے کے لیے جہاد و قتال کا راستہ اختیار کیا جائے گا اور جہاد و قتال کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک پوری دنیا میں اسلام کا غلبہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے اس مشن کو جاری رکھنا اُمت پر لازم قرار پایا' کیونکہ بقول اقبال ؎

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

مگر افسوس کہ امت خرافات میں کھو گئی۔ بااثر' خوشحال افراد اور مسلم حکمران عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ دنیا کی زندگی کے ساتھ دل لگا بیٹھے۔ کفر کی پیش قدمی کا نوٹس نہ لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کفر بڑھتا گیا اور مسلمان کافروں کے زیر تسلط آ گئے۔ اپنی تہذیب کو بھول بیٹھے اور انہیں اپنے آقائوں کے طور طریقے پسند آنے لگے۔ یہاں تک کہ کافروں کی بے حیائی' عریانی اور بے پردگی کو عملاً اختیار کر کے خود ہی اسلامی تعلیمات سے دور ہو گئے۔ یہ نتیجہ ہے جہاد کو چھوڑنے کا!

آج ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے اندر جذبۂ جہاد کو ابھارا جائے اور اس راستے میں جان و مال لگانے کو سعادت سمجھا جائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ فی سبیل اللہ



جان دینے والوں کو مردہ نہ کہو' یعنی وہ عام مرنے والوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ وہ نجات یافتہ' اللہ کے پیارے اور محبوب ہیں:

{وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾} (البقرۃ)

''اور جو لوگ فی سبیل اللہ قتل ہو جائیں انہیں مردہ نہ کہو' بلکہ وہ زندہ ہیں' مگر تم لوگوں کو اس کا شعور نہیں۔''

یعنی شہادت کی موت مرنے والوں کو صرف زندگی نہیں بلکہ حیاتِ جاودانی ملتی ہے۔ اور وہ حیات اتنی ارفع اور اعلیٰ ہے کہ دنیا کے زندہ لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مزید دیکھئے قرآن مجید میں مقتول فی سبیل اللہ کی فضیلت ان الفاظ میں آئی ہے:

{وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿ ۱۶۹﴾} (آل عمران)

''اور تم ان لوگوں کو جو فی سبیل اللہ جان دے دیں مردے خیال نہ کرو' بلکہ وہ اپنے پروردگار کے ہاں زندہ ہیں اور ان کو رزق دیا جاتا ہے۔''

جس طرح شہداء کی زندگی کی کیفیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح جو رزق ان کو دیا جاتا ہے وہ بھی انسانی وہم و گمان سے بالاتر ہے۔ گویا شہداء کی زندگی انتہائی حسین و جمیل اور راحت و آرام کی ہے۔ پھر یہ زندگی ابدی ہے' یعنی ماہ و سال کی حدود سے بالاتر ہے۔ زندگی کا یہ سکھ اور چین ایسا ہے کہ کبھی ختم نہ ہو گا اور نہ ہی شہداء کو یہ غم لاحق ہو گا کہ فلاں وقت ان کو ملنے والی یہ اعلیٰ و اَرفع نعمتیں ان سے چھن جائیں گی۔ شہداء کے اس انجام پر دل کی گہرائیوں سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یقین تھا' اسی لیے وہ دیوانہ وار غزوات میںشریک ہوتے تھے اور معرکہ حق و باطل میں جان دینے کو اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے۔ مرتے وقت ان کے الفاظ یہ ہوتے تھے: فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ (ربِّ کعبہ کی قسم' میں کامیاب ہو گیا!)۔ جنگ بدر کے موقعہ پر آپ ﷺ نے مجاہدین کو قتال کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: ''ایسی جنت میں جانے کے لیے کھڑے ہوجاؤ جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کے برابر ہے''۔ حضرت عمیر بن حمامؓ نے دہرا کر پوچھا تو بھی آپؐ نے وہی جواب دیا۔ عمیر کھجوریں کھا رہے تھے۔ یہ سن کر باقی کھجوریں پھینک دیں' تلوار



کی میان توڑ ڈالی اور میدانِ کارزار میں کود گئے اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (مسلم' کتاب الامارۃ) یہ یقین ان کے اندر رسول اللہ ﷺ نے پیدا کیا تھا جو خود اپنے لیے بھی شہادت کی تمنا کرتے تھے۔ آپ ﷺ کی دعا کے یہ الفاظ تھے: ((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ)) ''اے اللہ میں تیری راہ میں شہادت کا طلبگار ہوں۔'' نیز آپ ﷺ یہ بھی دعا کرتے تھے: ((اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ))۔ ان الفاظ کے ساتھ آپؐ اللہ کی راہ میں شہادت کی تمنا کرتے تھے۔ آپؐ نے اتنے غزوات میں حصہ لیا لیکن آپؐ کو شہادت کی موت نصیب نہ ہوئی۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ شہادت کا درجہ تو اُمت کے ہر فرد کے لیے کھلا ہے' مگر آپؐ تو اللہ کے رسول' برگزیدہ بندے تھے۔ اس لیے شہادت کی تمنا تو آپ شہادت کی فضیلت کے اظہار کے لیے کرتے تھے ورنہ آپ کا مقام تو شہید فی سبیل اللہ سے کہیں بلند تھا۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

{كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ۭ} (المجادلۃ: ۲۱)

''اللہ تعالیٰ نے طے کر دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب رہیں گے۔''

لہٰذا نہ تو اللہ تعالیٰ پر کوئی غالب آسکتا ہے اور نہ اس کے رسولوں پر کسی کو غلبہ نصیب ہو سکتا ہے۔ اللہ تو خود القوی ہے اور بے حد غالب ہے۔ نبی اور رسول کا ایک فرق یہ بھی ہے کہ نبی تو باطل پرستوں کے ہاتھوں قتل بھی ہوئے مگر رسولوں کو قتل نہیں کیا جا سکا۔ شہادت فی سبیل اللہ کی فضیلت کو واضح کرتے ہوئے آپ ﷺ کی یہ تمنا بخاری شریف اور مسلم شریف میں موجود ہے:

((لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ))

''میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں۔''

یہ فی سبیل اللہ قتل ہونے کی لذت کا بیان ہے۔ موت تو ہر ایک کو آنی ہے یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار ممکن نہیں۔ بالفاظِ قرآنی:

{كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ط} (آل عمران:۱۸۵)

---



''ہر جاندار کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔''

ہم ہر روز لوگوں کو موت کے منہ میں جاتے دیکھتے ہیں۔ کوئی بیماری سے مرتا ہے' کوئی حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب مرنا ہی ہے تو کیوں نہ اچھی موت کی تمنا کی جائے' جو نہ صرف انجام کے اعتبار سے اچھی ہے بلکہ سہل بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''راہِ خدا میں شہید ہونے والا قتل کیے جانے کی بس اتنی ہی تکلیف محسوس کرتا ہے جتنی تکلیف تم میں سے کوئی آدمی چیونٹی کے کاٹ لینے کی محسوس کرتا ہے۔'' (جامع ترمذی' سنن نسائی' سنن دارمی)

شہادت کی موت کی اس آسانی پر پختہ یقین رکھنا ضروری ہے' کیونکہ یہ خبر محبوبِ خدا رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی ہے جن سے زیادہ سچا کوئی ہوا ہے نہ ہو گا۔ اس بات کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ جنت میں جانے والا کوئی شخص واپس دنیا میں جانے کی تمنا نہ کرے گا سوائے شہید فی سبیل اللہ کے۔ وہ تمنا کرے گا کہ میں بار بار زندہ ہو کر دنیا میں جاؤں اور اللہ کی راہ میں شہادت کی لذت پاؤں۔ گویا شہادت کی لذت حصولِ جنت سے بھی بڑھ کر ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں جنت میں پہنچ جانے کے بعد کوئی شخص بھی نہیں چاہے گا اور نہیں پسند کرے گا کہ اس کو پھر دنیا میں اس حال میں واپس کر دیا جائے کہ دنیا کی ساری چیزیں اس کی ہوں (وہ سب کا مالک ہو) البتہ جو راہِ خدا میں شہید ہو کر جنت میں پہنچے گا وہ اس کی آرزو کرے گا کہ اس کو پھر دنیا میں واپس بھیج دیا جائے اور وہ پھر (ایک دفعہ نہیں) دس دفعہ فی سبیل اللہ شہید کیا جائے۔ وہ یہ آرزو اس لیے کرے گا کہ جنت میں دیکھے

گا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہیدوں کا کیسا انعام و اکرام ہے۔ (بخاری و مسلم) اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے اللہ کے محبوب بندے بن جاتے ہیں ۔ سورۃ الصف میں ارشاد ہے :

{اِنَّ اللہَ یُحِبُّ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ صَفًّا کَاَنَّہُمۡ بُنۡیَانٌ مَّرۡصُوۡصٌ ﴿۴﴾}

''بے شک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے ان لوگوں کو جو اس کی راہ میں (اس کے دین کو بلند کرنے کی خاطر) صف بنا کر قتال کرتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''

ظاہر ہے جس نے جان جیسی متاع عزیز بھی اللہ کی خاطر قربان کر دی اس نے اپنے پاس کیا رکھا تو ایسا شخص مالک دو جہاں کے ہاں اعلیٰ درجے کا اکرام و اعزاز پائے گا۔ کیونکہ فی سبیل اللہ لڑتے ہوئے خون میں لتھڑا ہوا وجود بڑی قدر والا ہے۔ بقول اقبال ؎



تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں !

جہاد دو قتال کی ترغیب قرآن مجید کی بہت سی آیات اور احادیث مبارکہ میں آئی ہے۔ یہ بہت فضیلت کی بات ہے ۔چنانچہ ہر مسلمان کی خواہش ہونی چاہیے کہ وہ دین اسلام کے غلبے کی خاطر اپنا مال اور جان لگانے کا موقعہ پائے ۔اور کسی مسلمان کو جہاد و قتال سے گریز ہے تو اس کو منافقت کی نشانی بتایا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے جس شخص نے اس حال میں انتقال کیا کہ نہ تو کبھی جہاد میں عملی حصہ لیا اور نہ کبھی جہاد کا سوچا (نہ اس کی نیت کی) تو اس نے ایک قسم کی منافقت کی حالت میں انتقال کیا۔ ( صحیح مسلم)

ہمارا ملک پاکستان اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا ‘لیکن آج بھی یہاں اسلامی قانون نافذ نہیں ہے۔ البتہ نام کے ساتھ اسلامی لکھا جاتا ہے اور آئین کے اندر بھی درج ہے کہ قانون سازی قرآن و سنت کے دائرے میں ہو گی۔ مگر یہ صرف لکھنے کی حد تک ہے۔ ورنہ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے وہ خلافِ شریعت ہے ‘حتیٰ کہ ہمارے عائلی قوانین اسلامی نہیں ہیں۔عدالتوں میں فیصلے شریعت کے مطابق نہیں ‘بلکہ انگریزی قانون کے مطابق ہو رہے ہیں۔ نہ ہمارا سیاسی نظام اسلامی ہے ‘نہ معاشی نظام اور نہ کوئی اور نظام۔ گویا ہم پاکستانی مسلمان غیر اسلامی ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم غلبۂ اسلام کے لیے مخلص ہوں اور اپنے ملک پاکستان میں نظامِ خلافت اسلامی کے لیے جدوجہد کریں۔ ہمارے ایمان کی سلامتی کے لیے یہ ناگزیر ہے۔ اس کے لیے انفرادی کوشش بھی ضروری ہیں اور اجتماعی بھی۔ چنانچہ ہمارے لیے کسی ایسی جماعت یا تنظیم میں شامل ہونا

ضروری ہے جس کا مشن نفاذ اسلام کی منزل کا حصول ہو' اقتدار میں آنا مقصد نہ ہو۔ گویا کسی بھی سطح پر اس جدوجہد میں خود غرضی یا لالچ نہ در آئے 'کیونکہ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن نہ مال غنیمت' نہ کشور کشائی !

اگر اس جدوجہد میں کامیابی نظر نہیں آتی تو یہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب روئے زمین کا کوئی گھر ایسا نہ ہوگا جہاں اسلام نہ داخل ہو۔ لہٰذا ہمارا کام اس مشن میں جدوجہد کرنا ہے 'کامیابی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

* * *



# حصولِ علم کی فرضیت' اہمیت اور فضیلت

یہ جہان دارالعمل ہے۔ یہاں ہر شخص کو کسی قدر اختیار ہے کہ وہ جیسا چاہے عمل کرے۔ عمل کی بنیاد علم ہے اور علم ہی کے ذریعے پتا چلتا ہے کہ کون سا کام اچھا ہے اور کون سا برا۔ اسی لیے حصولِ علم کو فرض قرار دیا گیا ہے تاکہ ہر شخص اچھائی اور برائی سے واقف ہو اور پھر اپنے ارادے سے اچھے یا برے کام کا انتخاب کرے ۔ اس دنیا میں زندگی گزار کر بندہ جب دارالجزا میں پہنچے گا تو اس سے اس کے اعمال کی بازپرس ہوگی اور اچھائی کی جزا اور برائی کی سزا کا فیصلہ ہوگا۔ پس حصولِ علم ضروری ہوا تاکہ انسان جائز اور ناجائز' حلال اور حرام' گناہ اور ثواب' خیر اور شر' حق اور باطل سے باخبر ہو سکے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ)) (۱)

''حصول علم ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے ۔''

اکثر اس حدیث میں كُلِّ مُسْلِمٍ کے بعد ''وَمُسْلِمَةٍ'' بھی لکھا ہوا دیکھا گیا ہے 'جبکہ یہ لفظ حدیث میں نہیں ہے' البتہ معنوی طور پر مسلم کا لفظ مرد و عورت دونوں کو شامل ہے۔ یوں ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ علم حاصل کرے۔ عربی کا

مشہور مقولہ ہے: اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَی اللَّحْدِ ''علم حاصل کرو ماں کی گود سے قبر میں جانے تک۔''

علم روشنی کی مانند ہے۔ انسان کی دو آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتا ہے مگر تاریکی میں اور رات کے اندھیرے میں کھلی آنکھوں کے باوجود اسے نظر نہیں آتا۔ چیزوں کو دیکھنے کے لیے روشنی ضروری ہے' ورنہ انسان آنکھوں کے باوجود تاریکی میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ یہی حال بے علم اور جاہل کا ہے کہ وہ اچھائی اور برائی سے ناواقف بھکا پھرتا ہے۔ ع ''بے علم نتواں خدا را شناخت'' یعنی ''بے علم آدمی خدا کو نہیں پہچان سکتا''۔ معلوم ہوا کہ معرفت خداوندی کے لیے علم لازمی ہے ---- علم وہ شمع ہے جس کی روشنی میں انسان راستے کی رکاوٹوں اور ناہمواریوں سے بچ کر چل سکتا ہے۔ فرشتے نورانی مخلوق ہیں' ان سے کوئی برائی سرزد نہیں ہوتی۔ وہ وہی کام



کرتے ہیں جس کا انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ اس طرح وہ معصوم عن الخطا مخلوق ہیں' مگر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے بجائے انسان کو اشرف المخلوق بنایا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے جب آدمؑ کو پیدا کیا تو اسے مسجودِ ملائکہ کا درجہ دیا۔ یہ اس لیے کہ جب فرشتوں سے چند چیزوں کے نام پوچھے گئے تو انہوں نے بے بسی کا اظہار کیا اور وہ نام نہ بتا سکے۔ پھر اللہ نے ان چیزوں کے نام آدمؑ سے پوچھے تو انہوں نے بتا دیئے۔ اس طرح آدمؑ کو فرشتوں پر فضیلت حاصل ہوئی۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

جو پایہ علم سے پایا بشر نے
فرشتوں نے بھی وہ پایہ نہ پایا

اب انسان کی فضیلت اس بات میں ہے کہ وہ علم حاصل کر کے خوب و زشت سے واقف ہو اور اچھائی کے کام کرے اور برائیوں سے دور رہے۔ سلطان العارفین سلطان باہوؒ نے صحیح فرمایا ہے: ''باہجوں علم جے کریں فقیری کافر مریں دیوانہ ہو'' یعنی علم کے بغیر انسان کو بلند مراتب نہیں مل سکتے اور اگر کوئی علم کے بغیر فقیری یعنی کمال کا دعویٰ کرے تو وہ اس میں جھوٹا ہے بلکہ علم سے تہی دست ہونا تو دیوانگی ہے جو اس کا خاتمہ کفر پر کر دے گی۔ اسی بات کو ولی کامل علی ہجویریؒ اپنی کتاب کشف المحجوب میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: ''جاہل درویش اسلام کے دشمن ہیں''۔ درویش تو خدا پرست اور لذائذ دنیا سے نفور ہوتا ہے' مگر جو شخص درویشی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہو اور اپنی ہیئت اور حرکات و سکنات سے درویشی کا دعویٰ کرتا ہو مگر علم سے بے بہرہ ہو تو وہ اسلام کو بدنام کرنے کا باعث ہے۔ درویش تو وہ ہے جس کو شرع محمدیؐ کا علم حاصل ہو اور وہ اس کی حدود و قیود کا لحاظ رکھتے ہوئے زندگی گزارے۔ اسی کو تقویٰ کہتے ہیں۔ گویا تقویٰ اختیار کیے بغیر درویشی کا دعویٰ ہی غلط ہے۔

علم دو قسم کا ہے' ایک دین کا علم اور دوسرا دُنیوی علم۔ انسان کی اصل فضیلت علم دین میں

منحصر ہے' جبکہ دنیوی علوم کی یہ فضیلت نہیں ۔وہ انسان کی مادی ضروریات پوری کرنے کے لیے ہیں۔ علومِ جدیدہ فزکس' کیمسٹری' اقتصادیات' سیاسیات' طب 'انجینئرنگ اور دوسرے بے شمار علوم روزی کمانے کے لیے ضروری ہیں'لیکن ان علوم کے حاصل کرنے میں اس قدر منہمک ہو جانا کہ علم دین کی اہمیت ذہن سے محو ہو جائے 'یہ نری جہالت ہے۔ ایک اچھا وکیل'



ڈاکٹر' انجینئر یا دکان دار اگر اپنے کام میں ماہر ہے ' اپنے پیشے سے خوب دولت کما رہا ہے اور خوشحال زندگی گزار رہا ہے 'مگر اس کی زندگی تقویٰ کے بغیر گزر رہی ہے تو وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ یا اپنے فن میں ماہر ہونے کے باوجود جاہل ہے۔ اگر اس کو اپنی جہالت کا علم بھی نہیں ہے تو پھر وہ جہل مرکب کا شکار ہے 'اور اگر اسے اپنی جہالت کا علم ہے تو ہو سکتا ہے وہ کسی وقت اپنی اس جہالت کو ترک کر کے شرع محمدی ؐ کے مطابق زندگی گزارنے کا عزم کر لے۔

بہترین علم تو قرآن مجید کا سیکھنا ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ))(۲)''تم میں بہترین وہ ہے جو قرآن مجید کا علم حاصل کرے اور پھر دوسروں کو اس کی تعلیم دے''۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ یہ انسانوں کو زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ اس کلام کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ کر دیا ہے اور ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک رکھا ہے۔یہ کلام حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا 'انہوں نے انسانوں کو اس کی تعلیم دی اور خود قرآن کی تعلیم کے مطابق عمل کر کے دکھایا۔ چونکہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی منشائے الٰہی یعنی قرآنی تعلیمات کے مطابق گزر رہی تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی زندگی کو دوسرے تمام انسانوں کے لیے نمونۂ عمل قرار دیا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

{لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ} (الاحزاب:۲۱)

''بے شک رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے زندگی گزارنے کا خوبصورت نمونہ موجود ہے۔''

اسی علم کو حاصل کرنے اور پھر اس علم پر عمل کرنے میں ہی انسان کی فضیلت ہے۔

انسان کا مقصد تخلیق عبادتِ ربّ ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا : {وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿ ۵۶ ﴾} (الذّٰریٰت)''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا ہے''۔ اب عبادت کرنے کا سلیقہ تو علم سے ہی آئے گا۔ اسی لیے علم کو عبادت پر فوقیت ہے ۔حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ مَرَّ بِمَجْلِسَیْنِ فِیْ مَسْجِدِہٖ فَقَالَ: ((کِلَاھُمَا عَلٰی خَیْرٍ وَاَحَدُھُمَا اَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِہٖ' اَمَّا ھٰؤُلَاءِ فَیَدْعُوْنَ اللّٰہَ وَیَرْغَبُوْنَ اِلَیْہِ فَاِنْ شَاءَ اَعْطَاھُمْ وَاِنْ شَاءَ مَنَعَھُمْ' وَاَمَّا ھٰؤُلَاءِ فَیَتَعَلَّمُوْنَ الْفِقْہَ اَوِ الْعِلْمَ

وَيُعَلِّمُوْنَ الْجَاهِلَ فَهُمْ اَفْضَلُ وَاِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا)) قَالَ ثُمَّ جَلَسَ فِيْهِمْ(۳)

''رسول اللہ ﷺ کا گزر دو مجلسوں پر ہوا جو آپ کی مسجد میں قائم تھیں' آپ ﷺ نے فرمایا: ''دونوں مجلسیں خیر اور نیکی کی مبارک مجلسیں ہیں اور ان میں سے ایک مجلس دوسری سے زیادہ افضل ہے۔ (ایک مجلس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ) یہ لوگ اللہ سے دعا اور مناجات میں مشغول ہیں' اللہ چاہے تو عطا فرما دے اور چاہے تو عطا نہ فرمائے (وہ مالک مختار ہے) اور (دوسری مجلس کے بارے میں فرمایا کہ) یہ لوگ دین کا علم اور فہم حاصل کرنے میں اور نہ جاننے والوں کو سکھانے میں لگے ہوئے ہیں' لہٰذا ان کا درجہ بالاتر ہے اور میں تو معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں''۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر آپؐ اسی مجلس میں بیٹھ گئے۔''

رسول اللہ ﷺ کا ہر عمل منشائے خداوندی کے مطابق تھا۔ آپؐ نے کسی فردِ بشر کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہیں کیا۔ آپ اُمی تھے' مگر علومِ الٰہی کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس قدر کامل علم عطا فرمایا کہ آپ ؐ نے اس کی روشنی میں بھرپور زندگی گزاری اور پھر لوگوں کو بھی وہ علم سکھایا' کیونکہ لوگوں تک ہدایت کا پیغام پہنچانا آپؐ کا فرض منصبی تھا' جسے قرآن مجید میں ان الفاظ سے واضح کیا گیا ہے:

{يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ} (المائدۃ:٦٧)

''اے رسول! جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچایئے۔ اور اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو گویا رسالت کا فریضہ ہی ادا نہ کیا۔''

آپؐ نے اس ذمہ ّداری کو انتہائی محنت اور جدوجہد کے ساتھ ادا کیا اور لوگوں کو احکامِ الٰہی سے روشناس کرایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی اس جدوجہد کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:

{طٰهٰ ۝۱ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝۲} (طٰہٰ)

''طاہا۔ (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں۔''

یعنی فریضہ ٔرسالت کی ادائیگی میں اتنی مشقت نہ اٹھایئے۔ آپؐ پر تو صرف لوگوں تک پیغامِ حق پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ ان کو ہدایت کے راستہ پر ڈالنا صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ پھر



سورۃ الکہف میں فرمایا:

{فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝۶}

''(اے پیغمبر ﷺ!) اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید آپ ان کے پیچھے رنج کر کے اپنے ئیں ہلاک کر دیں گے۔''

رسول اللہ ﷺ نے انتہائی خیر خواہی اور دلسوزی کے ساتھ علم حقیقی لوگوں کو سکھایا۔ چونکہ یہ علم انسان کی نجات کے لیے ناگزیر ہے اس لیے آپؐ نے تمام انسانوں پر لازم کیا کہ وہ خود علم حاصل کریں اور پھر دوسروں کو سکھائیں۔ حضرت عبدالرحمن کے والد ابزی الخزاعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

خَطَبَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ ذَاتَ یَوْمٍ فَاَثْنٰی عَلٰی طَوَائِفَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ خَیْرًا، ثُمَّ قَالَ: ((مَا بَالُ اَقْوَامٍ لَا یُفَقِّھُوْنَ جِیْرَانَھُمْ وَلَا یُعَلِّمُوْنَھُمْ وَلَا یَعِظُوْنَھُمْ وَلَا یَأْمُرُوْنَھُمْ وَلَا یَنْھَوْنَھُمْ! وَمَا بَالُ اَقْوَامٍ لَا یَتَعَلَّمُوْنَ مِنْ جِیْرَانِھِمْ وَلَا یَتَفَقَّھُوْنَ وَلَا یَتَّعِظُوْنَ! وَاللہِ لَیُعَلِّمَنَّ قَوْمٌ جِیْرَانَھُمْ وَیُفَقِّھُوْنَھُمْ وَیَعِظُوْنَھُمْ وَیَأْمُرُوْنَھُمْ وَیَنْھَوْنَھُمْ وَلَیَتَعَلَّمَنَّ قَوْمٌ مِنْ جِیْرَانِھِمْ وَیَتَفَقَّھُوْنَ وَیَتَّعِظُوْنَ اَوْلَاُعَاجِلَنَّھُمْ بِالْعُقُوْبَۃِ فِیْ دَارِ الدُّنْیَا))(۴)

ایک دن رسول اللہ ﷺ نے (مسجد میں منبر پر) خطاب فرمایا۔ پس آپ ﷺ نے مسلمانوں کے بعض گروہوں کی تعریف فرمائی (کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کرتے ہیں) اس کے بعد آپ ﷺ نے (مسلمانوں کے بعض دوسرے گروہوں کو تنبیہہ اور سرزنش کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا: ''کیا حال ہے ان لوگوں کا (اور کیا عذر ہے ان کے پاس) جو اپنے پڑوس والے (ان مسلمانوں کو جو دین سے واقف نہیں ہیں) دین نہیں سمجھاتے اور دین کی تعلیم نہیں دیتے اور وعظ و نصیحت نہیں کرتے اور ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام نہیں دیتے! (اسی کے ساتھ آپ ﷺ نے فرمایا) اور کیا حال ہے ان لوگوں کا (اور کیا عذر ہے ان کے پاس جو دین اور اس کے احکام سے واقف نہیں ہیں' اس کے باوجود) وہ اپنے پڑوس میں رہنے والے (ان مسلمانوں سے جو دین کی سمجھ بوجھ اور اس کا علم حاصل کر چکے ہیں) دین سیکھنے اور اس



کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے کی اور ان کے وعظ و نصیحت سے مستفید ہونے کی کوشش نہیں کرتے! (اس کے بعد آپ ﷺ نے قسم کے ساتھ تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ) وہ لوگ (جو دین کا علم رکھتے ہیں' علم نہ رکھنے والے) اپنے پڑوسیوں کو لازماً دین سکھانے اور دین کی سمجھ بوجھ ان میں پیدا کرنے کی کوشش کریں' اور ان کو وعظ و نصیحت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کریں... اور (جو لوگ دین اور اس کے احکام سے واقف نہیں' ان کو) میری تاکید ہے کہ وہ (دین کی سمجھ بوجھ اور اس کا علم رکھنے والے) اپنے پڑوسیوں سے دین سیکھیں اور اس کی سمجھ بوجھ حاصل کریں' اور ان کے وعظ و نصیحت سے استفادہ کیا کریں' ورنہ (یعنی اگر ان دونوں فریقوں نے اس ہدایت پر عمل نہیں کیا تو) میں ان کو اس دنیا ہی میں سزا دلوائوں گا۔''

گویا آپ ﷺ کی منشا یہ ہے کہ ہر آبادی میں دین کی عمومی تعلیم و تربیت کا ایسا نظام قائم ہو جس میں ہر شخص اپنی ذمہ داری محسوس کرے۔ جہاں نہ جاننے والوں پر لازم ہے کہ وہ دین کا علم ضرور حاصل کریں۔ وہاں اہلِ علم کو بھی اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو ضرور علم سکھائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس معاملے

میں کسی بھی طرح کی کوتاہی کرنے کو قابل تعزیر جرم قرار دیا ہے۔

آج صورت حال یہ ہے کہ اکثر نماز روزہ کرنے والے اور اپنا وقت ذکرو اذکار اور تلاوت میں گزارنے والے اپنے عمل کو کافی سمجھ کر مطمئن ہیں اور اس فرض سے غافل ہیں کہ دین کے علم کے حصول میں لگنا عبادت سے زیادہ فضیلت والا کام ہے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ علیہ نے بطریق ارسال روایت کیا ہے کہ:

سُئِلَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنْ رَجُلَیْنِ کَانَا فِیْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ اَحَدُھُمَا کَانَ عَالِمًا یُصَلِّی الْمَکْتُوْبَۃَ ثُمَّ یَجْلِسُ فَیُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَیْرَ وَالْآخَرُ یَصُوْمُ النَّھَارَ وَیَقُوْمُ اللَّیْلَ اَیُّھُمَا اَفْضَلُ؟ قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: ((فَضْلُ ھٰذَا الْعَالِمِ الَّذِیْ یُصَلِّی الْمَکْتُوْبَۃَ ثُمَّ یَجْلِسُ فَیُعَلِّمُ النَّاسَ الْخَیْرَ عَلَی الْعَابِدِ الَّذِیْ یَصُوْمُ النَّھَارَ وَیَقُوْمُ اللَّیْلَ کَفَضْلِیْ عَلٰی اَدْنَاکُمْ رَجُلًا)) (۵)

''رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے بنی اسرائیل کے ایسے دو آدمیوں کے بارے میں دریافت کیا گیا جن میں سے ایک کا معمول یہ تھا کہ وہ فرض نماز پڑھتا' پھر بیٹھ کر لوگوں کو نیکی اور بھلائی



کی باتیں بتلاتا اور دین کی تعلیم دیتا ---- اور دوسرے صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ دن کو برابر روزہ رکھتا اور رات کو کھڑے ہو کر نوافل پڑھتا (آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے دریافت کیا گیا) کہ ان دونوں میں کون افضل اور اعلیٰ ہے؟ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ''یہ عالم جو فرض نماز ادا کرتا ہے پھر لوگوں کو دین اور نیکی کی باتیں سکھانے کے لیے بیٹھ جاتا ہے' اس کو اس صائم النہار اور قائم اللیل عابد کے مقابلہ میں اس طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح تم میں سے کسی ادنیٰ آدمی پر مجھے فضیلت حاصل ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ فرض نماز اور روزہ کی ادائیگی تو ضروری ہے' اس کے علاوہ نوافل کی بھی بڑی تاکید کی گئی ہے' مگر تعلیم و تعلّم کو نوافل پر اس درجہ فضیلت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ان دونوں مجالس کو اچھا قرار دیا' مگر جہاں دین کی تعلیم ہو رہی تھی اس کو بہتر فرمایا اور آپؐ اس مجلس میں بیٹھ گئے ---- اس کے بعد تعلیم و تعلّم کی اہمیت کو مزید واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ عالم کو عابد پر اتنی فضیلت ہے جتنی تم میں سے کسی ادنیٰ آدمی پر مجھے فضیلت ہے۔

تحصیل علم بڑی فضیلت کا کام ہے' اس لیے اس مقصد کے لیے سفر اختیار کرنے والے کی بھی رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے توصیف فرمائی ہے اور اسے جنتیوں والا کام بتایا ہے۔ حضرت ابوالدرداءؓ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((مَنْ سَلَکَ طَرِیْقًا یَطْلُبُ بِہٖ عِلْمًا سَلَکَ اللہُ بِہٖ طَرِیْقًا مِنْ طُرُقِ الْجَنَّۃِ' وَاِنَّ الْمَلَائِکَۃَ لَتَضَعُ اَجْنِحَتَھَا رِضًا لِطَالِبِ الْعِلْمِ' وَاِنَّ الْعَالِمَ یَسْتَغْفِرُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالْحِیْتَانُ فِیْ جَوْفِ الْمَائِ' وَاِنَّ فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَی الْعَابِدِ کَفَضْلِ الْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ عَلٰی سَائِرِ الْکَوَاکِبِ' وَاِنَّ الْعُلَمَائَ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَائِ وَاِنَّ الْاَنْبِیَائَ لَمْ یُوَرِّثُوْا دِیْنَارًا وَلَا دِرْھَمًا وَاِنَّمَا وَرَّثُوا الْعِلْمَ' فَمَنْ اَخَذَہٗ اَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ)) (٦)

''جو بندہ (دین کا) علم حاصل کرنے کے لیے کسی راستہ پر چلے گا' اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کو جنت کے راستوں میں سے ایک راستے پر چلائے گا ---- اور (آپ ﷺ نے فرمایا کہ) اللہ کے فرشتے طالبانِ علم کے لیے اظہار رضا (اور اکرام و احترام) کے طور پر اپنے بازو جھکا دیتے ہیں اور (فرمایا کہ) علم دین کے حامل کے لیے آسمان و زمین کی ساری مخلوقات اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی استدعا کرتی ہیں 'یہاں تک کہ دریا



کے پانی کے اندر رہنے والی مچھلیاں بھی ---- اور (آپ ﷺ نے فرمایا کہ) عبادت گزاروں کے مقابلہ میں حاملین علم کو ایسی برتری حاصل ہے جیسی کہ چودھویں رات کے چاند کو آسمان کے باقی ستاروں پر ----اور (یہ بھی فرمایا کہ) علماء انبیاء کے وارث ہیں' اور انبیاء علیہ السلام نے دیناروں اور درہموں کا ترکہ نہیں چھوڑا ہے' بلکہ انہوں نے اپنے ترکے اور ورثے میں صرف علم چھوڑا ہے 'پس جس نے اس کو حاصل کر لیا اس نے بہت بڑی کامیابی اور خوش بختی حاصل کر لی۔''

گویا جب کوئی شخص علم کی تلاش میں نکلتا ہے تو وہ جنت کی طرف جانے والا راستہ طے کر رہا ہوتا ہے ---- حدیث کے آخری حصہ میں فرمایا کہ عام لوگوں کی طرح انبیاء کرام علیہم السلام اپنے پیچھے درہم و دینار نہیں چھوڑتے بلکہ وہ دین کا نورانی علم چھوڑ کر جاتے ہیں' اور جو لوگ اس علم کے حصول میں لگ جاتے ہیں وہی انبیاء کے وارث قرار پاتے ہیں اور انبیاء کا وارث ہونا خود بہت بڑی فضیلت ہے۔ طبرانی نے معجم الاوسط میں نقل کیا ہے کہ ایک دن حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بازار کی طرف سے گزرے۔ لوگ کاروبار میں مشغول تھے۔ آپؓ نے ان سے فرمایا: ''تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے 'تم یہاں ہو اور مسجد میں رسول اللہ ﷺ کی میراث تقسیم ہو رہی ہے!'' یہ سن کر لوگ مسجد کی طرف چل پڑے۔ مسجد سے واپس آئے تو کہا :وہاں تو کچھ بھی نہیں بٹ رہا' بس لوگ بیٹھے نماز پڑھ رہے ہیں' کچھ تلاوت کر رہے ہیں اور کچھ لوگ حلال و حرام کی باتیں کر رہے ہیں 'یعنی شرعی مسائل پر گفتگو کر رہے ہیں ۔یہ سن کر حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا: ''یہی تو رسول اللہ ﷺ کی میراث ہے۔''

علم دین کی تحصیل میں محنت و مشقت اور سفر اختیار کرنا اعلیٰ درجے کا عمل ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہسے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((مَنْ خَرَجَ فِيْ طَلَبِ الْعِلْمِ كَانَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَرْجِعَ))(۷)

''جو بندہ علم کے حصول کے لیے (گھر سے یا وطن سے) نکلا وہ اس وقت تک اللہ کے راستے میں ہے جب تک واپس نہ آجائے۔''

علم حاصل کر کے اسے دوسروں تک پہنچانا اور بھی بڑا کام ہے اور اجر و ثواب کا باعث ہے۔ حضرت ابوامامہ رضی

اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
((اِنَّ اللہَ وَمَلَائِکَتَہٗ وَاَھْلَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ حَتَّی النَّمْلَۃَ فِیْ جُحْرِھَا



وَحَتَّی الْحُوْتَ لَیُصَلُّوْنَ عَلٰی مُعَلِّمِ النَّاسِ الْخَیْرَ)) (۸)

''اللہ تعالیٰ رحمت نازل فرماتا ہے اور اس کے فرشتے اور آسمان و زمین میں رہنے والی ساری مخلوقات یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے سوراخوں میں اور (پانی میں رہنے والی) مچھلیاں بھی اس بندے کے لیے دعائے خیر کرتی ہیں جو لوگوں کو بھلائی اور دین کی تعلیم دیتا ہے۔''

گویا اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کی کل مخلوق کو اور فرشتوں کو اس کام پر لگا دیا ہے کہ جو لوگ تعلیم و تعلّم کا مبارک کام اختیار کریں وہ ان کے لیے دعائے خیر کرتے رہیں۔

اگرچہ دنیوی علوم سیکھنے بھی ضروری ہیں، کیونکہ معاشی جدوجہد کے لیے ان کا حصول ناگزیر ہے، مگر علم دین کی تحصیل کے بغیر چارہ نہیں، کیونکہ اس کے بغیر بندہ نہ اللہ کی رضا جان سکتا ہے اور نہ ہی اس کی ناراضگی والے کاموں سے بچ سکتا ہے۔ بڑے مبارک ہیں وہ لوگ جو دُنیوی علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ قرآن و سنت کی تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں اور اس علم کی روشنی میں خود نیکی کے کام کرتے اور برائی سے رکتے ہیں، نیز وہ دوسروں کو اچھائی کی تلقین کرتے اور برائیوں سے رکنے کا حکم دیتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ماہر فن ہیں مگر قرآن و سنت کے علم سے بے بہرہ ہیں وہ جہالت کی زندگی گزار رہے ہیں۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دین کا علم سیکھتے ہیں، مگر ان کے پیش نظر اس کے ذریعے دولت کمانا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ صحیح راستے سے ہٹ کر پرخطر راستے پر چل رہے ہیں۔ حصولِ علم کے مقدس کام کے ذریعے دنیا کے حقیر فوائد حاصل کرنا بہت بڑی نادانی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا یُبْتَغٰی بِہٖ وَجْہُ اللہِ لَا یَتَعَلَّمُہٗ اِلَّا لِیُصِیْبَ بِہٖ عَرَضًا مِنَ الدُّنْیَا لَمْ یَجِدْ عَرْفَ الْجَنَّۃِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَعْنِیْ رِیْحَھَا)) (۹)

''وہ علم جس سے اللہ کی رضا چاہی جاتی ہے (یعنی دین اور کتاب و سنت کا علم) اگر اس کو کوئی شخص دنیا کی دولت کمانے کے لیے حاصل کرے تو وہ قیامت میں جنت کی خوشبو سے محروم رہے گا۔''

دنیا کمانے کے لیے دین کا علم حاصل کرنے والا علم دین کی تحقیر کرتا ہے اس لیے اسے جنت تو دور کی بات ہے جنت کی خوشبو سے بھی محروم رکھا جائے گا۔

بعض لوگ قصداً درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کی مجالس میں نہیں بیٹھتے اور سمجھتے ہیں کہ جب ایسی مجالس میں جائیں گے تو نئی نئی باتوں کا علم ہو گا' پھر ان کے مطابق عمل بھی کرنا پڑے گا تو بہتر ہے کہ نہ وہاں جائیں اور نہ سنیں 'اس طرح ہم ناواقف رہ کر باز پرس سے بچ جائیں گے' کیونکہ ہمارے پاس عذر ہو گا کہ ہمیں ان باتوں کا علم ہی نہ تھا لہٰذا ان پر ہم عمل کیسے کرتے ! حالانکہ یہ واضح طور پر شیطان کا دھوکہ ہے' کیونکہ ہمیں تو علم حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور علم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے 'یعنی علمی مجالس میں شرکت نہ کرنا تو فرائض سے غفلت کا ارتکاب ہے جو خود گناہ کی بات اور عمل سے فرار کی صورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو قرآن و سنت کا نورانی علم سیکھنے کا ذوق و شوق عطا فرمائے ' اس پر خود عمل کرنے کی اور دوسروں کو سکھانے اور عمل پر آمادہ کرنے کی توفیق بھی دے۔ آمین یاربَّ العالمین !

## حواشی

(۱) سنن ابن ماجہ' المقدمۃ' باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ۔ وسنن الترمذی' ابواب فضائل القرآن' باب ما جاء فی تعلیم القرآن۔

(۳) سنن الدارمی' المقدمۃ' کتاب فی فضل العلم والعالم ' ح ۳۵۲۔

(۴) رواہ ابن راھویہ والبخاری فی الواحدان وابن السکن وابن مندۃ والطبرانی فی الکبیر۔ بحوالہ معارف الحدیث۔

(۵) سنن الدارمی' المقدمۃ'کتاب فی فضل العلم والعالم ' ح ۳۴۴۔

(۶) سنن الترمذی' کتاب العلم' باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ۔ وسنن ابی داؤد' کتاب العلم' باب الحث علی طلب العلم۔

(۷) سنن الترمذی ' کتاب العلم' باب فضل طلب العلم۔ قال ابوعیسیٰ ھذا حدیث حسن غریب۔

(۸) سنن الترمذی' کتاب العلم' باب ما جاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ۔

(۹) سنن ابی داؤد' کتاب العلم' باب فی طلب العلم لغیر اللہ تعالیٰ۔وسنن ابن ماجہ' المقدمۃ' باب الانتفاع بالعلم والعمل بہ۔

* * *



# دُنیوی اور اُخروی زندگی

ہر شخص جو اس دنیا میں آتا ہے اسے ماہ و سال کی صورت میں زندگی ملتی ہے جو ایک دن ختم ہوجاتی ہے۔ دنیا کی یہ زندگی عارضی اور ناپائیدار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت زندگی کے خاتمے کا نام نہیں بلکہ اس مہلت کے ختم ہونے کا نام ہے جو انسان کو اچھے یا بُرے اعمال کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔ کیونکہ جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے تو اس کی یہ دنیوی زندگی ختم ہوجاتی ہے اور اسی لمحے دوسری اور حقیقی زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ اس دوسری زندگی کی کوئی اخیر نہیں اور یہ ابد تک رہے گی۔ انسان کی مہلت عمر سراسر امتحان ہے ۔ قرآن میں ارشاد ہے:

{خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا} (الملک:۲)

''(اللہ تعالیٰ نے) موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔''

اور بقول شاعر ؎

موت اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر!

جس شخص نے دُنیوی زندگی کے ماہ و سال اللہ کی مرضی کے مطابق یعنی ایمان اور عمل صالح کے ساتھ بسر کیے وہ کامیاب قرار پائے گا اور اس دنیا سے رخصت ہو کر جانے کے بعد دوسری زندگی اُس کے لیے خوشی اور مسرت کا باعث ہو گی اور اس کا ٹھکانہ جنت ہو گا ---اور جنت وہ مقام ہے جس کی نعمتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پھر وہ نعمتیں سدابہار ہوں گی۔ کسی غم اور پریشانی کا وہاں گزر تک نہیں ہو گا۔ یہاں تک کہ جنت میں جانے والے کمزور ،مریض اور بوڑھے وہاں کسی طرح کی کمزوری ،بیماری اور بڑھاپا نہ پائیں گے ۔وہاں یہ سب لوگ عنفوانِ

شباب کی حالت میں ہوں گے ‘جہاں انہیں ان کی ہم عمر بیویاں ملیں گی جن کا حسن بے مثال اور جوانی بھرپور ہو گی ‘ان پر کبھی بڑھاپا طاری نہ ہو گا۔ بہشت میں جگہ پانے والوں کو



ہر طرح کا آرام اور چین میسر ہو گا۔ کلفت‘ تھکاوٹ اور کمزوری نام کی کوئی چیز وہاں نہ ہو گی۔ گویا جنت اس جگہ کا نام ہے جہاں جنتی کی کوئی خواہش ایسی نہ ہو گی جو پوری نہ ہو۔ جنت کا ماحول ایسا سازگار اور خوشگوار ہو گا کہ مدتِ مدید تک وہاں رہنے سے کسی طرح کی اُکتاہٹ نہ ہو گی‘ بلکہ خوشی اور مسرت بیش ازپیش ہو گی۔

اس کے برعکس جن لوگوں نے زندگی کی اس مہلت کو من مرضی کے مطابق گزارا اور ایسے اعمال کیے جن سے خالق نے روکا تھا‘ انہوں نے حلال اور حرام میں تمیز نہ کی‘ جائز اور ناجائز کی پروا نہ کی‘ کمزوروں کو ستایا‘ ظلم و ستم اور قتل و غارت کا بازار گرم کیے رکھا‘ شرفِ انسانیت کا پاس نہ جانتے ہوئے خونخوار درندوں اور جانوروں کا روپ دھارے رکھا‘ دنیا کے عیش کی خاطر ہر گناہ کا ارتکاب کیا‘ گویا زندگی ربّ کی نافرمانی میں بسر کی تو ایسے لوگ مہلت عمر کو ضائع کر بیٹھے۔ انہوں نے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے حقوق ادا نہ کیے بلکہ ربّ کی مخلوق کو ستاتے رہے اور اسی حال میں موت کے منہ میں چلے گئے۔یہ لوگ ایسے ہیں جو زندگی کے امتحان میں ناکام رہے۔ اگلی زندگی میں ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے زندگی کے شب و روز آزادانہ کیوں گزارے؟ تم نے وہ کام کیوں نہ کیے جن کا حکم خالق نے دیا تھا‘ اور وہ کام کیوں کیے جن سے روکا گیا تھا ؟تو وہ تمنا کریں گے کہ انہیں دوبارہ دنیا میں بھیجا جائے تو وہ اچھے کام کریں گے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

{وَ لَوۡ تَرٰۤی اِذِ الۡمُجۡرِمُوۡنَ نَاکِسُوۡا رُءُوۡسِہِمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ رَبَّنَاۤ اَبۡصَرۡنَا وَ سَمِعۡنَا فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا اِنَّا مُوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۲﴾} (السجدۃ)

’’اور اگر آپ مجرموں کو دیکھیں جس وقت وہ اپنے پروردگار کے سامنے سر ڈالے ہوئے ہوں گے اور کہیں گے اے ہمارے ربّ ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا پس ہم کو پھر واپس (دنیا میں) بھیج دے تو ہم بھلے کام کریں گے‘اب تو ہمیں یقین آگیا ہے۔‘‘

اُس وقت پچھتانے کا کیا فائدہ جب مہلت عمل ہی ختم ہو گئی؟ اب تو حسرت اور پشیمانی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا‘ اس لیے کہ اب دوبارہ دنیا میں بھیجا جانا ہرگز نہ ہو گا۔ سورۃ الانعام میں فرمایا:

{وَ لَوۡ رُدُّوۡا لَعَادُوۡا لِمَا نُہُوۡا عَنۡہُ وَ اِنَّہُمۡ لَکٰذِبُوۡنَ ﴿۲۸﴾}

’’اور اگر ان کو دنیا میں لوٹا بھی دیا جائے تو وہ وہی کام کریں گے جن سے ان کو منع کیا گیا

ہے ‘اور بے شک وہ جھوٹے ہیں۔‘‘

اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا کی زندگی میں کہتے رہے کہ ہمارے لیے بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم دوبارہ اٹھائے نہیں جائیں گے ۔یعنی جو کچھ ہم یہاں کر رہے ہیں اس کے بارے میں ہم سے کوئی باز پرس نہ ہو گی اور نہ ہی بداعمالیوں پر ہماری گرفت کی جائے گی۔

حقیقی ‘پائیدار اور مستقل آخرت کی زندگی کی تیاری کے سلسلہ میں سب سے اول عقیدۂ توحید ہے جس کی وضاحت سورۃ الاخلاص اور آیۃ الکرسی میں کی گئی ہے۔ دوم تمام گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانا ہے کہ وہ اللہ کے برگزیدہ بندے اور برحق پیغمبر تھے اور سب کے سب پیغمبرانہ صفات کے ساتھ متصف تھے۔ محمد مصطفی ﷺ پیغمبروں کے سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے اور آپؐ کے بعد کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں ہو گا۔ آپ خاتم النبیین تھے اور آپ پر اللہ تعالیٰ نے آخری آسمانی کتاب قرآن مجید نازل فرمایا جس میں زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ بتایا گیا ہے۔ پھر رسول پاک ﷺ نے قرآنی تعلیمات کی توضیح اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق فرمائی اور خود قرآنی تعلیمات پر پورے طور پر عمل کر کے دکھایا‘ یہاں تک کہ خالق کائنات نے آپ ﷺ کی زندگی کو تمام بنی نوعِ انسان کے لیے اُسوۂ حسنہ (عمدہ نمونہ) قرار دیا۔ لہٰذا اب وہی شخص کامیاب ہے جو آپؐ کے طریقے پر چلے۔ آپؐ کے ارشادات اور تعلیمات سنت اور حدیث کی صورت میں محفوظ ہیں۔

ایمانیات کے ضمن میں سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام پر نازل شدہ کتابوں‘ فرشتوں‘قیامِ قیامت اور اچھی بری تقدیر پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ان سب چیزوں پر صدقِ دل کے ساتھ ایمان لانے والا مؤمن کہلاتا ہے۔ ان عقائد پر ایمان لا کر ان کی روشنی میں عمل کرنا ضروری ہے۔ ایمانیات کے ان تمام شعبوں میں سے کسی ایک شعبے کا انکار کرنے والا دین اسلام سے خارج ہو کر کفر کی تاریک وادیوں میں چلا جاتا ہے۔ جس طرح کفر سے اسلام میں داخل ہونے والے کے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اسی طرح اگر اہل اسلام میں سے کوئی اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کر لیتا ہے تو مسلمان کی حیثیت سے کیے ہوئے اس کے تمام نیک اعمال ضائع ہو جائیں گے اور اگر اسی کفر کی حالت میں مر گیا تو جہنم رسید ہو گا‘ جہاں حد درجہ اذیت کی لمبی زندگی ہو گی۔ ایسے لوگوں کا کوئی پُرسانِ حال نہ ہو گا ‘نہ ان کی کوئی مدد کر سکے گا اور نہ اُن کے حق



میں کسی کو سفارش کرنے کی اجازت ہو گی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جہاں مؤمن پر لازم ہے کہ وہ ایمانیات کے تمام شعبوں کو دل سے مانے وہاں اس پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات جو قرآن و سنت میں بتائی گئی ہیں ان پر اپنی استطاعت کے مطابق زندگی بسر کرے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو رول ماڈل جانے ۔ تاہم کوئی انسان ایسا نہیں

جس سے لبھی گناہ اور قصور سرزدنہ ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ اگر لوگ بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہیں گے تو ان کے چھوٹے چھوٹے گناہ از خود معاف کر دیے جائیں گے ۔اور اگر اہل ایمان میں سے کوئی حقوق اللہ اور حقوق العباد تلف کرتے ہوئے معصیت میں زندگی گزارتا ہے اور معروف کی خلاف ورزی اور منکرات کو اختیار کرتا ہے تو اس کے نیک و بد اعمال تولے جائیں گے ‘اگر معاصی کا پلڑا بھاری ہوا تو جہنم میں ڈالا جائے گا اور اپنے گناہوں کی سزا پا کر بالآخر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ وہ برائیوں کی سزا پا کر بالآخر (یہودیوں کے کہنے کی طرح) جنت میں داخلے پر مطمئن ہو جائے اور جرائم کا ارتکاب کرنے میں جری ہو جائے‘کیونکہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے ستر گنا زیادہ تیز ہے ‘جس میں ایک لمحے کے لیے گرنا بھی ِقابل برداشت نہ ہو گا۔ اور پھر جہنم تو نام ہی اللہ کے غضب کا ہے جس سے ہر وقت پناہ مانگنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی رضا والے کام کرنے کی توفیق دے اور ہمارا خاتمہ اس حال میں ہو کہ ہم پکے سچے ّمؤمن ہوں۔ آمین یا ربّ العالمین !

* * *



# رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللهِ

اللہ تعالیٰ انسان کا خالق اور مالک ہے۔ اُسی کے ہاتھ میں ہر شخص کا نفع ‘ نقصان‘ صحت‘بیماری‘ امارت‘ غربت ‘ زندگی اور موت ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب انسان کوکوئی حاجت پیش آجائے تو اُسی کے سامنے دعا گو اور عرض گزار ہوتا ہے۔ جب انسان ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجز‘نیاز مند اور بے بس ہے تو ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے خوف کھائے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف رکھنا سب سے بڑی سچائی ہے ‘کیونکہ اس کے سوا حقیقی نفع و نقصان کا کوئی مالک نہیں۔ چونکہ خوفِ خدا ایک سچا جذبہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس بندے سے خوش ہوتا ہے جو اُس کی گرفت سے خوف کھاتا اور اُس کی رضا چاہتا ہے۔ دنیا میں انسان پر گناہ کرنے کے ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب اسے گناہ سے باز رکھنے والی کوئی چیز نہیں ہوتی‘ وہ گناہ کرنے پر پوری طرح قادر ہوتا ہے‘وہ تنہا ہوتا ہے‘ اسے کوئی فردِ بشر دیکھ نہیں رہا ہوتا۔ اگر ایسے موقع پر وہ محض خوفِ خدا سے

اس گناہ سے باز رہتا ہے تو یہ عمل اللہ تعالیٰ کو پسند آتا ہے اور وہ اس بندے کی طرف رحمت کے ساتھ رجوع کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوفِ خدا کو چوٹی کی دانائی کہا گیا ہے۔

قیامت کے دن جب شدید تپش ہو گی اور انسان پسینے میں شرابور ہوگا تو اللہ تعالیٰ سات بندوں کو اس تپش سے محفوظ رکھے گا اور اپنے عرش کے سائے میں انہیں جگہ دے گا۔ ان سات خوش بخت لوگوں میں ایک وہ ہو گا جسے دنیا میں کسی حسین و جمیل اور اعلیٰ نسب عورت نے دعوتِ گناہ دی' مگر اللہ سے خوف کھاتے ہوئے وہ گناہ کے اس موقع سے بچ نکلا' اگرچہ اسے اس فعل سے باز رکھنے کی کوئی دوسری وجہ نہ تھی اور اس کا نفس اسے برائی پر مسلسل آمادہ کر رہا تھا۔ خدا کا یہ خوف اس قدر عظیم کام ہے کہ قیامت کے دن کی سخت تپش میں وہ عرش کے سائے میں ہو گا۔ (بحوالہ ریاض الصالحین)

---

129

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کے خوف اور ہیبت سے جس بندۂ مؤمن کی آنکھوں سے کچھ آنسو نکلیں' اگرچہ وہ مقدار میں بہت کم مثلاً مکھی کے سر کے برابر ہوں 'پھر وہ آنسو بہہ کر اس کے چہرے پر پہنچ جائیں تو اللہ تعالیٰ اس چہرے کو آتش دوزخ کے لیے حرام کر دے گا''۔ (سنن ابن ماجہ) اللہ تعالیٰ کے خوف سے آنسو بہہ نکلنا تبھی ہوگا جب اللہ کی قدرت کا گہرا احساس ہوگا اور بداعمالی پر اس کی گرفت کا یقین ہو گا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی ہیبت سے کسی بندہ کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں تو اُس وقت اُس کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے کہ کسی پرانے سوکھے درخت کے پتے جھڑتے ہیں۔'' (رواہ البزار) جس طرح خوشی کا اثر چہرے پر رونق لے آتا ہے اور حزن و غم کی تاثیر یہ ہے کہ انسان کا چہرہ مرجھا جاتا ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت اور گرفت کے احساس سے کبھی کبھی جہاں آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں وہا بجسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے خوف کا یہ احساس گناہوں کو مٹانے کی بڑی تاثیر رکھتا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان فرشتوں کو جو دوزخ پر مقرر ہوں گے حکم دے گا کہ جس شخص نے کبھی مجھے یاد کیا یا کسی موقع پر مجھ سے ڈرا اُس کو دوزخ سے نکال لو''۔ (جامع ترمذی) اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے جو لوگ جہنم میں ڈالے جائیں گے ' ان میں سے وہ لوگ جنہوں نے زندگی میں کبھی اللہ کا ذکر کیا یا خوفِ خدا سے متاثر ہوئے وہ بھی جہنم سے نکال لیے جائیں گے۔ یوں خوفِ خدا کی کیفیت جہنم سے نکلنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے سات مرتبہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا' آپؐ

فرماتے تھے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص کفل نامی تھا' وہ کسی گناہ سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک عورت اس کے پاس آئی' اُس نے ساٹھ دینار اس عورت کو اُس شرط پر دیے کہ وہ اُس کی خواہش پوری کرے ۔جب اُس شخص نے اس عورت پر پورا قابو پا لیا



تو وہ کانپنے لگی اور رو پڑی۔ کفل نے پوچھا: کیوں روتی ہے؟ کیا میں نے تجھے مجبور کیا ہے؟ وہ بولی نہیں' لیکن یہ کام میں نے عمر بھر کبھی نہیں کیا تھا 'مگر اب صرف اپنی احتیاج کی مجبوری سے کرنا پڑرہا ہے۔ کفل نے کہا: اچھا تو نے یہ کام کبھی نہیں کیا اور اب مجبوراً کررہی ہے؟ (یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا) جا ! یہ دینار میں نے تجھے یونہی بخشے ۔ اور قسم کھائی کہ آج کے بعد کبھی خدا تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ (اتفاقاً) اُسی شب اس کا انتقال ہو گیا۔ صبح کو اس کے دروازے پر یہ نوشتہ ملا کہ ''اللہ تعالیٰ نے کفل کو بخش دیا'' ۔(ترمذی) کفل گناہوں میں لتھڑا پڑا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اُس پر خوفِ خدا طاری ہو گیا 'اُس نے اپنی شدید خواہش کو یک دم ترک کردیا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے تائب ہو گیاتو اللہ تعالیٰ نے اُس کو بخش دیا۔ چونکہ وہ بد عمل مشہور تھا لہٰذا اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کا ذکر نفرت کے ساتھ کرتے کہ وہ بہت برا تھا' مگر اُس کے خوفِ خدا اور سچی توبہ کا یہ اثر ہوا کہ خالق کائنات نے اُسے دنیا کی رسوائی سے بھی بچا دیا کہ اس کی بخشش کا اعلان اس کے دروازے پر تحریر کر دیا ۔ لوگ مان گئے کہ کفل نے مرنے سے پہلے ضرور کوئی ایسا کام کر لیا ہے جو اس کی بخشش کا ذریعہ بن گیا ہے۔ اور وہ کام کیا تھا؟ خوفِ خدا سے گناہ کو چھوڑنا اور سچی توبہ کرنا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث قدسی روایت کرتے ہیں کہ ''ایک بندے نے گناہ کیا اور پھر کہنے لگا : پروردگار ! مجھ سے گناہ ہو گیا ہے' مجھے بخش دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے نے گناہ کیا اور اتنا سمجھا کہ اس کا کوئی پروردگار بھی ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر مؤاخذہ کرتا ہے اور فرمایا: میں نے اپنے بندے کو بخش دیا۔ اس کے کچھ مدت بعد اس نے پھر گناہ کیا اور کہا: اے میرے رب میرا گناہ بخش دے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میرے بندے نے گناہ کیا اور اتنا سمجھا کہ اس کا کوئی پروردگار ہے جو گناہ بخشتا اور اس پر مؤاخذہ کرتا ہے اور فرمایا: میں نے اپنے بندے کو بخش دیا۔ پھر کچھ مدت بعد وہ گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے رب میرا گناہ بخش دے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے :میرے بندے نے گناہ کیا اوریہ سمجھا کہ کوئی اس کا پروردگار ہے جو گناہ بخشتا بھی ہے اور اس پر گرفت بھی کرتا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا :میں نے اپنے بندے کو بخش دیا' بس اب وہ جو چاہے کرے۔'' (صحیح بخاری و مسلم)

انسان اپنی فطری کمزوری کی بنا پر گناہ کر بیٹھتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو وہ بندہ پسند ہے جس سے گناہ ہو جائے تو وہ خدا سے خوف کھاتے ہوئے اس گناہ کی بخشش کے لیے اللہ کے سامنے گڑگڑائے ۔ چنانچہ اس کا گناہ معاف کر دیا جاتا ہے ۔ حدیث میں مذکور شخص سے بتقاضائے بشریت گناہ سرزد ہو جاتا ہے مگر وہ اسی وقت اُس بخشن ہار کے سامنے استغفار کرتا ہے۔ گناہ ہونے کے بعد جب اس بندے کے خوفِ خدا اور انابت کا یہ حال ہے کہ وہ فوری بخشش کے لیے ہاتھ پھیلادیتا ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وہ شخص ہے کہ جب بھی اس سے گناہ سرزد ہو گا یہ توبہ کے لیے جلدی کرے گا۔چنانچہ اس حال میں اللہ فرماتا ہے کہ اے میرے بندے تو اب جو چاہے کر میں نے تجھے بخش دیا۔ یعنی تو خوفِ خدا کے احساس سے ہر گناہ کے بعد سچے دل سے بخشش چاہے گا تو تجھے بخشش مل جایا کرے گی۔ اللہ تعالیٰ ان گناہگاروں کے گناہ بخشنے سے نہیں تھکتا جو اُس کے خوف سے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں۔

فرشتے وہ مخلوق ہیں کہ ان سے گناہ کا صدور ہو ہی نہیں سکتا ‘مگر انسان میں یہ فطری کمزوری رکھ دی گئی ہے کہ اس سے گناہ ضرور ہوجاتا ہے اگرچہ وہ کتنا ہی بچنے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی اس فطری کمزوری کا خالق ہے۔ اس کو پسند ہے کہ انسان سے خطا یا گناہ ہو جائے تو خوفِ خدا کے جذبے سے سرشار ہو کر اللہ تعالیٰ سے بخشش کا سوال کرے۔ ایسا ہو گا تو وہ اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا مہربان پائے گا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((كُلُّ بَنِيْ آدَمَ خَطَّائُ وَنَ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ)) ’’تمام انسا ن خطاکار ہیں اور اچھے خطاکار وہ ہیں جو خطا کے بعد اللہ سے رجوع کرتے ہیں ‘‘۔ (ترمذی‘ ابن ماجہ)یعنی اللہ سے ڈرتے ہیں اور اپنے گناہ کی معافی طلب کرتے ہیں۔ بلکہ اگر انسان نہ خطا کریں اور نہ ہی مغفرت طلب کریتو ایسے لوگ اللہ کو ناپسند ہیں۔ وہ تو چاہتا ہے کہ انسان فطری کمزوری کے تحت گناہ کر بیٹھیں تو پھر خوفِ خدا سے معافی کے خواستگار ہوں اور وہ انہیں معاف کر دے ۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے‘ وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے ‘اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تم کو فنا کر دیتا اور (تمہاری جگہ) ایسے لوگوں کو لاتا جن سے گناہ



سرزد ہوتے ‘پھر وہ اللہ سے مغفرت طلب کرتے تو اللہ انہیں معاف کرتا۔‘‘ (مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا :تین آدمی کہیں چلے جا رہے تھے کہ ان کو بارش نے آلیا۔ وہ پہاڑ کے ایک غار میں گھس گئے۔ پہاڑ سے غار کے منہ پر ایک پتھر کی چٹان آپڑی جس نے غار کا منہ بند کر دیا۔تینوں میں سے ایک نے دوسروں کو کہا اپنے ان نیک اعمال پر نظر ڈالو جو خاص طور پر اللہ کی رضا کے لیے کیے ہوں اور اس عمل کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو ۔ اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پتھر یا اس مصیبت کو دور کر دے گا۔ دو شخصوںنے اپنے ایک ایک نیک عمل کے وسیلے سے دعا مانگی اور پتھر

غار کے منہ سے کچھ ہٹ گیا۔ تیسرا آدمی اس طرح گویا ہوا: اے اللہ! میرے چچا کی ایک بیٹی تھی' میں اس سے انتہائی محبت کرتا تھا' ایسی محبت جیسی کسی مرد کو کسی عورت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ میں نے اُس سے وصال کی خواہش ظاہر کی تو اُس نے سو اشرفیوں کا تقاضا کیا۔ میں نے سو اشرفیاں جمع کر لیں اور ان کو لے کر اس عورت کے پاس پہنچا۔ پھر جب میں نے اس عورت پر قابو پا لیا تو عورت نے کہا خدا کے بندے خدا سے ڈر اور مہر کو نہ توڑ۔ چنانچہ پروردگار! میں تیرے خوف سے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس شخص نے اپنے اس عمل کے وسیلے سے اللہ سے دعا کی جو فوراً قبول ہوئی اور پتھر کی چٹان غار کے منہ سے ہٹ گئی۔ یہ واقعہ متفق علیہ ہے۔ گویا خدا کے خوف کے تحت گناہ کے کام پر اختیار رکھنے کے باوجود اس گناہ سے رک جانا ان کی مصیبت دور کرنے کا باعث بن گیا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک شخص تھا جس نے کبھی کوئی نیک عمل نہ کیا تھا۔ اس نے اپنے گھر والوں کو یہ وصیت کی کہ دیکھو جب میں مر جائوں تو میری لاش کو جلا دینا' پھر اس کی آدھی خاک جنگل میں اڑا دینا اور نصف دریا میں بہا دینا۔ خدا کی قسم! اگر کہیں حق تعالیٰ نے اس کو جمع کر لیا تو ایسا عذاب دے گا کہ تمام جہان میں ایسا عذاب کسی کو نہ دے گا۔ اس شخص کا انتقال ہو گیا تو گھر والوں نے اس کی وصیت پوری کر دی۔ حق تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا (کہ اس کے اجزاء پریشان کو جمع کرے) اس نے سب جمع کر دیے اور (اسی طرح) پانی کو حکم دیا تو اس نے بھی اس کے جو اجزاء اس میں تھے جمع کر دیے۔ اس کے



بعد اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا (بول) تو نے یہ حرکت کیوں کی تھی؟ اس نے عرض کیا: اے پروردگار! صرف تیرے خوف اور ڈر سے اور تو خوب جانتا ہے۔ اس پر حق تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی۔ (متفق علیہ) اس گنہگار نے شدتِ خوف اور مایوسی کے عالم میں عذابِ الٰہی سے نجات کا ایک غلط راستہ تجویز کیا۔ رحیم و کریم آقا نے اس کی غلطی کا نوٹس نہیں لیا بلکہ اس نے خوفِ خدا کی قدردانی کی اور اسے بخش دیا۔

اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر کر کسی بھی گناہ سے باز رہنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ کسی شخص کو رشوت کی پیشکش ہو' اسے رقم کی ضرورت بھی ہو' اُس کا نفس اسے رشوت قبول کرنے کا حکم دے رہا ہو' مگر اس وقت وہ خدا کے خوف سے ڈر کر انکار کر دے تو یہ وہ نیکی ہے جو اللہ کی رحمت کا سبب بنتی ہے۔ اسی طرح جھوٹ بول کر یا غلط بیانی کر کے خاصا نفع مل رہا ہو مگر خدا کا خوف آڑے آئے اور بندہ لالچ سے اجتناب کرنے میں کامیاب رہے تو خدا کا یہ خوف اس کے لیے رب کی خوشنودی کا سبب بن جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ رسول اللہ ﷺ بھی انسان تھے' لیکن عام انسان نہ تھے' اللہ کے بندے اور

اُس کے رسول تھے۔ ''بعد از خدا بزرگ توئی ''کی شان والے تھے۔ تاہم آپ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ خدا کا خوف رکھتے تھے۔ اس لیے کہ خدا کا خوف ہی حکمت کی چوٹی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کسی کا عمل اس کو جنت میں نہیں لے جا سکے گا اور نہ دوزخ سے بچا سکے گا ...اور میرا بھی یہی حال ہے' مگر اللہ کی رحمت اور اُس کا فضل دامن گیر ہو جائے۔'' (صحیح مسلم)

یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ کثرت سے استغفار کرتے تھے 'کیونکہ خوفِ خدا کے تحت استغفار اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول تو آپ ﷺ کا مشن تھا۔

* * *



# تزکیۂ نفس

تزکیہ کے معنی ہیں کسی چیز کو صاف ستھرے طریقے سے پروان چڑھانا۔ پس تزکیہ نفس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان اپنی زندگی میں خوبیوں کو اپناتا جائے اور برائیوں سے دور رہے۔ اس طرح نشوونما پانے والا نفس ترقی کی منازل بھی طے کرتا جائے گا اور وہ خیر سے قریب اور شر سے دور رہے گا۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں 'کیونکہ شر میں لذت پوشیدہ ہے اور انسان بھاگ بھاگ کر برائی کی طرف جاتا ہے 'چنانچہ شیطان ہمہ وقت برائی کی ترغیب دینے میں لگا رہتا ہے۔

تزکیہ نفس کے لیے ہمیں اپنا جائزہ لینا ہے کہ ہم میں کیا کیا برائیاں ہیں اور ان کو کس طرح دور کرنا ہے۔ اس طرح یہ بھی دیکھنا ہے کہ کون کون سی اچھائیاں ہیں جن کو ہم اختیار نہیں کر سکے۔ اس طرح اپنی

برائیوسے شعوری طور پر آگاہ ہو کر ان کو دور کرنے کی کوشش کرنا اور نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف لپکنا تزکیہ نفس کی منزل کو آسان بنا دیتا ہے۔ جس چیز کو انسان اچھا جانتا ہے اسے کرنے میں وہ جلدی آمادہ ہو جاتا ہے ‘لہٰذا ضروری ہے کہ اسے نیکی اور بھلائی کی خوبی کا شعور حاصل ہو اور برائی کی ہلاکت کا یقین ہو۔ اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ انسان کو اپنے خالق و مالک کی شفقت کا یقین ہو جائے اور وہ جان جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے روکا ہے یقینا وہ نقصان دہ اور مضر ہیں۔ ان سے اجتناب کرنے میں ہی فائدہ ہے۔ اسی طرح جن باتوں کے کرنے کا اس نے حکم دیا ہے ان کے کرنے میں کسی طرح کا نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اگر یہ یقین پختہ ہوجائے تو منزل آسان ہو جائے گی۔ اگر اللہ نے شراب سے روکا ہے تو ضرور یہ نقصان دہ ہے اور اس سے بچنا ہی خیریت کا باعث ہے ۔یوں سمجھئے کہ جو شخص برائی کے اجتناب کے راستے پر چل پڑا اور اسے ہمہ وقت نیکی اپنانے کا احساس لگا رہا تو وہ تزکیے کی منزل کی طرف رواں دواں ہو گیا۔

چونکہ تزکیہ ٔنفس کا تعلق عمل سے ہے اس لیے انسان کو اس حقیقت کا پختہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ ہمہ وقت زیر نگرانی (under observation) ہے ‘یعنی سمیع و بصیر ہستی اُس



کے ہر عمل سے واقف ہے۔ اگر اس نے کوئی کام اچھا یا برا لوگوں سے اوجھل ہو کر بھی کیا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور اس کے نامہ ٔاعمال میں اس کا اندراج ہو گیا ہے ۔یہ وہی نامہ ٔاعمال ہے جو فیصلے کے دن اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔ نامہ ٔاعمال نیکیوں کے اعتبار سے بھاری کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس میں بھلائیوں کا اندراج ہو لیکن وہ برائیوں سے خالی رہے۔ اگر انسان سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو معافی چاہے اور کوئی بھلائی کرے ‘اس طرح اس کی برائی محو کر دی جائے گی۔ عمر اللہ تعالیٰ کا انمول عطیہ ہے ۔یہ عمل کرنے کی مہلت اور حقیقی زندگی کی تیاری کا وقفہ ہے ۔اگر انسان اس کی اہمیت سے واقف ہو جائے تو اس کے لیے تزکیہ ٔنفس کی راہ آسان ہوجاتی ہے۔جب یہ زندگی ختم ہو جائے گی تو پھر اپنی برائیوں پر پچھتانا کام نہ آئے گا اور نہ ہی کسی کو نیکی کرنے کی مہلت ملے گی۔ اگر اس حقیقت کا گہرا ادراک ہو جائے تو برائی سے نفرت پیدا ہو جائے گی اور یہی بات نیکی کی طرف رغبت کا باعث ہو جائے گی۔ سنن ترمذی میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سا آدمی سب سے بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ’’جس کی عمر لمبی ہو اور عمل اچھا ہو‘‘۔ اس نے پھر پوچھا: کون سا آدمی سب سے برا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ’’جس کی عمر لمبی ہو اور عمل برا ہو‘‘۔ اس حدیث میں زندگی کی اہمیت نہایت سادہ طریقے سے واضح کر دی گئی کہ جس شخص نے تزکیہ ٔنفس کے ساتھ زندگی گزاری وہ کامیاب رہا۔ وہ انتہائی سعادت مند اور کامران

ہے ۔اس کی زندگی جتنی لمبی ہو گی اس کے لیے مفید تر ہو گی۔ اس کے برخلاف جس کی زندگی میں تزکیۂ نفس نہ ہو ا اور اس نے خواہشاتِ انسانی کے تحت مہلت عمر گزاری' اپنے اعمال کو وسیلہ نجات نہ بنایا تو اس کی عمر جس قدر طویل ہو گی اس کا خسارہ اسی قدر بڑھتا جائے گا۔

تزکیہ نفس کی منزل حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے اندر برائی اور بھلائی کی جو تمیز فطری طو رپر رکھی گئی ہے وہ اس سے آگاہ رہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے : {فَاَلۡہَمَہَا فُجُوۡرَہَا وَ تَقۡوٰىہَا ﴿۸﴾} (الشمس)۔ اس طرح وہ برائی کو برائی اور نیکی کو نیکی جانے گا۔ جب بھی اسے کوئی اچھا کام کرنے کا موقع ملے گا تو اسے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت سمجھے گا اور اس پر عمل کر کے اللہ کی رضا حاصل کرے گا اور اگر اس کے ذہن میں کوئی برا خیال پیدا ہو تو سمجھ لے گا کہ یہ شیطان کی طرف سے وسوسہ ہے 'جلدی سے اس موقع پر اعوذ باللہ کہہ کر اللہ کی پناہ میں آجائے گا اور برے خیال کو چھوڑ دے گا اور اس پر اللہ کا شکر بھی ادا



کرے گا کہ اس نے برائی سے بچنے کی توفیق مرحمت فرمائی۔

تزکیہ نفس کے لیے لمبی چوڑی ریاضتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسلام کے تمام احکام متوازن ہیں۔ برائیوں سے بچنے کی شعوری کوشش کرتے رہنا اور بھلائی کے کاموں کی طرف رغبت رکھنا تزکیہ نفس کا باعث ہے۔ اپنی جان کو خواہ مخواہ مشقت میں ڈالنے کی ضرورت نہیں 'جیسے چلے کاٹنا' آبادی سے دور ویرانے میں چلے جانا' خواہ مخواہ بھوک اور پیاس برداشت کرنا' عجیب و غریب غیر مسنون اوراد و وظائف کرنا' گھریلو زندگی سے فرار اختیار کرنا' نمازیں چھوڑ دینا یا تنہا نماز پڑھ لینا اور جماعت کو چھوڑنا اور ان مشقوں کو تزکیہ نفس سمجھنا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تمہارے اوپر تمہارے نفس کا بھی حق ہے 'یعنی حصول تزکیہ کے لیے بھاری بھرکم مشقتیں اختیار کر کے جسم کو تکلیف میں نہ ڈالو۔ رسول اللہ ﷺ خود تزکیہ نفس کے اعلیٰ ترین معیار پر تھے مگر لذائذ دنیا کو آپؐ نے ترک نہیں کیا۔ ہاں سہولتوں کے حصول میں آپ کمنہمک نہیں ہوئے 'جو نعمت آپؐ کو میسر ہوئی آپؐ نے اس سے فائدہ اٹھایا ۔ تجرد کی زندگی اور ترکِ دنیا کی آپؐ نے تعلیم نہیں دی۔ آپؐ کی تعلیم یہ ہے کہ زندگی بھرپور طریقے سے پوری ذمہ داریوں کے ساتھ گزارو مگر دیکھنا خواہشاتِ نفس اور شیطانی وسوسوں سے بچتے رہنا ہی تزکیہ نفس ہے۔

بخاری شریف کی ایک حدیث ہے جس کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس کا مفہوم اس طرح ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے تین آدمی رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہم کے ہاں گئے تاکہ حضور ﷺ کی عبادت کے متعلق استفسار کریں۔ جب ان کو بتایا گیا تو انہوں نے اسے قلیل سمجھا اور کہنے لگے کہ کہاں اللہ کے رسول ﷺ اور کہاں ہم! ان کی تو اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی گئیں (ان کو تو زیادہ عمل کی ضرورت نہیں) ۔ایک نے کہا: میں اب ہمیشہ رات نماز میں گزاروں گا' کمر بستر سے نہ لگاؤں گا۔دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ دن کو روزہ رکھوں گا' ناغہ نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا: میں ہمیشہ عورتوں سے الگ رہوں گا اور کبھی شادی نہیں کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ معلوم ہوا تو آپؐ ان کے پاس گئے اور ان سے فرمایا: اللہ کی قسم' میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور اس کی ناراضگی کی باتوں سے بچنے والا ہوں' لیکن میں روزے بھی رکھتا ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں' میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں(یعنی ساری رات نماز نہیں پڑھتا) اور میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں اور ان کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارتا ہوں (یہ میرا طریقہ ہے) اب جو کوئی میرے اس طریقہ سے



ہٹ کر چلے وہ میرا نہیں ! (فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ !)

تزکیہ نفس کے ضمن میں یہ حدیث حرفِ آخر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو قرآن مجید میں بہترین نمونہ کہا گیا ہے۔ آپؐ کے طرزِ زندگی سے ہٹ کر کوئی انداز خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے اختیار کیا جائے وہ مقبول نہیں۔قرآن مجید کا پڑھنا بہت بڑی نیکی ہے' لیکن یہاں بھی آپؐ کی تعلیم یہ ہے کہ جب تک تلاوت میں دل لگا رہے ٹھیک ہے 'مگر جب ذرا تھکاوٹ محسوس ہو تو تلاوت مؤخر کر کے آرام کرو 'طبیعت پر جبر کر کے یعنی باکراہ قرآن نہ پڑھو۔ سب سے بڑے مزکی اور سب سے بڑے متقی تو اللہ کے رسول ﷺ تھے ۔ اب تزکیہ اور تقویٰ تو آپؐ کے طریقے کی پیروی ہی سے پیدا ہو سکتا ہے ۔ صحابہ کرامؓ کی زندگیاں بھی آپؐ کی پیروی میں تھیں۔ کسی نے اس راہ میں مشقت کا طریقہ نہیں اپنایا اور تجرد کی زندگی کو اختیار نہیں کیا۔ پس اگر کوئی شخص بغیر کسی فطری مجبوری یا معذوری کے گھریلو زندگی بسر کرنے سے ابا کرتا ہے تو اس کا طرزِ عمل خلافِ پیمبر ہونے کی بنا پر مسترد ہے 'خواہ وہ عمل کیسا ہی خوش نما ہو۔ آپ ﷺ سے بڑا کوئی مزکی نہ ہوا نہ ہو سکتا ہے۔ اب ہر کسی کے لیے آپؐ کا انداز ہی لائق تقلید ہے ؎

ترسم کہ بکعبہ نرسی اے اعرابی  کیں راہ کہ تو می روی بترکستان است

''اے اعرابی! مجھے ڈر ہے کہ تو کعبہ شریف نہ پہنچ پائے گا ،کیونکہ جس راستے پر تو چل رہا ہے یہ تو ترکستان کو جاتا ہے۔''

تمام کے تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیاں آپ ﷺ کے نقش قدم پر تھیں۔ نماز بہترین عبادت ہے۔ جس طرح نفلی روزے سارا سال رکھنے سے روکا گیا ہے اسی طرح ساری رات نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے ،بلکہ بعض اوقات ایسے ہیں جن میں نماز پڑھنا حکماً منع ہے، مثلاً عصر کے بعد مغرب تک، پڑھے گا تو گنہگار ہو گا۔

الغرض جس طرح ساری خیر رسول اللہ ﷺ کے طریقے میں ہے اسی طرح آپؐ کے طریقے کو چھوڑ کر کوئی بھی طریقہ ایسا نہیں جس کو اختیار کر کے قبولیت کی اُمید رکھی جائے ؎

خلافِ پیمبرؐ کسے راہ گزید  کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

''جس نے پیغمبر ﷺ کے راستے کے خلاف راستہ اختیار کیا وہ کبھی بھی منزل تک نہیں پہنچ پائے گا۔''

* * *



# حسن اخلاق

اَخلاق خلق کی جمع ہے ،جس کا معنی ہے عادت، رویہ، behaviour، خصلت ،مزاج ۔ عادات ، رویے اور خصائل اگر اچھے ہوں تو انہیں حسن اخلاق کہا جاتا ہے اور اگر برے ہوں تو وہ رذائل اخلاق یعنی اخلاقی برائیاں ہیں۔ حسن اخلاق انسان کا زیور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں دی ہیں اور اس کو اختیار دیا ہے کہ وہ اپنی ان صلاحیتوں کو اچھائیوں میں خرچ کرے یا برائیوں میں۔ اسلام وہ دین ہے جو انسان کو اچھا انسان بننے کی تلقین کرتا ہے اور یہ حسن اخلاق سے ہی ممکن ہے۔ اچھے اخلاق والا آدمی اپنے اخلاق کی بدولت

دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے ‘اور اگر کوئی اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے تو بھی وہ بدلے میں اس کے ساتھ برائی نہیں کرتا ‘بلکہ حسن اخلاق سے پیش آتا ہے اور نتیجے کے طور پر اپنے رویے سے دشمن کو دوست بنا لیتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :{وَ لَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَ لَا السَّیِّئَۃُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَ بَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ﴿۳۴﴾ } (حٰمٓ السجدۃ) ’’اچھائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ تو (سخت کلامی کا) ایسے طریقے سے جواب دو جو بہت اچھا ہو (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس شخص میں اور تم میں دشمنی تھی وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے۔‘‘ جب رسول اللہ ﷺ نے حسن اخلاق کی تعلیم دی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا: حضور اگر دوسرا شخص بدسلوکی کرے تو پھر؟ آپؐ نے فرمایا :’’جو بھلائی کرے اس کے ساتھ بھلائی کرنا کوئی بڑا کام نہیں۔ تمہیں اس کے ساتھ بھلائی کرنے کی تعلیم ہے جو تمہارے ساتھ برائی کرے۔‘‘

اسلام میں حسن اخلاق کی تعلیم اس درجہ ہے کہ عقیدے کے اعتبار سے تو یہ دین توحید ہے مگر رویے(behaviour) کے اعتبار سے یہ دین دین اخلاق ہے۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا :’’ (قیامت کے دن اعمال تولنے والی) ترازو میں جو چیزیں رکھی جائیں گی ان میں حسن اخلاق سے زیادہ بھاری چیز کوئی نہیں



ہوگی اور اچھے اخلاق والا اپنے حسن اخلاق کے باعث روزہ دار اور نمازی کے درجے کو پالیتا ہے‘‘۔ (ترمذی) فرض نماز اور روزہ تو مسلمان کی نشانی ہے۔ اس کے بغیر تو بندہ صرف نام کا مسلمان رہ جاتا ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان نفلی نماز روزوں کا زیادہ اہتمام نہ کرتا ہو مگر اس کا اخلاق اچھا ہو تو اس کو وہی اجر ملے گا جو نفلی عبادات کرنے والے کو ملے گا۔

امام مالک بیان کرتے ہیں کہ انہیں یہ روایت پہنچی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ اخلاقی خوبیوں کو پورا کردوں‘‘۔ (موطا) انبیاء و رسل علیہم السلام کو دنیا میں اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کے عقائد اور اعمال کی اصلاح کریں۔ اسی کا نام تزکیہ نفس ہے جو انبیاء کے فرائض منصبی میں سے ہے۔ وہ انسانوں کی تربیت اس طرح کرتے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ بنا دیتے۔

حسن اخلاق کی تاثیر یہ ہے کہ اس سے دوسرے انسانوں کا بھلا ہوتا ہے خواہ اس میں اپنا نقصان ہو جائے۔ اچھے اخلاق والے انسان میں خود غرضی نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی ‘یہاں تک کہ وہ جھگڑے سے بچنے کے لیے اپنا حق چھوڑنے کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے۔وہ اپنا حق چھوڑے گا تو کسی دوسرے کا تو نفع ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :’’جس نے جھوٹ چھوڑ دیا اس لیے کہ وہ باطل ہے اس کے لیے بہشت کے گرد و نواح میں گھر بنایا جائے گا ‘اور جس نے حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دیا اس کے لیے جنت کے وسط میں گھر بنایا جائے

گا' اور جس نے اپنے اخلاق کو اچھا بنالیا اس کے لیے بہشت کے اوپر والے حصہ میں گھر بنایا جائے گا۔'' (ترمذی)
حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑ دینا اور اپنے حق سے دست بردار ہوجانا بڑی عزیمت کا کام ہے۔ ایسے شخص کے لیے جنت کے وسط میں سکونت کی خوشخبری دی گئی ہے۔ جبکہا چھے اخلاق والے کے لیے جنت کے بالاخانے میں اعلیٰ رہائش ہوگی 'کیونکہ اچھے اخلاق والے میں تمام اخلاقی خوبیاں ہوں گی۔

عقل انمول عطیہ خداوندی ہے۔ اگر اس سے کام لیا جائے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ حرام اور حلال میں تمیز کی جائے' جائز اور ناجائز' درست اور غلط کو پہچانا جائے۔ اپنی دنیوی حیثیت سے دھوکہ نہ کھایا جائے 'نہ اپنے اعلیٰ حسب نسب پر فخر کیا جائے اور نہ اپنی دولت مندی پر ہی اترایا جائے۔ہاں آدمی کا اخلاق اچھا ہو تو اس جیسی کوئی دوسری خوبی نہیں۔ دوسری تمام خوبیاں



حسن اخلاق کے ساتھ ہی خوبیاں ہیں' اگر حسن اخلاق نہیں تو کوئی خوبی خوبی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تدبیر کے بغیر کوئی عقل مندی نہیں اور حرام سے بچے رہنے کے برابر کوئی پرہیزگاری نہیں 'اور کوئی حسب اس کے برابر نہیں کہ انسان کا اخلاق اچھا ہو۔'' (ابن ماجہ)

مخلوقِ خدا کا ہر فرد اچھے سلوک کا مستحق ہے' وہ انسان ہو یا جانور' واقف کار' دوست یا رشتہ دار' اجنبی ہو یا مسافر۔ اگر اس کے ساتھ سابقہ پڑ جائے تو اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے جو قابل تعریف ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ رقم خرچ کر کے ہی حسن سلوک ہوتا ہے۔ محض زبان سے یا عمومی رویے سے بھی حسن سلوک کا اظہار ہوتا ہے۔ ساتھی مسافر کے ساتھ تھوڑی دیر کا ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایسا رویہ اختیار کیا جائے کہ وہ اچھا تاثر لے اور ملاقات یاد رکھے۔ گویا انسان کا وجود دوسروں کے لیے خوش کن اور خوشگوار ہو۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں: ''حسن اخلاق کشادہ روئی' خوب بھلائی کرنے اور تکلیف دینے سے بچنے کا نام ہے۔'' (امام ترمذی) رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں 'اور مؤمن وہ ہے جس کی طرف سے لوگوں کو اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں کوئی خوف و خطر نہ ہو۔'' (ترمذی' نسائی) بس یہی حسن اخلاق ہے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور وہ ہر وقت دوسرے مسلمان سے اچھے سلوک کا حق دار ہے۔ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے خندہ پیشانی سے ملنا بھی نیکی ہے۔ کوئی شخص نہیں چاہتا کہ کوئی اس کے ساتھ برا سلوک کرے 'چنانچہ اسے بھی دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ مسلمان وہ ہے جو دوسروں کے لیے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک دعا کے الفاظ اس طرح ہیں جو آپؐ نماز میں مانگتے تھے: ''اے میرے اللہ! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی راہنمائی کر' تیرے سوا کوئی بہتر اخلاق کی راہنمائی نہیں کر سکتا' اور برے اخلاق کو میری طرف سے ہٹا دے 'ان کو تیرے سوا کوئی ہٹا بھی نہیں

سکتا۔'' (صحیح مسلم)

ایک موقع پر آپؐ سے پوچھا گیا: یارسول اللہ ﷺ جو کچھ انسان کو دیا گیا ہے اس میں بہترین چیز کون سی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''حسن اخلاق''۔ (ابن ماجہ) حسن اخلاق کامل ایمان کی نشانی ہے' کوئی اہل ایمان بدخو' فحش گو اور بداخلاق نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی ہے تو اسے اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کر لینی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے مجھے وہ شخص سب



سے زیادہ عزیز ہے جس کا اخلاق تم میں سے سب سے زیادہ اچھا ہو۔'' (بخاری)

حسن اخلاق انسان کا زیور ہے۔ انسان کی قدر و قیمت' مقام و مرتبہ اس کے رویے میں ہے۔ عزیز جہاں بننے کے لیے اخلاقی خوبیوں کو اپنا ناگزیر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ حضرت برائ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ سب لوگوں سے زیادہ حسین چہرے والے تھے اور سب سے زیادہ اچھے اخلاق والے تھے' نہ آپؐ زیادہ لمبے تھے اور نہ پست قد۔'' (بخاری) آپ ﷺ کا اخلاق رحمت کا نمونہ تھا۔ آپؐ نے کسی کو ادنیٰ تکلیف تک نہ پہنچائی' حالانکہ آپؐ کو سب لوگوں سے زیادہ ستایا گیا۔ آپ ﷺ نے کسی کو سختی کے ساتھ ایمان لانے پر مجبور نہیں کیا۔ یہ آپ کا اخلاق تھا جس سے متاثر ہوکر لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ آپ ﷺ ہر چھوٹے بڑے کی بات پوری توجہ سے سنتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی شخص نے کوئی راز کی بات کہنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے کان کے ساتھ منہ لگایا ہو اور حضور ﷺ نے اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا ہو جب تک کہ وہ شخص (اپنی بات پوری کر کے خود ہی حضور ﷺ کی طرف سے) اپنا سر نہ پھیر لے' اور میں نے نہیں دیکھا کہ کسی شخص نے حضور ﷺ کا دست مبارک پکڑا ہو اور حضور ﷺ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا ہو جب تک کہ وہ شخص خود ہی حضور ﷺ کا ہاتھ نہ چھوڑ دے۔ (ابوداؤد)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (یمن کی طرف رخصت ہوتے ہوئے) جب میں نے رکاب میں پائوں رکھا تو آخری وصیت جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے کی وہ یہ تھی کہ ''اے معاذ بن جبل! لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنا۔'' (موطا امام مالک) ۔یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری دنوں میں حضرت معاذؓ کو یمن کا گورنر بنا کے روانہ کیا تھا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے انہیں بہت سی نصیحتیں کیں جن میں آخری وصیت حسن اخلاق اپنانا تھا۔ ہمدردی' خیر خواہی' ایثار' قربانی' تحمل اور بردباری حسن اخلاق کے مظہر ہیں۔ اگر درجہ بندی مطلوب ہو تو ہمارے حسن اخلاق کے سب سے زیادہ مستحق ہمارے والدین' بیوی بچے اور رشتہ دار ہیں' جن کے ساتھ ہمارا تعلق خود اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔ ان کے بعد

سائل اور ضرورت مند ہیں ‘پھر دوسرا ہر شخص بلکہ ہر ذی روح حسن اخلاق کا مستحق ہے۔

* * *



# وضو کے فضائل اور آداب

اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں صفائی ستھرائی اور پاکیزگی کو بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ یہ فطری طور پر ایک پسندیدہ صفت ہے جسے ''نصف الایمان'' اور ''شطر الایمان'' کہا گیا ہے۔ گویا یہ ایمان کا تکمیلی شعبہ ہے۔ ایک مومن بندے کو گندگی اور ناپاکی سے کراہت ہوتی ہے۔ فطرتِ سلیمہ صاف رہنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے وضو مقرر کیا گیا ہے۔ وضو سے طبیعت میں پاکیزگی کے علاوہ بشاشت اور انشراح پیدا ہو جاتی ہے۔ نماز اسلام کا اہم ترین رکن ہے جو بارگاہ الٰہی میں حضوری کا مظہر ہے۔ چنانچہ نماز کے لیے کھڑا ہونے سے قبل وضو ضروری ہے تاکہ مومن اللہ کے حضور اس حال میں پیش ہو کہ اس کا جسم صاف ستھرا ہو۔ وضو نماز کے لیے شرط ہے ‘یعنی وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کوئی نماز طہارت کے بغیر قبول نہیں ہوتی اور نہ کوئی صدقہ قبول ہو سکتا ہے جو ناجائز طریقہ سے حاصل کیے ہوئے مال سے کیا جائے۔'' (صحیح مسلم ‘عن عبداللہ بن عمرؓ)

نماز کی ادائیگی کے لیے کھڑے ہونے سے پہلے وضو کا حکم قرآن مجید میں ہے:

{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا قُمۡتُمۡ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغۡسِلُوۡا وُجُوۡہَکُمۡ وَ اَیۡدِیَکُمۡ اِلَی الۡمَرَافِقِ وَ امۡسَحُوۡا بِرُءُوۡسِکُمۡ وَ اَرۡجُلَکُمۡ اِلَی الۡکَعۡبَیۡنِ ؕ} (المائدۃ:٦)

''اے اہل ایمان ! جب تم کھڑے ہو نماز کے لیے تو دھو لیا کرو اپنے چہرے اور دونوں ہاتھ بھی کہنیوں تک اور اپنے سروں پر مسح کر لیا کرو اور (دھو لیا کرو) اپنے دونوپاؤں بھی ٹخنوں تک۔''

گویا وضو کرتے وقت منہ ہاتھ اور پاؤں دھونا اور سر کا مسح کرنا فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی طہور (یعنی وضو) ہے''۔ (مسند احمد عن جابرؓ) ویسے تو ہر کام اچھی طرح کرنا چاہیے‘ وضو بھی اچھی طرح کرنا چاہیے جو گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص وضو کرے اور خوب اچھی طرح وضو کرے تو اس کی

خطائیں اس کے جسم سے نکل جاتی ہیں‘حتیٰ کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتی ہیں‘‘۔ (متفق علیہ عن عثمانؓ)

اسی ضمن میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:’’جب کوئی بندہ وضو کرتا ہے اور اس میں اپنے چہرے کو دھوتا ہے اور اس پر پانی ڈالتا ہے تو پانی کے ساتھ اس کے چہرے سے وہ سارے گناہ نکل جاتے ہیں جو اس کی آنکھوں سے سرزد ہوئے تھے۔ اس کے بعد جب وہ اپنے ہاتھ دھوتا ہے تو وہ سارے گناہ اس کے ہاتھوں سے خارج ہو جاتے ہیں اور دھل جاتے ہیجو اس کے ہاتھوں سے ہوئے۔ اس کے بعد جب وہ اپنے پائوں دھوتا ہے تو وہ سارے گناہ اس کے پائوں سے خارج ہو جاتے ہیں جو اس کے پائوں سے ہوئے اور جن کے لیے اس کے پائوں استعمال ہوئے۔یہاں تک کہ وضو سے فارغ ہونے کے ساتھ وہ گناہوں سے پاک صاف ہو جاتا ہے‘‘۔(صحیح مسلم عن ابی ہریرہؓ) پانی کے ساتھ اعضاء دھونے سے ظاہری میل کچیل دور ہو جاتی ہے۔ چونکہ وضو کرنا اللہ تعالیٰ کا حکم اور رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہے‘ لہٰذا یہ صرف بدن کو صاف نہیں کرتا بلکہ اس کی برکت سے روحانی مفاد بھی ملتا ہے اور وضو کے اثر سے اعضاء بھلائی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور برائی سے اجتناب کرتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وضو وہی کرے گا جس کو نماز پڑھنا ہو گی‘ بے نمازی تو ان ساری بھلائیوں سے محروم رہے گا۔ بے نمازی کی یہ ایک محرومی ہے اس کے علاوہ وہ دوسرے کئی اعتبارات سے منحوس ٹھہرے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:’’جو کوئی تم میں سے وضو کرے اور مکمل وضو کرے‘پھر وضو کے بعد کہے ’’اَشْھَدُاَنْ لاَ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ‘‘ تو لازمی طور پر اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جائیں گے‘وہ جس دروازے سے چاہے گا جنت میں جا سکے گا‘‘۔(صحیح مسلم عن عمرؓبن الخطاب) اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل ہو چکا کہ جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی طہور یعنی وضو ہے۔حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ اس حدیث سے مکمل وضو کر کے بعد میں کلمۂ شہادت ادا کرنے والے کو بھی جنت میں داخلے کی بشارت ہے۔ایک شخص نے آپ ﷺ سے پوچھا:’’آپؐ روزِ محشر اپنی امت کو کیسے پہچانیں گے جبکہ نوح علیہ السلام سے لے کر آپؐ کی امت تک کئی امتیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا:’’ وضو کے نشانات کی وجہ سے۔ان کے ہاتھ ‘ پائوں اور پیشانی چمکتی ہو گی‘ان کے علاوہ



اور کوئی ایسا نہیں ہو گا۔ میں انہیں اس لیے بھی پہچان لوں گا کہ انہیں ان کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اور میں انہیں ایک اور علامت سے بھی پہچان لوں گا کہ ان کی اولاد ان کے آگے دوڑ رہی ہو گی۔‘‘(رواہ احمد عن ابی الدردائ)

وضو جہاں دنیاوی زندگی میں پاکی اور ستھرائی کا باعث ہے قیامت کے دن وہ نورانیت کا باعث ہو

گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے امتی قیامت کے دن بلائے جائیں گے تو وضو کے اثرات سے ان کے چہرے اور ہاتھ اور پاؤں روشن اور منور ہوں گے، پس تم میں سے جو کوئی اپنی روشنی اور نورانیت بڑھا سکے اور مکمل کر سکے تو ایسا ضرور کرے''۔ (متفق علیہ عن ابی ہریرہؓ) مکمل اور پورا وضو وہ ہے جس میں ہر عضو کو تین مرتبہ دھویا جائے۔ اس کے بعد وہ وضو ہے جس میں اعضائ، دو دو مرتبہ دھوئے جائیں، اور وہ تو محض وضو ہے جس میں ہر عضو ایک ہی مرتبہ دھویا جائے۔ پسندیدہ یہ ہے کہ وضو اطمینان اور سکون کے ساتھ کیا جائے اور ہر عضو کو تین بار دھویا جائے۔ جلدی میں ناقص وضو سے احتراز کرنا چاہیے۔ اصحابِ رسول ﷺ میں سے ایک صاحب سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے نماز فجر ادا کی تو سورۃ الروم کی تلاوت فرمائی جس کے دوران آپؐ بھول گئے۔ جب آپؐ نماز پڑھ چکے تو فرمایا: ''لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں لیکن وہ اچھی طرح وضو نہیں کرتے۔ یہی لوگ تو ہمیں قرآن بھلا دیتے ہیں''۔ (رواہ النسائی عن شبیب بن ابی روحؒ)

معلوم ہوا کہ ناقص وضو نتیجے کے اعتبار سے کیسا ہے۔ یہ وہ وضو ہے جسے سنجیدگی اور دھیان کے ساتھ نہ کیا گیا ہو، کیونکہ مکمل وضو کے بغیر تو نماز ہی نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو مسلمان وضو کرتا ہے اور اپنا وضو اچھی طرح کرتا ہے، پھر کھڑا ہو کر مکمل توجہ کے ساتھ دو رکعتیں پڑھتا ہے تو اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے''۔ (صحیح مسلم عن عقبہ بن عامرؓ) چونکہ وضو نماز کے لیے لازم ہے اس لیے نماز کو احسن بنانے کے لیے وضو بھی احسن ہونا چاہیے۔ نماز کے لیے حکم ہے کہ پورے دھیان سے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی جائے۔ اسی طرح بار بار اس بات کی بھی تاکید کی گئی ہے کہ وضو اچھے طریقے سے کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی مسلمان فرض نماز کا وقت ہونے پر اس کے لیے اچھی طرح وضو کرتا ہے اور اس کے خشوع اور رکوع کا اچھی طرح اہتمام کرتا ہے تو وہ (نماز) اس سے پہلے کیے ہوئے



گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے، بشرطیکہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ یہ ہمیشہ کے لیے ہے''۔ (صحیح مسلم عن عثمانؓ) وضو قیامت کے دن مؤمن کے لیے عزت افزائی کا باعث ہو گا۔ اس کے وضو کے اعضاء روشن ہوں گے اور اسے زیور پہنایا جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مومن کا زیور وہاں تک ہو گا جہاں تک اس کے وضو کا پانی پہنچتا ہے''۔ (صحیح مسلم عن ابی ہریرہؓ)

وضو میں پانی کے ساتھ اعضاء دھوئے جاتے ہیں۔ گرمیوں میں وضو کریں تو خنکی کا تصور ہوتا ہے مگر سردی کے موسم میں ٹھنڈا پانی ناگوار اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لیکن اس مشکل کو برداشت کرنا نتیجے کے اعتبار سے خوش گوار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تم کو وہ اعمال نہ بتائوں جن کی برکت سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹاتا ہے اور درجے بلند فرماتا ہے؟ حاضرین نے عرض کیا: حضور، ضرور بتائیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (۱)

تکلیف اور ناگواری کے باوجود پوری طرح کامل وضو کرنا۔ (۲) مسجدوں کی طرف زیادہ قدم چلنا۔ (۳) ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا منتظر رہنا۔ پس یہی ہے حقیقی رباط''۔ (صحیح مسلم عن ابی ہریرہؓ) ۔ رباط سے مراد ہے شیطان کی غارت گری سے حفاظت کی محکم تدبیر۔ وضو کی حالت میں انسان صاف ستھرا اور پاک ہوتا ہے۔ یہ اچھی حالت اکثر قائم رہنی چاہیے۔ بعض متقی اور خدا ترس لوگوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ اکثر باوضو رہتے تھے۔ اکثر اوقات باوضو رہنا بڑا فضیلت کا عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''جو شخص رات کو باوضو سوتا ہے تو ایک فرشتہ ساری رات اس سے جڑا رہتا ہے اور اس کے لیے ان کلمات سے استغفار کرتا ہے: اے اللہ اپنے فلاں بندے کی مغفرت کر دے کہ وہ رات کو باوضو سویا ہے''۔ (صحیح مسلم، بحوالہ بکھرے موتی ص ۵۶، از مولانا محمد یونس پالن پوری) اگر پہلے سے وضو قائم ہو اور نماز کا وقت آجائے تو اسی وضو کے ساتھ نماز پڑھی جا سکتی ہے، لیکن اگر پھر وضو کر لیا جائے تو پسندیدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے طہارت یعنی وضو کے باوجود تازہ وضو کیا اس کے لیے دس نیکیاں لکھی جائیں گی''۔ (ترمذی عن عبداللہ بن عمرؓ) رسول اللہ ﷺ کو طہارت اور نظافت بہت پسند تھی۔ آپؐ نے مسواک کے ساتھ منہ کو صاف رکھنے کی بڑی تاکید کی ہے، لہٰذا وضو کرتے وقت مسواک بھی کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ نماز جس کے لیے مسواک کی جائے اس نماز کے مقابلہ میں جو بلا مسواک پڑھی جائے ستر گنا فضیلت رکھتی ہے''۔ (بیہقی فی شعب الایمان)

---



مسواک بذاتہٖ نہایت مفید اور پسندیدہ عمل ہے جسے رسول اللہ ﷺ محبوب جانتے تھے۔ لیکن آپؐ نے وضو کے وقت مسواک کرنے کا حکم نہیں دیا، کیونکہ اس سے وضو کرنے والے پر مشقت پڑتی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ میری امت پر بہت مشقت پڑ جائے گی تو میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا پختہ حکم کرتا''۔ (صحیحین عن ابی ہریرہؓ) یہ امر آپ ﷺ کی نرمی کا مظہر ہے۔ یہ ویسا ہی ہے جیسا آپ ﷺ نے عام راتوں میں تہجد اور رمضان المبارک میں قیام اللیل کی بڑی فضیلت بتائی مگر اس کو ہر شخص کے لیے لازمی قرار نہیں دیا۔

مسواک کی فضیلت بتاتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسواک منہ کو بہت زیادہ پاک صاف کرنے والی اور اللہ تعالیٰ کو بہت خوش کرنے والی چیز ہے''۔ (صحیح بخاری عن عائشہؓ) یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو مسواک بہت پسند تھی۔ آپ کا معمول تھا کہ دن یا رات میں جب بھی آپؐ سوتے تو اٹھنے کے بعد وضو کرنے سے پہلے مسواک ضرور فرماتے۔ اسی طرح جب آپؐ رات کو تہجد کے لیے اٹھتے تو مسواک سے اپنے دہن مبارک کی خوب صفائی کرتے۔ روایات اس بات پر شاہد ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب باہر سے گھر تشریف لاتے تو سب سے پہلے آپؐ مسواک فرماتے تھے۔ غرض مسواک وضو کا حصہ نہ سہی مگر یہ منہ کی بو زائل کرتی ہے،

دانتوں کی حفاظت کرتی ہے اور آخرت میں بڑے اجر کا باعث ہو گی۔ ویسے تو ہر جائز اور نیک کام کی ابتدا بسم اللہ سے کرنی چاہیے ،مگر وضو کرتے وقت اس کی خصوصی تاکید ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے اللہ کا نام لیے بغیر وضو کیا ' اُس کا وضو ہی نہیں''۔ (جامع ترمذی عن سعید بن زیدؓ) اللہ کا نام لیے بغیر جو وضو کیا جائے اگرچہ وہ بالکل بیکار نہیں ہے لیکن اپنی باطنی تاثیر اور نورانیت کے لحاظ سے بہت ناقص ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' جو شخص وضو کرے اور اس میں اللہ کا نام لے تو یہ وضو اس کے سارے جسم کو پاک کر دیتا ہے اور جو کوئی وضو کرے اور اس میں اللہ کا نام نہ لے تو وہ وضو اس کے صرف اعضائے وضو ہی کو پاک کرتا ہے''۔ (سنن دار قطنی عن عبداللہ بن عمرؓ)

وضو کرنے کے بعد جسم کے گیلے حصوں کو کپڑے سے پونچھ لینا بھی سنت سے ثابت ہے۔ اس کے لیے تولیہ یا کوئی اور کپڑا استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ وضو کے بعد کلمہ شہادت اور یہ دعاء ماثور پڑھنا فضیلت اور برکت کا باعث ہے: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّا بِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ۔



# اَلصَّلاَۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ

الصَّلاَۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ ''نماز اہل ایمان کی معراج ہے!'' عام لوگوں میں مشہور ہے کہ یہ حدیث کے الفاظ ہیں ،مگر راسخ العلم علماء جانتے ہیں کہ یہ الفاظ حدیث کے نہیں بلکہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ علیہ نے نماز کی فضیلت اور اہمیت بیان کرتے ہوئے اپنی مشہور تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ ''میں لکھے ہیں ۔ اگرچہ یہ الفاظ حق نما ہیں ،تاہم جو بات رسول اللہ ﷺ نے نہ فرمائی ہو اُسے آپؐ کی طرف منسوب کرنا ہرگز درست نہیں۔ یہ بہت بڑی غلطی ،جھوٹ اور گناہ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: '' جو شخص جانتے بوجھتے مجھ پر جھوٹ باندھے گا وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ کی آگ میں کرلے۔'' (بخاری)

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے :توحید و رسالت کا اقرار ' نماز ' روزہ ' زکوٰۃ اور حج۔ ان میں نماز رکن رکین ہے ۔توحید اور رسالت کا اقرار کر کے تو بندہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے ۔ اس کے بعد وہ فریضہ جس پر اسے عمل کرنا ہے وہ پابندی کے ساتھ نماز ادا کرنا ہے۔ یوں سمجھئے کہ نماز مؤمن کی نشانی ہے ،کیونکہ اسلام قبول کرنے کے بعد زکوٰۃ اور حج تو تب فرض ہوں گے اگر وہ صاحب مال ہوا۔ روزے رمضان کا مہینہ آنے پر رکھے جائیں گے۔

صرف نماز ہی ہے کہ جو ایمان لانے کے فوراً بعد پابندی کے ساتھ ادا کرنا فرض ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کی عظیم اکثریت نماز کی ادائیگی سے غافل ہے اور اسے محض ثواب کا ایک کام سمجھتی ہے۔ حالانکہ نماز کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید میں نماز کی تاکید بار بار کی گئی ہے ۔چونکہ رسول اللہ ﷺ قرآن کے ہر حکم پر عمل پیرا تھے اس لیے آپؐ نے زندگی بھر نماز کی پابندی کی اور آپؐ کی متابعت میں تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نماز ادا کرتے تھے۔

نبی اکرم ﷺ کی نبوی زندگی کا آغاز ہوا تو آپؐ پر صرف ایک دن میں دو نمازیں پڑھنا فرض تھیں' فجر اور عشاء ۔ پھر مکہ مکرمہ کے قیام کے آخری دور میں آپ ﷺ کو معراج کی



سعادت ملی اور آپ ﷺ کو آسمانوں سے اوپر بلالیا گیا اور دیگر تحفوں کے علاوہ پنجگانہ نماز کا تحفہ بھی ملا۔ اب ہر مسلمان پر ایک دن رات میں پانچ نمازیں ادا کرنا فرض ہوا۔ نماز وہ فریضہ ہے جو کسی وقت بھی معاف نہیں۔ انسان حضر میں ہو یا سفر میں' سکھ میں ہو یا رنج میں' جوان ہو یا بوڑھا تندرست ہو یا بیمار ہو' اسے نماز ہر حال میں پڑھنی ہے۔ اگر اتنا کمزور' مجبور' معذور یا بوڑھا ہو کہ ارکانِ نماز کی ادائیگی کما حقہ نہیں کر سکتا تو جیسے بھی ممکن ہو اسے نماز ادا کرنا ہے۔ بیٹھ کر پڑھ لے' لیٹ کر یا محض اشارے سے پڑھ لے' نماز بہر حال پڑھنی ہے' چھوڑنی نہیں۔

جب نماز فرض ہوئی تو نبی مکرم ﷺ کو حکم ہوا کہ خود نماز پڑھیں اور اپنے گھر والوں کو بھی نماز کی ادائیگی کا حکم دیں۔ چنانچہ آپ ﷺ خود بھی انتہائی ذوق کے ساتھ نماز ادا کرتے اور گھر والوں اور تمام دوسرے مسلمانوں کو بھی نماز کی پابندی کا حکم دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے ہر کوئی نماز کی اہمیت سے واقف تھا اور کوئی نماز ضائع نہ کرتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری الفاظ اس طرح تھے : ((اَلصَّلَاۃَ، اَلصَّلَاۃَ، اِتَّقُوا اللہَ فِیمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ)) (ابوداؤد) ''لوگو ! نماز کا خیال رکھنا' لوگو ! نماز کا خیال رکھنا' اپنے غلاموں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہنا۔''

نماز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ ایک دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں اور ہر نماز کے لیے وقت مقرر ہے' تاہم نماز کا وقت ہو جائے تو ہر مسجد سے اذان بلند کی جاتی ہے تاکہ سب لوگ نماز کے لیے تیار ہو جائیں۔ جبکہ حج کے ایام مقرر ہیں۔ زکوٰۃ مال پر ایک سال گزر جائے تو ادا کرنی ہے۔ رمضان کا چاند نظر آ جائے تو روزے رکھنے ہیں۔ ان فرائض کے لیے وقت کا تقرر کافی ہے' مگر نماز کے لیے پانچوں وقت پابندی کے ساتھ اذان دی جاتی ہے اور مسلمانوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ نماز کے لیے تیار ہو جائیں۔ اگرچہ لوگوں کے پاس گھڑیاں موجود ہیں اور مساجد میں نماز کے اوقات بھی مقرر ہیں' پھر بھی ہر نماز کے لیے اذان کہنا ضروری ہے۔ فجر کی نماز رات کے آخری حصے میں پڑھی جاتی ہے' اُس وقت ہر شخص پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے' چنانچہ فجر کی اذان میں یہ بھی دہرا کر کہا جاتا

ہے کہ ''نماز نیند سے بہتر ہے''۔ گویا نماز کی پابندی کروانے کے لیے کتنا اہتمام کیا جاتا ہے۔چونکہ نماز اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا اور بندگی کا اظہار کرنا ہے اس لیے نماز سے پہلے وضو کا حکم ہے کہ بندہ صاف ستھرا ہو کر نماز کے



لیے تیار ہوجائے۔ نمازی کا لباس بھی مناسب ہو اور اللہ کے حضور کھڑے ہونے کے لائق ہو۔ حکم ہے کہ بندہ نماز میں ہمہ تن مشغول ہو جائے اور یوں تصور کرے گویا وہ اپنے خالق و مالک کے سامنے کھڑا ہے اور وہ اسے دیکھ رہا ہے ۔اگر کسی وقت نماز میں کوئی اِدھر اُدھر کا خیال آجائے تو فوراً اسے چھوڑ کر نماز کے الفاظ کی طرف متوجہ ہوجائے۔

سجدہ نماز کا ایک اہم رکن ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:''بندہ سجدے کی حالت میں اپنے ربّ کے انتہائی قریب ہوتا ہے''۔ (مسلم) اسی لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ علیہ نے نماز کو مؤمنوں کی معراج کہا ہے'کیونکہ نماز میں سجدہ کرتے ہوئے وہ بندگی کے عروج پر ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سجدے کی حالت میں زیادہ دعائیں کیا کرو''۔(مسلم) ۔ اسی طرح سجدے کی فضیلت میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جب بھی بندہ اللہ کو سجدہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس کا ایک درجہ بلند کر دیتا ہے اور اس کا ایک گناہ معاف کر دیتا ہے۔'' (ترمذی' ابن ماجہ)

آدم کا بیٹا غلطی کر جاتا ہے 'اس سے نامناسب کام بھی سرزد ہو جاتے ہیں جس سے وہ گناہگار ہوتا ہے 'چنانچہ ہر شخص کو ضرورت ہے کہ اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں ۔ اس کے لیے وہ دعاؤں کا سہارا لیتا ہے اور گناہوں کی معافی کا امیدوار ہو جاتا ہے۔ نماز گناہوں کی معافی کا شرطیہ علاج ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ كَفَّارَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ))(مسند احمد) ''پانچوں نمازوں کی پابندی آدمی کے تمام (صغیرہ) گناہ مٹا دیتی ہے۔'' حضور اکرم ﷺ نے طرح طرح سے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ نماز میں گناہوں کو مٹادینے کی تاثیر ہے ۔ ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے فرمایا:''بتلائو' اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر نہر جاری ہو جس میں وہ روزانہ پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے جسم پر کچھ میل کچیل باقی رہے گا؟ ''صحابہؓ نے عرض کیا : کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بالکل یہی مثال پانچ نمازوں کی ہے 'اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے سے خطائوں کو دھوتا اور مٹاتا ہے''۔ ( صحیح بخاری و صحیح مسلم)

ایک دفعہ نبی مکرم ﷺ سردی کے ایام میں باہر تشریف لے گئے' جہاں درختوں کے پتے از خود جھڑ رہے تھے۔ آپؐ نے ایک درخت کی دو ٹہنیوں کو پکڑا (اور ہلایا) تو ایک دم ان کے پتے جھڑنے لگے۔ پھر حضور ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اے ابوذر! جب مؤمن بندہ

خالص اللہ کے لیے نماز پڑھتا ہے تو اس کے گناہ ان پتوں کی طرح جھڑ جاتے ہیں۔'' (مسند احمد)

اللہ تعالیٰ کے سوا بندوں کے گناہ کوئی نہیں بخش سکتا۔ پس اللہ کے حضور پورے آداب و شرائط اور خلوص سے نماز پڑھنا گناہوں کی بخشش کا سبب بن جائے گا۔ نماز کی پابندی ہر مسلمان پر لازم ہے۔ ایک تو یہ ارکان اسلام میں سے ہے' دوسرے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بار بار حکم دیا ہے کہ وہ نماز قائم کریں اور اس کے لیے اذان کا طریقہ مقرر کیا ہے۔ تیسرے رسول اللہ ﷺ نے اس پر مداومت کی اور آپؐ کے اہل و عیال اور اصحاب نے کبھی نماز نہ چھوڑی۔ اب کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا کہ نماز کی ادائیگی میں کوتاہی کرے اور اپنی خطاؤں اور گناہوں کی بخشش کا سامان نہ کرے۔ اتنی اہمیت کے ہوتے ہوئے اگر کوئی مسلمان پنجگانہ نماز نہیں پڑھتا تو وہ سخت جاہل' احمق اور بدنصیب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الْكُفْرِ وَالشِّرْكِ تَرْكُ الصَّلَاةِ)) (صحیح مسلم) ''بندے کے اور کفر و شرک کے درمیان نماز چھوڑ دینے ہی کا فاصلہ ہے''۔ ایک دوسرے موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارے اور ان (کافروں) کے درمیان نماز قائم رکھنے کا عہد ہے' جس نے نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا''۔ (ترمذی) نماز کی اہمیت کے پیش نظر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ترکِ نماز کے علاوہ کسی گناہ کو کفر نہیں سمجھتے تھے۔ (ترمذی)

نماز میں اللہ تعالیٰ کی ثناء کی جاتی ہے' شیطان سے اللہ کی پناہ طلب کی جاتی ہے۔ سورۃ الفاتحہ پڑھتے ہیں جو اعلیٰ اور اکمل دعا ہے اور قرآن کا حصہ ہے۔ رکوع اور سجود میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم و تقدیس بیان کرتے ہیں۔ قعدہ میں اقرار کرتے ہیں کہ ہر قسم کی مالی' بدنی عبادات اور نیاز کے سارے کلمات اللہ ہی کے لیے ہیں۔ پھر درود پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر اپنی (کثیر) رحمتیں بھیجے۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا پر نماز ختم کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو نماز اللہ تعالیٰ کا ایک انمول تحفہ ہے' جو اس نے اپنے محبوب ﷺ کے ذریعے مؤمنین کو عطا فرمایا ہے۔ ضروری ہے کہ سب مسلمان نماز کے پابند ہوں اور اپنے اسلام کی حفاظت کریں۔

حضور ﷺ نے نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک فرمایا ہے اور اس کو ترک کرنے والوں کے لیے طرح طرح کی وعیدیں سنائی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے



دریافت کیا کہ دینی اعمال میں سے کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ٹھیک وقت پر نماز ادا کرنا''۔ انہوں نے عرض کیا: اس کے بعد کون سا عمل زیادہ محبوب ہے؟ فرمایا: ''ماں باپ کی خدمت کرنا''۔ انہوں نے پھر پوچھا: اس کے بعد کون سا عمل زیادہ محبوب ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''جہاد فی سبیل اللہ۔'' (صحیح بخاری و صحیح مسلم) اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے والدین کی خدمت اور جہاد فی سبیل اللہ سے افضل اور

محبوب عمل نماز کو بتلایا ہے۔ بلاشبہ نماز کا یہی مرتبہ و مقام ہے اور ہر مسلمان کو ذوق و شوق اور چاہت کے ساتھ نماز پڑھنی چاہیے ۔ اُمت کے متقی لوگ اور علمائے حق پنجگانہ نماز کے علاوہ کثرت سے نفل نمازیں بھی پڑھتے ہیں۔

نماز پڑھنے والوں کو کامیاب کہا گیا ہے اور ان کی فضیلت قرآن میں بیان ہوئی ہے ۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات میں بھی نمازوں کو گناہوں کا کفارہ کہا ہے ۔چنانچہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ خود پابندی کے ساتھ نماز پڑھے اور اپنے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کو نماز کی اہمیت کا احساس دلائے اور بتائے کہ آخرت کی کامیابی کے لیے نماز کی ادائیگی ضروری ہے ‘ورنہ حقیقی ناکامی کا سامنا کرنے پڑے گا۔ بے نماز اللہ کے غضب کا نشانہ بنے گا ۔ آپ ﷺ نے فرمایا: جو بندہ نماز اہتمام سے ادا کرے گا تو وہ قیامت کے دن اس کے لیے نور ہو گی اور دلیل ہو گی اور اس کے لیے نجات کا ذریعہ بنے گی اور جس شخص نے نماز کی ادائیگی کا اہتمام نہیں کیا تو وہ اس کے واسطے نہ نور بنے گی نہ برہان اور نہ ذریعہ نجات اور وہ بدبخت قیامت کے دن قارون‘ فرعون‘ ہامان اور (مشرکین مکہ کے سرغنہ) اُبی بن خلف کے ساتھ ہوگا۔‘‘ (رواہ احمد)

قرآن مجید کی سورۃ المدثر میں اہل جنت اور اہل دوزخ کا مکالمہ درج ہے۔ جنتی لوگ جہنم میں جانے والے اپنے شناسائوں سے جہنم میں جانے کا سبب پوچھیں گے تو وہ جواباً کہیں گے : {لَمۡ نَكُ مِنَ ٱلۡمُصَلِّينَ ﴿٤٣﴾}’’ہم نماز ادا نہیں کرتے تھے‘‘یعنی بے نماز تھے۔ محشر کے دن سب سے پہلا سوال نماز کا ہو گا۔ بے نمازی اسی وقت ناکام و نامراد ہو جائے گا ۔ اس کے لیے وقت گزر چکا ہو گا اور پچھتانا کسی کام نہ آئے گا۔

* * *



# سید الایام --- یوم الجمعۃ

اللہ تعالیٰ نے بعض چیزوں کو بعض چیزوں پر فضیلت دی ہے۔ سال کے بارہ مہینوں میں سب سے زیادہ فضیلت والا مہینہ رمضان ہے۔ راتوں میں فضیلت والی رات شب قدر ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ نفل نماز کے لیے افضل وقت تہجد کا وقت ہے۔ اسی طرح ہفتے کے سات دنوں میں افضل جمعہ کا دن ہے ۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ان سارے دنوں میں جن میں سورج طلوع ہوتا ہے سب سے بہتر جمعہ کا دن ہے۔ اسی دن حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ جمعہ ہی کے دن وہ جنت میں داخل کیے گئے اور جمعہ ہی کے دن وہ جنت سے باہر کیے گئے (دنیا میں بھیجے گئے) اور قیامت بھی خاص جمعہ ہی کے دن قائم ہوگی''۔ (صحیح مسلم) اس دن ظہر کی نماز کے وقت جمعہ کا خطبہ ہوتا ہے اور دو رکعت نماز فرض پڑھی جاتی ہے ۔ نمازِ جمعہ کے دو فرضوں اور خطبے کی بڑی فضیلت ہے۔ جمعہ کے دن غسل کرنا ' خوشبو لگانا' اچھے کپڑے پہننا اور پیدل چل کر اوّل وقت مسجد میں پہنچنا بڑے اجر کا باعث ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص جمعہ کے دن غسل کر کے' اچھا لباس پہن کر 'میسر ہو تو خوشبو لگا کر جمعہ کے لیے آئے اور لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے' پھر جس قدر اللہ نے اس کے مقدر میں کیا ہے نماز پڑھے اور پھر جب امام (منبر پر) آجائے تو نماز مکمل ہونے تک خاموشی اختیار کرے تو یہ اُس کے اِس اور سابقہ جمعہ کے مابین ہونے والے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔'' (ابوداؤد' احمد)

عید کے دن کی طرح جمعہ کے روز بھی اچھا لباس پہننے کی تاکید ہے۔ نماز جمعہ کے لیے جلدی مسجد میں پہنچنے کا حکم ہے ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :

{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنۡ یَّوۡمِ الۡجُمُعَۃِ فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ وَ ذَرُوا الۡبَیۡعَ ؕ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹﴾}(الجُمعۃ)

''اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نماز (جمعہ) کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے



ذکر کے لیے جلدی سے آجاؤ اور خرید و فروخت (کاروبار دنیا) چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔''

جمعہ کے دن مسجد میں جلدی آنا بڑے ثواب کا کام ہے ۔ صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو فرشتے مسجد کے دروازوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور شروع میں آنے والوں کے نام یکے بعد دیگرے لکھتے ہیں ۔ اول وقت دوپہر میں آنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اللہ کے حضور میں اونٹ کی قربانی پیش کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد آنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اللہ کے حضور گائے کی قربانی پیش کرتا ہے ۔ پھر اس کے بعد آنے والے کی مثال مینڈھا پیش کرنے والے کی' اس کے بعد مرغی پیش کرنے والے کی' اور اس کے بعد انڈا پیش کرنے والے کی۔

پھر جب امام خطبہ کے لیے منبر کی طرف جاتا ہے تو یہ فرشتے اپنے لکھنے کے دفتر لپیٹ لیتے ہیں اور خطبہ سننے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ''

خطبہ سننے کے دوران حاضرین کو پوری توجہ کے ساتھ خاموش بیٹھنا چاہیے اور کسی قسم کی کوئی بات نہ کرنی چاہیے ' حتیٰ کہ کسی ساتھ والے کو خاموش رہنے کا بھی نہ کہا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم نے دورانِ خطبہ کسی ساتھ والے شخص سے (بس اتنا) کہہ دیا کہ خاموش ہوجاؤ تو تم نے لَغو کام کیا۔'' (صحیح بخاری ،عن ابی ہریرہؓ)

جمعہ کے روز ایک گھڑی ایسی ہوتی ہے جو دعا کی قبولیت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جمعہ کے دن میں ایک گھڑی ایسی ہوتی ہے کہ اگر کسی مسلمان بندے کو حسن اتفاق سے خاص اس گھڑی میں خیر اور بھلائی کی کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی توفیق مل جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرما دیتا ہے''۔ (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

جمعہ کے دن یہ مبارک گھڑی چھپا کر رکھی گئی ہے' جس طرح لیلۃ القدر رمضان شریف کے آخری عشرے میں خفیہ رکھی گئی ہے اور حدیث میں اس کے کچھ اشارات دیے گئے ہیں ۔ جمعہ کی اس مقبول ساعت کے متعلق بھی بزرگانِ دین نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کچھ نے کہا ہے کہ یہ اجابت کی گھڑی امام کے خطبے کے لیے جانے سے ختم نماز تک ہے۔ بعض نے



کہا ہے کہ جب امام دو خطبوں کے درمیان بیٹھتا ہے تو یہ گھڑی اجابت کی ہوتی ہے۔ بعض نے جمعہ کے دن عصر سے غروبِ آفتاب کے درمیان کا وقفہ قبولیت دعا کے لیے خاص کیا ہے ۔ حضرت ابو بردہ بن ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو بیان کرتے ہوئے سنا۔ انہوں نے کہا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو جمعہ کی اس گھڑی کا وقت بیان کرتے سنا کہ وہ امام کے خطبہ کے لیے بیٹھنے سے لے کر نماز کے فارغ ہونے تک ہے۔ (صحیح مسلم)

بعض اذکار کو بعض وقتوں کے ساتھ خصوصی مناسبت ہے۔ جیسے رمضان کا خاص ذکر تلاوتِ قرآن ہے' عیدین کے موقع پر خاص ذکر تکبیرات (اللہ اکبر اللہ اکبر لا اِلٰہ اِلا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد) ہیں' حج کا خصوصی ذکر تلبیہ (لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ ...) ہے' اسی طرح جمعہ کے روز درود شریف پڑھنا خاص فضیلت کا حامل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ جمعہ کے دن مجھ پر درود کی کثرت کیا کرو 'کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش ہوتا ہے۔'' (رواہ ابوداؤد عن اوس بن اوس ثقفی)

قرآن مجید کی تلاوت کی خصوصی نسبت رمضان کے ساتھ اور درود شریف کی خصوصی نسبت جمعہ

کے دن کے ساتھ ہے ‘مگر یہ اذکار ہمہ وقتی ہیں۔ ان کا ہر روز پڑھنا رات اور دن کے تمام اوقات میں بڑے اجر کا باعث ہے۔ مثلاً قرآن مجید کی تلاوت کے ہر حرف پر دس نیکیاں ہیں خواہ وہ کسی بھی وقت پڑھا جائے۔ اسی طرح فرمانِ رسول ﷺ کی رو سے ایک دفعہ درود شریف پڑھنے والے پر اللہ تعالیٰ دس رحمتیں نازل فرماتا ہے۔ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر روز پنجگانہ نماز پوری پابندی کے ساتھ ادا کرے۔ نماز ایک اعلیٰ عمل ہے۔ عید الفطر اور عید الاضحی کے روز عید کی نماز اضافی ہوتی ہے۔ نماز جمعہ کی اہمیت کے پیش نظر ایک زائد اذان وقت سے پہلے بلند کی جاتی ہے تاکہ آبادی کے مسلمان ہوشیار ہو جائیں اور جمعہ کی نماز کے لیے تیار ہو جائیں۔ جمعہ کے خطبے اور نماز کی ازحد اہمیت ہے اور جمعہ کی نماز کا چھوڑنا انتہائی ناپسند کیا گیا ہے‘ بلکہ اس کی کوتاہی پر رسول اللہ ﷺ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جمعہ سے پیچھے رہ جانے والے لوگوں کے بارے میں فرمایا: ’’میں نے ارادہ کیا کہ میں کسی آدمی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے‘ پھر میں جمعہ سے پیچھے رہ جانے والے لوگوں کو ان کے گھروں سمیت آگ لگا دوں۔‘‘ (صحیح مسلم)



تاہم چار قسم کے لوگوں کو نماز جمعہ کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جمعہ کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا ہر مسلمان پر لازم اور واجب ہے۔ اس وجوب سے چار قسم کے آدمی مستثنیٰ ہیں۔ ایک غلام جو کسی کا مملوک ہو‘ دوسرے عورت ‘تیسرے نابالغ لڑکا‘ چوتھے بیمار۔‘‘ (سنن ابی دائود عن طارق بن شہابؓ)

جمعہ کی فضیلت اور اہمیت جان کر ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ جمعہ کی تیاری کے لوازمات پورے کرے ‘پھر وضو کر کے فرضوں سے پہلے کی سنتیں گھر پر ادا کرے اور جلدی سے قبل از وقت مسجد پہنچ جائے اور پہلی صف میں نشست حاصل کرے۔ نماز جمعہ کی اہمیت سے غافل مسلمان آج کل مسجد میں آنے کی عجلت نہیں کرتے ۔ جب خطیب اردو خطاب شروع کرتا ہے اس وقت مسجد میں چند لوگ ہوتے ہیں۔ بعد میں آہستہ آہستہ تعداد زیادہ ہوجاتی ہے۔ شاید ان کو غلط فہمی ہے کہ نماز کی دو رکعتوں میں شامل ہونا ہی جمعہ ہے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ظہر کی چار رکعتوں کے بجائے جمعہ کی دو رکعتیں ادا کی جاتی ہیں اور دو رکعتوں کا قائم مقام خطبہ ہوتا ہے ۔ لہٰذا جمعہ کی نماز کے ساتھ خطبہ بھی سنیں تو جمعہ کی نماز مکمل ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عربی خطبہ تو عام سامعین سمجھ نہیں پاتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خطیب کا اردو خطبہ دھیان سے سنا جائے جس میں اسلامی تعلیمات بیان کی جاتی ہیں ۔اگر خطیب شیریں بیان نہ ہو تو اول وقت مسجد میں پہنچنا ضروری نہیں سمجھا جاتا‘ یہ درست نہیں‘ کیونکہ ہر حال میں مسجد میں پہلے پہنچنا ضروری ہے۔ جیسا کہ اوپر حدیث سے واضح ہے‘ خواہ خطیب کی گفتگو عام سی ہو۔

ایک اور بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جمعہ سے قبل کی سنتیں گھر میں ادا کی جائیں۔ اب یہ رواج

ایسا عام ہوا ہے کہ چند لوگوں کے سوا سب نمازی عربی خطبے سے قبل مسجد میں سنتیں پڑھنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں' یہ practice ختم ہونی چاہیے اور سنتیں گھر پر پڑھنے کی عادت اپنانی چاہیے۔ جس طرح فرضوں کا ثواب گھر کی نسبت مسجد میں ستائیس گنا ہے اسی طرح سنتیں اگر گھر پر پڑھی جائیں تو ان کا ثواب مسجد میں پڑھنے سے کئی گنا بڑھ جاتا ہے ۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو! سنو اپنے گھروں میں بھی نماز پڑھا کرو۔ فرض کو چھوڑ کر باقی نمازیں گھر میں ہی پڑھنا افضل ہے''۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

* * *



# نماز باجماعت کی اہمیت

نماز پنجگانہ ایک اہم دینی فریضہ ہے' جس کی ادائیگی ہر عاقل بالغ مسلمان پر ضروری ہے۔ نماز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ قرآن مجید میں بار بار نماز قائم کرنے کا حکم ہے اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''مسلمان اور کافر میں فرق نماز کا ہے''۔یہی وجہ ہے کہ عہد رسالت میں منافقین کو بھی نماز کی پابندی کرنا پڑتی تھی تاکہ انہیں مسلمان سمجھا جائے۔ چونکہ اسلام اجتماعیت پر زور دیتا ہے' لہٰذا اس کی تمام عبادات اجتماعیت کا مظہر ہیں۔ روزہ رمضان میں سب مسلمانوں پر لازم ہے۔ حج کے لیے تو دنیا جہاں کے مسلمان حرم شریف میں اکٹھے ہوتے اور مناسک حج ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح نماز کے لیے حکم ہے کہ جماعت کے ساتھ ادا کی جائے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

{وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ﴿۴۳﴾} (البقرۃ)

''نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ ۔''

یعنی نماز جماعت کے ساتھ ادا کیا کرو۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو سب سے پہلا کام جو آپ نے کیا وہ مسجد کی تعمیر تھی' تاکہ سب مسلمان مل کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کریں۔ قرآن مجید میں سورۃ النساء کی آیت ۱۰۲ میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ خوف اور جنگ کی حالت میں بھی نماز جماعت کے ساتھ ادا کریں۔ جب اس قدر غیر معمولی حالات میں بھی جماعت چھوڑنے کی اجازت نہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ امن و

امان اور معمول کے دنوں میں نماز کی جماعت چھوڑی جائے۔

پانچوں نمازوں کے لیے مسجد میں اذان دینے کا حکم ہے اور اذان کے الفاظ ہیں: حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاح یعنی نماز کی طرف چلے آئو، فلاح کی طرف چلے آئو! گویا یہ نماز کے لیے صرف ایک یاد دہانی نہیں بلکہ خدائی بلاوا ہے کہ مسجد میں آکر نماز پڑھو۔ جماعت کے قیام کے لیے ضروری نہیں کہ بہت سے لوگ اکٹھے ہوں تو پھر نماز جماعت کے ساتھ ادا کی



جائے، بلکہ اگر صرف تین آدمی بھی موجود ہوں تو وہ نماز اکیلے اکیلے نہیں بلکہ باجماعت نماز ادا کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا کَانُوْا ثَلَاثَۃً فَلْیَؤُمَّھُمْ اَحَدُھُمْ، وَاَحَقُّھُمْ بِالْاِمَامَۃِ اَقْرَؤُھُمْ)) (صحیح مسلم)

''جب وہ تین ہوں تو ان میں سے ایک ان کی امامت کروائے، اور ان میں امامت کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہے جو سب سے زیادہ قرآن پڑھنے والا ہے۔''

اس حدیث میں تو تین افراد کی جماعت کا حکم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تو سفر کا ارادہ کرنے والے دو اشخاص کو بھی جماعت کے ساتھ نماز اد اکرنے کا حکم دیا ۔ حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا اَنْتُمَا خَرَجْتُمَا فَاَذِّنَا، ثُمَّ اَقِیْمَا، ثُمَّ لِیَؤُمَّکُمَا اَکْبَرُکُمَا)) (صحیح البخاری)

''جب تم دونوں نکلو تو اذان کہو، پھر اقامت کہو، پھر تم دونوں میں سے بڑی عمر والا تمہاری امامت کرائے۔''

کوئی شخص اگر مسجد میں موجود ہو اور اذان ہو جائے تو ایسے شخص کو بلاعذر مسجد سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں، بلکہ اب وہ نماز باجماعت ادا کرے اور پھر مسجد سے باہر جائے، کیونکہ اذان دینے والا پکار رہا ہے کہ نماز کا وقت ہو چکا ہے اور اب نماز کی جماعت ہونے والی ہے تو اس اعلان کے سننے کے بعد بغیر نماز ادا کیے مسجد سے باہر نکل جانے کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا:

((اِذَا کُنْتُمْ فِی الْمَسْجِدِ، فَنُوْدِیَ بِالصَّلَاۃِ، فَلَا یَخْرُجْ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُصَلِّیَ)) (مجمع الزوائد)

''کہ جب تم مسجد میں ہو اور نماز کے لیے اذان ہو جائے تو تم میں سے کوئی نماز ادا کیے بغیر نہ نکلے۔''

ایک حدیث کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے اذان کے بعد مسجد سے نکلنے والے شخص کو منافق قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَسْمَعُ النِّدَائَ فِیْ مَسْجِدِیْ ھٰذَا، ثُمَّ یَخْرُجُ مِنْہُ اِلَّا لِحَاجَۃٍ، ثُمَّ لَا

یَرجِعُ اِلَیہِ ، اِلاَّ مُنَافِقٌ)) (مجمع الزوائد والمعجم الأوسط للطبرانی)

''میری اس مسجد سے اذان سن کر بلاضرورت نکل کر واپس نہ آنے والا منافق ہی ہے۔''

نمازباجماعت ادا کرنا اس قدر ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک نابینا صحابی (حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ) کوجن کا گھر مسجد کے قریب نہ تھا اور ان کو مسجد لے جانے اور واپس لانے والا کوئی نہ تھا' ان کے متعدد عذروں کے باوجود گھر میں اکیلے نماز پڑھنے کی اجازت نہ دی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت منقول ہے کہ ایک نابینا شخص حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ ! بے شک مجھے مسجد میں لانے والا راہنما کوئی نہیں تو کیا آپؐ مجھے گھر میں ہی نماز پڑھنے کی اجازت دے دیں گے؟ آپ ﷺ نے انہیں اجازت دے دی۔ جب وہ (واپس جانے کی خاطر) مڑے تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں بلا کر فرمایا: ''کیا تم اذان سنتے ہو؟'' انہوں نے عرض کیا: جی ہاں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا :((فَأَجِبْ !)) ''سوتم اسے قبول کرو !'' یعنی باجماعت نماز ادا کرنے کی خاطر مسجد میں آیا کرو۔

بیماری کے سبب کوئی شخص مسجد میں نہ آسکے تو گھر پر نماز پڑھ لے۔اس کا یہ عذر جائز ہے۔ مگر نبی اکرم ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی کرتے ہوئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور صالحین امت شدید بیماری میں بھی باجماعت نماز میں شمولیت کے لیے مسجد جانے کا اہتمام کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں : ''بے شک میں نے دیکھا کہ ہم میں سے کھلے نفاق والے منافق کے سوا کوئی اور شخص (باجماعت) نماز سے پیچھے نہ رہتا۔ بلاشبہ (بیمار) آدمی کو دو آدمیوں کے سہارے لا کر صف میں کھڑا کیا جاتا''۔ ( صحیح مسلم' کتاب المساجد)

حضرت عامر عبداللہ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے۔ انہوں نے مؤذن کی آواز کو سنا' اُس وقت وہ جان کنی کے عالم میں تھے۔ فرمایا: ''میرا ہاتھ پکڑو(اور مجھے مسجد پہنچاؤ)'' ۔ عرض کیا گیا: بلاشبہ آپ بیمار ہیں۔ انہوں نے جواب دیا: ''اللہ کے بلاوے کو سنوں اور قبول نہ کروں (یہ کیسے ہو سکتا ہے)''۔ لوگوں نے ان کا ہاتھ تھاما اور وہ جا کر مغرب کی نماز میں امام کے ساتھ شامل ہو گئے۔ ابھی ایک رکعت ہی پڑھنے پائے تھے کہ فوت ہو گئے۔یہ وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو مسجد میں جا کر باجماعت نماز ادا کرنے کی اہمیت سے واقف تھے۔

سلف صالحین کا یہ طرزِ عمل ہمارے لیے مشعل راہ ہے کہ اگر اپنی قریبی مسجد میں کسی وجہ



سے نماز کی جماعت میں شامل نہ ہو سکتے تو اس غرض کے لیے دوسری مسجد میں چلے جاتے تاکہ وہاں جماعت مل جائے۔ حضرت اسود بن یزید بن قیس کے متعلق امام بخاری کہتے ہیں: ''جب ان کی (اپنی مسجد میں) جماعت رہ جاتی

تو دوسری مسجد کی طرف چلے جاتے۔'' (صحیح البخاری) اسی طرح کا طرزِ عمل حضرت حذیفہؓ اور سعید بن جبیرؒ اور دوسرے بہت سے صالحین سے ثابت ہے۔

مدنی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کو کئی جنگیں پیش آئیں۔ اللہ کے حکم کے مطابق وہاں بھی آپؐ نمازباجماعت کا اہتمام کرتے۔ رسول اللہ ﷺ کی سرکردگی میں صحابہ کرام نے جہینہ قبیلہ کے ایک گروہ کے خلاف جہاد کیا۔ گھمسان کی اس جنگ کے موقع پر بھی آپ ﷺ نے مجاہدین کو ظہر اور عصر کی نمازیں اپنے اپنے وقت پر جماعت کے ساتھ پڑھائیں' حالانکہ دشمن اس انتظار میں تھے کہ مسلمان نماز میں مشغول ہوں تو ان پر حملہ کر دیں۔ اسی طرح جب بھی میدانِ جنگ میں نماز کا وقت آیا آپؐ نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھائی۔ اور یہی دستور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں رہا' کیونکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر ہی عمل کرتے تھے۔

یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی آخری علالت کے ایام تھے' آپ ﷺ کمزوری کے باعث چل کر مسجد نہیں جا سکتے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ''آپ دو آدمیوں کے سہارے اس طرح مسجد جا رہے تھے کہ آپؐ کے دونوں قدم مبارک زمین پر گھسٹتے ہوئے لکیریں لگا رہے تھے۔'' (صحیح بخاری)

نمازباجماعت کی تاکید آپ ﷺ نے اس درجہ کی کہ جماعت میں شامل نہ ہونے والوں پر آپؐ نے انتہائی درجے کی ناراضی کا اظہار فرمایا' حالانکہ آپ رحمۃ للعالمین یعنی مجسم رحمت و رأفت تھے' آپ ﷺ نے ایسے لوگوں کو ان کے گھروں سمیت جلانے کا مصمم ارادہ فرمایا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' یقینا میں نے پختہ ارادہ کیا کہ ایندھن جمع کیا جائے' پھر میں نماز کا حکم دوں تو اس کے لیے اذان دی جائے۔ پھر میں ایک شخص کو حکم دوں تو وہ لوگوں کی امامت کرائے' پھر میں (جماعت سے پیچھے رہ جانے والے) مردوں کے پیچھے جاؤں اور ان کو ان کے گھروں سمیت جلا کر راکھ کر دوں۔'' (صحیح البخاری)

نمازباجماعت کی اس قدر تاکید اور جماعت چھوڑنے پر اس قدر وعید اس لیے ہے کہ



نمازباجماعت حکم خدا اور سنت رسول ہے' اور کسی بندے کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرے اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے اعراض کرے۔ جب کوئی اللہ اور اس کے رسول کی رضا والے کام کرے تو اس کو بے حد اجر و ثواب کی خوشخبری بھی ہے۔ نمازباجماعت ادا کرنے پر بھی رسول اللہ ﷺ نے کئی بشارتیں سنائی ہیں۔ ایک صحابی کا گھر مسجد سے دُور تھا' اُس نے آپ ﷺ سے بات کی اور کہا کہ میں مسجد کے قریب

رہائش لانا چاہتا ہوں' تو آپؐ نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ نماز کے لیے مسجد کی طرف جتنے قدم اٹھائے جائیں گے ان پر اجر و ثواب ہے' اسی طرح واپس آنے پر بھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ خَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ مُتَطَهِّرًا اِلٰى صَلَاةٍ مَكْتُوْبَةٍ فَاَجْرُهٗ كَاَجْرِ الْحَاجِّ الْمُحْرِمِ)) (سنن ابی داؤد)

''اپنے گھر سے اچھی طرح پاک صاف ہو کر فرض نماز کے لیے روانہ ہونے والے شخص کا اجر احرام باندھ کر حج کرنے والے شخص کے اجر کی مانند ہے۔''

گویا دن میں پانچ نمازوں کے لیے چاہت اور رغبت کے ساتھ مسجد میں جانے والا کس قدر خوش بخت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بشارت کے مطابق ہر روز پانچ حج ادا کرنے کا ثواب پا رہا ہے۔

نماز باجماعت ایسا نورانی عمل ہے کہ اس کے بدلے میں روزِ حشر روشنی ملے گی۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((بَشِّرِ الْمَشَّاؤُوْنَ فِي الظُّلَمِ اِلَى الْمَسَاجِدِ بِنُوْرٍ تَامٍّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))(سنن ابن ماجہ)

''تاریکیوں میں مسجدوں کی طرف بار بار جانے والوں کو روز قیامت کامل نور کی بشارت دے دو!''

مسجد اللہ کا گھر ہے۔ جو شخص محض نماز باجماعت کی ادائیگی کے لیے گھر سے ارادہ کر کے نکلتا ہے تو وہ مسجد میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ کا مہمان ہوتا ہے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان منقول ہے:

((مَنْ تَوَضَّاَ فِيْ بَيْتِهٖ ، فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ ، ثُمَّ اَتَى الْمَسْجِدَ ، فَهُوَ زَائِرُ اللهِ، وَحَقٌّ عَلَى الْمَزُوْرِ اَنْ يُكْرِمَ الزَّائِرَ)) (مجمع الزوائد والمعجم الكبير للطبرانی)



''جس شخص نے اپنے گھر میں اچھی طرح وضو کیا' پھر وہ مسجد آیا تو وہ اللہ تعالیٰ کا مہمان ہے اور بے شک میزبان کے ذمہ مہمان کی تکریم کرنا لازم ہے۔''

سبحان اللہ! جب میزبان اللہ تعالیٰ ہو تو مہمان کی تکریم کس درجہ کی ہو گی۔ جیسے وہ ذات پاک بے مثل اور بے مثال ہے اسی طرح اس کی میزبانی بھی برتر از وہم و خیال ہو گی۔ اے اللہ کریم ہمیں زندگی کے آخری دن تک نماز باجماعت کی سعادت نصیب کرنا اور اس کے نتیجے میں الٰہی مہمان ہونے کا شرف عطا کرنا۔ آمین!

نماز تو پھر ایک فضیلت والا عمل ہے' جماعت کھڑی ہونے سے قبل مسجد میں جا کر نماز کے انتظار میں بیٹھنا بھی کس قدر عظیم کام ہے! حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَحَدُكُمْ مَا قَعَدَ يَنْتَظِرُ الصَّلَاةَ فِيْ صَلَاةٍ، مَا لَمْ يُحْدِثْ ، تَدْعُوْ لَهُ الْمَلَائِكَةُ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ)) (صحیح مسلم)

''تم میں سے جب تک کوئی باوضو نماز کے انتظار میں رہے وہ نماز ہی میں ہوتا ہے۔ فرشتے اس کے لیے دعا

کرتے ہیں: ''اے اللہ اسے معاف فرما دیجیے' اے اللہ اس پر رحم فرمایئے!''

فرشتے اللہ تعالیٰ کی نورانی اور معصوم مخلوق ہیں۔ ان پاکبازوں کی دعا ضرور شرف قبولیت پائے گی اور نماز کے انتظار میں مسجد میں جا کر بیٹھنے والوں کے لیے باعث سعادت ہو گی۔ ظاہر ہے جو شخص پاک صاف ہو کر قبل از وقت مسجد میں جا کر نماز کے انتظار میں بیٹھے گا وہ اللہ کے ذکر میں مشغول رہے گا اور اللہ کا ذکر خود بہت بڑی فضیلت کا باعث ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے {وَلَذِكْرُ اللهِ اَكْبَرُ} ''اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا عمل ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا:

((اِنَّ اللهَ لَيَعْجَبُ مِنَ الصَّلَاةِ فِي الْجَمِيْعِ)) (مجمع الزوائد والمعجم الکبیر للطبرانی)

''بے شک اللہ تعالیٰ نماز باجماعت سے خوش ہوتا ہے۔''

جس عمل سے اللہ خوش ہوتا ہے وہ عمل لازماً بندے کے گناہوں کی معافی کا سبب بنتا ہے۔ حضرت



عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

((مَنْ تَوَضَّاَ لِلصَّلَاةِ فَاَسْبَغَ الْوُضُوْءَ، ثُمَّ مَشٰى اِلَى الصَّلَاةِ الْمَكْتُوْبَةِ، فَصَلَّاهَا مَعَ النَّاسِ، اَوْ مَعَ الْجَمَاعَةِ، اَوْ فِي الْمَسْجِدِ غَفَرَ اللهُ لَهٗ ذُنُوْبَهٗ))

(صحیح مسلم)

''جس شخص نے نماز کے لیے وضو کیا 'تو کامل وضو کیا' پھر فرض نماز کی خاطر چلا اور اسے لوگوں کے ساتھ 'یا جماعت کے ساتھ' یا مسجد میں ادا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے گناہوں کو معاف فرما دیا۔''

گناہ کے کام تو پوری احتیاط کے باوجود بھی انسان سے ہو جاتے ہیں۔ اگر اسے نماز اور جماعت کی توفیق ملی ہے تو اس کے گناہوں کی بخشش بھی ہو رہی ہے۔ یہ بڑی خوش بختی ہے۔

آج ہم اپنے ارد گرد دیکھیں تو افسوس صد افسوس' مسلمانوں کی بھاری اکثریت نماز سے غافل ہے۔ یہ لوگ اپنی دنیوی مصروفیتوں اور کاروبار میں بہت چست' ماہر' سمجھ دار اور سیانے ہیں' لیکن بدقسمت ہیں کہ ان کی زندگی کے قیمتی اوقات اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی میں گزر رہے ہیں اور یہ آخرت کے حساب کتاب سے بے خبر ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

((اِنَّ اَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عَمَلِهٖ صَلَاتُهٗ، فَاِنْ صَلُحَتْ فَقَدْ اَفْلَحَ وَاَنْجَحَ وَاِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ...))

(رواہ الترمذی والنسائی)

''قیامت کے روز بندے سے اُس کے اعمال میں سے سب سے پہلے نماز کے بارے میں محاسبہ کیا جائے

گا ' پس اگر یہ درست ہوئی تو وہ کامیاب وکامران ہو گا اور اگر یہ خراب ہوئی تو وہ ناکام و نامراد ہو گا...''
جب نماز کے بارے میں پوچھا جائے گا تو بے نماز مسلمانوں کے پاس کیا جواب ہو گا؟ کیا نماز اہم ترین فریضہ نہیں ہے جس کا ذکر بار بار قرآن مجید میں آیا ہے اور جس کی تاکید رسول اللہ ﷺ نے قول و فعل سے واضح کی ہے۔
ایک دن رسول اللہ ﷺ نے نماز کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :
''جو بندہ نماز اہتمام کے ساتھ ادا کرے گا وہ قیامت کے دن اس کے واسطے نور ہو گی



اور دلیل ہو گی اور اس کے لیے نجات کا ذریعہ بنے گی ' اور جس نے نماز کی ادائیگی کا اہتمام نہیں کیا تو وہ اس کے واسطے نہ نور بنے گی نہ برہان اور نہ ذریعہ نجات۔ اور وہ
(بدبخت) قیامت میں قارون ' فرعون ' ہامان اور (مشرکین مکہ کے سردار) اُبی بن خلف کے ساتھ ہو گا۔ (مسند احمد ' مسند دارمی ' شعب الایمان للبیہقی)
جب کافر اور مسلمان کے درمیان نماز کا فرق ہے ' جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ کے اور کفر کے درمیان نماز چھوڑ دینے ہی کا فاصلہ ہے'' ( صحیح مسلم) تو بے نمازی آخرت کے لیے کس سہارے پر مطمئن ہیں؟ اسی طرح جو لوگ پنجگانہ نماز ادا کرتے ہیں ' مگر ہر نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے مسجد میں جانے کو ضروری نہیں سمجھتے ' انہیں بھی اپنا طرزِ عمل ضرور بدلنا چاہیے ' کیونکہ نماز باجماعت کا رہ جانا عظیم خسارہ اور چھوڑنا سنگین غلطی ہے۔ اور خسارے والا کام چھوڑ کر فضیلت والے کام کی طرف لپکنا چاہیے۔ کچھ پتا نہیں زندگی کا سفر کب ختم ہو جائے اور سوال و جواب شروع ہو جائیں۔
نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی کی کتاب ''نماز باجماعت کی اہمیت'' سے مدد لی گئی ہے ' جو اس موضوع پر نہایت مفید اور جامع کتاب ہے۔ یہ کتاب دارالنور ' اسلام آباد نے شائع کی ہے اور مکتبہ قدوسیہ ' غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

* * *

# مسجد کی عظمت، ضرورت اور اہمیت

مسجد اسلامی معاشرے میں وہ جگہ ہے جہاں مسلمان جماعت کی صورت میں ایک امام کے پیچھے نماز پنجگانہ ادا کرتے ہیں ۔ ایک دن میں پانچ وقت نماز پڑھنا ہر مسلمان کے لیے لازم ہے۔ اسلام میں نماز کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندے اور کفر کے درمیان نماز چھوڑ دینے ہی کا فاصلہ ہے۔'' (صحیح مسلم) اسلام اجتماعیت پر زور دیتا ہے ،لہٰذا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز ادا کرنے کے لیے مسجد جائے اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے۔ مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنے کی اہمیت اس بات سے واضح ہے کہ ہر نماز کے وقت مسجد میں اذان بلند کی جاتی ہے ،جو اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ قریبی مسجد میں نماز کی جماعت تیار ہے، لوگ وضو کر کے مسجد کی طرف چل پڑیں۔ اذان میں ''حی علی الصلوٰۃ'' کا یہی مطلب ہے کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے، لوگ نماز کی باجماعت ادائیگی کے لیے مسجد کی طرف چل پڑیں۔

مسجد مسلمان آبادی کے اندر وہ مرکزی مقام ہے جہاں قرب و جوار کے مسلمان جماعت کے ساتھ ایک دن میں پانچ مرتبہ حاضر ہوتے اور نماز ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا مسجد کی تعمیر کو بہت بڑے ثواب کا کام بتایا گیا ہے، بلکہ اس کی تعمیر کرنے والے کو جنت کی بشارت دی گئی ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی اللہ (کی رضا اور خوشنودی) کے لیے مسجد تعمیر کرائے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں شاندار محل تعمیر فرمائیں گے۔'' (صحیحین)

مسجدوں میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے ،مسلمان وہاں نماز پڑھتے ، سجدہ و رکوع کرتے اور اللہ کا ذکر کرتے ہیں ۔اس طرح نمازی مسجد میں اللہ کے مہمان ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا میزبان ہوتا ہے ۔ ربّ کریم ہر دفعہ کی حاضری پر جنت میں نمازی کے لیے مہمانی کا خاص سامان تیار کراتا ہے۔ کنز العمال میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان مذکور ہے : ''مسجدیں اللہ کے گھر ہیں اور ان میں حاضر ہونے والے اہل ایمان اللہ تعالیٰ کے ملاقاتی ہیں'



اور جس کی ملاقات کو کوئی آئے اس پر حق ہے کہ وہ آنے والے ملاقاتی کا اکرام کرے اور اس کی خاطر داری کرے۔'' (بحوالہ معارف الحدیث)

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ

جس وقت بھی اور جتنی دفعہ بھی ‘صبح کو یا شام کو‘ اپنے گھر سے نکل کر مسجد کی طرف جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے واسطے جنت کی مہمانی کا سامان تیار کراتا ہے ۔ ‘‘ (صحیحین)

مسجد میں لوگ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے آتے ہیں ‘لہٰذا مسجد کے ماحول کو پاکیزہ‘ صاف ستھرا اور دلکش بنانے کی ترغیب دی گئی ہے اور ہر اُس فعل سے روکا گیا ہے جو نمازیوں کے لیے کسی بھی اعتبار سے تکلیف دہ ہو۔ کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ وہ مسجد میں بیٹھا اونچی آواز میں قرآن مجید پڑھے یا ذکر و اذکار میں مشغول ہو جبکہ کچھ دوسرے لوگ نماز پڑھ رہے ہوں۔ مسجد میں آوازیں بلند کرنا اور دنیا کی باتیں کرنا تو بالکل جائز نہیں --- اور اس شخص کے لیے سخت وعید ہے جو مسجد کے ماحول کو نمازیوں کے لیے ناسازگار بنائے۔ ایسے شخص کو بہت بڑا ظالم کہا گیا ہے اور اس کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

{وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنۡ یُّذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ وَ سَعٰی فِیۡ خَرَابِہَا ؕ اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَہُمۡ اَنۡ یَّدۡخُلُوۡہَاۤ اِلَّا خَآئِفِیۡنَ ؕ لَہُمۡ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ وَّ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۱۴﴾} (البقرۃ)

’’اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ لیا جائے وہاں نام اس کا اور کوشش کی ان کے اجاڑنے میں۔ ایسوں کو لائق نہیں کہ داخل ہوں ان میں مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لیے دنیا میں ذلت ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔‘‘

مسجدوں کی عظمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے انہیں صاف ستھرا بھی رکھا جائے اور نمازیوں کے لیے ہر ممکن سہولت اور دلکشی کا سامان کیا جائے۔ مسجد کے ارد گرد بھی کسی طرح کا کوڑا کرکٹ نہ ڈالا جائے اور گندگی کے ڈھیر وہاں برداشت نہ کیے جائیں کہ یہ نمازیوں کے لیے اذیت کا باعث ہوں گے ۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے محلوں میں مسجدیں بنانے کا اور ان کی صفائی اور خوشبو کے استعمال کے اہتمام کا حکم دیا۔(ترمذی‘ ابوداؤد‘ ابن ماجہ)



فرض نماز اکیلے بلاجماعت گھر پر ادا کرنے کو پسند نہیں کیا گیا ‘بلکہ ایسا کرنے والوں پر آپؐ نے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے ۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:’’ میرے دل میں آتا ہے کہ نماز کا حکم دوں اور نماز کھڑی ہو تو پھر میں ان لوگوں کے گھروں میں جاؤں جو مسجد میں آکر باجماعت نماز میں شریک نہیں ہوتے اور ان کو آگ لگا دوں (یعنی ان کے اپنے گھروں میں موجود ہوتے ہوئے ان کے گھروں کو جلادوں)‘‘۔ (بخاری)

نماز باجماعت ادا کرنے کا سخت تاکیدی حکم ہے ۔ اگر آدمی سفر میں ہو یا کسی ایسی جگہ ہو جہاں کوئی مسجد نہ ہو تو وہاں بھی نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم ہے۔ اگر ایسی جگہ تین افراد اکٹھے ہوں تو بھی انہیں اپنی نماز

اکیلے اکیلے نہیں' بلکہ باجماعت نماز پڑھنے کا حکم ہے ۔ حضرت ابودردائ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا :'' جو تین آدمی کسی بستی یا جنگل میں ہوں اور پھر وہ باجماعت نماز نہ پڑھیں تو شیطان ان پر غالب آجاتا ہے۔ لہٰذا تم جماعت کی پابندی اپنے اوپر لازم کر لو' کیونکہ بھیڑیا اُس بکری کو کھا جاتا ہے جو ریوڑ سے دور ہو۔'' (ابوداؤد)

نماز کے لیے مسجد میں جانا بڑا فضیلت کا عمل ہے۔ صحیحین کی ایک حدیث میں' جس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں' رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ سات قسم کے آدمی ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنی رحمت کے سایہ میں جگہ دے گا جس دن کہ اس کے سایہ رحمت کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہو گا۔ ان افراد میں سے ایک وہ مردِ مؤمن ہے جس کا حال یہ ہے کہ مسجد سے باہر جانے کے بعد بھی اس کا دل مسجد ہی میں اٹکا رہتا ہے۔ مسجد وہ جگہ ہے جو مؤمن کو سکون و اطمینان مہیا کرتی ہے۔وہ مسجد میں گھریلو ماحول سے الگ ہوتا ہے 'نہ وہاں بچوں کا شور و غل نہ گھریلو باتیں۔وہاں تو نماز ہوتی ہے یا نماز کے انتظار میں بیٹھنا ہوتا ہے۔ نماز کے انتظار میں اس طرح بیٹھنا بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ آدمی نماز میں ہو۔ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے رہبانیت اختیار کرنے کی اجازت دے دیجیے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت کی رہبانیت نماز کے انتظار میں مسجدوں میں بیٹھنا ہے۔ (شرح السنہ)

مسجد ایسا بابرکت مقام ہے جہاں بستی کے مسلمان مل کر نماز ادا کرتے ہیں 'جس سے نماز کا ثواب گھر میں یا بازار میں پڑھی جانے والی نماز سے پچیس گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔ پھر جب



تک بندہ مسجد میں نماز پڑھتا ہے اُس وقت تک فرشتے برابر اُس کے حق میں عنایت اور رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں : اے اللہ ! اپنے اس بندے پر خاص عنایت فرما۔ اس پر رحمت فرما۔ نمازی اس دعا کا مستحق رہتا ہے جب تک وہ اپنے ہاتھ یا زبان سے کسی کو ایذا نہ پہنچائے یا اس کا وضو نہ ٹوٹ جائے ۔ ( صحیح بخاری) جب بندہ نماز باجماعت کے ارادے سے گھر سے مسجد کی طرف چل پڑتا ہے تو اس کے لیے ہر قدم پر ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور ایک برائی معاف کر دی جاتی ہے ۔ (نسائی)

مسجدیں اللہ کے ذکر کا محل ہوتی ہیں۔ انہیں بیت اللہ سے ایک خاص نسبت ہے۔ انسانی بستیوں میں بازار اور منڈیاں بھی ہوتی ہیں 'جہاں جا کر عموماً انسان غافل ہو جاتے ہیں' وہاں منکرات و معصیات کی کثرت ہوتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شہروں اور بستیوں میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ان کی مسجدیں ہیں اور سب سے زیادہ مبغوض (ناپسند) ان کے بازار ہیں'' ۔ ( صحیح مسلم)

مسجد کو اللہ کا گھر کہا گیا ہے' اس لیے اس کے آداب کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ قبل ازیں کچھ آداب کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ مسجد میں دنیا کے حالات پر تبصرہ کرنا اور اونچا بولنا منع ہے۔ چھوٹے بے سمجھ بچوں کو مسجد میں نہ لے جائیں جنہیں مسجد کے احترام کا شعور نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ وہاں پیشاب یا پاخانہ کر دیں یا تھوک پھینک دیں۔ البتہ ہوشیار اور سمجھ دار بچوں کو اپنے ساتھ مسجد میں لے کر جائیں تاکہ چھوٹی عمر سے ہی بچوں میں نماز کا شوق پیدا ہو۔ بچوں کے ساتھ مسجد میں نرمی ' محبت اور شفقت کا سلوک کریں۔ مسجد میں گم شدہ چیز کا اعلان کرنا منع ہے۔ مسجد میں ڈرتے اور لرزتے ہوئے جائیں 'داخل ہوتے وقت پہلے دایاں پائوں اندر رکھیں اور مسجد سے باہر نکلتے وقت پہلے بایاں پائوں باہر رکھیں۔ داخل ہوتے وقت اَللّٰھُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِکَ پڑھیں اور نکلتے وقت اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ کہیں۔

مسجد کی تمام چیزیں موقوفہ ہیں 'ان سے ذاتی فائدہ اٹھانا درست نہیں۔ یہ بھی درست نہیں کہ مسجد میں کوئی اپنا موبائل چارج کرے۔ اگر ایسا کرنا ضروری ہو تو اندازاً اتنی رقم مسجد میں دے دی جائے ۔ مسجد میں داخل ہوں تو اپنا موبائل بند کر دیں تاکہ اس کی گھنٹی سے نمازی پریشان نہ ہوں اور ان کی نماز میں خلل واقع نہ ہو۔

* * *



# الاقتصادفِی العِبادۃ

اللہ تعالیٰ نے جو کام انسان کے لیے پسند کیے ہیں ان میں سادگی اور آسانی رکھی ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:{یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ} (البقرۃ:۱۸۵) ''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تنگی نہیں چاہتا''۔ اللہ تعالیٰ رحمن اور رحیم ہے۔ اس کی تمام صفات لامحدود ہیں مگر رحمت کا ذکر خصوصی ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا : {وَ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ} (الاعراف:۱۵۶)''میری رحمت ہر شے پر وسیع ہے''۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے ۔ اُس نے انسان کو پیدا کیا 'وہ اس کی صلاحیتوں کو جانتا ہے اور خود فرماتا ہے : {وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا ﴿۲۸﴾}(النسائ)''انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو اعمال لازم کیے ہیں ان میں

اس کی اس کمزوری کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے : {لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَاط} (البقرۃ:۲۸۶) ''اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا''۔ یہی وجہ ہے کہ تمام لازمی امور میں آسانی کا پہلو رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو عبادات پسند ہیں‘ مگر کوئی شخص عبادات میں مبالغہ کرتا ہے تو اسے اس سے روکا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اللہ کے بندے تھے‘ انہیں عبادت نہایت مرغوب تھی ‘لیکن ان کو بھی روک دیا گیا کہ وہ ساری رات جاگ کر نوافل پڑھنے میں گزاریں۔ سورۃ المزمل کے آغاز میں فرمایا :{قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۙ﴿ ۲ ﴾ نِّصْفَہٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا ۙ﴿ ۳ ﴾ اَوْ زِدْ عَلَیْہِ وَ رَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ؕ﴿ ۴ ﴾ } ''(اے نبی ﷺ !) رات کو قیام کیا کریں‘ سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے۔ نصف رات ‘ اس سے تھوڑا کم یا تھوڑا زیادہ اور ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھیے''۔ اسی سورۃ کی آخری آیت میں‘ جو بعد میں نازل ہوئی‘ دو تہائی یا نصف یا ایک تہائی رات تک قیام کرنے کی پابندی ختم کر دی گئی اور یہ سہولت دے دی گئی کہ ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق قیام اللیل میں جتنا ممکن ہو اتنا قرآن پڑھ لیا کرے۔

حضور اکرم ﷺ کی زندگی اہل ایمان کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ پس پوری رات یا



رات کا بیشتر حصہ عبادت میں گزارنا اللہ کے حکم کے خلاف اور اُسوۂ حسنہ کے عملی نمونے سے تجاوز ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا مشن تھا کہ وہ اللہ کے پسندیدہ کاموں کا حکم دیں اور لوگ اپنی طرف سے جو مشکل کام اختیار کریں ان سے انہیں روکیں۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:{یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ عَنِ الْمُنْکَرِ وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْط} (الاعراف:۱۵۷) ''وہ (رسول اللہ ﷺ) انہیں نیک کام کرنے کا حکم دیتے ہیں اور برے کام سے روکتے ہیں اور پاک چیزوں کو ان پر حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں اور ان پر سے وہ بوجھ اور طوق جو اُن پر تھے اتارتے ہیں''۔یہ اِصر اور اَغلال وہ طریقے تھے جو لوگوں نے اپنی طرف سے اختیار کر رکھے تھے‘ حالانکہ اللہ نے ان کا حکم نہیں دیا تھا۔ بدعات اسی قبیل کی چیزیں ہیں ۔یہود و نصاریٰ نے رہبانیت اختیار کر لی کہ وہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر تجرد کی زندگی گزاریں‘ اس طرح وہ گناہ سے بچے رہیں گے اور اللہ کی عبادت کرتے رہیں گے۔ چونکہ ترکِ دنیا اللہ کا حکم نہ تھا اس لیے وہ اس بدعت کو اختیار کر کے اللہ کو ناراض کر بیٹھے‘ اگرچہ وہ اپنے خیال میں اللہ کی رضا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر اللہ کی رضا تو صرف ان کاموں سے حاصل ہوتی ہے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے یا اُس کے رسول ﷺ نے۔ آج بعض مسلمان بھی عبادات میں غلو کو اچھا جانتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ عبادت کا بہترین انداز اور طریقہ تو وہی ہے جس پر حضور ﷺ عمل پیرا تھے۔ آپؐ رات کی نماز میں اس قدر طویل قیام فرماتے کہ آپؐ کے پائوں مبارک سوج جاتے ‘مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس مشقت سے روک دیا ‘جیسا کہ سورۃ المزمل میں ہے۔

عبادات میں نماز کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ نماز ادا کرنے کی تاکید ہے، مگر غلو کی اس میں بھی اجازت نہیں۔ دن رات میں صرف پانچ نمازیں فرض ہیں۔ اس کے علاوہ نفل پڑھنے کی ترغیب ہے ،مگر نفل نمازوں کی مشغولیت میں حقوق العباد تلف کرنے کی اجازت نہیں۔ دنیاوی زندگی کے ضروری کام کرنے سے نہیں روکا گیا ،بلکہ جائز ضروری کام کو باعث ثواب بتایا گیا ہے۔ روزے سال بھر میں ایک ماہ کے فرض ہیں۔ اس کے علاوہ نفل روزے رکھنا کارِ ثواب ہے، لیکن نفل روزے بھی وہ پسندیدہ ہیں جو حقوق العباد اور دوسرے



ضروری دنیاوی کاموں کی ادائیگی میں رکاوٹ نہ بنیں۔ بخاری اور مسلم کی روایت کردہ حدیث اس بارے میں صحیح طرزِ عمل کی نشاندہی کرتی ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

''تین آدمی رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کے گھروں کی طرف آئے، وہ نبی کریم ﷺ کی عبادت کے بارے میں سوال کرتے تھے ،جب ان کو آپؐ کی عبادت کے بارے میں بتایا گیا تو انہوں نے اس کو تھوڑا سمجھا اور دل میں خیال کیا کہ ہم نبی کریم ﷺ سے کیا مناسبت رکھتے ہیں، آپ ؐ کے اگلے اور پچھلے تمام گناہ معاف ہو چکے ہیں۔ ایک نے کہا کہ میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھتا رہوں گا ۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزے رکھوں گا اور افطار نہیں کروں گا ۔ تیسرے نے کہا میں عورتوں سے الگ تھلگ رہوں گا اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔ چنانچہ (جب رسول اللہ ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو) آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا :تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے ایسی ایسی باتیں کہی ہیں؟ خبردار! اللہ کی قسم، میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں اور تقویٰ اختیار کرتا ہوں ،لیکن میں (نفل) روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور (نفل) نماز بھی پڑھتا ہوں اور سو بھی جاتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں ۔پس جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ میری امت سے نہیں ہے۔'' (متفق علیہ)

اس مضمون کو مزید احادیث میں بھی واضح کیا گیا ہے اور عبادت میں غلو اور مشقت سے روکا گیا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو وہاں دو ستونوں کے درمیان ایک رسی بندھی ہوئی تھی۔ آپؐ نے پوچھا: ''یہ رسی کیسی ہے؟'' صحابہؓ نے عرض کیا: یہ رسی حضرت زینب ؓ نے باندھ رکھی ہے ،جب وہ عبادت کرتے کرتے تھک جاتی ہیں تو رسی کے ساتھ چمٹ جاتی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اسے کھول دو ،تم نشاط کے وقت نماز پڑھو ،جب تھکاوٹ ہو جائے تو آرام کرو۔ (متفق علیہ)

اپنے آپ کو مشقت میں ڈال کر عبادت کرنا اور اس عبادت کو حصولِ ثواب کا ذریعہ سمجھنا نادانی ہے ،کیونکہ یہ سنت کے خلاف ہے ،اور جو کام سنت کے خلاف ہو وہ ثواب کا باعث کیسے ہو سکتا ہے؟

171

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ''میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نمازیں پڑھا کرتا تھا، چنانچہ آپؐ کی نماز اور آپ کا خطبہ درمیانہ ہوتا۔'' (مسلم)

عبادات میں شدت اور سختی نہ صرف منع ہے بلکہ ہلاکت اور بربادی کا سبب ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''شدت اور سختی کرنے والے ہلاک اور برباد ہو گئے''۔ آپؐ نے یہ الفاظ تین مرتبہ دہرائے۔ (مسلم) ویسے تو ہر کام میں میانہ روی ہی پسندیدہ اور نتائج کے اعتبار سے اچھی ہے، مگر عبادت چونکہ اللہ تعالیٰ کو خوش کرتی ہے لہٰذا غلطی سے انسان اس میں غلو کو اچھا جانتا ہے۔ ایسا کرنا تو ممنوعات میں شامل ہے اور سنت کی خلاف ورزی ہے۔ حضرت وہب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

''نبی کریم ﷺ نے سلمان اور ابوالدرداءؓ (رضی اللہ عنہما) کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا، چنانچہ سلمانؓ ابوالدرداءؓ سے ملنے کے لیے گئے تو دیکھا کہ اُمّ الدرداءؓ نے بوسیدہ سا لباس پہن رکھا ہے۔ سلمان نے پوچھا کیا بات ہے؟ انہوں نے جواب دیا: تمہارے بھائی ابوالدرداء کو دنیا سے کچھ حاجت نہیں ہے۔ پس ابوالدرداء آئے تو انہوں نے سلمان کے لیے کھانا تیار کیا اور کہا آپ کھا لیجیے میں روزے سے ہوں۔ سلمان نے کہا جب تک آپ نہیں کھائیں گے میں نہیں کھاؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے بھی کھانا کھا لیا۔ جب رات ہوئی تو ابوالدرداء قیام کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سلمان نے ان سے کہا سو جاؤ۔ وہ سو گئے (کچھ دیر ٹھہر کر) پھر قیام کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سلمان نے کہا سو جاؤ (وہ سو گئے) جب رات کا آخری حصہ ہوا تو سلمان نے کہا: اب اٹھو۔ دونوں نے نماز پڑھی۔ سلمان نے ان سے کہا: بے شک تمہارے پروردگار کا تم پر حق ہے، تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے، پس ہر حق والے کو اس کا حق دو! پھر وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور اس کا آپؐ سے ذکر کیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''سلمان نے سچ کہا۔''

قرآن مجید کی تلاوت بہت بڑی نیکی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں- الٓمٓ ایک نہیں تین حروف ہیں۔ گویا تلاوتِ قرآن نیکیاں کمانے کا بہت اونچا عمل ہے۔ مگر نماز، روزے اور دوسری عبادات کی طرح یہاں بھی میانہ روی ہی پسندیدہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ آپؐ نے مجھ سے فرمایا:

172

''کیا مجھ کو اس بات کی اطلاع نہیں ملی کہ تم ہمیشہ روزہ رکھتے ہو اور ہر رات میں قرآن ختم کرتے ہو؟'' میں نے کہا جی ہاں یارسول اللہ! اور میں اس سے بھلائی کا ہی ارادہ رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام جیسا

روزہ رکھو۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ عبادت گزار تھے اور ایک مہینہ میں ایک قرآن ختم کرو ''۔ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے نبیؐ میں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا : ''تو بیس دن میں ختم کرو''۔ میں نے کہا :اے اللہ کے نبیؐ ! میں اس سے زیادہ کی قوت رکھتا ہوں۔ تو آپؐ نے فرمایا : ''دس روز میں ختم کرو''۔ میں نے عرض کیا یا نبی اللہ ! میں اس سے بھی زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں ۔تو آپؐ نے فرمایا: ''ایک ہفتہ میں قرآن پڑھو اور اس پر زیادتی نہ کرو''...الخ ( صحیحین)

حج زندگی میں ایک بار فرض ہے ‘وہ بھی اُس پر جس کو استطاعت ہو ‘ورنہ نہیں۔ جس نے ایک دفعہ حج کر لیا وہ کافی ہے۔ ہاں اگر وہ اس کے بعد نفل حج کرنا چاہے یا عمرہ کرے تو اچھا ہے‘ فرض تو ادا ہو چکا۔ اسی طرح زکوٰۃ صاحب مال پر پورے سال کے بعد اڑھائی فیصد فرض ہے ۔یہ شرح زائد از ضروریات مال رکھنے والے کے لیے معمولی رقم ہے۔ہاں وہ اس کے علاوہ صدقہ و خیرات کرے تو عند اللہ ماجور ہو گا۔یہاں بھی اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات سے بچ جانے والے مال پر انفاق فی سبیل اللہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ ﴿ وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَؕ﴾ (البقرۃ:۲۱۹) ''(اے نبیؐ !) آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے جو ضرورت سے زائد ہو''۔ اس بات کو ناپسند کیا گیا ہے کہ کوئی صاحب مال اپنے اور اپنے بال بچوں پر کنجوسی سے خرچ کرے۔ نہ اچھا کھائے نہ پہنے اور صاحب مال ہونے کے باوجود اپنے اور اپنے اہل و عیال پر غربت طاری رکھے ‘کیونکہ اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے جائز اخراجات پورے کرنا بھی ضروری ہے ‘بلکہ ثواب کا باعث ہے۔

المختصر جس طرح رسول اللہ ﷺ کا اُسوہ ہر عمل میں اعلیٰ معیار کا ہے‘ اسی طرح عبادات کا انداز اور طریقہ بھی وہی صحیح ہے جس کی آپ ؐنے ہدایت دی ہے۔ اورجو کوئی اس کے خلاف میں بہتری سمجھے وہ اسلام کے عمومی مزاج سے بے خبر ہے۔

* * *



# نفل نمازوں کی اہمیت اور ضرورت

ہر مسلمان پر ایک دن رات کے دوران پانچ نمازیں فرض ہیں۔ ان کی ادائیگی انتہائی ضروری ہے ۔حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرے خلیل و محبوب ﷺ نے مجھے وصیت فرمائی ہے کہ ''اللہ کے ساتھ کبھی کسی چیز کو شریک نہ کرنا اگرچہ تمہارے ٹکڑے کر دیے جائیں اور تمہیں آگ میں بھون دیا جائے اور خبردار کبھی بالارادہ نماز نہ چھوڑنا کیونکہ جس نے (دیدہ و دانستہ اور) عمداً نماز چھوڑ دی تو اس کے بارے میں وہ ذمہ داری ختم ہو گئی (جو اللہ کی طرف سے اس کے وفادار اور صاحب ایمان بندوں کے لیے ہے) اور خبردار شراب کبھی نہ پینا کیونکہ وہ ہر برائی کی کنجی ہے۔'' (سنن ابن ماجہ)

فرض نمازوں کو مسجد میں جا کر باجماعت پڑھنے کا تاکیدی حکم ہے ۔ ایک نابینا صحابی رضی اللہ عنہ نے جب رسول اللہ ﷺ سے اپنی معذوری کے سبب اجازت مانگی کہ وہ فرض نماز گھر میں پڑھ لیا کریں تو آپؐ نے انہیں اجازت نہ دی اور فرمایا: ''اگر تم اذان کی آواز سنتے ہو تو تم فرض نمازیں مسجد میں آ کر باجماعت ادا کیا کرو۔'' (مسلم)

جماعت کے ساتھ فرض نماز کی ادائیگی کا حکم {وَ ارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ ﴿۴۳﴾} (البقرۃ) کے الفاظ کے ساتھ قرآن مجید میں موجود ہے۔ نماز کے ارکان مثلاً قیام' رکوع' سجدہ اور قعدہ اللہ کے حضور حاضر ہونے کی پسندیدہ حالتیں ہیں۔ ان میں پھر سجدے کی حالت کو زیادہ فضیلت حاصل ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ سجدے کی حالت میں اپنے رب کے انتہائی قریب ہوتا ہے' اس لیے سجدے کی حالت میں زیادہ دعائیں کرو۔'' نماز کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک فرمایا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ فرائض کے علاوہ بھی کثرت کے ساتھ نمازوں میں مشغول رہا کرتے تھے' اور ہر فرض نماز کے ساتھ نوافل کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ نفل زاید چیز کو کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں مالِ غنیمت کو انفال کیا گیا ہے' کیونکہ اصل چیز تو اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے جہاد و قتال ہے اور اس عمل میں اگر



دشمن کا کچھ مال بھی مل گیا تو گویا یہ ایک زاید فائدہ ہوا۔ اس اضافی فائدے کو انفال کہا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نفل بھی کثرت کے ساتھ پڑھتے تھے۔ اس ضمن میں آپ کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات آپؐ اتنی دیر تک نفل پڑھتے رہتے کہ کھڑے کھڑے پائوں میں ورم آجاتا تھا۔ ہر فرض نماز کے ساتھ نبی مکرم ﷺ کچھ نوافل ضرور پڑھتے تھے۔ ایسے نوافل افراد اُمت کے لیے سنت کی حیثیت سے رائج ہیں' جیسے صبح کی نماز میں فرضوں سے پہلے دو رکعتیں' ظہر کی نماز سے پہلے چار رکعتیں اور بعد میں دو رکعتیں' مغرب میں فرضوں کے بعد دو رکعتیں اور عشاء میں فرضوں کے بعد دو رکعتیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو مسلمان آدمی ہر روز فرضوں کے علاوہ اللہ کی رضا کی خاطر بارہ رکعتیں نفل ادا کرتا ہے تو اللہ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دیتا ہے''۔

(مسلم)یہ تو وہ بارہ رکعتیں ہیں جو ہر فرض نماز کے ساتھ جوڑ دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی نفل نمازیں پڑھنے کا معمول ہونا چاہیے جن کا بہترین وقت رات ہے۔ جن نفل نمازوں کے متعلق یہ مشہور ہے کہ آپؐ ان میں اتنا طویل قیام کرتے کہ آپ کو پائوں میں ورم آجاتا ‘وہ آپؐ کے رات کے نفل ہی ہوتے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تو آپؐ کے شیدائی تھے ‘جو عمل آپ کو محبوب ہوتا تھا وہ اُن کا بھی پسندیدہ عمل ہو جاتا تھا‘ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی کثرت کے ساتھ نوافل پڑھتے تھے۔ فرض نمازیں تو مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ پڑھنی ضروری ہیں مگر نفلوں کے لیے بہترین جگہ گھر ہے۔ فرضوں سے ماقبل کی سنتیں گھر میں پڑھی جائیں اور بعد کی سنتیں بھی گھر آکر ادا کی جائیں۔ اگرچہ مسجد میں بھی پڑھ سکتے ہیں مگر گھر میں پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے۔ آپ ؐنے فرمایا :’’تم اپنی نمازوں کو اپنے گھروں میں پڑھا کرو اور اپنے گھروں کو قبرستان نہ بنائو۔‘‘ (مسلم) اس سے مراد نفل نمازیں ہیں‘ کیونکہ فرض تو بہر حال مسجد میں ہی ادا کیے جائیں گے۔

نفل نمازیں گناہوں کی بخشش کا سبب ہیں۔ ان کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ فرض نمازوں کی ادائیگی میں اگر کمی رہ گئی ہو تو اللہ تعالیٰ اپنی خاص رحمت سے اُس کمی کو نفلوں کے ذریعے پوری فرما دیں گے۔ جامع ترمذی کی ایک روایت میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :قیامت کے دن بندے کے اعمال میں سے سب سے پہلے نماز کا حساب ہو گا اور اس کی نماز جانچی جائے گی‘ اگر وہ ٹھیک نکلی تو بندہ فلاح یاب اور کامیاب ہو جائے گا اور اگر وہ خراب نکلی تو بندہ ناکام اور نامراد رہ



جائے گا۔پھر اگر اس کے فرائض میں کمی ہوئی تو ربّ کریم فرمائے گا کہ دیکھو کیا میرے بندے کے ذخیرۂ اعمال میں فرائض کے علاوہ کچھ نیکیاں (سنتیں یا نوافل) ہیں تاکہ اُن سے اِس کے فرائض کی کمی پوری ہو سکے؟ پھر نماز کے علاوہ باقی اعمال کا حساب بھی اسی طرح ہو گا۔

کچھ نوافل خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:’’ فرض نماز کے بعد سب سے افضل وسط رات کی نماز ہے ‘یعنی نماز تہجد۔‘‘ (صحیح مسلم) عشاء اور فجر کے درمیان کوئی نماز فرض نہیں کی گئی۔ یہ وقت آرام کرنے کا ہے ‘مگر جو بندہ عشاء کی نماز پڑھ کر سو جائے اور آدھی رات گزرنے کے بعد کسی وقت اٹھ جائے اور وضو کر کے اُس سکوت اور سناٹے میں نفلوں کے لیے کھڑا ہو جائے اور فجر کا وقت شروع ہونے سے پہلے پہلے فارغ ہو جائے تو یہ نماز تہجد ہے۔ چونکہ رات کے وقت نیند اور آرام کو قربان کرنا آسان کام نہیں اس لیے اس قیام کا ثواب بھی بے انتہا ہے۔ سورۃ الاسراء میں اللہ تعالیٰ نے آپ ؐکو تہجد کی نماز کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ مقام محمود کی امید بھی دلائی ہے۔ مقامِ محمود عالم آخرت اور جنت میں بلند ترین مقام ہو گا۔ گویا مقامِ محمود کی نمازِ تہجد کے ساتھ خصوصی مناسبت ہے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی خاص رحمت کے

ساتھ ہر رات کے آخری حصہ میں اپنے بندوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اُس وقت جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور رکوع و سجود میں مشغول ہوں اُن کی خوش بختی کا کیا کہنا ! تہجد کے علاوہ کچھ اور نفل نمازیں بھی ہیں جن کی خصوصی فضیلت ہے۔ ان میں نماز اشراق ہے جو طلوع آفتاب کے تھوڑی دیر بعد پڑھی جاتی ہے ‘پھر نمازچاشت ہے جو دن کے اچھی طرح چڑھنے کے بعد پڑھی جاتی ہے۔ ان نمازوں کو بھی گناہوں کی بخشش کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔

نفل نمازوں کی اس قدر فضیلت کا تقاضا ہے کہ بندہ ان نمازوں کے لیے ضرور وقت نکالے ۔ دنیوی مفاد کے لیے انسان کتنی مشقت اور تکلیف اٹھاتا ہے‘ روزی کی تلاش میں کہاں کہاں کی خاک چھانتا پھرتا ہے اور اس ساری تگ ودوکا مقصد حیاتِ مستعار کے اوقات کو بہتر بنانا ہوتا ہے‘جبکہ نوافل میں لگائی ہوئی محنت اور وقت انسان کی خطاؤں کی معافی اور آخرت کی کامیابی کا باعث بنے گا۔ صرف فرض نمازوں پر قناعت کرنا مناسب نہیں‘ بلکہ زندگی کے شب و روز سے آنے والی ابدی زندگی کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی خاطر نفل نمازوں کا اہتمام کرنا بھی ضروری ہے۔ نفل نمازوں میں تحیۃ الوضوء کے دو نفل بھی ہیں جو وضو کے



بعد شکرانے کے طور پر پڑھے جاتے ہیں‘ ان کی بھی بڑی فضیلت ہے ۔حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اس نماز کے ساتھ خصوصی دلچسپی تھی‘ جس کے نتیجہ میں رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنے آگے آگے جنت میں دیکھا۔ اسی طرح تحیۃ المسجد وہ دو رکعتیں ہیں جو بندہ مسجد میں داخل ہو کر بیٹھنے سے پہلے ادا کرے‘گویا یہ شکرانے کے دو نفل ہیں جو وہ مسجد میں آنے کی توفیق دینے پر اللہ کے حضور ادا کرتا ہے۔

رمضان کے مبارک مہینے کی راتوں میں نوافل کی کثرت کا بہت بڑا اجر و ثواب ہے۔یہ نوافل تراویح کے نام سے امت میں معروف ہیں اور رمضان کی راتوں میں ان کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ تراویح کی یہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اور اس میں پورا قرآن حکیم از اول تا آخر پڑھا جاتا ہے۔ جو لوگ سارا مہینہ باقاعدگی سے تراویح پڑھتے ہیں وہ اس نماز کے دوران قرآن حکیم کی مکمل قراءت سن لیتے ہیں اور ڈھیروں ثواب کے حق دار قرار پاتے ہیں حتیٰ کہ اس نماز پر گناہوں کی بخشش کی خوشخبری دی گئی ہے---- جس طرح رمضان شریف میں دن کا روزہ فرض اور فضیلت کا باعث ہے اسی طرح رات کے نوافل بھی گناہوں کی بخشش کی خاص تاثیر رکھتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جو لوگ رمضان کی راتوں میں نوافل (تراویح و تہجد) پڑھیں گے ان کے سب پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔‘‘ (بخاری و مسلم)جس طرح پیچھے ذکر ہوا کہ نفل نمازوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ بندے کی فرض نمازوں میں کمی اپنے فضل و کرم سے پوری کر دیں گے‘ اسی طرح امید ہے کہ نفل روزوں کے ذریعے رمضان کے فرض روزوں کی کمی اور نفلی صدقات کے ذریعے زکوٰۃ کی ادائیگی میں کمی اور کوتاہی بھی پوری کر دی جائے گی۔ پھر کون مسلمان بندہ ایسا ہے کہ جو یہ دعویٰ کر سکے کہ شعور کی

زندگی سے لے کر آج تک اُس نے پورے فرائض کسی کمی اور کوتاہی کے بغیر ادا کیے ہیں؟ اگر ایسا نہیں' اور یقینا ایسا نہیں ہے تو ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ فرض نمازوں کے ساتھ نفل نمازوں کا بھی اہتمام کرے' رمضان کے روزوں کے علاوہ نفل روزے بھی رکھے اور فرض زکوٰۃ کے علاوہ صدقات' اور خیرات بھی دیتا رہے' کیونکہ یہ وہ چیزیں ہیں جو آخرت میں اس وقت کام آنے والی ہیں جب کوئی دوست' عزیز رشتہ دار' حتیٰ کہ ماں باپ اور اولاد بھی کچھ کام نہ آئیں گے اور ہر کوئی خود اپنے اعمال کا جواب دہ ہو گا۔

* * *

177

# نماز کی اہمیت اور تارکِ نماز کا انجام

کوئی مسلمان ایسا نہیں جو نماز کی اہمیت سے بے خبر ہو۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی بڑی تعداد نماز کی ادائیگی سے غافل ہے۔ نماز کی اہمیت قرآن و حدیث سے واضح ہے۔ مسلمان کا آخرت پر ایمان ہے اور آخرت کی زندگی میں دنیاوی زندگی میں کیے گئے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سب سے پہلے بندے سے نماز کا حساب لیا جائے گا۔ جب نماز کا عمل اتنا ضروری ہے تو اس کی ادائیگی کو آسان بنایا گیا ہے تاکہ ہر شخص اس کا اہتمام کرے۔

ایک دن رات میں پانچ نمازیں ادا کرنا فرض ہیں۔ ہر نماز کی ادائیگی میں چند منٹ صرف ہوتے ہیں۔ نماز پڑھنے کی جگہ مسجد ہے' اگرچہ نماز ہر صاف ستھری جگہ پر پڑھی جا سکتی ہے۔ مسجد بنانا ایسا ہی ہے جیسا جنت میں گھر بنانا۔ اس ترغیب کی بنا پر اور نماز کی اہمیت کے پیش نظر ہر چھوٹی بڑی بستی' گاؤں یا شہر میں مسجدیں موجود ہیں۔ محلوں کے اندر مسجدیں ہیں۔ ہماری آبادیوں میں ہر مسلمان کے گھر کے نزدیک مسجد ہے۔ ہر نماز کے وقت مسجد میں اذان ہوتی ہے' جس میں اونچی آواز سے قریب کے مسلمانوں کو نماز کے وقت سے آگاہ کیا جاتا ہے تاکہ یہ آواز سن کر نماز کے لیے تیار ہوا جائے۔ پھر اذان کے الفاظ یہ ہیں: حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃ ... حَیَّ عَلَی الْفَلَاح '' نماز کی طرف آئو! ... کامیابی کی طرف آئو!'' اور یہ آواز اللہ تعالیٰ کا حکم یاد دلاتی ہے۔ پانچ وقت یہ الفاظ سن کر نماز کی ادائیگی کے لیے تیار نہ ہونا اور اسے معمول کی آواز سمجھنا بڑی کم فہمی ہے۔ نماز کو جنت کی کنجی کہا گیا ہے اور ہر شخص کی تمنا

ہے کہ اگلی زندگی میں اسے جنت نصیب ہو۔ نماز مسلمان کی شناخت ہے۔ قرآن مجید میں نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم بار بار تاکید کے ساتھ آیا ہے۔ اتنی تاکید اور یاد دہانی کسی دوسرے فرض کی ادائیگی کے لیے نہیں۔ اس لیے کہ مسلمان اور کافر میں نماز کا فرق بتایا گیا ہے۔

نجات صرف مسلمان کے لیے ہے۔ نماز ادا نہ کرنے سے ڈر ہے کہ بندہ مشرک ہو جائے

---



اور مشرک کے لیے نجات نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :{اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ لَا تَکُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۳۱﴾} (الروم)''نماز پڑھتے رہو اور مشرکوں میں سے نہ ہونا''۔ مشرک وہ شخص ہے جس کے لیے ہمیشہ کی جہنم ہے۔ سورۃ البینہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''... مشرک ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے۔ یہ لوگ ساری مخلوق سے بدتر ہیں''۔ (آیت ٦)

نماز کسی حال میں بھی معاف نہیں۔ اگر کوئی شخص بیمار یا معذور ہو تو وہ بھی نماز ادا کرے۔ بیٹھ کر پڑھے' لیٹ کر پڑھے ۔ اگر ایسا بھی نہ کر سکے تو اشارے سے پڑھے۔ نماز نہ پڑھنے کا کوئی عذر نہیں۔ سفر میں بھی نماز ادا کرنا ضروری ہے۔ نمازِ قصر کا حکم قرآن میں سفر ہی کے لیے ہے۔ حالت جنگ میں بھی نماز باجماعت ادا کی جائے گی۔ اس کا حکم قرآن مجید میں موجود ہے اور ادائیگی کا طریقہ رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے۔ گویا نماز ایسا فرض ہے جو کسی شخص سے کسی حال میں بھی معاف نہیں۔ پھر اچھے خاصے صحت مند مسلمان بھی نماز نہ پڑھیں' یہ بات ناقابل فہم ہے۔

نماز رسول اللہ ﷺ کی پسندیدہ عبادت ہے۔ آپؐ فرض نمازوں کے علاوہ نفل نمازیں کثرت سے پڑھتے' آپؐ رات کا بیشتر حصہ نماز میں قیام کرتے۔ آپؐ نے فرمایا :''نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی نماز سے حد درجہ محبت تھی۔ مسلمان بزرگانِ دین کا بھی یہی حال تھا۔ بعض بزرگوں کو شیطان نے یہ وسوسہ ڈالنے کی کوشش کی کہ تمہارے تقویٰ' نیک نفسی اور کثرتِ عبادت کی وجہ سے تم سے نماز معاف ہے' تو کسی نے بھی شیطان کا یہ وسوسہ قبول نہ کیا' بلکہ لاحول پڑھ کر اس کو بھگا دیا۔

نماز کے لیے وضو شرط ہے۔ خود وضو کے ظاہری اور باطنی بے شمار فوائد ہیں۔ اس سے انسان صاف ستھرا اور چست ہو جاتا ہے اور صفائی و پاکیزگی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے : {وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُطَّہِّرِیۡنَ ﴿۱۰۸﴾}(التوبہ) ''اور اللہ ایسے بندوں کو محبوب رکھتا ہے جو بہت زیادہ پاکیزگی اختیار کرتے ہیں۔''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اپنی امت کے لوگوں کو اس طرح پہچان لوں گا کہ ان کے وضو کے اعضاء روشن ہوں گے اور یہ روشنی ان کی کامیابی اور نجات کی علامت ہو گی''۔ نماز کے علاوہ اکثر اوقات باوضو

رہنے کو پسند کیا گیا ہے۔ وضو نہ صرف جسمانی صفائی کا باعث ہے بلکہ اس سے روحانی ترفع بھی حاصل ہوتا ہے۔ رات کو باوضو سونا فضیلت کا باعث ہے ۔جو شخص باوضو فوت ہو جائے اسے جنت کی بشارت ہے۔ پاکیزگی



فطرتِ سلیمہ ہے' طہارت فرشتوں کی خصلت ہے۔ پس نماز کے لیے طہارت کو لازمی قرار دینا اس لیے بھی ضروری ہے کہ نماز میں انسان اللہ کے حضور حاضر ہوتا ہے اور اُس وقت پاکیزہ ہی ہونا چاہیے۔ نماز پڑھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا جسم پاک صاف ہو' اسی طرح اُس کا لباس بھی اُجلا اور پاک ہو۔ نماز کی برکت سے نمازی شخص ہر وقت بتکلف صاف ستھرا رہے گا۔

شیطان انسان کا بدترین دشمن ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی جماعت میں شامل کر کے جہنم کا ایندھن بنائے۔ وہ مکار دھوکے باز ہے۔وہ انسان کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نماز کی کوئی ضرورت نہیں' وہ غفور ورحیم ہے' اُس کی رحمت اور مغفرت بے پایاں ہے' وہ کسی بے نمازی کو سزا نہیں دے گا بلکہ وہ تو تمام گناہوں کو بشمول نماز معاف کر دے گا۔ نماز اس کا تاکیدی حکم تو ہے 'لیکن اُس بے نیاز ذات کے لیے کسی بے نماز کو بخش دینا چنداں مشکل نہیں۔ اس طرح اس کا وسوسہ لوگوں کو نماز سے دور رکھنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ وہ مسلمان کے ذہن سے یہ بات فراموش کر دیتا ہے کہ نماز پڑھنا اللہ تعالیٰ کا تاکیدی حکم ہے اور نماز نہ پڑھنا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے اور رحمان و رحیم مالک کی حکم عدولی کسی اعتبار سے اچھی نہیں۔ شیطان لوگوں کو صراطِ مستقیم سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ لوگوں کو گمراہ کرنے میں انتہائی ماہر ہے۔ اس کی مہارت کا اندازہ لگائیے کہ وہ دین توحید کے ماننے والوں کو بھی شرکیہ کاموں میں مشغول کر دیتا ہے ۔ انسان سمجھتا ہے کہ میں کلمہ توحید کا قائل مسلمان ہوں' اگر میں غیر اللہ سے استمداد کروں ' فوت شدہ بزرگوں کی خدمت میں نذر و نیاز پیش کروں اور دوسرے ایسے کام کروں 'جن میں غیر اللہ کی رضا اور خوشنودی شامل ہو تو مجھے دین توحید کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے کوئی نقصان نہ ہوگا ۔ایسا مسلمان بھول جاتا ہے کہ شرکیہ کام کرنے کی کسی مسلمان کو بھی اجازت نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:{وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُہُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَ ہُمْ مُّشْرِکُوْنَ ﴿۱۰۶﴾} (یوسف) ''اور اکثر لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے مگر وہ (اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں''۔یہ شیطانی وسوسہ ہے جس کے دھوکے میں آکر دین توحید کا ماننے والا طرح طرح کے شرکیہ کام کرتا ہے ۔ نماز نہ پڑھنا بھی شرکیہ کام ہے 'جیسا کہ پیچھے سورۃ الروم آیت ۳۱ میں گزرا۔

قرآن و سنت کے اندر نماز کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:



بندے اور کفر وشرک کے درمیان نماز چھوڑدینے ہی کا فاصلہ ہے''۔ (صحیح مسلم)نماز کا حقیقت ایمان کے ساتھ ایسا گہرا تعلق ہے کہ نماز چھوڑ دینا آدمی کو کفر کی سرحد تک پہنچا دیتا ہے۔ نماز نہ پڑھنا حضور ﷺ کو اس قدر ناپسند

تھا کہ ایک دفعہ آپؐ نے خطبے میں ارشاد فرمایا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دوں جو نماز کے لیے نہیں آتے۔ ایک حدیث میںآپ ﷺ نے نماز نہ پڑھنے والوں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ان کا حشر قیامت میں قارون' ہامان' فرعون اور ابی بن خلف کے ساتھ ہو گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے باغی ہیں۔آپ ﷺ کا ارشاد ہے ''جس نے دیدہ دانستہ اور عمداً نماز چھوڑ دی وہ ہماری ملت سے خارج ہو گیا''۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی مؤمن مسلمان نماز کا تارک ہو۔ اس لیے اُس وقت تارکِ نماز ہونا مسلمان نہ ہونے کی علامت تھی۔

نماز نہ پڑھنے کا اس سے زیادہ نقصان کیا ہو سکتا ہے کہ ایسا کرنا اُس مالک کی نافرمانی ہے جس کے سامنے سب حاجت مند ہیں اور وہی مشکل سے نکالتا ہے۔ پھر یہ رسول اللہ ﷺ کی حکم عدولی ہے اور رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین' انسانوں کے سب سے زیادہ ہمدرد اور اپنی امت کے خیر خواہ ہیں۔ نماز کا نہ پڑھنا آپکو کسی صورت گوارا نہیں ۔جنگ اُحد کے موقع پر جب کافروں کے ساتھ تصادم میں آپؐ عصر کی نماز وقت پر ادا نہ کر سکے تو آپؐ نے کافروں کو ان الفاظ میں بددعا دی: ''اللہ تعالیٰ ان کے گھروں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے۔''(متفق علیہ) حالانکہ آپؐ سراپا رحمت تھے۔

نماز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہے ۔ ہر شخص نجات کا خواہاں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ بندے پر راضی ہو گیا تو وہ اسے جنت میں داخل کر دے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا :''اللہ تعالیٰ پنجگانہ نمازوں کے ذریعے خطاؤں کو دھوتا اور مٹاتا ہے۔'' (متفق علیہ) آپؐ نے یہ بھی فرمایا: ''جب مؤمن بندہ خالص اللہ کے لیے نماز پڑھتا ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑجاتے ہیں جس طرح درخت کی سوکھے پتوں والی ٹہنی کو ہلائیں تو اُس کے پتے گر جاتے ہیں''۔ (مسند احمد) جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا :''ٹھیک وقت پر نماز پڑھنا۔''(متفق علیہ)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:



((خَمْسُ صَلَوَاتٍ اِفْتَرَضَهُنَّ اللهُ تَعَالٰى، مَنْ اَحْسَنَ وُضُوْئَ هُنَّ وَصَلاَّهُنَّ لِوَقْتِهِنَّ وَاَتَمَّ رُكُوْعَهُنَّ وَخُشُوْعَهُنَّ كَانَ لَهٗ عَلَى اللهِ عَهْدٌ اَنْ يَّغْفِرَلَهٗ، وَمَنْ لَّمْ يَفْعَلْ فَلَيْسَ لَهٗ عَلَى اللهِ عَهْدٌ اِنْ شَاءَ غَفَرَلَهٗ وَاِنْ شَاءَ عَذَّبَهٗ))(رواہ احمد و ابوداؤد)

''پانچ نمازیں اللہ تعالیٰ نے فرض کی ہیں۔ جس نے ان کے لیے اچھی طرح وضو کیا اور ٹھیک وقت پر ان کو پڑھا اور رکوع و سجود بھی جیسے کرنے چاہئیں ویسے ہی کیے اور خشوع کی صفت کے ساتھ ان کو ادا کیا تو ایسے شخص کے لیے اللہ تعالیٰ کا پکا وعدہ ہے کہ وہ اس کو بخش دے گا 'اور جس نے ایسا نہیں کیا (اور نماز کے بارے میں

اس نے کوتاہی کی) تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا کوئی وعدہ نہیں' چاہے گا تو اس کو بخش دے گا اور چاہے گا تو سزا دے گا۔''

* * *



# رمضان المبارک
# نیکیوں کی نشوونما کا موسم بہار

رمضان المبارک اسلامی سال کا نواں مہینہ ہے۔یہ مہینہ امتیازی شان رکھتا ہے' کیونکہ اس میں قرآن حکیم نازل ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کی بہت سی احادیث میں اس ماہِ مبارک کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ رمضان حصولِ ثواب کے لیے سازگار ماحول مہیا کرتا ہے۔اس لیے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ معمول تھا کہ وہ رمضان کے استقبال کی خصوصی تیاری کرتے تھے۔ مسلمانوں کو اس مہینہ کے روزے رکھنے کا حکم ہے اور روزہ ارکان اسلام میں سے ایک رکن ہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آغازِ رمضان سے ایک روز قبل رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں تفصیل کے ساتھ ماہِ رمضان کا تعارف کرایا اور شب و روز کے معمول بتائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((یَا اَیُّھَا النَّاسُ فَقَدْ اَظَلَّکُمْ شَھْرٌ عَظِیْمٌ، شَھْرٌ مُّبَارَکٌ ، شَھْرٌ فِیْہِ لَیْلَۃٌ خَیْرٌ مِنْ اَلْفِ شَھْرٍ، جَعَلَ اللّٰہُ صِیَامَہٗ فَرِیْضَۃً وَقِیَامَ لَیْلِہٖ تَطَوُّعًا ۔ مَنْ تَقَرَّبَ فِیْہِ بِخَصْلَۃٍ مِّنَ الْخَیْرِ کَانَ کَمَنْ اَدّٰی فَرِیْضَۃً فِیْمَا سِوَاہُ، وَمَنْ اَدّٰی فَرِیْضَۃً فِیْہِ کَانَ کَمَنْ اَدّٰی سَبْعِیْنَ فَرِیْضَۃً فِیْمَا سِوَاہُ ، وَھُوَ شَھْرُ الصَّبْرِ، وَالصَّبْرُ ثَوَابُہُ الْجَنَّۃُ، وَشَھْرُ الْمُوَاسَاۃِ، وَشَھْرٌ یُزَادُ فِیْہِ رِزْقُ الْمُؤْمِنِ ۔ مَنْ فَطَّرَ فِیْہِ صَائِمًا کَانَ لَہٗ مَغْفِرَۃٌ لِذُنُوْبِہٖ وَعِتْقُ رَقَبَتِہٖ مِنَ النَّارِ، وَکَانَ لَہٗ مِثْلُ اَجْرِہٖ مِنْ غَیْرِ اَنْ یُّنْتَقَصَ مِنْ اَجْرِہٖ شَیْ یٌٔ)) قُلْنَا: یَارَسُوْلَ

اللہِ لَیْسَ کُلُّنَا یَجِدُ مَا یُفَطِّرُ بِہِ الصَّائِمَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ: ((یُعْطِی اللہُ ھٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلٰی مَذْقَۃِ لَبَنٍ اَوْ شَرْبَۃٍ مِّنْ مَّائٍ، وَمَنْ اَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاہُ اللہُ مِنْ حَوْضِیْ شُرْبَۃً لَّا یَظْمَأُ حَتّٰی یَدْخُلَ الْجَنَّۃَ، وَھُوَ



شَھْرٌ اَوَّلُہٗ رَحْمَۃٌ وَّاَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ وَّآخِرُہٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ، وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَّمْلُوْکِہٖ فِیْہِ غَفَرَ اللہُ لَہٗ وَاَعْتَقَہٗ مِنَ النَّارِ))(رواہ البیھقی فی شعب الایمان، بحوالہ مشکوٰۃ، کتاب الصوم)

''لوگو! تمہارے اوپر ایک عظمت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے۔ یہ برکت والا مہینہ ہے۔ اس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہینہ کے روزے فرض قرار دیے ہیں اور اس کی رات کی عبادت نفل قرار دی ہے۔ جو شخص اس مہینہ میں کسی نیکی سے اللہ تعالیٰ کی قربت تلاش کرے (یعنی رب تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نفل عبادت کرے) اس کا ثواب اتنا ہی ہوتا ہے جتنا رمضان کے سوا دوسرے مہینوں میں فرض کا۔ اور جو شخص اس مہینہ میں فرض ادا کرے اس کو غیر رمضان میں ادا کیے ہوئے فرض سے ستر گنا ثواب ملتا ہے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے۔ یہ غم خواری کا مہینہ ہے۔ اس میں مؤمن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے ۔ جو شخص اس مہینہ میں کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرائے وہ اس کے لیے گناہوں کی بخشش کا سبب ہوتا ہے اور دوزخ کی آگ سے نجات کا ذریعہ۔ اور اس کو بھی روزہ دار کے برابر ثواب ملتا ہے جبکہ روزہ دار کے ثواب میں بھی کوئی کمی نہیں ہوتی''۔ ہم نے پوچھا: یارسول اللہ! ہم سب کے پاس اتنا سامان نہیں ہے کہ اس سے ہم روزہ دار وںکے روزے افطار کرائیں! آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی عطا فرماتا ہے جو لسّی کے ایک گھونٹ، ایک کھجور یا پانی کے ایک گھونٹ سے کسی کا روزہ افطار کرائے، اور جو شخص روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائے اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض سے ایسا سیراب کرے گا کہ پھر اس کو کبھی پیاس نہ لگے گی حتیٰ کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ اور یہ مہینہ ایک ایسا مہینہ ہے کہ اس کے ابتدا میں رحمت ہے، درمیان میں مغفرت اور آخر میں دوزخ سے نجات۔ اور جس شخص نے اس مہینہ میں اپنے (روزہ دار) غلام پر کام کا بوجھ ہلکا کر دیا اللہ تعالیٰ اس کو بخش دیتا ہے اور اسے دوزخ کی آگ سے نجات دیتا ہے۔''

اس حدیث سے رمضان المبارک کا پروگرام واضح طور پر سمجھ میں آرہا ہے کہ مسلمان دن کو روزہ رکھیں، یعنی رضائے الٰہی کی خاطر بھوک اور پیاس برداشت کریں، اور رات کو قیام کریں، یعنی اجتماعی طور پر قرآن کی تلاوت اور سماعت کا اہتمام کریں جسے عرفِ عام میں نمازِ تراویح

کہا جاتا ہے۔ چونکہ ان ایام میں تھوڑی عبادت کا زیادہ ثواب ملتا ہے اس لیے رمضان المبارک میں مساجد کی رونق بڑھ جاتی ہے ‘لوگ بکثرت نوافل پڑھتے اور تلاوت کرتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ فُتِحَتْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ [وَفِیْ رِوَایَۃٍ : فُتِحَتْ اَبْوَابُ الْجَنَّۃِ] وَاُغْلِقَتْ اَبْوَابُ جَھَنَّمَ ‘ وَسُلْسِلَتِ الشَّیَاطِیْنُ)) وَفِیْ اُخْرٰی: ((فُتِحَتْ اَبْوَابُ الرَّحْمَۃِ)) (متفق علیہ)

’’جب رمضان شروع ہوتا ہے تو آسمان کے دروازے [ایک دوسری روایت میں ہے کہ جنت کے دروازے] کھول دیے جاتے ہیں‘ اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں ‘اور شیطانوں کو زنجیریں پہنا دی جاتی ہیں‘‘۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ ’’رحمت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔‘‘

اس طرح رمضان المبارک میں ربّ العزت کی طرف سے نیکی کمانے کے لیے سازگار ماحول میسر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں ایک لمحۂ فکریہ بھی ہے کہ سازگار ماحول کی فراہمی کے باوجود جو لوگ رمضان میں اپنے شب و روز کے معمولات تبدیل نہیں کرتے اور بدستور برائی پر عمل پیرا رہتے ہیں ‘وہ انتہائی ناپسندیدہ قرار پاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے سزاوار بنتے ہیں‘ کیونکہ جو لوگ سرکش شیطانوں کے قید کر دیئے جانے کے باوجود بھی گناہ کرتے ہیں گویا کہ وہ اپنی ذات کو گناہوں کا اس حد تک خوگر بنا چکے ہوتے ہیں کہ اب انہیں کسی بیرونی تحریص و ترغیب کی ضرورت نہیں رہتی‘ بلکہ ان کے باطن میں شیطان نے ہمہ وقتی بسیرا کر رکھا ہے۔

رمضان کا مہینہ باطنی صفائی کے لیے تربیت فراہم کرتا ہے۔ وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو اِس ماہِ مبارک کے ماحول سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دن کو پورے آداب کے ساتھ روزہ رکھتے اور شب کو دل کی آمادگی کے ساتھ نماز تراویح میں شرکت کرتے ہیں۔ ایسے لوگ روزے کی حالت میں جہاں کھانے پینے کی پاکیزہ‘ طیب اور حلال چیزیں نہیں کھاتے وہاں مکروہات‘ ممنوعات اور منکرات کے قریب بھی نہیں پھٹکتے‘ جھوٹ اور غیبت سے بچتے اور برائیوں سے دُور رہتے ہیں۔ اس طرح ایک ماہ کی تربیت انہیں واقعی گناہوں سے متنفر اور نیکیوں سے مانوس کر دیتی ہے ۔ دیکھا گیا ہے کہ کئی لوگوں نے رمضان المبارک کے بابرکت اور سازگار ماحول



سے فائدہ اٹھایا اور منشیات کے استعمال جیسی بری عادات کو ترک کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بعض ناپختہ فہم لوگ رمضان المبارک کے پروگرام کی حکمت کو نظرانداز کرتے ہوئے اس ماہِ مبارک سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو روزہ تو ضرور رکھتے ہیں لیکن برائیوں کے ارتکاب سے پرہیز اُن کے پروگرام میں شامل نہیں ہوتا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ لَّمْ یَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِہٖ فَلَیْسَ لِلّٰہِ حَاجَۃٌ فِیْ اَنْ یَدَعَ طَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ)) (صحیح البخاری)

''جو شخص (روزہ کی حالت میں) جھوٹ بولنا اور برا کام کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اِس کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔''

گویا رمضان المبارک میں بھوکا پیاسا رہنا اور رات کا قیام حصولِ مقصد کے لیے واسطہ ہے اور اصل مقصد تقویٰ ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾} (البقرۃ)

''اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا' تاکہ تم پرہیزگار بنو۔''

پس روزہ وہی مفید ہے جو انسان کے معمولات پر اثر انداز ہو کر اسے پرہیزگار بنا دے۔ بالفاظِ دیگر اسے بھلائیاں مرغوب ہو جائیں اور برائیوں سے نفرت پیدا ہو جائے۔ فہو المطلوب!

* * *



# مسنون اعتکاف کی فضیلت

جس طرح شمسی سال کا ہر مہینہ مخصوص موسم لے کر آتا ہے اسی طرح قمری سال کا نواں مہینہ ''رمضان'' اللہ تعالیٰ کی بھرپور رحمتوں کا سماں ہے۔ اس ماہ میں رب کائنات کی لامحدود رحمتیں بارش کی مانند برستی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق رمضان کا پہلا عشرہ رحمتوں کا' دوسرا عشرہ بخشش کا اور تیسرا دوزخ کی آگ سے رہائی کی خاطیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ رمضان کے استقبال کے لیے خصوصی تیاری کرتے

تھے۔ آپ ﷺ نے اس مہینے کو شَہْرٌ عَظِیْم اور شَہْرٌ مُبارَک فرمایا ہے۔

رمضان مبارک کئی اعتبارات سے خصوصی فضائل کا حامل ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن مجید کے نزول کا آغاز ہوا۔ قرآن مجید حضور ﷺ کا سب سے بڑا معجزہ اور کتابِ ہدایت ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے لیا ہے۔ اس ماہ کے روزے فرض کیے گئے ہیں اور راتوں کی عبادت کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی ماہ میں لیلۃ القدر ہے جس کی شان یہ ہے کہ قرآن کریم میں اسے خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَہْرٍ کہا گیا ہے' یعنی یہ رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ گویا اس ایک رات کا عمل خیر برس ہا برس کی نیکیوں کے برابر ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر حد درجہ مہربان ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ((اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللہِ))یعنی مخلوقِ خدا اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف اعمال اور مختلف اوقات کو خصوصی فضیلت دی ہے تاکہ اس کے بندے زیادہ سے زیادہ فائدے اٹھائیں' اللہ تعالیٰ کی رحمتیں لوٹیں اور ڈھیروں ثواب حاصل کریں۔

رمضان المبارک کا پورا مہینہ ہی بابرکت اور باسعادت ہے کہ اس کے روزے رکھنا فرض اور رات کے نوافل پسندیدہ ہیں' مگر اس کا آخری عشرہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس کے آنے کے انتظار میں رہتے تھے۔ خود بھی اس میں عبادت کی مشقت کے لیے تیار ہوتے تھے اور گھر والوں کو بھی تلقین کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اس آخری عشرے میں



عبادت وغیرہ میں وہ مجاہدہ کرتے اور مشقت اٹھاتے جو دوسرے دنوں میں نہیں کرتے تھے۔ اس بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

کَانَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ یَجْتَھِدُ فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مَا لَا یَجْتَھِدُ فِیْ غَیْرِہٖ (رواہ مسلم)

''رسول اللہ ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں (عبادات وغیرہ میں) اتنی کوشش کرتے جو باقی عام دنوں میں نہیں کرتے تھے۔''

رمضان کے آخری عشرے کی خصوصی فضیلت کی بنا پر اس میں اعتکاف کی عبادت رکھ دی گئی ہے کہ جو بندہ استطاعت رکھتا ہو وہ رمضان کا آخری عشرہ مسجد میں بایں طور گزارے کہ وہ دن کو روزے دار ہو اور رات کو شب بیدار۔ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ آپؐ ہر سال رمضان کے آخری عشرے کا اعتکاف فرماتے تھے' بلکہ ایک سال کسی وجہ سے اعتکاف نہ کر سکے تو اگلے سال آپ نے دو عشروں کا اعتکاف کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے اس عمل سے اعتکاف کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ اس بارے میں اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ملاحظہ ہو۔ وہ بیان کرتی ہیں:

اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَعْتَکِفُ الْعَشْرَ الْاَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ حَتّٰی تَوَفَّاہُ اللہُ ثُمَّ اعْتَکَفَ اَزْوَاجُہٗ مِنْ بَعْدِہٖ (رواہ

البخاری)

''نبی اکرم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کیا کرتے تھے یہاں تک کہ اللہ نے آپؐ کو اٹھا لیا۔ پھر آپؐ کے بعد آپ کی ازواج مطہراتؓ بھی اعتکاف کرتی تھیں۔''

خواتین کے لیے ان کے اعتکاف کا مقام ان کے گھر کی وہی جگہ ہے جو انہوں نے نماز پڑھنے کے لیے مختص کر رکھی ہو۔ اگر گھر میں کوئی ایسی جگہ نہ ہو تو اعتکاف کے لیے گھر میں کوئی پرسکون جگہ مقرر کر لینی چاہیے۔

اعتکاف کی حالت میں انسان دنیوی مصروفیات سے فارغ ہوتا ہے اور اس کے یہ دس دن مسجد کے پاکیزہ اور بابرکت ماحول میں بسر ہوتے ہیں۔ وہاں نہ کوئی دنیوی بات چیت ہوتی ہے نہ کسی ناجائز کام کا موقع ہوتا ہے۔ پنجگانہ فرض نمازوں کی ادائیگی اس سہولت کے ساتھ مل جاتی ہے کہ قیامِ جماعت کے وقت بندہ مسجد ہی میں موجود ہوتا ہے اور آسانی سے ہر



نماز کی تکبیر تحریمہ میں شامل ہو جاتا ہے ‘جبکہ دوسرے دنوں میں یہ فضیلت مشکل ہی سے حاصل ہوتی ہے ۔ نمازوں کی اس پابندی کے علاوہ اس کا وقت ذکر و اذکار اور تلاوت ِقرآن میں گزرتا ہے۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کے لیے اس کے پاس کافی وقت ہوتا ہے۔ مزید برآں اگر وہ چاہے تو وقت سے فائدہ اٹھا کر قرآن کی چند سورتیں زبانی یاد کر سکتا ہے جو زندگی بھر اس کے حافظے میں محفوظ ہو جاتی ہیں اور وہ انہیں وقتاً فوقتاً پڑھ کر ثواب حاصل کرتا رہتا ہے۔

انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ اچھے کام کرنے کی ازبس کوشش کے باوجود اس سے برائیاں بھی صادر ہو جاتی ہیں۔ اعتکاف ایسی عبادت ہے کہ معتکف اعتکاف کے دوران صرف ذکر و اذکار‘ تلاوت اور نمازوں میں وقت گزارتا ہے اور اس کے یہ دس دن گناہوں کے بغیر گزرتے ہیں۔ گویا اس کی زندگی کا یہ وقفہ گناہوں سے پاک صاف اور نیکیوں سے لبریز گزرتا ہے ۔ اس طرح اعمال کی کتاب کا یہ بے خطا حصہ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہو گا اور دوسری خطاؤں کی معافی کا ذریعہ بن جائے گا۔

لیلۃ القدر بھی اسی عشرے میں ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ یوں سمجھئے کہ اعتکاف کا ایک مقصد لیلۃ القدر کی تلاش بھی ہے جس کی رسول اللہ ﷺ نے ترغیب دی ہے۔ نبی اکرم ﷺ خود بھی اعتکاف میں لیلۃ القدر کو تلاش کرتے تھے اور اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی لیلۃ القدر کی تلاش کا حکم فرماتے تھے۔ اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((تَحَرَّوا لَیلَۃَ الْقَدرِ فِی الْوِترِ مِنَ الْعَشرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ)) (رواہ البخاری)

شب قدر کو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔''

معتکف آخری عشرے کی تمام راتیں مسجد میں ذکر و اذکار اور تلاوت اور نماز میں گزارتا ہے ۔ پس اسے ضرور ہی شب قدر مل جاتی ہے اور وہ اس سے مقدور بھر فائدہ اٹھا لیتا ہے۔

لیلۃ القدر کی ایک فضیلت یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے ان لوگوں کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں جو ذکر و اذکار اور نمازوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب شب قدر ہوتی ہے تو جبرائیل فرشتوں کے جھرمٹ میں نازل ہوتے ہیں اور ہر اُس بندے کے لیے دعائے رحمت کرتے



ہیں جو کھڑا یا بیٹھا اللہ کے ذکر اور عبادت میں مشغول ہوتا ہے۔'' (شعب الایمان للبیہقی)

لیلۃ القدر کے لیے حتمی طور پر ایک مخصوص رات نہیں بتائی گئی' بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ رمضان مبارک کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ہوتی ہے۔ گویا یہ کوئی بھی طاق رات ہو سکتی ہے ۔ اس مخصوص رات کو حکمت کے تحت خفیہ رکھا گیا ہے' مگر یہ معتکف کی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس عشرے کی ہر رات عبادت میں گزرتا ہے اور اس طرح لازمی طور پر لیلۃ القدر کو پا لیتا ہے جس کے فضائل بے حد و حساب ہیں۔

رمضان کے اس آخری عشرے میں اللہ کی رحمت زوروں پر ہوتی ہے' لہٰذا معتکف کو کثرت کے ساتھ استغفار اور دعا کے لیے ہاتھ پھیلانے کا موقع ملتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے بتایئے اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کونسی رات شب قدر ہے تو میں اس رات اللہ تعالیٰ سے کیا عرض کروں اور کیا دعا مانگوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کہو:

((اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ کَرِیْمٌ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ)) (رواہ الترمذی)

''اے اللہ !تو بہت معاف فرمانے والا اور کرم فرمانے والا ہے اور معاف کردینا تجھے بہت پسند ہے' پس تو میری خطائیں معاف فرما دے۔''

چونکہ شب قدر آخری عشرے ہی کی ایک رات ہوتی ہے لہٰذا معتکف کو موقع میسر ہے کہ وہ ہر رات کثرت سے یہ دعا کرے ۔اس طرح اس کی یہ دعا یقینا لیلۃ القدر کی بھی دعا ہو گی۔

اس ضمن میں یہ بھی یاد رکھیے کہ اعتکاف ایک سنجیدہ عمل اور عبادت ہے۔ مسجد میں دس دن گزارنے کے شوق میں کم عمر بچے جو ان ایام کی قدر و قیمت اور آداب سے آگاہ نہ ہوں اعتکاف نہ کریں' بلکہ وہی لوگ اعتکاف کا ارادہ کریں جو نہ صرف اعتکاف کی پابندیو پر عمل کر سکیں بلکہ یہاں شب و روز کی فراغت سے روحانی ارتقاء حاصل کریں اور اس دس روزہ تربیت سے فائدہ اٹھائیں۔ فضول محافل اور لایعنی باتوں سے گریز کریں۔ نماز باجماعت کا اہتمام کریں۔ غرض حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں سستی' کاہلی اور لاپرواہی سے

اجتناب کریں۔ اسی طرح دورانِ اعتکاف یہ بھی ملحوظ رہے کہ زبان پر سختی سے کنٹرول کیا جائے تاکہ کسی قسم کا غلط لفظ زبان سے نکلے' نہ کسی کی غیبت ہو اور نہ کوئی جھوٹی بات کہی جائے تاکہ اعتکاف کا



سارا وقفہ نیکی میں مصروف اور برائیوں سے بچا ہوا گزرے۔

جو لوگ اعتکاف کا ارادہ کریں' اعتکاف سے پہلے وہ کسی صاحب علم سے اعتکاف کے آداب و مسائل سیکھ لیں تاکہ اعتکاف کے ایام پوری سنجیدگی سے گزاریں اور عید الفطر کے دن اعتکاف کی نعمت سے استفادہ کرنے کی بدولت شاداں و فرحاں ہوں اور اللہ کے حضور سجدۂ شکر بجا لائیں۔

اس حوالے سے آخری بات نوٹ کرنے کی یہ ہے کہ رمضان کی آخری رات یعنی چاند رات بڑی فضیلت کی حامل ہے اور اس رات مزدور کو اُس کی مزدوری دی جاتی ہے اور اسی رات روزے داروں اور معتکفین حضرات کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشش کے پروانے بطور انعام دیے جاتے ہیں۔ اس لیے روزے داروں اورر معتکفین حضرات کو چاہیے کہ وہ اس قدر فضیلت والی رات کو بازاروں میں گھوم کر ضائع کرنے کے بجائے ربّ العزت کے حضور سر بسجود ہوں تاکہ وہ بخشش کے فیصلے کے مستحق ٹھہریں۔اس حوالے سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ملاحظہ ہو۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''رمضان کی آخری رات میں اُمت کے لیے مغفرت اور بخشش کا فیصلہ کیا جاتا ہے''۔ آپؐ سے دریافت کیا گیا:کیا وہ رات ''شب قدر'' ہوتی ہے؟آپ ﷺ نے فرمایا :'' عمل کرنے والا جب اپنا عمل پورا کر دے تو اس کو پوری اُجرت مل جاتی ہے۔'' (مسند احمد)

* * *



# قیام اللیل (تہجد) کی فضیلت

قرآن مجید میں دو دفعہ تہجد کی نماز کا ذکر ہے۔ ایک دفعہ سورۂ بنی اسرائیل میں اور ایک دفعہ سورۃ المزمل میں۔ یہ دونوں سورتیں مکی ہیں۔ مکہ میں پنجگانہ فرض نمازوں سے قبل مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تہجد کی نماز ادا کرتے تھے۔ ہجرت مدینہ سے پہلے آپ کا سفر معراج ہوا جس میں آپ پر اور آپ کی اُمت پر ہر روز پانچ نمازیں ادا کرنا فرض ہوا اور تہجد کی نماز کی حیثیت نفل نماز کی ہو گئی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پھر بھی تہجد شوق سے پڑھتے تھے۔ تہجد اس نماز کو کہتے ہیں جو عشاء کی نماز کے بعد پڑھی جائے۔ اصطلاحِ شرع میں نماز تہجد وہ نماز ہے جو عشاء کی نماز پڑھ کر کچھ دیر سو کر اٹھنے کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ نماز تہجد کے علاوہ چاشت' اشراق اور اوّابین وغیرہ نفلی نمازیں ہیں 'مگر تہجد کو دیگر تمام نفلی نمازوں پر فوقیت حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ اُمت کے مشاہیر علماء ' بزرگ اور اہل تقویٰ اس نماز کے پابند رہے۔سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں رسول اللہ ﷺ کو قرآن کے ساتھ جاگتے رہنے کی تلقین ہے وہاں یہ بھی ذکر ہے کہ کیا عجب آپؐ کا رب آپؐ کو مقامِ محمود پر کھڑا کر دے ۔گویا تہجد کی نماز کو مقامِ محمود کے ساتھ خصوصی نسبت ہے۔ مقامِ محمود تمام انبیاء میں سے آنحضرت ﷺ کے لیے مخصوص ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق یہ مقام شفاعت کبریٰ کا ہے کہ میدانِ حشر میں جب تمام بنی آدم جمع ہوں گے اور ہر نبی و پیغمبر سے شفاعت کی درخواست کریں گے تو تمام انبیاء عذر کردیں گے 'صرف محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ شرف حاصل ہو گا کہ وہ بنی آدم کی شفاعت فرمائیں۔ لوگ حالت اضطراب سے نجات پائیں گے اور سب سے پہلے آپؐ کے ہاتھ پر بابِ شفاعت کھلے گا۔ (دائرہ معارف اسلامیہ)

دن کی روشنی کام کاج کے لیے ہے اور رات سونے کا وقت ہے 'تاکہ آدمی دن بھر کی مصروفیت کے بعد رات کو آرام کر کے اپنی تھکاوٹ دور کرے اور اگلے دن کے کام کے لیے تازہ دم ہو جائے۔ لیکن رات کے اوقات کو صرف سونے اور آرام کے لیے وقف کر دینا مستحسن نہیں۔ عشاء اور فجر کی نمازوں کے درمیان کا وقفہ بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ فضا میں جیسا سکون رات



کے سناٹے میں ہوتا ہے ایسا دوسرے کسی وقت میں نہیں ہوتا۔ اگر آدمی عشاء کے بعد سو جائے اور پھر جاگ کر اللہ کی یاد میں لگ جائے 'پھر فجر کی نماز ادا کرے تو رات کے وقت کا اس طرح گزارنا دینی اور دنیوی اعتبار سے بڑا فائدہ مند ہے۔ رات کے تیسرے پہر بستر چھوڑ کر اللہ کے حضور نماز میں کھڑے ہو جانا نفس کی ریاضت اور تربیت کا خاص وسیلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں کی تعریف سورۃ السجدہ میں ان الفاظ میں کی گئی ہے :

{تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا }(آیت ١٦)

''ان کے پہلو خواب گاہوں سے الگ رہتے ہیں۔ وہ اس وقت اپنے پروردگار سے امید اور بیم کے ساتھ دعائیں کرتے ہیں۔''

یہ وقت لوگوں کے گہری نیند سونے کا ہوتا ہے ‘مگر اللہ کے پیارے بندے شوقِ عبادت میں اس پرسکون وقت اور ماحول میں مالک ِارض و سما کے حضور کھڑے ہو کر اُس کی تسبیح اور تقدیس میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اُس سے دین و دنیا کی فلاح طلب کرتے ہیں‘ اپنی خطاؤں کی معافی چاہتے ہیں اور اپنی حاجات مانگتے ہیں۔ اس وقت کی خاص بات یہ ہے کہ نماز میں مصروف شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ لو لگائے ہوتا ہے اور اس کی یہ عبادت قطعاً بے ریا ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے گھر والے بھی اس کی اس عبادت سے بے خبر ہوتے ہیں۔ نیکی کا بے ریا کام نہایت قیمتی ہوتا ہے‘ کیونکہ ایسا بندہ کسی سے نہ اجر کا خواہاں ہوتا ہے نہ تعریف کا۔ وہ سرے سے اس نماز کا دوسروں سے ذکر نہیں کرتا۔ اس نماز کا مقام گھر ہے تاکہ بندے کی یہ عبادت مکمل طور پر خلوص پر مبنی ہو۔ اس طرح یہ نماز عوام الناس سے خفیہ رہے اور اس میں کسی طرح کی نمود و نمائش نہ ہو اور ایسی ہی عبادت پر بھرپور اجر کا وعدہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو نماز تہجد کے ساتھ خصوصی نسبت تھی۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے (نماز تہجد میں) اس قدر لمبا قیام کیا کہ آپ کے قدم مبارک متورم ہو گئے۔ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں جبکہ آپؐ کی اگلی پچھلی ساری تقصیریں معاف ہو گئی ہیں ! (یعنی قرآن مجید میں اس بات کا اعلان ہو چکا ہے) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا : ’’کیا میں (اللہ تعالیٰ کے احسانِ عظیم کا) زیادہ شکر کرنے والا بندہ نہ بنوں؟‘‘ (صحیح بخاری و صحیح مسلم) رسول اللہ ﷺ اُمت کے لیے اُسوۂ حسنہ ہیں‘ اگرچہ یہ نماز فرض نہیں ہے لیکن جن کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خصوصی محبت کا دعویٰ



ہے اُن کے لیے تو یہ نماز فرض نمازوں کے بعد سب سے زیادہ مرغوب ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’رات کی نفل نماز دن کی نفل نماز سے ایسی ہی افضل ہے جیسا کہ چھپ کر دیا ہوا صدقہ اعلانیہ صدقہ سے افضل ہے‘‘۔(طبرانی ‘بحوالہ منتخب احادیث از مولانا محمد یوسف کاندھلوی) یہی وجہ ہے کہ اُمت کے متقی اور پرہیزگار بزرگ ہمیشہ رات کی اس نماز کے قائل رہے اور محبت اور چاہت کے ساتھ قیام اللیل پر عمل پیرا رہے۔ نماز تہجد کی فضیلت آپ ﷺ کے فرامین سے ظاہر ہے۔ آپ نے کئی موقعوں پر اس نماز کی تلقین کی۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’تم تہجد ضرور پڑھا کرو ‘کیونکہ وہ تم سے پہلے صالحین کا طریقہ اور شعار رہا ہے اور قرب الٰہی کا خاص وسیلہ ہے ‘اور وہ گناہوں کے برے اثرات کو مٹانے والی اور معاصی سے روکنے والی ہے۔‘‘ (جامع ترمذی) رات کی یہ عبادت اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند ہے کہ وہ رات کے آخری حصہ میں اپنی خصوصی شانِ رحمت کے ساتھ اپنے بندوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ان کی دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے۔ اُمت کے چنیدہ افراد جو رضائے الٰہی کی طلب کا شوق رکھتے ہیں وہ ضرور اس عبادت کے لیے جاگ کر اللہ کی خصوصی رحمت اور برکت سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عن ہسے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہمارا رب تبارک و تعالیٰ ہر رات کو جس وقت آخری تہائی رات باقی رہ جاتی ہے سماء دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کون ہے جو مجھ سے دعا کرے اور میں اس کی دعا قبول کروں! کون ہے جو مجھ سے مانگے میں اس کو عطا کروں! کون ہے جو مجھ سے مغفرت اور بخشش چاہے میں اس کو بخش دوں!'' (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اللہ تعالیٰ کی رحمت کی اس ارزانی کا تقاضا ہے کہ رات کے آخری پہر میں فجر کی نماز سے پہلے آدمی بستر چھوڑ دے اور وضو کر کے دست بستہ اپنے رب کے سامنے حاضر ہوجائے اور نمازِ تہجد ادا کرے اور رسول اللہ ﷺ کی تلقین کردہ وہ دعائیں کریں جن میں اپنی کمزوری کا بار بار اقرار کرے اور اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تمجید کے ساتھ اس کی عظمت' بزرگی اور کبریائی کا اعتراف کرے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اُس نے اس بابرکت گھڑی سے فائدہ اٹھانے کی توفیق دی۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ نماز تہجد دوسری تمام نفل نمازوں پر خصوصی فضیلت رکھتی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل نماز وہ ہے جو رات کے درمیان



پڑھی جاتی ہے (یعنی تہجد)''۔ (صحیح مسلم)

قرآن مجید میں پسندیدہ کردار ان لوگوں کا بیان ہوا ہے جو نیکیو ںمیں ایک دوسرے سے بڑھنے کا داعیہ رکھتے ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ کی اس فضیلت مآب عبادت کو بندہ نہ صرف خود اختیار کرے بلکہ اپنے پیاروں' دوستوں اور متعلقین کو بھی اس کی نصیحت کرے۔ کیونکہ مسلمان کا یہ شعار ہے کہ جس چیز کو وہ خود پسند کرے اسی چیز کو دوسروں کے لیے بھی چاہے۔ مرد خود نماز تہجد کا عادی بنے اور اپنی بیوی کو بھی اس کی نصیحت کرے' اسی طرح اگر بیوی خود عبادت کا شوق رکھتی ہو تو وہ اپنے مرد کو اس نماز کی ترغیب دے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی رحمت اس بندے پر جو رات کو اٹھا اور اس نے نماز تہجد پڑھی اور اپنی بیوی کو بھی جگایا اور اس نے بھی نماز پڑھی۔ اور اگر (نیند کے غلبے کی وجہ سے) وہ نہیں اٹھی تو اس کے منہ پر پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے کر اس کو بیدار کر دیا۔ اسی طرح اللہ کی رحمت اس بندی پر جو رات کو نماز تہجد کے لیے اٹھی اور اس نے نماز ادا کی اور اپنے شوہر کو بھی جگایا' پھر اس نے بھی اٹھ کر نماز پڑھی۔ اور اگر وہ نہ اٹھا تو اس کے منہ پر پانی کا ہلکا سا چھینٹا دے کر اٹھا دیا''۔ (سنن ابی دائود' سنن نسائی)

صحابہ کرام اور صحابیات رضوان اللہ علیہم اجمعین کو رسول اللہ ﷺ سے اس نماز کی فضیلت پر گہرا یقین تھا۔ یہ ان کی آپس میں محبت اور خیر خواہی کا جذبہ تھا کہ مرد تہجد پڑھتا تھا تو وہ اپنی عورت کو بھی آمادہ کرتا تھا کہ وہ بھی رب کی رحمت کا مزہ لوٹے۔ اسی طرح صحابیات بھی اپنے شوہروں کو قول و فعل سے اس

نماز کو اختیار کرنے پر آمادہ کرتی تھیں۔ اسلام کے تمام حکموں میں انسانی کمزوریوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ نماز تہجد کے معاملے میں بھی اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص تہجد پڑھنے کا عادی ہو اور نیند کے غلبہ کی وجہ سے (کسی رات) اس کی آنکھ نہ کھلی تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے تہجد کا ثواب لکھ دیتے ہیں اور اس کا سونا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انعام ہے کہ بغیر تہجد پڑھے اسے تہجد (اس رات) پڑھنے کا ثواب مل جاتا ہے''۔ (نسائی)چونکہ تہجد کی یہ نماز خصوصی فضیلت کی حامل ہے اس لیے اس کو اختیار کر کے پھر چھوڑ دینا اچھا نہیں سمجھا گیا۔ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کو فرمایا: ''عبداللہ ! تم فلاں کی طرح مت ہو جانا کہ وہ رات کو تہجد پڑھا کرتا تھا 'پھر اس نے چھوڑ دی''۔ ( صحیح بخاری)

* * *



# صبر کے مفہوم کی وسعت اور اس کا صلہ

اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے ۔ نظامِ کائنات میں اس کی مشیت کارفرما ہے۔ دکھ سکھ اسی کی طرف سے ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:{وَ نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَ الْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ} (الانبیائ:۳۵) ''ہم تو تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں''۔ انسان پر جو بھی حالت طاری ہوتی ہے 'خواہ وہ خوشی کی ہو یا غمی کی' وہ صبر کی متقاضی ہے۔ صبر کا معنی ہے رکنا' ضبط کرنا۔ اگر انسان پر خوشی کے لمحات آتے ہیں تو انہیں صبر سے گزارنا ہے 'اس موقع پر اخلاقی اور شرعی حدود سے تجاوز کرنا بے صبری ہے۔ غمی کے موقع پر غم میں نڈھال ہو کر واویلا کرنا' شکوہ وشکایت کرنا 'صبر کے منافی ہے۔ صحت مند آدمی ان کاموں سے بچ کر رہے جن سے صحت مندی کی ناشکری ظاہر ہو۔ اس کے اندر یہ جذبہ موجود رہے کہ صحت اس سے چھن بھی سکتی ہے'اگر ایسا ہوا تو پھر کیا ہو گا۔ اسی طرح بیماری میں صبر کرنا یہ ہے کہ بیماری کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھے اور جانے کہ اس میں بھلائی ہے ۔ غرض ہر طرح کے حالات میں ضبط کا مظاہرہ کرے' یہ بہت بڑے ثواب کا کام ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث۔

صبر کرنا مشکل ضرور مگر اجر کے اعتبار سے بہت اعلیٰ ہے۔ قرآن اور حدیث میں صابرین کے لیے بڑے درجے ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے:{وَ اصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۴۶﴾} (الانفال) ''صبر کرو' بے شک اللہ صبر

کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' {وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾} (آل عمران) ''اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔'' یہ وہ رتبہ ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی اعزاز نہیں۔ عام طور پر بیماری' غربت و افلاس اور صدمات کو ناخوشگوار سمجھا جاتا ہے' مگر ان کی ناخوشگواری اس وقت دور ہو جاتی ہے جب ان حالات کو اللہ کی مشیت جانا جائے' اور صبر کا دامن نہ چھوٹنے پائے' تو اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی راست رو ہے جسے صحت' عزت' خوشحالی' نیک اولاد اور ہر طرح کی دنیاوی سہولیات ملی ہوئی ہوں اور وہ غرور و تکبر سے بچ کر ان کا اچھا استعمال کر رہا ہو۔ ان نعمتوں کو عطیہ خداوندی سمجھ کر ان سے دوسروں



کو فائدہ پہنچائے۔ یہ شخص بھی صابرین میں شامل ہو گا اور بے حد و حساب اجر پائے گا۔ اگرچہ سازگار حالت میں بھی صبر کرنا احساسِ تقویٰ کے بغیر ممکن نہیں' تاہم صبر کا اعلیٰ درجہ دکھوں' مصائب' صدمات اور بیماریوں میں صبر کرنا ہے۔ ان کو کمال حوصلے کے ساتھ برداشت کرنا اور جزع و فزع سے بچ کر رہنا' شکوہ و شکایت نہ کرنا' اور یہ سمجھنا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہیں جو الرحمن اور الرحیم ہے' اس کا کوئی کام عبث اور حکمت سے خالی نہیں۔ وہ الحکیم ہے' اس کی ہر حکمت کو انسان کماحقہ نہیں سمجھ سکتا' کیونکہ انسان محدود صلاحیتوں کا مالک ہے: {وَ عَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّ ہُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾} (البقرۃ:۲۱۶) ''ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو' اور ہو سکتا ہے ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔'' عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ صبر کا تعلق صرف مصائب و آلام اور صدمات کے ساتھ ہے' حالانکہ خوشی کے مواقع بھی صبر کے ساتھ گزارنے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک گھرانے میں شادی کا موقع ہے۔ خوشی کے اس پررونق موقع پر شرعی احکام کو پس پشت ڈال دینا صبر کے منافی ہے۔ یہ وقت تو اللہ کا شکر ادا کرنے کا ہے جس نے یہ خوشی دکھائی۔ اس گہما گہمی میں غیر شرعی رسومات کی پابندی کرنا اور نمازوں کو ضائع کر دینا بے صبری ہے۔ اسی طرح کا معاملہ خوشی کے دیگر مواقع پر کیا جاتا ہے' حالانکہ خوشی کے مواقع پر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے جانے دینا' نہ صرف بے صبری ہے بلکہ ناشکری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو بھلا بیٹھے جس نے یہ خوشی دی ہے۔ اگر بندہ مصیبت کی حقیقت جان لے تو اس کو صبر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس مصیبت سے انقباض اور پریشانی بڑھے وہ تو گناہوں کی وجہ سے ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو اور تسلیم و رضا زیادہ ہو وہ حقیقتاً مصیبت نہیں' گو صورتاً مصیبت ہو۔ چنانچہ مصیبت میں صبر کرنا رفع درجات کا باعث ہوتا ہے۔ مصائب دراصل ایک تجارت ہے کہ ایک چیز ہم سے لی جاتی ہے اور اس کے عوض دوسری چیز دی جاتی ہے' یعنی سکون اور چین لیا جاتا ہے اور اُخروی انعام دیا جاتا ہے۔

قرآن مجید کے واضح الفاظ ہیں کہ: {مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ} (التغابن:۱۱) ''کوئی مصیبت

اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی۔'' چونکہ اسلام کامل ضابطہ حیات ہے لہٰذا مصائب کو برداشت کرنا بھی سکھایا گیا ہے۔ اگر انسان کا عقیدہ پختہ ہو کہ جس طرح



دنیوی نعمتیں صحت' دولت' خوشحالی اور اولاد اللہ کے عطیات ہیں اسی طرح صدمات' مفلسی اور پریشانیاں بھی اسی کی طرف سے ہیں تو ناخوشگوار حالات میں صبر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ نعمتوں پر شکر کرنا نعمتوں میں اضافے کا باعث ہے ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: {لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَأَزِيدَنَّكُمۡ} (ابراہیم:۷)''اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں لازماً اور زیادہ دوں گا۔'' اسی طرح نعمتوں کے چھن جانے یا مصیبت اور بیماری پر صبر کرنا عین صواب اور اجر کا باعث ہے۔ جبکہ جزع فزع اور رونے پیٹنے اور واویلا کرنے سے نقصان کی تلافی نہیں ہوتی بلکہ اجر ضائع ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا کمسن بیٹا ابراہیم فوت ہو رہا تھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ لوگوں کے استفسار پر آپؐ نے واضح فرمایا کہ یہ آنسو شفقت اور دردمندی کے ہیں' افسوس کے نہیں۔ بیٹا فوت ہوگیا تو آپؐ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور فرمایا: ''اے ابراہیم ! تمہاری جدائی کا ہمیں صدمہ ہے''۔ (صحیحین) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے ایک بیٹے کا انتقال ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو تعزیت نامہ لکھوایا:

''اللہ کے رسول محمد(ﷺ) کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام ۔ سلامٌ علیک! میں پہلے تم سے اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں (بعد ازاں) دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو اس صدمہ پر اجر عظیم دے' اور تمہارے دل کو صبر عطا فرمائے' اور ہم کو اور تم کو نعمتوں پر شکر کی توفیق دے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں اور ہمارے مال اور ہمارے اہل و عیال یہ سب اللہ تعالیٰ کے مبارک عطیے ہیں اور اس کی سپرد کی ہوئی امانتیں ہیں (اس اصول کے مطابق تمہارا لڑکا بھی تمہارے پاس اللہ کی امانت تھا) اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا خوشی اور عیش کے ساتھ تم کو اس سے نفع اٹھانے اور جی بہلانے کا موقع دیا اور جب اس کی مشیت ہوئی اپنی اس امانت کو تم سے واپس لے لیا' وہ تم کو اس کا بڑا اجر دینے والا ہے' اللہ کی خاص نوازش اور اس کی رحمت اور اس کی طرف سے ہدایت (کی تم کو بشارت ہے) اگر تم نے ثواب اور رضائے الٰہی کی نیت سے صبر کیا --- پس اے معاذ! صبر کرو اور ایسا نہ ہو کہ جزع و فزع تمہارے قیمتی اجر کو غارت کر دے اور پھر تمہیں ندامت ہو (کہ صدمہ بھی پہنچا اور اجر سے بھی محرومی رہی) اور یقین رکھو کہ جزع فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا اور نہ اس سے رنج و غم



دور ہوتا ہے' اور اللہ کی طرف سے جو حکم اترتا ہے وہ ہو کر رہنے والا ہے' بلکہ یقینا ہو چکا ہے۔ والسلام !'' (رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط)

نبی اکرم ﷺ نے صبر کا بڑا اجر بتایا اور مصیبت پر جزع فزع کرنے سے منع کیا۔ حضرت عبداللہ

بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی (غمی اور موت کے موقع پر) اپنے رخساروں پر طمانچے مارے اور منہ پیٹے اور گریبان پھاڑے اور اہل جاہلیت کے طریقے پر واویلا کرے وہ ہم میں سے نہیں (یعنی وہ ہمارے طریقے پر نہیں ہے)''۔(صحیح بخاری و صحیح مسلم) ہر قسم کی نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی عطا کرتا ہے اور اولاد بھی وہی دیتا ہے۔ باقی نعمتوں کی طرح اولاد بھی ماں باپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ جب دوسری نعمتوں کی طرح اولاد کی نعمت چھن جاتی ہے تو طبعی محبت کی بنا پر اس موقع پر انسان بڑے صدمے سے دوچار ہوتا ہے اور غم کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ اس صدمے کے وقت صبر کرنا اور یہ سمجھنا کہ بیٹا یا بیٹی اللہ کی امانت تھی ،جس وقت اُس نے چاہا امانت واپس لے لی، یہ اس کی رضا ہے ،یہی طرزِ عمل مطلوب ہے۔ جب بندہ اللہ کی رضا پر راضی ہو گیا تو اُس نے بہت زیادہ اجر پایا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کا بچہ انتقال کر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ روح قبض کرنے والے فرشتے سے فرماتا ہے: تم نے میرے بندے کے بچے کی روح قبض کی؟ وہ عرض کرتے ہیں جی ہاں! پھر فرماتا ہے کہ تم نے اس کے دل کا پھل اس سے لے لیا؟ وہ عرض کرتے ہیں جی ہاں! پھر فرماتا ہے کہ اس بندہ نے اس حادثہ پر کیا کہا (اور اپنا کیا تاثر ظاہر کیا؟) فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اس بندے نے آپ کی حمد کی، آپ کا شکر کیا اور اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھا (یعنی ہم سب اللہ ہی کے لیے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کے جانے والے ہیں) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ (اس کے اس صابرانہ رویہ پر) اس کے لیے جنت میں ایک عالیشان گھر بنائو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔ (مسند احمد، جامع ترمذی)

جب کسی کے ہاں کسی عزیز کی وفات ہو جائے تو تعزیت کے لیے آنے والے لوگ کہتے ہیں بہت افسوس ہے! بڑی بے وقت موت ہے! یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ موت دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور اللہ تعالیٰ کا کوئی کام عبث یا بے وقت نہیں ہوتا۔ وہ الحکیم ہے، اُس کا ہر کام اچھا اور بروقت ہے۔ اس کا موت وحیات کا نظام حکیمانہ ہے۔ تعزیت کے وقت ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' کہا جائے اور کہا جائے کہ اللہ کی مرضی اسی طرح تھی اور پسماندگان کو صبر کی تلقین کی جائے۔



دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ دکھ، تکالیف، مصائب اور صدمات تو بہرحال آئیں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے ان مصائب پر صبر کرنے والوں کو بڑے اجر کی خوشخبری سنائی ہے۔ اگر کوئی مصائب پر واویلا کرتا ہے، روتا پیٹتا ہے تو وہ مصیبت ٹل تو نہیں جاتی، بلکہ وہ دکھ زیادہ پریشان کرتا ہے، جبکہ مصیبت پر جزع فزع نہ کرنے اور صبر کرنے

کا اعلیٰ صلہ اور ثواب موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ بیمار آدمی کے پاس جاتے تو اسے خوشخبری سناتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دے گا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ایمان والے بندے کے کسی پیارے کو جب میں اٹھا لوں پھر وہ ثواب کی امید میں صبر کرے تو میرے پاس اس کے لیے جنت کے سوا کوئی معاوضہ نہیں''۔ (صحیح بخاری)

بیماریوں اور مصائب پر صبر کرنے کے اجر کی بشارت تو احادیث کی روشنی میں مسلم ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی مردِ مؤمن کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے، مرض سے یا اس کے علاوہ، تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جس طرح خزاں رسیدہ درخت اپنے پتے جھاڑ دیتا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

یہ بدلہ صبر کی بدولت ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں جب کسی کی دو پیاری چیزیں (یعنی آنکھیں) لے لیتا ہوں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے اور ثواب کا امیدوار رہتا ہے تو میں اس کے لیے جنت سے کم ثواب پر راضی نہیں ہوتا''۔ (ترمذی) مصائب پر صبر کرنا بڑے اجر کا باعث ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی سینکڑوں دعائیں ہیں، مگر کسی دعا میں آپؐ نے بیماری یا مصیبت طلب نہیں کی کہ اس طرح برائیاں ختم ہوں گی اور نیکیاں ملیں گی، اور نہ اُمت کو ایسی دعا کرنے کی تعلیم دی ہے۔ حالانکہ یہ خوشخبری آپ ﷺ کی طرف سے بیماروں اور مصیبت زدہ لوگوں کو بار بار دی گئی ہے کہ اس سے گناہوں کی بخشش ہوتی ہے۔ اس لیے کہ مسلمان کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کی حاجت نہیں کہ بندہ پر مصیبت آئے اور وہ اس پر صبر کرے تو اس کے گناہ بخشے جائیں۔ وہ تو یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ کی شان رکھتا ہے۔ بخشش کے لیے بس اُس کی رضا چاہیے۔

مسنون دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگنے کی دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شان کا مالک ہے کہ وہ جس کو چاہے دنیا میں مصائب سے بچائے رکھے، عافیت کے ساتھ زندہ رکھے اور اُس کی بخشش کر دے۔

* * *



# شکر کا مفہوم اور اس کی وسعت

منعم کی عطا کردہ نعمتوں اور احسانات کا اعتراف کرنا اور اس پر اس کی تعریف کرنا اور احسان مند ہونا شکر کہلاتا ہے۔ سب سے بڑا منعم اور حقیقی محسن اللہ تعالیٰ ہے۔ پس ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں انسان پر بے پایاں ہیں اس لیے اس کا شکر بھی بے حد ادا کرنا واجب ہے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ صبر مصائب اور صدمات پر تحمل اور برداشت کا نام ہے اور شکر خوشگوار اور سازگار حالات پر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا ہے مگر اس اندازِ فکر میں جامعیت نہیں ہے۔ صبر جس طرح مصائب اور مشکلات میں ضروری ہے اسی طرح خوشی اور مسرت کے مواقع پر بھی صبر کرنا اور شرعی حدود کی پابندی کرنا لازم ہے۔ شکر کا بھی یہی معاملہ ہے کہ آسودگی' خوشحالی اور اچھی صحت پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے کہ ایک نعمت چھن گئی ہے تو دوسری لاتعداد نعمتیں ایسی ہیں جن سے بندہ فائدہ اٹھا رہا ہے۔

انسانی زندگی میں دکھ اور رنج بھی ہیں اور آرام اور خوشی بھی۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اسی کے حکم اور فیصلے سے ہوتا ہے ۔ زندگی کو متوازن' پرسکون اور آسودہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ حالات کے مطابق صبر اور شکر کے تقاضے پورے کیے جائیں ۔ جس طرح صابر کو صبر کا صلہ اجرت کی صورت میں ملتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور شکر کے اجر کے علاوہ بندے کی نعمتوں میںاضافہ کرتا ہے ۔ اس طرح صابر اور شاکر انسان ہرحال میں فائدہ ہی حاصل کرتا ہے۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بندۂ مؤمن کا معاملہ بھی عجیب ہے' اس کے ہر معاملہ اور ہرحال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے' اگر اس کو خوشی اور راحت و آرام پہنچے تو وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے' اور یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے ' اور اگر اسے کوئی دکھ اور رنج پہنچتا ہے تو وہ



(اس کو بھی اپنے حکیم و کریم رب کا فیصلہ اور اس کی مشیت یقین کرتے ہوئے) اس پر صبر کرتا ہے 'اور یہ صبر بھی اس کے لیے سراسر خیر اور موجب برکت ہوتا ہے''۔ (مسلم)

حقیقی محسن اور منعم تو اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر دنیا کی زندگی میں لوگ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ جو بندہ کسی دوسرے کی ضرورت کے وقت اور مشکل میں مدد کرتا ہے یا کسی کام میں آسانی پیدا کرتا ہے تو اس کا احسان مند ہونا بھی اخلاقی خوبی اور اچھا عمل ہے۔ تو جب ایک شخص اپنے دوست کا احسان مند ہوتا ہے اور اظہارِ شکر کرتا ہے تو وہ دراصل اللہ ہی کا شکر گزار ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جس نے میرے ساتھ بھلائی کی ہے اس کو بھلائی کرنے کی توفیق بھی اللہ ہی نے دی ہے اور پھر اُسی نے احسان کرنے والے کے دل میں اس ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ اس طرزِ عمل سے بندہ خود سمجھ لیتا ہے کہ جب بندے کے معمولی سے احسان کا بدلہ بھی دیا جانا ایک اچھا عمل ہے تو منعم حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر و سپاس ادا کرنا کتنا ضروری ہے۔ نبی

مکرم ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللّٰہَ)) (رواہ الترمذی، عن ابی ھریرۃؓ) ''جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا۔''

اللہ تعالیٰ غنی ہے اور حمید ہے۔ وہ صمد ہے، سب اس کے محتاج ہیں۔ جو اس کی عبادت کرتا ہے ۔ دراصل وہ اپنا ہی فائدہ کرتا ہے۔ صبر کرنے اور شکر کرنے کا فائدہ بھی صابر اور شاکر کو ہی ملتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: {وَ مَنْ شَکَرَ فَاِنَّمَا یَشْکُرُ لِنَفْسِہٖ ۚ وَ مَنْ کَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ کَرِیْمٌ ﴿۴۰﴾} (النمل) ''اور جو شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدے کے لیے شکر کرتا ہے، اور جو ناشکری کرتا ہے پس اللہ تو غنی اور کریم ہے''۔ یعنی اس کو تو اس بات کی حاجت نہیں کہ کوئی اس کا شکر ادا کرے۔ پھر شکر کا فائدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے اور شاکر کی نعمتوں میں اضافہ کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :{وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکُمْ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَ لَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ ﴿۷﴾} (ابراہیم:۷) ''اور جب تمہارے پروردگار نے (تم کو) آگاہ کیا کہ اگر شکر کرو گے تو میں تمہیں اور بھی دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو یقینا میرا عذاب سخت ہے''۔ گویا جہاں شکر گزاری اجر کا باعث ہے ناشکری عذابِ خداوندی کو دعوت والی بات ہے۔

شکر گزاری کا رویہ عذاب کو ٹال دیتا ہے۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہے: {مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ



بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ شَاکِرًا عَلِیْمًا ﴿۱۴۷﴾} ''اگر تم (اللہ کے) شکر گزار ہو اور (اس پر) ایمان لے آؤ تو اللہ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا؟ اور اللہ تو قدر شناس دانا ہے۔''

اللہ تعالیٰ انسان کی شکر گزاری سے اس کی عقل و شعور کا ٹیسٹ لیتا ہے کہ آیا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمتیں حاصل کر کے انہیں اللہ کی مہربانی سمجھتا ہے یا اسے اپنی دانائی اور سمجھ داری کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک صحابی جب ملکہ بلقیس کا تخت آناً فاناً لے آیا تو سلیمانؑ نے تخت کے اس طرح آ جانے کو اللہ کا فضل قرار دیا۔ نہ اپنا فعل بتایا اور نہ اپنے صحابی کا۔ اسے اللہ کا فضل اور اپنی آزمائش جانا اور فرمایا: {ہٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ ۫ لِیَبْلُوَنِیْۤ ءَاَشْکُرُ اَمْ اَکْفُرُ ؕ} (النمل:۴۰) ''یہ میرے رب کا فضل ہے، میرے جانچنے کو کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری!''

چونکہ انسان سراسر اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے اور ہمہ وقت اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے دعا مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ کی مشیت کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے، اس لیے شکر کا جذبہ بھی وہ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگتا ہے۔ ایک شکر تو کیا مؤمن تو ہر اچھا کام کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ ہی سے مانگتا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب معجزانہ طور پر چیونٹی کی آواز سنی تو اسے اپنا کمال نہ بتایا بلکہ اسے سراسر اللہ کی مہربانی کہا۔ اللہ تعالیٰ سے اس کی خوشنودی کی توفیق مانگی اور کہا:{رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰی وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىہُ وَ

اَدۡخِلۡنِیۡ بِرَحۡمَتِکَ فِیۡ عِبَادِکَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿ ۱۹ ﴾}(النمل:۱۹) ''اے میرے پروردگار! مجھے توفیق عطا کر کہ جو احسان تو نے مجھ پر کیے ہیں اور میرے ماں باپ پر کیے ہیں ان کا شکر ادا کروں اور ایسے نیک کام کروں کہ تو ان سے خوش ہو جائے اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما۔''

دنیا کی چمک دمک میں الجھ کر بندہ مادی مصروفیات میں پڑ جاتا ہے۔ شیطان اسے دھوکہ دے کر دنیا کی زیب و زینت میں الجھائے رکھتا ہے اور بندہ فریب میں آکر محسن حقیقی کے احسانات کو فراموش کر دیتا ہے۔ اس طرح شیطان کو تو خوش کر دیتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو ناراض کر بیٹھتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :{ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿ ۲۴۳ ﴾}(البقرۃ) ''بے شک اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں



کرتے''۔ یعنی اللہ تعالیٰ تو اپنے بندوں پر مہربان ہے لیکن ایسے بندے کثیر تعداد میں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مستفید ہو رہے ہیں مگر منعم حقیقی کو بھولے ہوئے ہیں۔

انسان پر کیسے ہی حالات طاری ہوں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا واجب ہے۔ اگر اسے خوشی کے مواقع میسر آئے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں' اور اگر وہ کسی کمی اور مصیبت میں گرفتار ہے تو بھی اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس سے بڑی مصیبت بھی آ سکتی تھی جس سے اسے اللہ نے بچایا ہوا ہے۔ نابینا بھی اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس کے پاس آنکھیں تو نہیں ہیں لیکن دوسرے کتنے اعضاء صحیح سالم ہیں جن سے وہ فائدہ اٹھا رہا ہے۔ صحت مند انسان جب کسی مریض' معذور یا مصیبت زدہ کو دیکھے تو اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے اسے صحت جیسی نعمت عطا کی ہے اور معذوری اور مصیبت سے بچایا ہوا ہے۔

شکر گزاری فطری جذبہ ہے۔ جس شخص میں یہ جذبہ نہیں ہے اس نے فطرت کو دبا رکھا ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ جس نے مشکل اور مصیبت میں اس کی مدد کی ہے اسے موقع ملے تو اس کے احسان کا بدلہ چکائے۔ انسان تو انسان جذبہ شکر گزاری حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے۔جس گائے' بھینس' گدھے' گھوڑے کو انسان نے پال رکھا ہے اور ان کو چارہ دیتا ہے' ان کی خدمت کرتا ہے تو وہ جانور بھی اس کے شکر گزار ہوتے ہیں اور اس کے اشاروں کو سمجھتے ہیں اور اس کی خدمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ ایک شخص کا جنگل سے گزر ہوا۔ اس نے وہاں ایک شیر دیکھا جو درد سے کراہ رہا تھا۔ وہ شخص اس کے قریب گیا۔دیکھا تو شیر کے پائوں میں کانٹا چبھا ہوا تھا۔ اس نے شیر کے پائوں سے کانٹا نکال دیا۔ شیر نے دم ہلا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور اُس کے پائوں چاٹنے لگا۔ اتفاق سے وہ شخص کسی جرم میں پکڑا گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس شخص کو بھوکے شیر کے پنجرے میں ڈال دیا جائے تاکہ وہ اس کو پھاڑ کھائے۔ چنانچہ اس شخص کو شیر کے پنجرے میں دھکیل دیا گیا۔ بھوکا شیر اس پر جھپٹا مگر فوراً

ہی پیچھے ہٹ گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہ وہی شیر تھا جس کے پائوں سے اس شخص نے کانٹا نکالا تھا۔ شیر نے اپنے محسن کو پہچان لیا اور اسے کچھ نہ کہا۔

حکایت ہے کہ ایک شخص کو درندے نے زخمی کر دیا۔ وہ بے یارومددگار بیٹھا اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔ کسی شخص نے دیکھا تو پوچھا کہ یہ شکر گزاری کا کون سا موقع ہے؟ اُس نے جواب

---



دیا: شکر اس بات پر کر رہا ہوں کہ مجھے درندے نے زخمی کیا ہے' رب نے مجھے شیطان کے حملے سے محفوظ رکھا ہے۔

غالباً شیخ سعدیؒ کا واقعہ ہے کہ وہ سفر میں تھے کہ ان کا جوتا بوسیدہ ہو کر ٹوٹ گیا اور انہیں ننگے پاؤں پاپیادہ چلنا پڑا۔ اس پر ان کے دل میں شکایت پیدا ہوئی کہ پروردگار! مجھ غریب الدیار کو یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ چلتے چلتے انہوں نے ایک شخص کو دیکھا جس کے دونوں پائوں نہیں تھے اور وہ گھٹنوں کے بل گھسٹ گھسٹ کر چل رہا تھا۔ اس پر مسافر نے اپنی شکایت پر استغفار کیا اور صمیم قلب سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کے تمام اعضائے جسمانی صحیح سالم ہیں۔

راقم نے خود اپنی آنکھوں سے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھ نہیں تھے۔ وہ مسجد میں وضو کر رہا تھا اور اپنے دونوں پیروں سے ہاتھوں کا کام لے رہا تھا۔ پائوں کی انگلیوں کے ساتھ مسواک پکڑ کر دانت صاف کر رہا تھا۔ عبرت کا مقام ہے کہ اس قدر معذوری کے باوجود وہ بندہ کلمہ شکر الحمد للہ ادا کر رہا ہے اور نماز پڑھ رہا ہے۔ جب کہ کثیر تعداد میں بھلے چنگے تنومند افراد ناشکری کی راہ پر گامزن ہیں اور اپنا سر ربّ العزت کی بارگاہ میں نہیں جھکاتے۔

خداداد نعمتیں تو بے شمار ہیں۔ کیا ہمارے لیے یہ نعمت کم ہے کہ اس نے ہمیں دولت ایمان سے نوازا اور رسولِ مقبول ﷺ کا اُمتی بنایا۔ فالحَمد للہ علٰی ذٰلک!

* * *

---



# اُسوۂ حسنہ اور اسلامی اخلاق

اسلام ہی کامل اور مکمل دین ہے جو قرآن و سنت کی صورت میں بنی نوعِ انسان کو دیا گیا ہے۔ چونکہ اس کا طرزِ زندگی اللہ تعالیٰ کا تعلیم کردہ اور پسندیدہ ہے اس لیے اس کے علاوہ دوسرا کوئی طریقہ نہ کامل ہے اور نہ قابل قبول۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

{وَ مَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ} (آل عمران:۸۵)

''جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''

دین اسلام وہ ضابطہ ٔحیات ہے جو اللہ کا دیا ہوا ہے۔ چونکہ انسان کا پیدا کرنے والا اللہ ہے اور وہ انسان کی قوت' صلاحیت اور نفسیات کو جانتا ہے 'اس لیے اسلام کے اصول ایسے نہیں جو انسانی ہمت اور طاقت کی گرفت میں نہ آسکتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جو معاشرہ اسلامی اخلاق و آداب کی بنیادوں پر قیام پذیر ہو گا وہ امن و امان اور خوشحالی کا گہوارہ ہو گا۔

شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے اور وہ کبھی نہیں چاہتا کہ انسان اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ کام کر کے فلاح پا سکے۔ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہوئی مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انسانوں کو گمراہ کرنے پر لگا ہوا ہے اوراپنے اس مشن کی تکمیل کے لیے وہ انسان کو طرح طرح کے سبز باغات دکھاتا ہے۔ وہ انسان کو ہر اس کام پر آمادہ کرتا ہے جس کو اختیار کر کے دُنیوی زندگی کو آسودہ بنایا جا سکتا ہے' خواہ وہ کام دوسرے افراد اور معاشرے کے لیے کتنا ہی نقصان دہ اور انسانوں کی اُخروی زندگی کو کتنا ہی بگاڑنے والا کیوں نہ ہو ----قرآن حکیم میں واضح طور پر بار بار متنبہ کیا گیا ہے کہ شیطان کا کام گمراہ کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کا تعلیم کردہ دین اسلام ہی واحد کامیابی کا راستہ ہے۔ جو شخص شیطان کی پرفریب چالوں میں آگیا وہ اپنی آنے والی زندگی میں ناکام ٹھہرے گا اور عذابِ الٰہی کا مستحق ہو گا ۔اور جو شیطان کے بہکاوے میں نہ آئے گا اور زندگی خدائی تعلیمات کے مطابق گزارے گا وہ کامیاب قرار دیا جائے گا اور انعام



میں ایسی خوشگوار زندگی پائے گا جس کی خوبیاں کسی طرح بھی بیان نہیں کی جا سکتیں۔ وہ زندگی جو ہر طرح کی بیماری' کوفت اور صدمات سے پاک ہو گی اور کبھی نہ ختم ہونے والی ہو گی۔

اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ زندگی کا انداز قرآن مجید میں واضح کر دیا گیا ہے اور پھر بنی نوعِ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی زندگی کو اُسوۂ حسنہ یعنی بہترین طرزِ حیات قرار دے دیا گیا ہے ۔یعنی آپ کی مثالی زندگی کو اپنا کر ہی حقیقی کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ جس طرح قرآن مجید کی تعلیمات کو زمانے کی دست برد سے محفوظ کر دیا گیا کہ آج تک اُس میں کسی طرح کی تحریف نہیں ہو سکی' اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی

زندگی کو بھی مشعل راہ بنا کر لوگوں کے لیے محفوظ بنا دیا گیا ہے ۔ قرآن کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا اور فرمایا: {اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾}(الحجر)''بے شک ہم نے ہی یہ قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے حالات کو بھی محفوظ کر دیا گیا ،مگر یہ حفاظت انسانی کاوشوں کے ذریعے قائم رکھی گئی اور فرما دیا گیا: {لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ } (الاحزاب:۲۱)''رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے''۔گویا اللہ تعالیٰ نے یہ بات اپنے ذمہ لے لی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے شب و روز کے معمولات لوگوں کے سامنے رکھے گا تاکہ وہ ان کو اپنا سکیں۔ بطور مثال آنحضرت ﷺ کی زندگی کے چند ایسے واقعات بیان کیے جاتے ہیں جن کی روشنی میں سیدھا راستہ اپنانے میں کوئی ابہام نہیں رہتا۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی سادگی کا نمونہ تھی۔ آپؐ گھر کے کام اپنے ہاتھوں سے کر لیتے ، حتیٰ کہ گھر میں جھاڑو تک دے لیتے ، اپنی جوتی کو خود مرمت کر لیتے۔ کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی چٹائی پر لیٹ جاتے جس سے بدن پر چٹائی کے نشانات پڑ جاتے۔ جب آپؐ لوگوں کے درمیان ہوتے تو باہر سے آنے والوں کو پتا نہ چلتا کہ ان میں کون رسول اللہ ﷺ ہیں ، کیونکہ آپؐ اپنے لیے کوئی امتیازی نشست اختیار نہ کرتے تھے۔ بھوک برداشت کر لینا آپؐ کا معمول تھا۔ دنیا کی نعمتوں سے بھرپور استفادہ کرنا آپ کا شعار نہ تھا۔آپؐ کے گھر میں کئی کئی دنوں تک چولہا نہ جلتا اور کھجوریں کھا کر گزارا کر لیا جاتا۔ اپنے گھر میں آرام طلبی کا سامان پسند نہ کرتے۔ دُنیوی فوائد حاصل کرنے میں ہرگز مستعد نہ ہوتے ۔ انکساری کا یہ عالم تھا کہ جب



آپ تشریف لاتے تو لوگ آپ کو دیکھ کر کھڑے نہ ہوتے ،کیونکہ آپؐ نے اس بات سے روک دیا تھا۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ آپؐ نے کسی صحابی کو سواری پر سوار کیا اور خود الوداع کہنے کے لیے پیدل ساتھ چلتے رہے۔ ظاہر ہے کہ سوار اصرار کرتا ہو گا مگر آپؐ نے ساتھ پیدل چلنے ہی کو اختیار کیا۔ آپؐ سواری پر سوار ہوتے تو کسی دوسرے کو بھی ساتھ سوار کر لیتے۔

مشہور تاریخی واقعہ ہے کہ غزوۂ احزاب کے موقعہ پر مدینہ کے باہر خندق کھودنا پڑی تاکہ دشمن شہر میں داخل نہ ہو سکیں۔ہر صحابی کے ذمہ خندق کھودنے کا کام لگا دیا گیا۔ آپؐ خود بھی خندق کھودنے میں لگ گئے ،بلکہ دوسروں سے بڑھ کر یہ کام کیا ۔ گویا آرام طلبی اور امتیاز کا آپؐ کے ہاں کوئی سوال نہ تھا۔ جب سفر میں کسی جگہ پڑاؤ ہوتا تو وہاں کھانا پکانے کے لیے کام کرنا پڑتا۔ اس سلسلہ میں ہر کوئی اپنے حصے کا کام کرتا ۔ایک دفعہ ایسا ہوا تو آپؐ نے آگ جلانے کے لیے لکڑیاں اکٹھی کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپؐ کے مقام و مرتبہ اور عزت و احترام کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی موجودگی میں آپؐ کوئی

مشقت کا کام کریں ‘مگر آپؐ پسند نہیں کرتے تھے کہ دوسرے لوگ کام کریں اور آپؐ فارغ رہیں۔جنگ درپیش ہوتی تو آپ ﷺ کسی خیمے میں محفوظ نہ بیٹھتے بلکہ بہ نفس نفیس میدانِ جنگ میں موجود رہتے۔ جنگ اُحد میں آپؐ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے اور آپؐ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئے۔

قانون کی نگاہ میں آپ ﷺ سب کو برابر جانتے تھے اور چھوٹے بڑے‘ امیر غریب میں کوئی امتیاز روا نہ رکھتے۔جو بھی جرم کا ارتکاب کرتا وہ سزا پاتا۔ جب ایک اونچے خاندان کی لڑکی نے چوری کی تو آپ ﷺ نے اس کو ہاتھ کاٹنے کی سزا سنائی۔ آپؐ کے پاس سفارش کی گئی کہ اس لڑکی کو سزا نہ دی جائے‘ کیونکہ یہ اونچے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس پر آپؐ سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ پہلی قومیں اسی لیے تو ہلاک ہوئیں کہ اگر کوئی غریب آدمی جرم کرتا تو سزا پاتا اور اگر کوئی بڑا آدمی جرم کرتا تو اسے چھوڑ دیا جاتا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر (معاذ اللہ) میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔

رسول اللہ ﷺ نے بھائی چارے کا درس دیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:{اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ} (الحجرات:۱۰) ’’مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں‘‘۔ دو مسلمان

---



جن کی رہائش قریب قریب ہے یا ہزاروں میل دور ہے وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اخوت کا تقاضا ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا ہمدرد اور خیر خواہ ہو۔آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ)) (متفق علیہ)

’’تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔‘‘

گویا ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے لیے اسی طرح خیر اور نفع چاہے جس طرح وہ اپنے لیے چاہتا ہے‘ اسی طرح ہر برائی اور نقصان کو اس کے لیے ناپسند کرے جو وہ اپنے لیے پسند نہیں کرتا۔ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ)) (صحیح البخاری)

’’مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔‘‘

گویا ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائیوں کو نہ تو زبان سے برا بھلا کہے اور نہ ہی ہاتھ کی طاقت کے ساتھ کسی کو دکھ دے یا نقصان پہنچائے۔

مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کا بالخصوص اور ہر انسان کا بالعموم ہمدرد اور خیر خواہ ہو۔ سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ کسی کو صراطِ مستقیم پر لے آیا جائے۔ یعنی غیر

مسلموں کو نہایت اچھے طریقے سے اسلام کی دعوت دی جائے تاکہ وہ اسلام میں داخل ہو کر فلاح یافتہ ہو جائیں ۔ ایک غیر مسلم نصرانی' مجوسی یا عیسائی مخلوق خدا کی بھلائی کے لیے رفاہِ عامہ کے کتنے ہی اچھے کام کرے وہ اللہ کے ہاںبے وزن ہوں گے ۔ سورۃ الکہف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: {فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾} ''اور ان کے واسطے قیامت کے دن ہم میزان کھڑی نہ کریں گے''۔اس لیے کہ یہ کام تو اچھے ہیں لیکن کام کرنے والا دائرۂ اسلام سے باہر ہے اور اعمال صرف اسی کے وزن دار ہوں گے جو مسلمان ہو گا۔ پس غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کے لیے پوری ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ کوشش کرنی چاہیے ۔ہاں اگر کوئی غیر مسلم ہزار کوشش کے باوجود اسلام میں داخل نہ ہو تو اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور سختی نہ کی جائے 'کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے : {لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ} (البقرۃ:۲۵۶) ''دین اسلام میں (داخل کرنے کے لیے) سختی نہیں ہے۔''



ایک اہم اسلامی تعلیم یہ ہے کہ دوسروں کے کام آیا جائے۔ ضرورت کے وقت دوسروں کی مدد کی جائے۔ قرآن مجید میں ان لوگوں کو عذاب سے ڈرایا گیا ہے جو ضرورت کی چیزیں مانگنے پر انکار کرتے ہیں۔ ضرورت مند مسلمان کو استطاعت کے مطابق قرض دینا ضروری ہے اور اگر ممکن ہو تو مفلس کو قرض معاف کر دیا جائے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ احسان کا رویہ اپنائیں' خاص طورپر اپنے والدین' عزیز و اقارب 'یتیموں 'مسکینوں 'مسافروں اور پھر تمام دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ۔ہمدردی کا یہ رویہ صرف انسانوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ تمام دوسرے حیوانات اور چرند پرند کے ساتھ بھی روا رکھنے کا اسلام حکم دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جانوروں اور چرند و پرند کو ستانے یا زیادہ کام لینے اور خوراک کم دینے سے بھی روکا گیا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب ایک شخص چڑیا کے بچے اٹھا لایا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بچے جہاں سے اٹھا کر لائے ہو وہیں رکھ کر آئو۔ اسی طرح جب آپ ﷺ نے ایک اونٹ کو کمزور و لاغر دیکھا تو اس کے مالک کو بلا کر تنبیہہ کی کہ اس کو خوراک ٹھیک دیا کرو اور کام کم لیا کرو۔

رسول اللہ ﷺ نے زندگی بھر کسی سے زیادتی کا انتقام نہیں لیا۔ اگرچہ اسلام میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے اجازت ہے کہ زیادتی کرنے والے سے انتقام لیا جائے 'مگر معاف کر دینے کو فضیلت کا باعث بتایا گیا ہے۔ معاف کرنے کی ترغیب اس طرح دی گئی ہے کہ جو دنیا میں کسی کا قصور معاف کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا قصور معاف کرے گا۔ اسی طرح مفلس شخص اگر قرضہ ادا نہ کر سکے تو اس کا قرضہ معاف کر دینا بھی بڑی فضیلت کا باعث ہے۔

ماں باپ اپنے بچوں کو پیار محبت سے پالتے ہیں' ان کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ خود تکلیف اور مشقت برداشت کر لیتے ہیں مگر انہیں آرام اور راحت پہنچاتے ہیں۔ ماں خاص طور پر بچوں پر جان نچھاور کرتی ہے

۔ جب بچے بڑے ہو جائیں تو اللہ کا حکم ہے کہ وہ بوڑھے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کریں' ان کا کہنا مانیں' ان کی ضروریات پوری کریں۔ اگر بڑی عمر کی وجہ سے ان پر بچپنا عود کر آئے اور ان کے مزاج میں سختی آجائے تو بھی ان کو اُف تک نہ کہیں ۔یہ بات کس قدر فطری ہے کہ جنہوں نے حد درجہ احسان کیا ہو ان پر احسان کیا جائے اور ان کو خوش رکھا جائے۔

مرد اور عورت ایک گھر کی بنیاد رکھتے ہیں 'پھر ان کے بچے ہوتے ہیں۔ اس طرح گھر



ایک ادارہ بن جاتا ہے۔ گھر کے تمام افراد کی ضروریات کو پورا کرنا مرد کی ذمہ داری ہے۔ مرد عورت کی نسبت طاقتور اور توانا ہوتا ہے اور عورت کمزور' اس لیے مرد کو گھر سے باہر کام کرنا اور روزی کمانا ہوتا ہے 'جبکہ عورت گھر کے کام کاج کرتی ہے۔ عورت کا کام آسان رکھا گیا ہے اور اس پر روزی کی تلاش کی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی ۔ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی رضامندی سے کوئی ملازمت وغیرہ کرتی ہے تو اس کی اپنی مرضی ہے۔ شوہر بیوی کو کمانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اسلام کی باقی دوسری تعلیمات کی طرح یہ طرزِ زندگی بھی بہت فطری ہے۔

مرد کو ایک وقت میں چار تک بیویاں رکھنے کی اجازت ہے 'مگر ساری بیویوں کے ساتھ انصاف کی کڑی شرط ہے ۔اگر کوئی مرد اس شرط کو نہ نباہ سکتا ہو تو ضروری ہے کہ وہ ایک بیوی پر ہی اکتفا کرے۔ ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت اس لیے ہے کہ کوئی مرد بے راہ روی اختیار نہ کرے اور دوسری عورتوں کی طرف تشنہ نگاہ سے نہ دیکھے۔ مرد کو گھر میں انچارج بنایا گیا ہے ۔ گویا بیوی شوہر کے ماتحت ہے 'اس اعتبار سے امکان ہے کہ شوہر اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے عورت پر زیادتی کرے۔ چنانچہ شوہر کو سختی کے ساتھ حکم ہے کہ بیوی کے ساتھ ظلم و زیادتی ہرگز نہ کرے۔ اسی طرح نوکر چاکر مالک کے خدمت گار ہوتے ہیں تو مالک کو یہ اختیار نہیں کہ وہ نوکروں کو حقیر جانے اور ان کے ساتھ سختی کرے 'بلکہ نوکر چاکروں کے بارے میں نرمی اختیار کرنے کا حکم ہے ۔ حتیٰ کہ مالک کو پابند کیا گیا ہے کہ جو خود کھائے وہی ان کو کھلائے 'اور جو خود پہنے وہی ان کو پہنائے۔

الغرض اسلام کی تمام تعلیمات' جو ہمیں رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ سے ملتی ہیں' فطرت کے عین قریب ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ عشق رسول ﷺ کا دم بھرنے کا ثبوت دیتے ہوئے نبی اکرم ﷺ کی دی ہوئی تمام تعلیمات پر عمل پیرا ہوں اور خصوصیت کے ساتھ اپنے اخلاق و کردار کو اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں ڈھالیں۔ اس سے ایک طرف تو احسن معاشرہ وجود میں آئے گا اور دوسری طرف ہم اجر و ثواب کے مستحق قرار پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں اُسوۂ حسنہ کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے 'آمین یا ربّ العالمین !

* * *

# فضائل اخلاق

رسول اللہ ﷺ انسانوں کو اچھے انسان بنانے آئے تھے کہ انسانوں میں وہ صفات پیدا ہو جائیں جو انسانیت کے شایانِ شان ہوں۔ ایسی صفات ہی فضائل اخلاق ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے مقاصد بعثت میں سے یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں کا تزکیہ کریں ‘یعنی انسانوں کو سچی تعلیم و تربیت کے ذریعے اعلیٰ کردار و عمل کے افراد بنائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقی خوبیوں کو کمال تک پہنچائوں۔‘‘ (مسند امام احمد عن ابی ہریرہؓ) چنانچہ آپؐ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اخلاقی خوبیوں سے مزین ہوئے اور خوش اخلاقی کی اعلیٰ مثالیں چھوڑ گئے۔ با اخلاق انسان دنیاکی زندگی میں اطمینان و سکون پاتا ہے اور آخرت میں اسے ارحم الراحمین کی رضا نصیب ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں فضائل اخلاق کی بہت اہمیت بیان کی گئی ہے ۔ فضائل اخلاق سے مزین شخص ناخوشگوار معاشرے میں بھی عزت و وقار حاصل کر لیتا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ ظہورِنبوت سے پہلے کی زندگی میں بھی اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے کہ لوگ آپؐ کو صادق اور امین کے القاب سے پکارتے تھے۔ پس اچھے انسان کی خوبیوں میں حسن اخلاق سب سے بڑی خوبی ہے۔نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ’’تم میں سب سے اچھے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں‘‘۔ (متفق علیہ‘ عن عبداللہ بن عمروؓ) تمام اہل ایمان آپ ﷺ کے اُمتی ہیں ‘لیکن ایمان کا سب سے اعلیٰ درجہ اُس شخص کو حاصل ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:’’ایمان والوں میں زیادہ کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جو اخلاق میں زیادہ اچھے ہیں۔‘‘ (ابوداؤد عن ابی ہریرہؓ)

قیامت کے روزاعمال کا وزن ہو گا‘اچھے اعمال اور برے اعمال تولے جائیں گے۔ جن خوش نصیب اہل ایمان کے نیک اعمال وزن دار ہوں گے وہ کامیاب و کامران ہوں گے۔ چنانچہ حسن اخلاق نیکیوں کا پلڑا بھاری کر دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ’’قیامت کے دن



مؤمن کی میزانِ عمل میں سب سے زیادہ وزنی اور بھاری چیز جو رکھی جائے گی وہ اس کے اچھے اخلاق ہوں گے۔‘‘ (ترمذی‘عن ابی الدردائؓ) با اخلاق وہ مؤمن ہے جس کے کردار و عمل سے شرافت و نجابت جھلکتی ہووہ اپنی اچھی

عادات کے سبب لوگوں میں ہردل عزیز ہو۔ وہ کسی کے لیے تکلیف کا باعث نہ ہو بلکہ دوسروں کی تکلیف اسے پریشان کر دے اوروہ ان کی تکلیف دور کرنے میں لگ جائے۔ یہی مطلب ہے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔ وہ دوسروں کا خیر خواہ ہو۔ پس جس کو حسن اخلاق کی نعمت مل گئی یوں سمجھئے کہ وہ خوش نصیب انسان ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے حسن اخلاق کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ حسن اخلاق کشادہ روئی (اختیار کرنے) خوب بھلائی کرنے اور دوسروں کو تکلیف دینے سے بچنے کا نام ہے۔ حسن اخلاق کی فضیلت بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''صاحب ایمان بندہ اپنے اچھے اخلاق سے ان لوگوں کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو رات بھر نفلی نمازیں پڑھتے ہوں اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھتے ہوں''۔ (ابوداؤد، عن عائشہؓ)

اخلاقی خوبیاں انسانیت کا زیور ہیں۔ یہی انسان کو شرف عطا کر کے دوسری مخلوق سے ممتاز کرتی ہیں۔ پوچھا گیا حضور ﷺ ! انسان کو جو کچھ دیا گیا ہے اس میں سب سے بہتر کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''اچھے اخلاق''۔ (ابن ماجہ، عن اسامہ بن شریک) اسلام میں ایمان اور اخلاق کا گہرا تعلق ہے۔ ایمان اسلام کے بنیادی عقائد کو ماننے کا نام ہے۔ جس شخص کا ایمان کامل ہو گا اس کا کردار بھی اچھا ہو گا' کیونکہ ایمانیات میں آخرت پر یقین کی اہمیت واضح ہے۔ چنانچہ جس شخص کے سامنے یوم الدین کا محاسبہ مستحضر ہو گا وہ ہر اُس کام سے بچے گا جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہو گا۔ پس جو لوگ حسن اخلاق سے مزین ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کے پیارے ہیں ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم دوستوں میں مجھے زیادہ محبوب وہ ہیں جن کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں۔'' (صحیح بخاری، عن عبداللہ بن عمروؓ) آپ ﷺ اپنے صحابہ کو جابجا اخلاقی خوبیاں اپنانے کی تلقین کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی حیات طیبہ کے آخری دور میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا ۔ حضرت معاذؓ کہتے ہیں کہ جب میں نے رکاب میں پائوں رکھا تو آخری وصیت جو رسول اللہ ﷺ نے مجھے فرمائی' وہ یہ تھی کہ اے معاذ! لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنا۔ (مؤطا امام مالک) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم دوستوں میں



مجھے زیادہ محبوب وہ ہیں اور قیامت کے دن ان ہی کی نشست بھی میرے زیادہ قریب ہو گی جن کے اخلاق تم میں زیادہ بہتر ہیں۔'' (ترمذی عن جابرؓ) رسول اللہ ﷺ کے فرامین کی روشنی میں خوش اخلاقی کی مظہر چند ایک باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ ہر شخص اپنا جائزہ لے سکے کہ وہ اس سلسلہ میں کہاں کھڑا ہے اور فضائل اخلاق حاصل کرنے کے لیے اسے کن کن عادات کو اپنانا ضروری ہے تاکہ وہ دنیا میں ہردلعزیز بن سکے اور آخرت میں کامیاب و کامران ہو سکے' یعنی جنت میں جانے والا بن جائے۔ انسان کو معاشرے میں دوسرے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ چنانچہ نبی مکرم ﷺ کی ہدایت یہ ہے کہ اپنے لین دین اور معاملات میں رحم دلی کا طریقہ اپنایا جائے اور دوسروں پر بے جا

سختی نہ کی جائے۔ رحمدلی کے رویے کا انجام بتاتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''رحم کرنے والوں اور ترس کھانے والوں پر رحمن رحم کرے گا۔ تم زمین پر بسنے والی اللہ کی مخلوق پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا''۔ (جامع ترمذی، عن عبداللہؓ بن عمرو بن العاص) اس حدیث کا ترجمہ بصورتِ شعر یوں کیا گیا ہے:

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر  خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر!

اس سے معلوم ہوا کہ رحم کا وطیرہ صرف انسانوں کے لیے نہیں، بلکہ اللہ کی مخلوق چرند پرند بھی رحم کے مستحق ہیں۔ یہ رحم دلی کا تقاضا ہے کہ کسی مصیبت زدہ کو دیکھ کر آدمی بے چین ہو جائے اور اس کی مدد کے لیے آمادہ ہو جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس شخص میں یہ جذبہ نہیں اس کی انسانیت میں نقص ہے۔ بخاری اور مسلم کی ایک روایت کا خلاصہ اس طرح ہے کہ ایک آدمی کو چلتے چلتے سخت پیاس لگی۔ اسے ایک کنواں مل گیا تو اس نے وہاں سے پانی پیا۔ دیکھا تو وہاں ایک کتا پیاس سے بے کل ہے اور گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ آدمی کے دل میں رحم آیا، وہ کنویں میں اترا، اپنے چمڑے کے موزے میں پانی بھر کر لایا اور اس پیاسے کتے کو پلایا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس رحم دلی کی وجہ سے اس شخص کی بخشش کر دی۔ رسول اللہ ﷺ ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے۔ وہاں ایک اونٹ تھا، جب اس اونٹ نے آپؐ کو دیکھا تو ایسی درد بھری آواز نکالی جیسی بچے کے جدا ہوجانے پر اونٹنی کی آواز نکلتی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ اس کے قریب تشریف لے گئے اور آپؐ نے اس کی کنوتیوں پر اپنا دست شفقت پھیرا۔ وہ اونٹ خاموش ہو گیا۔ پھر آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: یہ اونٹ کس کا ہے؟ اس کا مالک کون ہے؟ ایک انصاری نوجوان آیا اور عرض کیا



یہ اونٹ میرا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس بے زبان جانور کے بارے میں تم اللہ سے نہیں ڈرتے، جس نے تم کو اس کا مالک بنایا ہے؟ اس نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور زیادہ کام لے کر اس کو بہت دکھ پہنچاتے ہو۔ (سنن ابی دائود، عن عبداللہ بن محضرؓ) گویا کسی بے زبان جانور کو تکلیف میں دیکھ کر اس کی تکلیف دور کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، کیونکہ ہر ذی روح اللہ کے کنبے کا فرد ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: ((اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللہِ)) ''ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔'' ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد کرنا بھی رحم دلی کا مظہر ہے۔ رسول اللہ ﷺ کسی ضرورت مند سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹاتے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ رسول اللہ ﷺ سے کسی چیز کا سوال کیا گیا ہو اور آپؐ نے جواب میں نہیں کہا ہو۔ (صحیح بخاری، صحیح مسلم) اگر سائل کی ضرورت پوری کرنے کے لیے آپ ﷺ کے پاس کچھ نہ ہوتا تو قرض لے کر اس کی مدد کر دیتے۔ قصور وار کو معاف کر دینا ایک اعلیٰ اخلاقی خوبی ہے۔ اگرچہ انصاف کے ساتھ بدلہ لینا جائز ہے لیکن اللہ کا جو بندہ

انتقام لینے کی استطاعت رکھتا ہو مگر وہ انتقام نہ لے اور معاف کر دے اور صلح اور اصلاح کی کوشش کرے تو اس کا خاص اجر و ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا: پروردگار! آپ کے بندوں میں کون آپ کی بارگاہ میں زیادہ باعزت ہے؟ ارشاد فرمایا: وہ بندے جو قابو پانے کے بعد خطاکار کو معاف کر دیں''۔ (شعب الایمان للبیہقی، عن ابی ہریرہؓ) قصور وار کو معاف کرنا بڑی جواں مردی کا کام ہے، لیکن کوئی شخص اگر اللہ کی حدود کو توڑے تو اس کو سزا دی جائے گی۔ گھر کے نوکر چاکر یا ماتحت ملازموں کے ساتھ بھی نرمی کا سلوک پسندیدہ ہے۔ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ! میں اپنے خادم کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپؐ نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہے۔ اس نے پھر وہی عرض کیا کہ یارسول اللہ میں اپنے خادم کو کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''ہر روز ستر دفعہ''۔ (جامع ترمذی، عن عبداللہ بن عمرؓ)

نبی محترم ﷺ نے خوش اخلاقی کی تعلیم پر بڑا زور دیا اور خود خوش اخلاقی کی اعلیٰ مثالیں قائم کیں۔ پس مسلمان کی شان بھی یہی ہے کہ وہ اخلاق کا اچھا ہو، اور اس کا اخلاق دوسروں پر اچھا اثر ڈالے۔

* * *



# اللہ کے ذکر سے حاصل ہونے والی پہاڑوں کے برابر نیکیاں کہیں ضائع نہ ہو جائیں!

ذکر کا معنی ہے یاد --- اور ذکر اللہ، اللہ کی یاد۔ اللہ کو یاد کرنا بہت بڑا عمل ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: {وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ} (العنکبوت:۴۵) ''اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے''۔ اسی طرح سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہوا: {یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا ﴿۴۱﴾} ''اے اہل ایمان! اللہ کا ذکر کرو بہت زیادہ''۔ سورۃ الجمعہ میں فرمایا: {وَ اذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰﴾} ''اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو، شاید کہ تمہیں فلاح نصیب ہو

جائے''۔قرآن مجید میں ذکر کثیر کی تلقین کی گئی ہے ۔چونکہ اللہ کا ذکر فلاح و کامرانی کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی فلاح پسند ہے اس لیے وہ بار بار اور کثرت کے ساتھ اپنے ذکر کی تاکید کرتا ہے ۔

قرآن مجید تو سراسر ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:{اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾}(الحجر) ''بے شک ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مہربانی ہے کہ جس ذکر کو فلاح کا سبب بتایا ہے وہ قرآن کی صورت میں ہر قسم کی تحریف سے محفوظ کر دیا ہے۔ نہ وہ مٹ سکتا ہے اور نہ اس میں کسی طرح کی تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اب انسان کو ہمہ وقت اس ذکر سے فائدہ اٹھانے کا موقع میسر ہے۔ذکر اللہ کا روحانی فائدہ تو مبنی بر حقیقت ہے ،لیکن یہ مادی اور دنیوی فائدوں سے بھی خالی نہیں۔ دل کا اطمینان بڑی نعمت ہے۔ دنیا کی زندگی میں آدمی کو طرح طرح کی فکر مندیاں، خواہشات،آرزوئیں اور تمنائیں ہیں جو پریشانی اور tensionکا باعث ہوتی ہیں، مگر جو شخص خلوصِ نیت کے ساتھ اللہ کے ذکر کو اپنا لیتا ہے وہ آسودہ اور مطمئن زندگی گزارتا ہے

---



۔ قرآن مجیدمیں ارشاد ہے : {اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ ﴿۲۸﴾}(الرعد) ''خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان ہوا کرتا ہے''۔جب ہر طرح کی بے اطمینانی، پریشانی، فکر اور اندیشے اللہ کے ذکر سے کافور ہو جاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اللہ کے ذکر سے غفلت جہاں ناکامی، نامرادی ، بے چینی اور ہجوم افکار پیدا کرتی ہے، وہاں دُنیوی زندگی کو بدمزہ کر دیتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے : {وَ مَنۡ یَّعۡشُ عَنۡ ذِکۡرِ الرَّحۡمٰنِ نُقَیِّضۡ لَہٗ شَیۡطٰنًا فَہُوَ لَہٗ قَرِیۡنٌ ﴿۳۶﴾}(الزخرف) ''اور جو اللہ کی یاد سے غافل ہوتا ہے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں پھر ہر وقت وہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔''اس طرح اللہ تعالیٰ نے جہاں ذکر اللہ کی اہمیت واضح کر دی ہے وہاں اس سے غفلت کا نتیجہ بھی بتا دیا ہے۔ اگرچہ دنیا میں اللہ کی رضا کی خاطر کیے جانے والے کئی دوسرے اعمال فضیلت کا باعث ہیں ،مگر اللہ کا ذکر وہ عمل ہے جو سب سے اعلیٰ درجہ رکھتا ہے، بلکہ ذکر اللہ دوسرے اچھے اعمال کو بھی زیادہ اچھا کر دیتا ہے ۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا :کون سے جہاد کا اجر سب سے زیادہ ہے؟ ارشاد فرمایا:''جس جہاد میں اللہ تعالیٰ کا ذکر سب سے زیادہ ہو''۔ پوچھا :روزہ داروں میں سب سے زیادہ اجر کسے ملے گا؟ فرمایا: ''جو اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ ذکر کرنے والا ہو''۔ پھر اسی طرح نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ افضل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر زیادہ ہو۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: ابو حفص ! ساری خیر اور بھلائی تو ذکر کرنے والے لے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بالکل ٹھیک کہتے ہو۔'' (مسند احمد)

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اللہ کا ذکر ایسے الفاظ میں ہو جن سے اللہ کی کسی صفت کا اظہار ہوتا ہو یا کوئی

التجا یا دعا ہو ‘مگر حقیقت یہ ہے کہ محض اللہ تعالیٰ کا نام ہی اس قدر فضیلت والا ہے کہ صرف اللہ اللہ کہنا بھی اللہ کا ذکر ہے ‘بلکہ بلند پایہ ذکر ہے ۔ سورۃ المزمل کی ابتدائی آیات میں نبی مکرم ﷺ کو دی گئی ہدایات کے ضمن میں ارشاد ہوا : {وَ اذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ وَ تَبَتَّلۡ اِلَیۡہِ تَبۡتِیۡلًا ؕ ﴿۸﴾} (المزمل) ’’اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرو اور سب سے کٹ کر اُسی کے ہو رہو !‘‘

جیسا کہ ماقبل بیان ہوا کہ قرآن مجید سراسر ذکر ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی تلاوت اعلیٰ درجہ کا ذکر ہے۔ اسی طرح نماز بھی ذکر کا بہت بڑا ذریعہ ہے : {وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾}



(طٰہٰ) ’’میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو‘‘۔قیام میں سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ پڑھتے ہیں تو اللہ کی ثنا بیان کرتے ہیں۔ سورۃ الفاتحہ پڑھتے ہیں تو اللہ کی حمد بیان کرتے ہیں۔ رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ اور سجدے میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کہتے ہیں تو اللہ کی عظمت اور بزرگی کا اقرار کرتے ہیں ۔پھر قعدے میں بیٹھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرتے اور رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھتے ہیں اور دعا کرتے ہیں۔ یہ سارا کچھ ذکر اللہ ہے۔ اسی لیے نمازی کو چاہیے کہ نماز پڑھتے وقت اللہ کی توحید‘ عظمت‘ رفعت اور بزرگی اپنے اوپر طاری رکھے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب بندہ نماز کے الفاظ کے معانی اور مطالب سے بھی آگاہ ہو۔ قرآن مجید میں آیا ہے : {وَلِلّٰہِ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی فَادۡعُوۡہُ بِھَا} (الاعراف:۱۸۰) ’’اور اللہ ہی کے لیے اچھے نام ہیں‘ پس تم اُسے ان ہی (ناموں) سے پکارو !‘‘اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ذکر کے تمام مسنون الفاظ اچھے ہیں‘ تاہم یہاں بھی فرقِ مراتب نمایاں ہے ۔جب ہم احادیث کی روشنی میں مختلف اذکار کے فضائل جانتے ہیں تو تمام اَورادو اَذکار ہی اجر و ثواب کے اعتبار سے اس قدر عظیم الشان ہیں کہ اختیار کرنے کے لیے آسانی سے چنائو نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَفۡضَلُ الذِّکۡرِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ)) (رواہ الترمذی وابن ماجہ)

’’سب سے افضل ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے۔‘‘

کلمہ ’’لا الٰہ الا اللہ‘‘ ذکر کے دوسرے کلمات کے مقابلے میں ایک مخصوص فضیلت اور خصوصیت رکھتا ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ کے نبی موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا : اے میرے ربّ ! مجھ کو کوئی کلمہ تعلیم فرما جس کے ذریعے میں تیرا ذکر کروں۔تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ ! لا الٰہ الا اللہ کہا کرو۔ انہوں نے عرض کیا: اے میرے ربّ ! یہ کلمہ تو تیرے سارے ہی بندے کہتے ہیں‘ میں تو وہ کلمہ چاہتا ہوں جو آپ خصوصیت سے مجھے ہی بتائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ ! اگر ساتوں آسمان اور میرے سوا وہ سب کائنات جس سے آسمانوں کی آبادی ہے اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں

رکھی جائیں اور لا الٰہ الا اللہ دوسرے پلڑے میں تو لا الٰہ الا اللہ کا وزن ان سب سے زیادہ ہو گا۔'' (شرح السنہ للبغوی) لا الٰہ الااللہ وہ کلمہ ہے جس کا اقرار انسان کو کفر کی تاریکیوں سے



نکال کر اسلام کی روشنی میں لے آتا ہے۔ یہ لا الٰہ الا اللہ ہی کا اقرار ہے کہ بندہ راستے سے پتھر کا ٹکڑا بھی ہٹا دے گا تو اجر پائے گا جبکہ اس کلمے کا انکاری بڑا اچھا اور مفید کام بھی کرے گا تو کوئی اجر نہیں پائے گا۔ عاقبت میں اس کے لیے نجات نہیں' بلکہ نارِ جہنم ہے۔ جب صاحب ایمان اس کلمے کا ذکر کرتا ہے تو بے حساب ثواب پاتا ہے۔

سُبْحَانَ اللہ' اَلْحَمْدُ لِلّٰہ' لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ'اور اَللّٰہُ اَکْبَر یہ وہ چار کلمات ہیں جن کے ذکر کی رسول اللہ ﷺ نے خصوصی فضیلت اور اجر و ثواب بیان فرمایا ہے ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک ایسے درخت کے پاس سے گزرے جس کے پتے سوکھ چکے تھے ۔آپؐ نے اس پر اپنا عصائے مبارک مارا تو اس کے سوکھے پتے جھڑ پڑے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''سُبْحَانَ اللہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰـہَ اِلاَّ اللہُ وَاللہُ اَکْبَرُ بندے کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتے ہیں جس طرح تم نے اس درخت کے پتے جھڑتے دیکھے''۔ (جامع ترمذی) یہ وہ چار کلمات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی عظمت' حمد' توحید اور بزرگی کا اقرار ہے اور یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ کلمات بہت پسند تھے اور اللہ تعالیٰ بھی ان کو پسند کرتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس دنیا کی وہ تمام چیزیں جن پر سورج کی روشنی پڑتی ہے ان سب چیزوں کے مقابلے میں مجھے یہ زیادہ محبوب ہے کہ میں ایک دفعہ سُبْحَانَ اللہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰـہَ اِلاَّ اللہُ وَاللہُ اَکْبَرُ کہوں۔'' (صحیح مسلم)

اللہ کے ذکر کی فضیلت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ اسے تمام اعمال سے افضل عمل قرار دیا گیا ہے ۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی معظم ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ بندوں میں کون سب سے افضل ہے اور قیامت کے دن درجے کے لحاظ سے اَرفع (بہت اونچا) کون ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کو زیادہ یاد کرنے والے بندے اور زیادہ یاد کرنے والی بندیاں''۔ عرض کیا گیا :یارسول اللہ ! کیا ان لوگوں کا درجہ اُس بندے سے بھی اونچا ہے جو راہِ خدا میں جہاد کرے؟ آپ ﷺ نے فرمایا :''اگر کسی بندے نے کفار اور مشرکین کی صفوں میں گھس کر تلوار چلائی یہاں تک کہ اس کی تلوار ٹوٹ گئی اور وہ دشمنوں کے ہاتھوں زخمی ہو کر خون میں لت پت ہو گیا تب بھی اللہ کا ذکر کرنے والا بندہ درجہ میں اس سے

افضل ہے''۔ (مسند احمد' جامع ترمذی)اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تحمید' عظمت اور کبریائی پر مشتمل بہت سے کلمات ہیں' جن کے فضائل بے شمار ہیں۔ یہ جملے اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں اوراجر و ثواب کے لحاظ سے اونچے درجے کے ہیں۔ چند کلماتِ ذکر کی عظمت ملاحظہ ہو۔ حضرت ابوذرغفاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :''کیا میں تم کو نہ بتائوں کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ کلام کیا ہے؟'' میں نے عرض کیا :یارسول اللہ ﷺ ! مجھے بتا دیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ کلام کیا ہے ۔ ارشاد فرمایا :''اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ کلام سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ ہے''۔ ( صحیح مسلم)

تسبیح و تحمید کی فضیلت میں ذخیرۂ احادیث میں ایک بہت پیاری حدیث وارد ہوئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ)) (متفق علیہ)

''دو کلمے ایسے ہیں جو رحمن کو بہت محبوب ہیں۔ زبان پر بہت ہلکے ہیں اور میزان میں بہت وزنی ہیں: سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم ۔''

امام بخاریؒ نے اپنی ''صحیح البخاری'' کا اختتام اسی حدیث پر کیا ہے اور مدارسِ دینیہ میں ''تقریب ختم بخاری'' میں یہی حدیث زیر مطالعہ آتی ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن مجھ سے فرمایا:'' میں تمہیں وہ کلمہ بتائوں جو جنت کے خزانوں میں سے ہے؟'' میں نے عرض کیا :ضرور بتائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا :''وہ ہے لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ'' (متفق علیہ)

{لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ}یہ وہ کلمات ہیں جن کے پڑھنے سے اللہ تعالیٰ کے رسول حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے نجات ملی تھی۔ یہ بھی ذکر اللہ کے خاص کلمات ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ قرآن مجید سارا ہی ذکر ہے' اس لیے اس کی تلاوت کریں تو ذکر اللہ کے وہ تمام کلمات آجاتے ہیں جن کا پڑھنا اجر و ثواب کا باعث ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے فرمان کی رو سے قرآن کریم کی تلاوت سے ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں عطا ہوتی ہیں۔ بلاشبہ اللہ کا ذکر زبان سے کرنا بڑی فضیلت کا کام ہے' تاہم انسان کے



عمل میں بھی اللہ کا ذکر ہونا چاہیے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے : {فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَ ابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللهِ وَ اذْكُرُوا اللهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿ ۱۰ ﴾} (الجمعۃ) ''پس جب نماز (جمعہ) پڑھی جا چکے تو زمین میں پھیل جائو اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرو تاکہ تم فلاح پائو''۔یعنی مسجد میں نماز ادا کر کے جب نکلو

اور اپنے کاروبار میں مصروف ہو جائو تو بھی اللہ کا ذکر کرتے رہو ۔گویا اللہ کے ذکر کے لیے کسی جگہ یا وقت کا تعین نہیں۔ ذکر اللہ مسلمان کا ہمہ وقتی وظیفہ ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں ان لوگوں کو صاحب شعور (اولواالالباب) فرمایا گیا ہے جو اللہ کو یاد کرتے ہیں ‘کھڑے او ر بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے (آل عمران: ۱۹۱) یعنی ہر حال میں ۔

قرآن مجید تو سراسر اللہ کا ذکر ہے ‘جبکہ حدیث شریف میں اللہ کے ذکر پر مشتمل بعض طویل اور اکثر قصیر جملے ملتے ہیں جو لاتعداد نیکیوں کا باعث ہیں۔ اس طرح کثرت سے ذکر کرنے والا شخص ڈھیروں نیکیاں اکٹھی کر لیتا ہے جو اس کے لیے آخرت کا ذخیرہ اور اجر و ثواب کا باعث ہوں گی۔جیسا کہ اوپر ذکر اللہ کی فضیلت نقل ہوئی ‘ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ زبان کے ساتھ اللہ کا ذکر نیکیاں کمانے کا مؤثر ذریعہ ہے ‘مگر برائیوں سے نہ بچنا اور حقوق العباد کی تلفی نیکیوں کو ضائع کر دینے کی تاثیر رکھتی ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی:{اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ } (ھود:۱۱۴) ’’یقیناً نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں‘‘۔ عقل سلیم کا تقاضا ہے کہ انسان عملی طور پر اللہ اور اس کے رسول کا مطیع فرمان ہو۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ذکر الٰہی کا زبان سے ادا کرنا اپنا اثر کھو بیٹھے گا۔یہ سمجھنا انتہائی خود فریبی ہے کہ زبانی ذکر بڑی فضیلت کی چیز ہے ‘لہٰذا کاروبارِ زندگی میں احکامِ الٰہی کی نافرمانی سے کچھ نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ روزِ محشر نیکیاں اور بدیاں تولی جائیں گی ‘جس کا وزن زیادہ ہو گا ‘اسی کے مطابق جزا و سزا کا فیصلہ ہو گا۔ جب رسول اللہ ﷺ نے ذکر اللہ کے ساتھ نیکیاں ملنے کی خوشخبری سنائی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپؐ سے سوال کر کے حقیقت معلوم کر لی جو ہم تک پہنچ چکی ہے۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:’’جو شخص لَا اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ کہتا ہے اُس کے لیے جنت واجب ہوجاتی ہے ‘جو شخص سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سو مرتبہ پڑھتا ہے اس کے لیے ایک لاکھ چوبیس ہزار نیکیاں لکھی جاتی ہیں‘‘۔ صحابہؓ نے عرض کیا: ایسی حالت میں تو کوئی بھی ہلاک



نہیں ہو سکتا۔ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:’’(بعض لوگ پھر بھی ہلاک ہوں گے ‘اس لیے کہ)تم میں سے ایک شخص اتنی نیکیاں لے کر آئے گا کہ وہ پہاڑ پر رکھ دی جائیں تو وہ دب جائے گا ‘لیکن اللہ کی نعمتوں کے مقابلے میں وہ نیکیاں ختم ہو جائیں گی ‘پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جس کی چاہیں گے مدد فرمائیں گے اور ہلاک ہونے سے بچالیں گے ۔‘‘(مستدرک حاکم)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :’’ اللہ تعالیٰ اس بندے سے خوش ہوتے ہیں جو لقمہ کھائے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرے یا پانی کا گھونٹ پیے اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرے۔‘‘ (مسلم) گویا ہر لمحے اللہ کا ذکر کرے۔قرآن مجید میں ارشاد ہے : {ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ ۸ ﴾ ٪} (التکاثر) ’’پھر اُس دن تم سے نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا‘‘۔یعنی تم نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی

نعمتوں سے فائدہ تو اٹھایا کیا ان کا حق بھی ادا کیا ؟یعنی انہیں اللہ کی رضا کے مطابق استعمال کیا؟انسان کے لیے سب سے بڑی نعمتیں تو اس کے اعضاء و جوارح ہیں جن کو وہ ہمہ وقت استعمال کرتا ہے۔ ان نعمتوں کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا اور انسان کو جواب دینا ہو گا۔ مثلاً پوچھا جائے گا کہ تمہارے پاس اللہ کی نعمت آنکھیں تھیں ،تم نے ان کے استعمال میں اللہ کو یاد رکھا؟ دنیا کی بے شمار چیزوں میں سے اکثر دیکھنے کی تھیں، کچھ کی طرف دیکھنا ممنوع تھا ،تم نے ممنوع چیزوں کا دیکھنا چھوڑا؟آنکھوں سے قرآن مجید ،حدیث شریف اور اسلامی تعلیمات پر مبنی تحریروں کو پڑھا یا ناول ،افسانے اور فحش لٹریچر پڑھتے رہے؟ تمہارے ہاں ٹی وی موجود تھا، اس میں دکھائے جانے والے بے مقصد ڈرامے، جن میں عریاں لباس میں ملبوس بنی ٹھنی عورتوں کے کردار دکھائے جاتے تھے ، مخلوط محفلوں کے مناظر دکھائے جاتے تھے، کیا تم نے ان کے دیکھنے سے گریز کیا یا لگاتار دیکھتے رہے؟اسی طرح زبان کے بارے میں سوال ہو گا کہ اسے کیسے استعمال کیا؟ فضول، بے مقصد اور غیر محتاط گفتگو کرتے رہے یا اچھی گفتگو کی؟ کیا گفتگو کرتے وقت تمہارے پیش نظر یہ آیت رہی :{مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿ ۱۸ ﴾} (قٓ) ''جو لفظ بھی وہ بولتا ہے تو اس کے پاس ایک مستعد نگران (فرشتہ) ہوتا ہے (جو اس کو لکھ لیتا ہے)''۔ یعنی تمہاری گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے ۔ جو لفظ بھی تم زبان سے نکالو گے وہ تمہارے نامۂ اعمال میں درج ہو جائے گا۔ کیا تم نے کبھی اس طرف دھیان کیا کہ میرے نامہ ٔاعمال میں



جو کچھ درج ہو رہا ہے وہ اللہ کے پسند کی گفتگو ہے یا اسے ناراض کرنے والی؟ کیا زبان کو جھوٹ، غیبت، چغلی، بہتان ،گالی گلوچ میں استعمال کیا؟ کان اللہ کی نعمت ہیں ،پوچھا جائے گا تم نے اس عظیم نعمت کو کس طرح خرچ کیا؟ پند و نصائح کی مجالس میں شرکت کی، تلاوت سنتے رہے، بزرگوں کی پرتاثیر باتیں سنیں یا موسیقی سے لطف اندوز ہوتے رہے اور گانے سنتے رہے، بلکہ اپنی گاڑی میں گانوں پر مشتمل کیسٹ رکھی اور ڈرائیونگ کے دوران کانوں کے استعمال سے اللہ اور اس کے رسول کو ناراض کیا؟ہاتھ اور پائوں اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں۔ اگر ان کی قدر پوچھنا ہو تو ان سے پوچھو جو ان سے محروم ہیں۔ پوچھا جائے گا کہ اپنے ہاتھوں کے ساتھ اپنے زیردستوں یا کمزوروں پر ظلم کیا یا ضرورت مندوں کی مدد کی؟ اسی طرح اپنے پائوں پر چل کر چوری اور ڈاکے کے لیے نکلے یا نماز کی ادائیگی یا کسی غریب کی مدد کے لیے نکلے؟عقل و شعور انسان کا امتیازی اعزاز ہے۔ اس کو کس طرح استعمال کیا؟ اس سے برے بھلے کی پہچان کی یا اس کا آزادانہ اور حسب منشا استعمال کیا؟ اس کا مثبت استعمال کیا یا منفی؟ کیا آپ ان علمائے سوء کے مداح تھے جنہوں نے عورتوں کے پردے کی مخالفت کی یا اس طرح کی نام نہاد تحقیق کی حمایت کی جس سے رسول اللہ ﷺ کے واضح احکام کی نفی ہوتی ہو؟ غرض انسان کو بے شمار نعمتوں سے نوازا گیا ہے ۔ انہی نعمتوں کے بارے میں انسان سے مؤاخذہ ہو گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول

اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمُ ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهٖ حَتّٰى يُسْأَلُ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَ اَفْنَاهُ، وَعَنْ شَبَابِهٖ فِيْمَ اَبْلَاهُ، وَمَالِهٖ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهٗ وَفِيْمَ اَنْفَقَهٗ، وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ)) (رواہ الترمذی)

''قیامت کے دن (جب حساب کتاب کے لیے بارگاہِ خداوندی میں پیشی ہو گی تو) آدمی کے پائوں اپنی جگہ سے سرک نہ سکیں گے جب تک کہ اُس سے پانچ چیزوں کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کر لی جائے۔ (اوّل) اس کی پوری زندگی کے بارے میں کہ کن کاموں اور مشغلوں میں اس کو ختم کیا؟ (دوم) خصوصیت سے اس کی جوانی کے بارے میں کہ کن کاموں میں اس کو بوسیدہ اور پرانا کیا؟ (سوم اور چہارم) مال و دولت کے بارے میں کہ کہاں سے اور کن طریقوں اور راستوں سے اس کو حاصل کیا اور کن کاموں اور کن راہوں میں اس کو خرچ کیا؟ (پنجم) جو کچھ علم حاصل کیا اس پر کتنا عمل کیا؟''

---



اس حدیث کو پڑھ اور سن کر ہر شخص غور کرے اور فکر مند ہو کہ وہ ان سوالات کے جواب دینے کے لیے کہاں تک تیار ہے؟ کیا وہ زندگی گزارنے میں سنجیدہ اور متفکر ہے کہ اسے ان سوالات کے جواب دینے ہوں گے؟ کیا اس نے روزی کمانے کے لیے سودی کاروبار، ناجائز چیزوں کی خرید و فروخت، ملاوٹ، جھوٹ اور دھوکہ دہی تو اختیار نہیں کی؟ کیا انسان اس سوال کے جواب میں اپنے آپ کو تیار پاتا ہے کہ اس نے جوانی کیسے گزاری؟ جوانی میں انسان طاقت وراور توانا ہوتا ہے۔ وہ جوانی کا وقت اس طرح آزادانہ گزارتا ہے کہ قوت کے نشے میں اسے فکر آخرت کا خیال نہیں رہتا اور وہ اپنی آزاد مرضی سے مصروفیت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ گھنٹوں ٹی وی دیکھتا، کھیل کود میں مصروف رہتا، گپ شپ لگاتا ہے۔ اسلامی احکام کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، سگریٹ نوشی کرتا اور ون ویلنگ جیسے فضول اور خطرناک کھیلوں میں دلچسپی لیتا ہے۔ جب کسی نوجوان کے یہ لچھن ہوں تو کیا وہ جوانی کے بارے میں پوچھے گئے سوالوں کا قابل قبول جواب دے سکتا ہے؟ ہر انسان کو زندہ رہنے کے لیے اور اپنے بال بچوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے روزی کمانے کا ذریعہ اختیار کرنا ہوتا ہے۔ روزی کمانے کے جائز ذرائع بھی ہیں ناجائز بھی۔ انسان سے پوچھا جائے گا کہ اُس نے روزی کیسے کمائی؟ اگر وہ ملازم تھا تو اُس نے فرائض منصبی دیانت داری کے ساتھ پورے کیے؟ اگر کاروبار کرتا تھا تو جھوٹ اور دھوکہ تو نہیں کرتا تھا؟ کم تول کر گاہکوں کا حق تو نہیں مارتا تھا؟ کیا چوری اور ڈاکے کو تو ذریعہ معاش نہیں بنا لیا تھا؟ رشوت تو نہیں لیتا تھا؟ دوسروں کے پلاٹ اور مکان پر ناجائز قبضہ تو نہیں کرتا تھا؟

پانچواں اور آخری سوال علم اور عمل کے متعلق ہو گا۔ اگر کسی نے ضروریاتِ دین کا علم حاصل نہ کیا تو وہ بھی پکڑا جائے گا۔ کچھ لوگ اس شیطانی وسوسے کو اختیار کر لیتے ہیں اور علم حاصل نہیں کرتے کہ نہ

پتا ہو گا اور نہ عمل کرنا پڑے گا‘مگر وہ نہیں جانتے کہ یہ دوہرا گناہ ہے۔ علم حاصل کرنا بھی لازمی ہے اور اس کے مطابق عمل بھی ضروری ہے۔ علم سے مراد سکول اور کالج کی تعلیم نہیں بلکہ سوال علم دین سیکھنے اور اس پر عمل کرنے کے بارے میں ہو گا۔ پوچھا جائے گا کہ تم نے دین کا ضروری علم حاصل کیا یا نہیں؟ حقوق اللہ اور حقوق العباد کے بارے میں جو کچھ تم جانتے تھے اس پر عمل کیا یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اپنی دینی معلومات پر عمل نہیں کرتا تو وہ بھی پکڑا جائے گا۔ دینی علم پر عمل یہ بھی ہے کہ انسان جہاں خود اس پر عمل کرے دوسروں کو بھی اس کی



تاکید کرے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَ تَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا تَفۡعَلُوۡنَ ﴿۲﴾} (الصف) ’’اے ایمان والو ! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟‘‘

پس اس آخری سوال کے جواب کے لیے بھی سنجیدہ ہونا چاہیے کہ جب علم سیکھنے اور اس پر عمل کرنے کے متعلق پوچھا جائے گا تو بندہ جواب دے سکے کہ اُس نے اپنی معلومات دینی پر کس حد تک عمل کیا ! الغرض یہ وہ پانچ بنیادی سوال ہیں جو ہر شخص سے پوچھے جائیگے۔ اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والوں کو بھی ان سوالوں کا جواب دینا ہو گا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا سوال ہوگا اسی طرح ان پانچ سوالوں کا جواب بھی ہر انسان کو دینا ہو گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’کیا تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟‘‘ صحابہؓ نے عرض کیا: ہم میں مفلس وہ آدمی ہے جس کے پاس درہم و دینار اور مال و اسباب نہ ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’قیامت کے دن میری اُمت کا مفلس وہ آدمی ہو گا جو نماز‘ روزے‘ زکوٰۃ وغیرہ سب کچھ لے کر آئے گا لیکن اس آدمی نے دنیا میں کسی کو گالی دی ہو گی‘ کسی پر تہمت لگائی ہوگی‘ کسی کا مال کھایا ہو گا‘ کسی کا خون بہایا ہو گا اور کسی کو مارا ہو گا تو ان سب لوگوں میں اس آدمی کی نیکیاں تقسیم کر دی جائیں گی اور اگر اس کی نیکیاں ان کے حقوق کی ادائیگی سے پہلے ہی ختم ہو گئیں تو ان لوگوں کے گناہ اس آدمی پر ڈال دیے جائیں گے‘ پھر اس آدمی کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔‘‘ (صحیح مسلم)

گویا جس شخص نے نماز‘ روزے‘ ذکرو اذکار اور دوسرے نیکی کے کاموں سے بہت نیکیاں کمائی ہوں گی اسے بھی حساب دینا ہو گا۔ پانچ سوالوں کے جوابوں کے علاوہ اس سے حقوق العباد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ جس جس شخص کی اس نے حق تلفی کی ہو گی ان کو اس شخص کی نیکیاں دے کر راضی کیا جائے گا۔ اس شخص نے لوگوں کے حقوق اس قدر زیادہ تلف کیے ہوں گے کہ حق داروں کو بدلے میں اس کی نیکیاں دی جائیں گی تو اس شخص کی نیکیاں ختم ہو جائیں گی اور ابھی حق دار باقی ہوں گے۔ اب ان حق داروں کو مطمئن کرنے کے لیے اس کے پاس نیکیاں نہ ہوں گی تو حق داروں کے گناہ اس کے سر ڈال دیے جائیں گے اور بالآخر وہ شخص جو بہت

نیکیاں کما کر لایا تھا جہنم رسید ہو جائے گا۔ معلوم ہوا کہ جس طرح دنیا کی زندگی میں نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں :{اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡہِبۡنَ السَّیِّاٰتِ ؕ} (ھود:۱۱۴) ''کچھ



شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں'' اسی طرح روزِ حساب حقوق العباد کی تلفیاں نیکیوں کو ختم کر دیں گی ۔ لہٰذا اللہ کا ذکر کرنے والوں کو حقوق العباد کی طرف سے بے خوف ہو جانا کسی صورت بھی مناسب نہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نامہ ٔاعمال تین طرح پر ہیں ۔ایک نامہ عمل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نہیں بخشے گا اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : ''بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے''۔ دوسرا اعمال نامہ جس کو اللہ تعالیٰ نہیں چھوڑے گا وہ ہے بندوں کا آپس میں ظلم کرنا۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کا بدلہ لے۔ تیسرا نامہ اعمال جس کی اللہ تعالیٰ پروا نہیں کرے گا وہ ہے بندوں کا اپنے اور خدا کے درمیان ظلم کرنا(یعنی حقوق اللہ میں کوتاہی)۔یہ اللہ کے سپرد ہے کہ اگر چاہے تو عذاب دے اور چاہے تو درگزر کرے''۔ (بیہقی)

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ حقوق العباد میں غفلت نیکیوں کے ڈھیر ختم کر دے گی' کیونکہ اللہ تعالیٰ حق داروں کو ان کے غصب شدہ حق کے بدلے میں نیکیاں دے کر مطمئن کرے گا۔

مختصر یہ کہ ذکر و اذکار نیکیاں اکٹھی کرنے کا بہت بڑا اور آسان ذریعہ ہے' مگر یہ بات ہرگز فراموش کرنے کی نہیں کہ اگر زندگی غیر سنجیدہ بے فکری میں گزاری' ذکر و اذکار اور اوراد و وظائف میں تو لگے رہے مگر لوگوں کے حقوق تلف کیے اور اللہ کی نافرمانی والے کام بھی کرتے رہے تو اوراد وظائف سے جمع کی ہوئی ڈھیروں نیکیاں ختم ہو جائیں گی' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حق داروں کے گناہ حق تلفی کرنے والے پر ڈال دیے جائیں اور وہ ڈھیروں نیکیوں کے باوجود جہنم میں ڈال دیا جائے۔

نتیجتاً اَوراد وظائف اور ذکرواذکار کو کثرت کے ساتھ اپنانا چاہیے مگر دیگر فرائض و سنن کی ادائیگی اور حقوق العباد میں احتیاط سخت ضروری ہے۔ اسی طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ناراضگی والے کاموں سے بچنا اور اللہ سے مغفرت مانگتے رہنا لازم ہے۔

* * *

# نیکی پھیلانا اور برائی مٹانا

افراد سے مل کر ایک معاشرہ بنتا ہے۔ معاشرے میں اچھے لوگوں کی اکثریت ہو تو بھی وہاں بے عمل اور ضعیف الایمان لوگ موجود ہوں گے۔ کیونکہ شیطان اپنے مشن میں پوری طرح لگا ہوا ہے ۔وہ تو نیکوکار لوگوں کو بھی نہیں چھوڑتا اور طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر لوگوں کو برائیوں پر آمادہ کرتا ہے۔ شیطانی حملوں اور ہتھکنڈوں سے بچنے کے لیے مسلمانوں کو قرآن و سنت کو مضبوطی سے پکڑنے کا حکم ہے ۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کو صحیح علم و عمل کی توفیق دی ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو بھلائی کے کاموں کی ترغیب دے اور برائیوں سے روکنے کی ذمہ داری پوری کرے‘کیونکہ مؤمن جو اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لیے پسند کرتا ہے۔ ہر مؤمن کا فرض ہے کہ وہ خود نیکی اختیار کرے اور برائیوں سے دور رہے‘ پھر دوسروں کو بھی بھلائی کی دعوت دے اور برائیوں سے ٹوکے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: {كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ} (آل عمران:۱۱۰) ’’تم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے تاکہ تم بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو‘‘ ۔ اسے ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں۔ اور یہ کام رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی پر محیط ہے۔ یہ کام کرنے والوں کو آپؐ نے بڑے اجر کی نوید سنائی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ’’جس شخص نے کسی نیک کام کی طرف راہنمائی کی تو اس کو اس نیک کام کرنے والے کے اجر کے برابر اجر ملے گا‘‘۔( صحیح مسلم)

اس امر کو انجام دینے کا راستہ اجر و ثواب کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کی آسان نیکی ہے‘ کیونکہ یہ کام انبیاء کرام علیہم السلام کا پوری زندگی کا کام رہا ہے۔ شرط یہ ہے کہ یہ کام محض اللہ کی خوشنودی اور مسلمان بھائی کی خیر خواہی کے لیے ہو۔ ایک شخص شراب اور سود کا عادی ہے۔ کسی نیک آدمی کی پرخلوص تنبیہہ سے وہ یہ برائیاں چھوڑ دیتا ہے اور گناہوں سے بچ جاتا ہے تو یہ تنبیہہ کرنے والا بھی بڑا اجر پائے گا۔ اسی طرح جو شخص مسلمان ہو کر نماز کی ادائیگی سے غافل

ہے تو جو کوئی نصیحت کر کے اسے نماز کا پابند بنا دیتا ہے تو یہ داعی بھی بڑا ثواب پائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ بات کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ پر اور تمہارے ذریعے کسی ایک آدمی کو ہدایت دے دے تمہارے لیے اس ساری کائنات سے بہتر ہے جس پر آفتاب طلوع ہوتا ہے''۔ (معجم کبیر للطبرانی) یہ اتنا بڑا کارِ ثواب ہے کہ اس کو آمادگی کے ساتھ انجام دینا چاہیے اور جو شخص اس کام سے غافل ہے یہ اس کی بدنصیبی ہے۔ گویا اس کے سامنے صاف پانی کی نہر جاری ہے اور اسے نہا دھو کر صاف ستھرا رہنے کی توفیق نہیں۔

بھلائی کی دعوت دینا اور برائی سے روکنے کے عمل کی فضیلت بیان کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جس بندے نے کسی نیکی کے راستے کی طرف (لوگوں کو) دعوت دی تو اس داعی کو ان سب لوگوں کے اجروں کے برابر اجر ملے گا جو اس کی بات مان کر نیکی کے رستہ پر چلیں گے اور عمل کریں گے اور اس کی وجہ سے عمل کرنے والوں کے اجروں میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ (اور اسی طرح) جس نے گمراہی (بدعت وغیرہ) کی طرف دعوت دی تو اس داعی کو ان سب لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ ہو گا جو اس کی دعوت پر اس گمراہی اور بدعملی کے مرتکب ہوں گے اور اس کی وجہ سے ان لوگوں کے گناہوں میں (اور ان کے عذاب میں) کوئی کمی نہ ہوگی''۔ (صحیح مسلم، عن ابی ہریرہؓ)

معلوم ہوا کہ بھلائی کی طرف بلانا جس قدر فضیلت کا کام ہے دوسروں کو بری عادتوں کا رسیا بنا دینا بڑی تباہی اور ہلاکت کا باعث ہے۔ سگریٹ پینے والے، رشوت لینے والے اور سود کھانے والے کی حوصلہ افزائی کرنا نری تباہی ہے ۔ گویا جس طرح نیکی کی طرف بلانا فضیلت کا عمل ہے اسی طرح کسی برائی کو عام کرنا دنیا اور آخرت کی رسوائی کا باعث ہے۔ بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا صرف ایک نیک عمل ہی نہیں بلکہ ہر مسلمان کا فریضہ ہے، کیونکہ یہ اُمت مسلمہ کا بنیادی مقصد ہے ۔ قرآن مجید میں حضور ﷺ کی امت سے فرمایا گیا ہے: ''تم وہ بہترین اُمت ہو جو لوگوں (کی اصلاح و ہدایت) کے لیے ظہور میں لائی گئی ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔'' (آل عمران:۱۱۰) گویا نیکی پھیلانے اور معاصی کو روکنے کی جدوجہد ہر مسلمان کا فریضہ ہے، جس کی ادائیگی بے انتہا اجر کا باعث ہے اور اس سے روگردانی بڑی بدنصیبی اور اللہ کے حکم کی نافرمانی



ہے۔ آپ ﷺ کا مشہور فرمان ہے ''جو کوئی تم میں سے کوئی بدی اور خلافِ شرع بات دیکھے تو لازم ہے کہ (اگر طاقت رکھتا ہو تو) اپنے ہاتھ سے اس کو بدلنے کی کوشش کرے۔ اور اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنی زبان سے اس کو بدلنے کی جدوجہد کرے ۔ اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل میں تو اسے برا جانے، اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔'' (مسلم عن ابی سعید الخدری) اسی لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے ناگزیر عمل کی

اہمیت سے غفلت عذابِ الٰہی کا موجب بن سکتی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے: ''اے اہل ایمان! تم پر لازم ہے کہ اپنے نفسوں کی فکر کرو۔ گمراہ ہونے والے لوگ تمہارا کچھ نہ بگاڑیں گے جب کہ تم ہدایت پر ہو۔'' (المائدۃ:۱۰۵) اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ ہر شخص کو بس اپنی فکر کرنی چاہیے۔جب وہ خود راہِ راست پر چل رہا ہے' نیکی کے کام کر رہا ہے اور برائیوں سے بچ رہا ہے تو اس پر دوسرے بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کی ذمہ داری نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ معلوم ہوا تو آپؓ نے فرمایا: کسی کو اس آیت سے غلط فہمی نہ ہو' میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے' آپؐ فرماتے تھے: ''جب لوگوں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ شریعت کے خلاف کام ہوتے دیکھیں اور اس کی اصلاح کے لیے کچھ نہ کریں تو قریبی خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان سب پر عذاب آجائے۔'' (سنن ابن ماجہ' جامع ترمذی)۔ قرآن وحدیث کے دوسرے نصوص کی روشنی میں محولہ بالہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب تم اپنی استطاعت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کر چکے اور اس کے باوجود بداطوار اور ناخدا ترس لوگ ہدایت قبول نہ کریں اور گمراہی ہی کی حالت میں رہیں تو پھر ان کی معصیت کوشی کی ذمہ داری تم پر نہیں' تم اللہ کے نزدیک بری ہو۔ یہ ہے اس آیت کا صحیح مطلب۔ اسی چیز کی تائید رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی ہے۔آپؐ نے فرمایا: ''کسی قوم میں کوئی آدمی ہو جو ایسے اعمال کرتا ہو جو گناہ اور خلافِ شریعت ہیں اور اس قوم اور جماعت کے لوگ اس کی قدرت اور طاقت رکھتے ہوں کہ اس کی اصلاح کر دیں اور اس کے باوجود اصلاح نہ کریں(اس کو اسی حال میں چھوڑے رکھیں) تو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ مرنے سے پہلے کسی عذاب میں بتلا فرمائے گا۔'' (سنن ابن ماجہ) اس امر کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے آپؐ نے کسی پہلے زمانے کا یہ واقعہ بیان کیا کہ کوئی بستی تھی (جس



کے باشندے عام طور پر سخت فاسق و فاجر تھے) اللہ تعالیٰ نے جبریل کو حکم دیا کہ فلاں بستی کو اس کی پوری آبادی کے ساتھ الٹ دو۔ جبرئیل نے عرض کیا: پروردگار! اس شہر میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے آنکھ جھپکنے کے برابر بھی تیری کبھی نافرمانی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ اس بستی کو اس بندے پر اور اس کے دوسرے سب باشندوں پر الٹ دو' کیونکہ ایک ساعت کے لیے بھی اس بندے کا چہرہ میری حمیت کی وجہ سے متغیر نہیں ہوا۔ (شعب الایمان)

گویا اپنے ارد گرد کے ماحول میں برائیوں کا ارتکاب کرنے والوں کو برداشت کرنے اور ان کی اصلاح کے لیے کوشش نہ کرنے سے انسان ان بدعملوں کا ساتھی شمار ہوتا ہے۔ اور اگر مجرم لوگ کسی عذاب میں بتلا ہوتے ہیں تو یہ بھی اس عذاب میں ڈالا جائے گا۔اس اہم فریضے کی غفلت جہاں انسان کو عذاب میں بتلا کردینے کا باعث ہو سکتی ہے وہیں نیکی پھیلانے اور بدی کو مٹانا بہت بڑا فضیلت کا کام ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم امر بالمعروف اور

نہی عن المنکر برابر کرتے رہو ... یہاں تک کہ جب (وہ وقت آجائے) کہ تم دیکھو کہ بخل اور دولت اندوزی کے جذبہ کی اطاعت کی جاتی ہے اور اپنی خواہشات کا اتباع کیا جاتا ہے اور بس دنیا ہی کو مقصود بنا لیا گیا ہے اور ہر شخص خود رائی اور خود بینی کا شکار ہو گیا ہے تو اس وقت بس اپنی ذات ہی کی فکر کرو اور عوام کو چھوڑ دو۔ کیونکہ تمہارے بعد ایسا دور بھی آئے گا کہ صبر اور ثابت قدمی اختیار کرنا ایسا (مشکل) ہو گا جیسے ہاتھ میں انگارہ لے لینا۔ ان دنوں میں شریعت پر عمل کرنے والوں کو تمہاری طرح عمل کرنے والے پچاس آدمیوں کے برابر اجر و ثواب ملے گا ۔(جامع ترمذی)

آج کے برے ماحول میں نافرمانیوں اور معصیت کے کام دیکھ کر پرسکون اور بے فکر رہنا دین کے تقاضوں سے غفلت کی علامت ہے۔ شریعت کے احکام کی پابندی نہ کرنے والوں کی اصلاح کے لیے اپنے پورے وسائل اور صلاحیت استعمال کرنا ضروری ہے۔ چونکہ ایسا کرنا آسان نہیں رہا اس لیے جو ایسا کرے گا حضور ﷺ کی بشارت کے مطابق وہ آپؐ کے زمانے کے پچاس افراد کے برابر اجر پائے گا۔ ضروری امر یہ ہے کہ داعی خود نمونہ بنے ' اچھے کام کرے اور برے کاموں سے متنفر ہو۔ حلال خور اور خوش اخلاق ہو۔ دعوت کے آداب سے واقف ہو۔ اس طرح اس کی کوشش نتیجہ خیز ہو گی ' ورنہ اس کی دعوت نہ صرف بے نتیجہ رہے گی بلکہ اسلام سے نفرت کا باعث بن جائے گی۔

* * *



# صلہ رحمی - اسلامی اخلاق کا طرۂ امتیاز

صلہ رحمی سے مراد ہے : رحمی رشتہ داروں کے ساتھ میل ملاپ رکھنا ' اچھے تعلقات قائم کرنا ' پیار و محبت کے ساتھ رہنا اور ان کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھنا۔ اسی طرح کسی بھی صورت میں ان کے ساتھ رنجش ' عداوت اور دشمنی نہ رکھنا اور ضرورت کے وقت ان کی مدد کرنا بھی صلہ رحمی میں شامل ہے۔ اسلام بنی نوع انسان کو نہ صرف صلہ رحمی کی تعلیم دیتا ہے ' بلکہ اس کی تاکید بھی کرتا ہے ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ))(مسلم ' عن ابی رقیہ تمیم بن اوسؓ ) ''دین خیر خواہی کا نام ہے''۔ یعنی دوسروں کی بھلائی چاہنا دین اسلام کا اہم

تقاضا ہے۔ اگرچہ حسن سلوک تو سب کے ساتھ ہونا چاہیے مگر اس کے اولین مستحق وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے آپ کا رشتہ دار بنایا ہے ---- رشتہ داری اور دوستی میں بڑا فرق ہے۔ رشتہ دار تو وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا رشتہ آپ کے ساتھ جوڑا ہے ‘جبکہ دوستی کا تعلق ہم خود کسی کے ساتھ استوار کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کےپیدا کیے ہوئے تعلق کی اہمیت زیادہ ہے۔ چنانچہ قرآن اور حدیث میں رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کی باربار تاکید کی گئی ہے۔ رشتہ داروں میں سب سے قریب ترین رشتہ دار ماں باپ ہوتے ہیں جو انسان کے وجود کا سبب ہوتے ہیں اور اپنی اولاد کو پال پوس کر جوان کرتے ہیں۔ پھر ان کی ضروریات پوری کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ خود تکلیف برداشت کر لیتے ہیں مگر اولاد کو مشقت میں نہیں ڈالتے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں سب سے پہلے اپنی عبادت کا حکم دیا وہاں ساتھ ہی ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی بھی تاکید فرمائی۔ سورۃ النساء میں ارشاد ہے:

{وَ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ لَا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا} (آیت ۳۶)

’’اور اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائو اور اپنے ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔‘‘

سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

---



{وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا} (آیت ۲۳)

’’اور تمہارے ربّ نے حکم دیا ہے کہ نہ عبادت کرو مگر اُسی (اللہ) کی اور اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔‘‘

سورۃ الانعام میں ہے:

{قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمۡ عَلَیۡکُمۡ اَلَّا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّ بِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا} (آیت ۱۵۱)

’’(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے آئو میں تمہیں بتائوں جو کچھ تمہارے پروردگار نے تمہارے اوپر حرام کیا ہے‘ وہ یہ کہ تم اُس (اللہ) کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک نہ ٹھہرائو اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔‘‘

اس کے علاوہ قرآن مجید میں دوسری آیات میں بھی والدین کے ساتھ اچھا برتائو کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان کے ساتھ گستاخی سے پیش آنے کو منع کیا گیا ہے ۔ لہٰذا ہمہ وقت ان کے ساتھ بول چال میں بھی ادب کو ملحوظ رکھا جائے اور ان کو کوئی ایسا جملہ نہ کہا جائے جو ان کو برا لگے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{فَلَا تَقُلۡ لَّہُمَاۤ اُفٍّ وَّ لَا تَنۡہَرۡہُمَا وَ قُلۡ لَّہُمَا قَوۡلًا کَرِیۡمًا ﴿۲۳﴾}

’’پس ان دونوں (ماں باپ) کو اُف تک نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو بلکہ ان کے ساتھ خوشگوار لہجے میں بات

کرو۔''

رسول اللہ ﷺ نے بھی والدین کے ساتھ اچھے سلوک کی تاکید کی ہے۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ آپ ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

((اَلْوَالِدُ اَوسَطُ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ، فَاِنْ شِئْتَ فَاَضِعْ ذٰلِکَ الْبَابَ اَوْ اَحْفَظْهُ)) (سنن الترمذی)

''باپ جنت کے دروازوں میں سے بہترین دروازہ ہے۔چنانچہ تمہیں اختیار ہے خواہ اس دروازہ کو ضائع کر دو یا اس دروازہ کی حفاظت کرو۔''

یعنی باپ کی فرمانبرداری کر کے 'اسے راحت پہنچا کر اور اسے خوش کر کے جنت کا دروازہ اپنے لیے وا کر لو یا اس کی نافرمانی کر کے اور دل دکھا کر اس دروازے کو بند کر لو۔ اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے ایک اور موقع پر یوں بیان فرمایا:

---



((رِضَی الرَّبِّ فِی رِضَی الْوَالِدِ وَسَخَطُ الرَّبِّ فِیْ سَخَطِ الْوَالِدِ)) (سنن الترمذی، عن عبداللہ بن عمرورضی اللہ عنہما)

''ربّ کی رضا باپ کی رضامندی میں ہے اور رب کا غصہ باپ کے غصے میں ہے۔''

چونکہ والدہ اولاد کی خاطر نسبتاً زیادہ تکلیف اور مشقت برداشت کرتی ہے اس لیے وہ باپ سے بھی زیادہ حسن سلوک کی مستحق ہے۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تمہاری ماں''۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری ماں''۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہاری ماں''۔ اس نے پوچھا پھر کون؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: 'پھر تمہارا باپ۔'' (صحیح البخاری 'عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

والدین کی خدمت اور اطاعت کئی طرح سے اولاد کے لیے بھلائی کا باعث ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی رزق میں اضافے اور درازی عمر کا باعث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اس کی عمر دراز کی جائے اور اس کے رزق کو بڑھا دیا جائے اس کو چاہیے کہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کرے''۔ (مسند احمد 'عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ) اسی طرح ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کیا اس کے لیے خوشخبری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی عمر میں اضافہ فرمائیں گے۔'' (مستدرک حاکم' عن معاذ رضی اللہ عنہ)

ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اولاد کا فرض ہے۔ یہ اچھے اخلاق کا اولین تقاضا ہے' جس کے لیے قرآن مجید میں واضح احکام موجود ہیں اور رسول اللہ ﷺ کے فرمودات بھی بکثرت ملتے ہیں ۔ والدین کی خدمت و اطاعت سے نیک اولاد کو سکون میسر آتا ہے اور اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور اس پر آخرت کے ثواب اور جنت کی

نوید ہے۔ اس کے برعکس اس اولاد کی بدبختی کا کیا ٹھکانہ ہے جسے والدین کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں اور وہ اپنے رویے سے انہیں ناراض کرتی ہے' ان کے ساتھ گفتگو میں نرمی اختیار نہیں کرتی' اُن کا کہنا نہیں مانتی بلکہ انہیں پریشان اور تنگ کرتی ہے۔ چونکہ ایسی اولاد اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے ارشادات کی خلاف ورزی کرتی ہے اس لیے وہ کسی بشارت کی حق دار نہیں بلکہ اس کو انجامِ بد سے خبردار کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ



نے فرمایا: ''وہ آدمی ذلیل و خوار ہو' پھر ذلیل و خوار ہو' پھر ذلیل و خوار ہو''۔ عرض کیا گیا یارسول اللہ کون؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ شخص جو اپنے ماں باپ میں سے کسی ایک کو یا دونوںکو بڑھاپے کی حالت میں پائے پھر (ان کی خدمت سے ان کا دل خوش کر کے) جنت میںداخل نہ ہو۔'' (صحیح مسلم 'عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ) اسی طرح ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے اپنے والدین یا ان میں سے ایک کو پایا پھر ان کے ساتھ بدسلوکی کی تو وہ شخص دوزخ میں داخل ہو گا''۔ (مسند احمد عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ) گویا والدین کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آنا' ان کو دکھ دینا' تنگ کرنا 'ان کے لیے تکلیف اور اذیت کا باعث بننا' گفتگو یا عمل کے ساتھ ان کو ناراض کرنا ایسا گناہ ہے جو انسان کو آگ کے عذاب کا مستحق بنادے گا۔

والدین زندہ ہوں تو ان کے ساتھ حسن سلوک نہ صرف اخلاقی خوبی ہے بلکہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا حکم بھی ہے۔ اگر والدین میں سے ایک یا دونوں وفات پا جائیں تو بھی حکم ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک روا رکھا جائے اور ان کے لیے بخشش کی دعا کی جائے ۔ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یارسول اللہ ﷺ !کیا میرے لیے اپنے والدین کے انتقال کے بعد ان دونوں کے ساتھ حسن سلوک کی کوئی صورت باقی ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں ! ان کے لیے دعائیں کرنا' اللہ سے ان کے لیے مغفرت طلب کرنا' ان کے بعد ان کی وصیت کو پورا کرنا' جن لوگوں سے ان کی وجہ سے رشتہ داری ہے ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور ان کے دوستوں کا اکرام کرنا (والدین کے ساتھ حسن سلوک کے مترادف ہے)۔'' (سنن ابی دائود' عن ابی اسید مالک بن ربیعہ ساعدی رضی اللہ عنہ)

باپ کے رشتہ داروں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم رکھنے کا حکم ہے تو اس ضمن میں اچھی اولاد سے یہ بھی توقع ہے کہ وہ باپ کے دوستوں کے ساتھ بھی اچھے تعلقات رکھے' ان کا احترام کرے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ پیش آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ بیٹا(باپ کے انتقال کے بعد) باپ سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے''۔ (صحیح مسلم' عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ)

ماں باپ کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد صلہ رحمی کے اولین مستحق ان کے بہن بھائی اور قریبی رشتہ دار ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنے والد کی وفات کے بعدان کے

ساتھ صلہ رحمی کرنا چاہے جبکہ وہ قبر میں ہیں تو اس کو چاہیے کہ اپنے باپ کے بھائیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے''۔ (صحیح ابن حبان' عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ) حسن سلوک یہ ہے کہ ان کا ادب و احترام کرے' ان کی خوشی میں شریک ہو' رنج و پریشانی میں ان سے ہمدردی اور مدد کرے۔

رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم ہے 'مگر بعض رشتہ داروں کا رویہ نامناسب ہوتا ہے اور وہ اچھا سلوک نہیں کرتے بلکہ بدخواہ ہوتے ہیں' تو ایسے رشتہ داروں کے ساتھ بھی بھلائی کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ یعنی ان کی برائی کے جواب میں برا سلوک نہیں کرنا چاہیے بلکہ برائی کے مقابلہ میں بھلائی کر کے ان کو رام کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں جو برابری کا معاملہ کرے 'یعنی دوسرے کے اچھے برتاؤ کرنے پر اس سے اچھا برتاؤ کرے 'بلکہ صلہ رحمی کرنے والا تو وہ شخص ہے جو دوسرے کے قطع رحمی کرنے پر بھی صلہ رحمی کرے''۔ (صحیح البخاری' عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما)

ایک شخص جس کے رشتہ دار اس سے بدسلوکی کرتے تھے 'وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ ؐ سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسولؐ! میرے بعض رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں ان سے تعلق جوڑتا ہوں وہ مجھ سے تعلق توڑتے ہیں' میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوں وہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں' اور میں ان کی زیادتیوں کو برداشت کرتا ہوں وہ میرے ساتھ جہالت سے پیش آتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا: ''جیسا تم کہہ رہے ہو اگر حقیقت میں ایسا ہی ہے تو تم ان کے منہ میں گرم گرم راکھ جھونک رہے ہو اور جب تک تم اس پر قائم رہو گے تمہارے ساتھ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مددگار رہے گا''۔ (صحیح مسلم' عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

صلہ رحمی کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ اگر والدین یا دوسرے رشتہ دار کافر اور مشرک ہوں تو بھی ان کے ساتھ اچھے سلوک کا حکم ہے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میری والدہ جو شرک پر قائم تھی (مکہ سے) میرے پاس (مدینہ میں) آئی ۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ معلوم کیا اور پوچھا: میری والدہ آئی ہے اور مجھ سے ملنا چاہتی ہے تو کیا میں اپنی والدہ کے ساتھ صلہ رحمی کر سکتی ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اپنی والدہ کے ساتھ صلہ رحمی کرو!'' (صحیح البخاری)

صلہ رحمی کی تاکید' فضیلت اور اہمیت کے علی الرغم کوئی شخص اگر اپنے رشتہ داروں کے



ساتھ خواہ مخواہ حسد رکھتا ہے اور ان کی بدخواہی چاہتا ہے تو ایسے شخص کے لیے حدیث میں بڑی وعید آئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔'' (صحیح البخاری 'عن جبیر بن مطعم

رضی اللہ عنہ)

اس حدیث کی تشریح میں مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قطع رحمی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا سخت گناہ ہے کہ اس گناہ کی گندگی کے ساتھ کوئی جنت میں نہ جا سکے گا۔ ہاں جب اس کو سزا دے کر پاک کر دیا جائے گا یا کسی وجہ سے اس کو معاف کر دیا جائے تو جنت میں جا سکے گا۔''

قرآن و حدیث سے صلہ رحمی کی اہمیت واضح ہے' لیکن آخر پھر بھی کیوں اس کو نظر انداز کیا جاتا ہے؟تو اس کی ایک نفسیاتی وجہ ہے اور وہ یہ کہ عزت و ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی جس کے لیے چاہتا ہے رزق زیادہ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہے کم کر دیتا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عزت اور رزق کے اعتبار سے لوگوں کی حیثیت مختلف ہو جاتی ہے ۔ایک خاندان کے کچھ افراد عزت اور رزق کے اعتبار سے برتری حاصل کر لیتے ہیں اور دوسرے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ جو لوگ دنیوی اعتبار سے اوپر نکل جاتے ہیں وہ اپنے سے کمتر حیثیت کے رشتہ داروں کو حقیر سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں کہ ان کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے' جو نفرت پیدا کرتی ہے ۔اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رزق اور عزت کے اعتبار سے جو لوگ پیچھے رہ جاتے ہیں وہ اپنے ان رشتہ داروں سے حسد کرنے لگتے ہیں جو معاشرے میں ان سے اوپر سمجھے جاتے ہیں 'جس سے قریبی رشتہ داری کے باوجود نفرت کے جذبات جنم لیتے ہیں اور یہ دوری اختلاف سے بڑھ کر عداوت میں بدل جاتی ہے۔ دنیوی حیثیت کے اس فرق کو خدائی فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا جائے تو بات اختلاف و عداوت تک نہیں پہنچے گی۔

* * *



# رزقِ حلال کی برکتیں اور رزقِ حرام کا وبال

ہر جاندار کے زندہ رہنے کے لیے خوراک کی ضرورت ہے۔ اسی طرح انسان بھی زندہ رہنے کے لیے خوراک کا محتاج ہے۔ اس خوراک سے انسان کا جسم نشوونما پاتا ہے۔ خوراک کا جسمانی صحت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اچھی خوراک سے جسم کے اعضاء طاقت حاصل کرتے ہیں 'جبکہ بری خوراک کئی طرح کی بیماریوں کا

باعث بنتی ہے۔ اسی لیے ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اچھی سے اچھی غذا کھائے۔ انسانی خوراک میں پھل اور سبزیاں، دودھ اور گھی، گوشت اور انڈے اچھی غذائیں ہیں۔ ان سے جسم مضبوط اور توانا ہوتا ہے۔ جس طرح خوراک انسانی جسم کو ظاہری طور پر متاثر کرتی ہے اسی طرح غذا کا انسان کی روحانی صحت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔
انسان کو حصولِ رزق کے لیے جائز طریقے بتا دیے گئے ہیں، چنانچہ جو شخص روزی حاصل کرنے کے لیے جائز ذرائع استعمال کرے گا اور رزق حلال کھائے گا اُس کے اخلاق و کردار مثبت طور پر اثر قبول کریں گے۔یوں اس کے لیے نیکی کے کام کرنے میں آسانی ہو گی۔ اس کا دل اللہ کی عبادت اور دوسرے نیک کاموں کی طرف مائل ہو گا۔ اس کے برعکس جو شخص روزی کمانے میں محتاط نہیں ہوتا اور اسے رزق حلال کے حصول کی فکر نہیں ہوتی، بلکہ اسے جس کام میں وافر روزی حاصل ہوتی نظر آتی ہے وہ اُسی کی طرف مائل ہوجاتا ہے، تو ایسے شخص کے اخلاق و کردار منفی اثر قبول کرتے ہیں۔
رزقِ حلال انسان کے کردار و عمل کو صحیح سمت کی طرف لے جانے میں ممدومعاون ہوتا ہے، اس لیے اسلام میں اس کے بارے میں خصوصی ہدایات دی گئی ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

{یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾} (البقرۃ)

''اے اہلِ ایمان! ان پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ جو ہم نے تم کو رزق دیا ہے اور اللہ کا



شکر ادا کرو اگر تم اُسی کی عبادت کرتے ہو۔''

رزق کی فراہمی تو بہرحال اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے۔ وہ اچھے برے اور نیک و بد سب کو روزی دیتا ہے۔ اب یہ انسان کی آزمائش ہے کہ وہ اپنی قسمت کا رزق کس طرح حاصل کرتا ہے۔ اگر اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ حصولِ رزق کا کوئی ناجائز ذریعہ اختیار نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کی قسمت کا رزق جائز اور حلال ذرائع سے دے گا ،اور جس نے جائز و ناجائز کا خیال نہ رکھا ،بلکہ جس جگہ سے اسے زیادہ روزی ملنے کی امید ہوئی اس نے وہی ذریعہ اختیار کر لیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے بھی اس کا ازل سے طے شدہ مقسوم ہی ملے گا۔
انسان روزی کے حصول کے لیے جائز یا ناجائز جدوجہد تو کر سکتا ہے مگر روزی کا گھٹانا یا بڑھانا اس کے دائرہ اختیار میں نہیں، کیونکہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

{اَللّٰهُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ} (الرعد:۲۶)

'' اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق بڑھاتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے رزق تنگ کر دیتا ہے۔''

رزقِ حلال کی فضیلت واضح کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ))(۱)

''حلال روزی حاصل کرنے کی فکر و جدوجہد فرض کے بعد فریضہ ہے۔''

گویا جس طرح اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام نماز روزہ وغیرہ فرض ہیں اسی طرح روزی کمانے کے لیے جائز ذرائع اختیار کرنا بھی فرض ہے اور اللہ کے احکام کی بجاآوری کا نام عبادت ہے۔ اسی طرح صاف ستھری روزی کمانے والے کو جہاں دوسرے بہت سے فائدے ہوں گے وہاں ایک فائدہ یہ ہو گا کہ اس راہ میں کی جانے والی کوشش پر اسے عبادت کا ثواب ملے گا۔

روزی کمانے کا بڑا ذریعہ تجارت اور سوداگری ہے۔جو شخص اپنی تجارت اور کاروبار میں سچائی اور دیانت داری اختیار کرتا ہے اور اللہ کے احکام کی پابندی کرتا ہے اسے قیامت اور آخرت میں اچھے انجام کی خوشخبری سنائی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِيْنُ مَعَ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ))(۲)

''پوری سچائی اور دیانت داری کے ساتھ کاروبار کرنے والا تاجر (آخرت میں) نبیوں'



صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہو گا۔''

صاف ستھرے طریقے سے روزی کمانا آسان کام نہیں' کیونکہ نفسِ انسانی تو انسان کو برائی کی طرف کھینچتا ہے۔ کثرت کی خواہش اور طمع ولالچ انسان کو آسانی سے غلط راہ پر لے جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے:

{اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ} (یوسف:۵۳)

''بے شک نفس تو پورے زور کے ساتھ برائی کی طرف مائل کرتا ہے۔''

اسی لیے جو شخص رضائے الٰہی کی خاطر یہ گھاٹی عبور کر لیتا ہے اسے جنت میں انبیاء 'صلحاء اور شہداء کی رفاقت نصیب ہونے کی بشارت ہے۔

سب سے پاکیزہ اور بابرکت کمائی وہ ہے جو بندہ اپنے ہاتھوں کی محنت سے کمائے۔ رسول اللہ ﷺ حضرت دائود علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ اَنْ يَّاْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ ' وَاِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَاْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدَيْهِ))(۳)

''کبھی کسی نے کوئی کھانا اس سے بہتر نہیں کھایا جو اُس نے اپنے ہاتھوں کی محنت سے کمایا ہو۔ اور اللہ کے پیغمبر دائود علیہ السلام اپنے ہاتھوں سے کام کر کے کماتے تھے۔''

ہاتھوں کی محنت سے کمانا کوئی گھٹیا کام نہیں بلکہ سنت دائودیؑ ہونے کے ناتے فضیلت کی بات ہے۔ جو لوگ ہاتھ

سے کام کرنے والوں کو حقیر سمجھتے ہیں ان کے لیے اس میں عبرت کا سامان ہے۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سی کمائی زیادہ پاک اور اچھی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

((عَمَلُ الرَّجُلِ بِيَدِهِ وَكُلُّ بَيْعٍ مَبْرُوْرٍ))(۴)

''آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور ہر تجارت جو پاک بازی کے ساتھ ہو (بہترین کمائی ہے)۔''

رزقِ حلال انسان کے وجود میں صالح خون پیدا کرتا ہے' جس سے اس کے دل میں نورانیت پیدا ہوتی ہے 'جو اچھائیوں کی طرف مائل کرتی اور برائیوں سے نفرت پیدا کرتی ہے۔ اس کے برعکس حرام اور ناجائز طریقوں سے کمایا ہوا مال نری ہلاکت ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بدترین۔ حدیث میں آتا ہے:



((اِنَّ اللهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلاَّ طَيِّبًا)) (۵)

''بے شک اللہ پاک ہے اور وہ صرف پاک چیز ہی کو قبول کرتا ہے۔''

حرام کمائی میں سے اگر صدقہ وخیرات کیا جائے تو وہ بھی قبول نہیں' حتیٰ کہ جو شخص حرام مال چھوڑ کر مرجاتا ہے وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ بن جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَكْسِبُ عَبْدٌ مَالَ حَرَامٍ فَيَتَصَدَّقُ مِنْهُ فَيُقْبَلُ مِنْهُ فَيُبَارَكُ لَهُ فِيْهِ' وَلَا يَتْرُكُهُ خَلْفَ ظَهْرِهِ اِلاَّ كَانَ زَادَهُ اِلَى النَّارِ' اِنَّ اللهَ لَا يَمْحُو السَّيِّئَ بِالسَّيِّئِ وَلٰكِنْ يَمْحُو السَّيِّئَ بِالْحَسَنِ' اِنَّ الْخَبِيْثَ لَا يَمْحُو الْخَبِيْثَ))(٦)

''ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ کسی ناجائز طریقے سے مال کمائے اور اس میں سے فی سبیل اللہ صدقہ کرے تو اس کا صدقہ قبول ہو' اور اس میں سے خرچ کرے تو اس میں برکت ہو۔ اور جو شخص حرام مال (مرنے کے بعد) پیچھے چھوڑ کے جائے گا تو وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ ہی ہو گا۔ یقینا اللہ تعالیٰ بدی کو بدی سے نہیں مٹاتا بلکہ بدی کو نیکی سے مٹاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ گندگی گندگی کو نہیں دھو سکتی۔''

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مِنْ عِنْدِ رَبِّهِ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ: عَنْ عُمْرِهِ فِيْمَ اَفْنَاهُ وَعَنْ شَبَابِهِ فِيْمَ اَبْلَاهُ وَعَنْ مَالِهِ مِنْ اَيْنَ اكْتَسَبَهُ وَفِيْمَ اَنْفَقَهُ وَمَاذَا عَمِلَ فِيْمَا عَلِمَ))(۷)

''قیامت کے دن اولادِ آدم کا کوئی فرد اپنے رب کے پاس سے اپنے قدم نہیں اٹھا سکے گا جب تک اس سے پانچ سوال نہ پوچھ لیے جائیں: (۱) زندگی کہاں فنا کی؟ (۲) جوانی کن مشغلوں میں بوسیدہ کی؟ (۳) مال کہاں (اور کن طریقوں) سے کمایا؟ (۴) مال کہاں خرچ کیا؟ (۵) اپنے علم پر کتنا عمل کیا؟''

ان پانچ سوالوں میں سے تیسرا اور چوتھا سوال مال کے بارے میں ہے کہ تو نے زندگی میں مال کیسے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ گویا حرام مال دنیا میں تو انسان کھا لے گا' پہن لے گا' بال بچوں کو کھلا لے گا اور پیچھے بھی

چھوڑ جائے گا' مگر آخرت میں اسے جواب دہی کرنا ہو گی اور آخرت وہ جگہ ہے جہاں کوئی سفارش اور رشوت نہیں چلے گی اور فیصلہ کرنے والی خود اللہ تعالیٰ کی ذات ہو گی۔



رزق حرام کی جتنی بھی برائی بیان کی جائے کم ہے' کیونکہ یہ کمائی انسان کو دوزخ میں لے جائے گی جس سے برا کوئی انجام نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَکُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ کَانَتِ النَّارُ اَوْلٰی بِہٖ))(۸)

''وہ گوشت جنت میں نہ جا سکے گا جس کی نشوونما حرام مال سے ہوئی ہو اور ہر گوشت (جسم) جو حرام مال سے پلا بڑھا ہے دوزخ اس کی زیادہ مستحق ہے۔''

رشوت اور سود حرام کمائی ہے۔ جھوٹ بول کر' دھوکہ دے کر اور کم تول کر کی ہوئی کمائی حرام ہے۔ ملازم اگر شرائط ِ ملازمت کے مطابق فرائض کی ادائیگی نہیں کرتا مگر تنخواہ پوری وصول کرتا ہے تو وہ بھی حرام کمائی ہے۔چوری کر کے ڈاکہ ڈال کر لوٹا ہوا مال مالِ حرام ہے۔ مالِ حرام تمام نیکیوں کو ضائع کر دیتا ہے۔ حرام مال کھانے والے کا نماز' روزہ اور حج قبول نہیں۔ حرام مال سے نکالی ہوئی زکوٰۃ مسترد ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنِ اشْتَرٰی ثَوْبًا بِعَشَرَۃِ دَرَاھِمَ وَفِیْہِ دِرْھَمٌ حَرَامٌ لَمْ یَقْبَلِ اللّٰہُ لَہٗ صَلٰوۃً مَّا دَامَ عَلَیْہِ))(۹)

''جس شخص نے دس درہم میں کوئی کپڑا خریدا اور اس میں ایک درہم حرام کا تھا تو جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر رہے گا اس کی کوئی نماز اللہ کے ہاں قبول نہ ہو گی۔''

ایک شخص بڑے ذوق و شوق کے ساتھ حج کو جاتا ہے' سفر کی صعوبت اٹھاتا ہے' وہاں دوڑ دھوپ کرتا اور مشقت اٹھاتا ہے' ہاتھ پھیلا کر اللہ سے دعائیں مانگتا ہے مگر اس کی دعا حرام مال کی وجہ سے مسترد کر دی جاتی ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''لوگو! اللہ تعالیٰ پاک ہے' وہ صرف پاک ہی کو قبول کرتا ہے اور اس نے اس بارے میں جو حکم اپنے پیغمبروں کو دیا ہے وہی اپنے سب مؤمن بندوں کو دیا ہے۔(پیغمبروں کے لیے اس کا ارشاد ہے کہ) اے پیغمبرو! تم پاک اور حلال غذا کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ (اہل ایمان کو مخاطب کر کے اس نے) فرمایا کہ اے اہل ایمان تم ہمارے رزق میں سے حلال اور طیب کھاؤ اور حرام سے بچو۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ایک ایسے آدمی کا ذکر فرمایا جو طویل سفر کر کے (کسی مقدس مقام پر) ایسے حال میں جاتا ہے کہ اس کے



بال پراگندہ ہیں اور جسم اور کپڑوں پر گرد و غبار ہے اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کے دعا کرتا ہے: اے میرے ربّ ! اے میرے ربّ ! اور حالت یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام ہے' اس کا پینا حرام ہے' اس کا لباس

حرام ہے اور حرام غذا سے اس کی نشوونما ہوئی ہے۔ تو اس آدمی کی دعا کیسے قبول ہوگی؟''(۱۰)

حرام کمائی میں سود بھی شامل ہے۔ قرآن مجید میں سودی کاروبار کی ممانعت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ۚ وَ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۹﴾}(البقرۃ)

''اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سود میں سے جو کچھ رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو' اگر تم ایمان والے ہو۔ پس اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس رات مجھے معراج ہوئی میرا گزر ایک ایسے گروہ پر ہوا جن کے پیٹ گھڑوں کی طرح ہیں اور ان میں سانپ بھرے ہوئے ہیں جو باہر سے نظر آتے ہیں۔ میں نے جبریلؑ سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے بتلایا کہ یہ سود خور ہیں۔''(۱۱)

اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حرام کمائی انجام کے اعتبار سے کس قدر خطرناک اور خوفناک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کمائی سے بھی منع کیا ہے جو مشتبہ ہو' یعنی جس کا حلال و حرام واضح نہ ہو' مبادا کہ وہ حرام ہو اور اس کا حصول عذاب میں مبتلا کرنے کا سبب بن جائے۔

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں عام طور پر اس میں حلال و حرام کی تمیز اٹھ گئی ہے۔ ہم پاکستانی مسلمان بحیثیت مجموعی دنیا کی بدعنوان ترین قوم شمار ہوتے ہیں۔ رزقِ حلال کے حصول کی اہمیت نگاہوں سے دور ہو چکی ہے۔ دولت کی ہوس اور کثرت کی خواہش نے عاقبت کی گرفت کو ذہن سے نکال دیا ہے۔ یہ وہی دَور ہے جس کی خبر رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں دی ہے:

((یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَایُبَالِی الْمَرْءُ مَا اَخَذَ مِنْہُ اَمِنَ الْحَلَالِ اَمْ مِنَ



الْحَرَامِ))(۱۲)

''لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی کو اس کی پروا نہ ہوگی کہ وہ جو لے رہا ہے' حلال ہے یا حرام ؟''

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر مسلمان اپنی روزی پر نظر رکھے اور جہاں کوئی مشتبہ چیز نظر آئے اسے بھی چھوڑ دے۔ پاکیزہ روزی حاصل کرے اور اسی سے اپنی ضروریات پوری کرے۔ دنیا کی حیثیت و وجاہت اور status کی اہمیت ذہن سے نکال دے اور سمجھ لے کہ اس status کو بہتر سے بہتر کرنے کی جدوجہد میں اگر جہنم کی آگ میں جلنا پڑے تو کیا وہ ہمیں قبول ہے یا دنیا کی زندگی میں حلال پر اکتفا کر کے کمتر درجے کے status پر گزارا کرنا

بہتر ہے جس سے عاقبت کی سزا سے بچا جا سکے؟ جب انسان اپنی اصلاح کر لے اور رزقِ حلال کے حصول پر کاربند ہو جائے تو پھر اپنے رشتہ داروںاور حلقہ احباب میں رزقِ حرام کی شناعت واضح کرنے کے مواقع کی تلاش میں رہے اور موقع ملنے پر حق تبلیغ ادا کر کے سرخرو ہو۔ ورنہ رزقِ حرام کھانے اور کھانے والوں کو نہ روکنے کا انجام تو اوپر رسول اللہ ﷺ کے فرامین کی روشنی میں واضح ہو چکا۔

## حواشی

(۱) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔

(۲) سنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ ﷺ باب ما جاء فی التجار...

(۳) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ۔

(۴) مسند احمد، ح ۱۶۶۲۸۔ راوی : رافع بن خدیج ص۔

(۵) صحیح مسلم،کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب لاطیب وتربیتھا۔

(۶) مسند احمد، ح ۳۴۹۰۔ راوی: عبداللہ بن مسعودص-

(۷) سنن الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع عن رسول اللہ ﷺ باب ما جاء فی شان الحساب والقصاص۔

(۸) مسند احمد، ح ۱۳۹۱۹، والبھیقی فی شعب الایمان۔ راوی : جابر بن عبداللہ۔

(۹) رواہ احمد فی المسند۔ والبیھقی فی شعب الایمان۔

(۱۰) صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب قبول الصدقۃ من الکسب والطیب وتربیتھا۔

(۱۱) مسند احمد، سنن ابن ماجہ۔

(۱۲) صحیح البخاری،کتاب البیوع، باب من لم یبال من حیث کسب المال۔

اُمت مسلمہ ربّ العالمین کے چنیدہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۚ} (فاطر:۳۲)

''پھر ہم نے وارث کیے کتاب کے وہ لوگ جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا۔''

یہ آیت مسلمانوں کی فضیلت پر شاہد ہے۔ فضیلت والے اس مقام کا تقاضا ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی بن کر رہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میارشاد ہے: {اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ} (الحجرات:۱۰)''بلاشبہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں''۔ گویا ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی کا خیر خواہ' ہمدرداور غم خوار ہو۔ ہر انسان پسند کرتا ہے کہ اس کی عزت ہو' اس کو نفع پہنچے' اُس کی خیر خواہی کی جائے۔ اُس کی غیر حاضری میں اُس کے اچھے کاموں کی تعریف کی جائے۔ پس اخوت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ایسا ہی رویہ رکھے' بلکہ ایسا رویہ تو مسلمان ہونے کی علامت ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَایُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ)) (متفق علیہ)

''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

اس مضمون کو مختلف احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔ ملاقات کے وقت السلام علیکم کہنا شعائر اسلام میں سے ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے ملاقات کرتا ہے تو اُس وقت اُس کے لیے سلامتی کی دعا کرتا ہے۔ جس کو دعا دی جاتی ہے وہ بھی جواباً انہی الفاظ میں یا ان سے بہتر الفاظ میں دعا دیتا ہے۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مؤمن جب مؤمن سے ملتا ہے ' اس کو سلام کرتا ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کرتا ہے تو دونوں کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جیسے درخت کے پتے جھڑتے ہیں۔'' (ترمذی)



سلام اس قدر محبت پیدا کرنے کا باعث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بارہا اس کی تلقین فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں تو جدا ہونے سے پہلے دونوں کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔'' (ابوداؤد) ملاقات کے وقت مسلمان اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ خوشی کے جذبات اور خندہ پیشانی سے ملتا ہے تو یہ بڑا فضیلت کا عمل ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اپنے مسلمان بھائی کو خوش کرنے کے لیے اس طرح ملتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے خوش کر دیں گے۔'' (رواہ الطبرانی فی الصغیر)

مسلمان بھائی کے لیے نیک تمنا اور اچھی دعا بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے ۔ اگر یہ دعا کسی کی غیر حاضری میں کی جائے تو اس کی فضیلت زیادہ ہوجاتی ہے۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کی دعا اپنے مسلمان بھائی کے لیے پیٹھ پیچھے قبول ہوتی ہے۔ دعا کرنے والے کے سر کے جانب ایک فرشتہ مقرر ہوتا ہے' جب بھی یہ دعا کرنے والا اپنے بھائی کے لیے بھلائی کی دعا کرتا ہے تو اس پر وہ فرشتہ آمین کہتا ہے (اور دعا کرنے والے سے کہتا ہے) اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اس جیسی بھلائی دے جو تم نے اپنے بھائی کے لیے مانگی ہے۔'' (مسلم)

جب مسلمان جمائی لیتا ہے تو ''الحمد للہ'' کہتا ہے ۔جو شخص یہ کلمہ سنتا ہے اُس پر لازم ہے کہ وہ جواباً ''یرحمک اللہ'' کہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے۔ گویا جب کسی نے اللہ کی حمد کی تو سننے والا اسے دعا دے کہ اللہ تعالیٰ تجھ پر رحم کرے۔ یہ اندازِ محبت اور خیر خواہی کا مظہر ہے۔

زندگی میں بعض اوقات کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑجاتا ہے یا مصیبت کا کوئی وقت آجاتا ہے تو ایسی صورت میں اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ دامے 'درمے 'سخنے ہمدردی کا اظہار اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہے ۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی اپنے بھائی کی حاجت پوری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی حاجت پوری فرماتے ہیں۔'' (ابوداؤد) گویا دوسرے مسلمان کی حاجت پوری کرنے سے بندہ اللہ کی ذمہ داری میں آجاتا ہے۔ مسلمان بھائی کو جس طرح کی مدد کی ضرورت ہو مشکل میں اس کا ساتھ دینا اجر و ثواب کا باعث اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے



کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اپنے کسی بھائی کے کام کے لیے چل کر جاتا ہے تو اس کا یہ عمل دس سال کے اعتکاف سے افضل ہے اور جو شخص ایک دن کا اعتکاف بھی اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے اور جہنم کے درمیان تین خندقیں حائل فرما دیتے ہیں' ہر خندق زمین وآسمان کی مسافت سے زیادہ چوڑی ہے۔'' (طبرانی' مجمع الزوائد)

اسلامی بھائی چارے میںمحبت' الفت اور اپنائیت کا عنصر اس قدر اہم ہے کہ ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان کا بدخواہ اور اذیت کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو تو فاعل کا اسلام ہی مشکوک ہوجاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔'' (بخاری) یوں مسلمان اپنے بھائیوں کے لیے شرافت' نرمی اور حمایت کا مجموعہ ہو جاتا ہے۔

مہمان کی عزت کرنا 'اس کے آرام اور ضروریات کا خیال رکھنا اسلامی اخلاق کی اہم تعلیم ہے۔ حضرت ابوسعید

خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔'' آپ ﷺ نے یہ بات تین بار ارشاد فرمائی ۔ ایک شخص نے عرض کیا :یارسول اللہ ! مہمان کا اکرام کیا ہے؟ ارشاد فرمایا : ''تین دن۔ اور جو اس کے بعد بیٹھا رہے تو میزبان کا کھانا پلانا مہمان پر احسان ہے۔'' (مسند احمد)

مسلمان بھائی کا اکرام یہ بھی ہے کہ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت کی جائے۔ عیادت کے موقع پر ایسی امید افزا گفتگو کی جائے کہ مریض کا دل خوش ہو جائے اور عیادت اس کے لیے سکون اور چین کا باعث ہو۔ عیادت بڑی فضیلت کا کام ہے ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا :''جو مسلمان کسی مسلمان کی صبح کو عیادت کرتا ہے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اُس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں اور جو شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اُس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں اور اسے جنت میں ایک باغ مل جاتا ہے۔'' (ترمذی) مریض کی عیادت جہاں بیمار کے لیے خوش آئند ہوتی ہے وہاں عیادت کرنے والا مریض سے اپنے حق میں دعا بھی کرا سکتا ہے اور مریض کی دعا مستجاب ہوتی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے



فرمایا :''جب تم مریض کے پاس جاؤ تو اس سے کہو کہ وہ تمہارے لیے دعا کرے ،کیونکہ اس کی دعا فرشتوں کی دعا کی طرح ہوتی ہے۔'' (ابن ماجہ)

اگر کوئی مسلمان بھائی ضرورت مند ہو اور وہ قرض کا سوال کرے تو اسے انکار کر کے مایوس اور بددل نہیں کرنا چاہیے بلکہ حسب ِ استطاعت اس کی مدد کرنا چاہیے۔ اس طرح ایک مسلمان بھائی اپنی ضرورت پوری کرلے گا اور ضرورت کے وقت کام آنے والا شخص بے حساب اجر و ثواب پائے گا۔ اور اگر مقروض کے نامساعد حالات کی وجہ سے اسے قرضے کی ادائیگی میں مہلت دی جائے تو یہ عمل قرضے کے ثواب سے کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس شخص کا کسی دوسرے شخص پر کوئی حق (قرضہ وغیرہ)ہو اور وہ اس مقروض کو ادا کرنے کے لیے دیر تک مہلت دے دے تو اس کو ہر دن کے بدلے صدقہ کا ثواب ملے گا۔'' (مسند احمد)

اگر مسلمان بھائی عمر میں بڑا ہو تو اس کی تعظیم کی جائے' ادب و احترام کے ساتھ بلایا جائے' اسے عزت کا احساس دلایا جائے ۔اور اگر مسلمان بھائی عمر میں چھوٹا ہو تو اس کے ساتھ شفقت اور ہمدردی کا سلوک کیا جائے۔ اسلامی اخلاق کی یہ چیزیں آپس کی محبت اور مؤدت میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ اس لیے اسلامی تعلیمات میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے

ارشاد فرمایا: ''جو شخص ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے اور ہمارے بچوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے عالم کا حق نہ پہچانے وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔'' (مسند احمد)

مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کا عیب ظاہر نہ کرے۔ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے' ہر شخص سے نامناسب اور غیر محتاط کام ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر کسی مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان کی کمزوری ' راز' عیب غلطی یا گناہ کے کام کا علم ہوجائے تو اسے دوسروں پر ظاہر نہ کرے 'بلکہ اُس کی پردہ پوشی کر کے اسے ندامت سے بچائے۔یہ بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کے عیوب پر پردہ ڈالے گا اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کے عیوب پر پردہ ڈالے گا...'' (مسند احمد)

---



اگر کسی مسلمان بھائی سے قصور ہو جائے یا جسمانی تکلیف پہنچے تو حتی الوسع اسے معاف کر دینا چاہیے۔ یہ مسلمان بھائی کا اکرام ہے۔ اگر وہ اپنی غلطی پر معذرت کرے تو اُس کی معذرت قبول کر لینی چاہیے ۔ حضرت ابودردا رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا :''جس شخص کو بھی (کسی کی طرف سے) جسمانی تکلیف پہنچے پھر اس کو معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کا ایک درجہ بلند فرما دیتے ہیں اور ایک گناہ معاف فرما دیتے ہیں۔'' (ترمذی)

اپنے مسلمان بھائی کے بارے میں بدگمانی سے منع کیا گیا ہے اور ہر اس طرزِ عمل اور گفتگو سے باز کیا گیا ہے جس سے اس کی عزت میں فرق آتا ہو یا اہانت ہوتی ہو۔ خانہ کعبہ دنیا کے مسلمانوں کا مرکزی مقام ہے۔ اس کا احترام ہر مسلمان کے دل میں ہے۔ نماز ادا کرتے وقت مسلمان اس کی طرف رخ کرتے ہیں۔ حج کے موقع پر اس کا طواف کرتے ہیں۔ خانہ کعبہ اللہ کا گھر ہے 'اس کی عظمت بہت زیادہ ہے ۔خانہ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر اسے عقیدت کے ساتھ دیکھنا بھی ثواب کا باعث ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ایک مسلمان کی عزت و حرمت خانہ کعبہ سے بھی زیادہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کو دیکھ کر ارشاد فرمایا: ''لا الٰہ اِلا اللہ (اے کعبہ !) تو کس قدر پاکیزہ ہے' تیری خوشبو کس قدر عمدہ ہے اور تو کتنا زیادہ قابل احترام ہے (لیکن) مؤمن کی عزت و احترام تجھ سے زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو قابل احترام بنایا ہے اور (اسی طرح) مؤمن کے مال ' خون اور عزت کو بھی قابل احترام بنایا ہے ۔ اس بات کو بھی حرام قرار دیا ہے کہ ہم مؤمن کے بارے میں ذرا بھی بدگمانی کریں۔'' (طبرانی' مجمع الزوائد)

* * *



# دُنیوی زندگی کی حقیقت

انسان کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی صلاحیتوں سے نواز کر دوسرے جانداروں سے ممتاز کیا۔ اس شرف و امتیاز کے بدلے میں اسے اپنے خالق و مالک کی اطاعت کا حکم دیا اور نیک و بد کی پہچان کا مکلف ٹھہرایا۔ دنیا کی زندگی میں جابجا دکھ اور درد بھی ہیں مگر راحت و آسائش کے سامان بھی ہیں۔ پھر شیطانی طاقتوں کو بھی پھلنے پھولنے اور انسانوں کو دنیوی نعمتوں کے حصول میں مگن کرنے کی اجازت دے دی۔اس طرح انسان اس زندگی میں سراسر ابتلاء و آزمائش میں ہے۔ ہاں اس امتحان میں کامیاب ہونے والوں کو بدلے میں حیاتِ جاودانی ملے گی جو ایسی نعمتوں سے بھرپور ہوگی جس کا آج کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا' جبکہ ناکام ہونے والوں کو خالق و مالک کے غضب کا نشانہ بننا پڑے گا۔

اس جہان میں جہاں شیطانی طاقتیں لوگوں کو گمراہ کرنے میں سرگرم ہیں وہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں کو انبیاء و رسل بنا کر بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو اللہ کی رضا والے کام کرنے کی تلقین کریں اور طاغوتی طاقتوں کی پیروی کرنے کے انجامِ بد سے خبردار کریں۔ چونکہ دنیوی چمک دمک نقد سودا ہے اس لیے انسان کا اس کی طرف لپکنا بڑا آسان ہے' مگر اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ذریعے دنیا کی حقیقت اچھی طرح سے واضح کر کے انسان کو سچی کامیابی سے آگاہ کر دیا ہے ۔ آخری الہامی کتاب قرآن مجید میں تو یہ مضمون مختلف پیرائے میں متعدد مرتبہ دہرایا گیا ہے اور خبردار کیا گیا ہے کہ حیاتِ دنیوی تو بس دھوکے کا سامان ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

{اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّ لَہۡوٌ وَّ زِیۡنَۃٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَ تَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ ؕ کَمَثَلِ غَیۡثٍ اَعۡجَبَ الۡکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَہِیۡجُ فَتَرٰىہُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ یَکُوۡنُ حُطَامًا ؕ وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۙ وَّ مَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضۡوَانٌ ؕ وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ ﴿۲۰﴾} (الحدید)

''جان رکھو دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا اور زینت (وآرائش) اور تمہارے آپس میں فخر (وستائش) اور مال و اولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب (و خواہش) ہے ... اور دنیا کی زندگی تو محض متاعِ فریب ہے۔''

سورۂ آل عمران میں فرمایا:

{كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿ ۱۸۵ ﴾}

''ہر متنفس کو موت کا مزا چکھنا ہے' اور تم کو قیامت کے دن تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا' تو جو شخص جہنم سے دور رکھا گیا اور بہشت میں داخل کیا گیا وہ مراد کو پہنچ گیا' اور دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔''

انبیاء کرام علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ کا پیغام اُس کے بندوں تک پہنچانے کا حق ادا کر دیا ۔ اللہ کی رضا والے کام بھی بتا دیے اور ان کاموں سے بھی خبردار کر دیا جو اُس کی ناراضگی کا باعث ہیں۔ پس جن لوگوں نے نقد منافع کو چھوڑ کر حق کی آواز کو قبول کیا وہ حقیقت میں کامیاب قرار دیے گئے۔ ان کے ساتھ حیاتِ اُخروی میں انعامات کا وعدہ کیا گیا' جبکہ باطل پر اَڑ جانے والوں اور سفلی خواہشات کی پیروی کرنے والوں کو دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ۔یہ اس لیے کہ قرآن مجید میں واضح کیا گیا ہے کہ انسان دنیا کی زندگی میں سراسر امتحان میں ہے اور جو امتحان میں ہو اس کی نظر امتحان کے نتیجہ پر لگی ہونی چاہیے۔ پس نتیجہ کے بارے میں فکر مند شخص دُنیوی زندگی میں محتاط طرزِ عمل اختیار کرے گا۔ یہ بات عین منطقی بھی ہے کہ حسن اخلاق' ہمدردی اور نیکی کا رویہ اختیار کرنے والے کو انجام کار انعام ملنا چاہیے' جبکہ بداخلاق چور' ڈاکو اور خائن کو اس کے جرائم کی سزا ملنی چاہیے' مگر ایسا اس دنیا میں نہیں ہو رہا۔ یہاں بروں کا رسہ عموماً دراز ہے اور اخلاقی اقدار کو اپنانے والے اور رزقِ حلال تلاش کرنے والے عموماً طرح طرح کی مشکلات میں ہیں اور ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ اگر کہیں بھی انصاف نہ ملے تو کائنات کا یہ نظام بالکل فضول ٹھہرتا ہے' جبکہ ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں' وہ تو الحکیم ہے ۔ اس کی حکمت اتنی عظیم ہے کہ انسانی دماغ اس کے اکثر کاموں کی حکمت نہیں جان سکتا۔ بے آباد علاقوں کے پھولوں اور جنگل کے درختوں کے پھلوں کی حکمت' بعض موذی



جانوروں مثلاً مکھی' مچھر وغیرہ کی تخلیق کی غایت انسانی فکر سے بالاتر ہے' حالانکہ اللہ نے کسی شے کو بے مقصد (فضول)پیدا نہیں کیا۔ وہ خود فرماتا ہے :

{وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ} (صٓ:۲۷)

''اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بلامقصد پیدا نہیں کیا۔''

اور پھر حق پرست لوگ اپنی دعا میں اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

{رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿ ۱۹۱ ﴾}(آل عمران)

''اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ (سب کچھ) بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے!''

یعنی تیری پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے لاتعداد ایسی ہیں جن کی حقیقت سے ہم بے خبر ہیں۔ پس ہماری اس بے خبری پر ہماری گرفت نہ کرنا۔

دنیا کی تمام چیزیں بنی نوع انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:{هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۠} (البقرۃ:۲۹)''اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے جو کچھ بھی زمین میں ہے سارے کا سارا تمہارے لیے پیدا کیا ہے''۔ سورج' چاند' ستارے' رات' دن' دریا' سمندر' مویشی' باربردار جانور سب انسان کی خدمت کر رہے ہیں۔ جب زمین پر انسانی زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا تو یہ چیزیں بھی ختم کر دی جائیں گی۔ انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ ان چیزوں سے فائدہ اٹھائے مگر ان کے خالق کو نہ بھولے' اسی طرزِ عمل کو اللہ کا ذکر کہا گیا ہے۔ پھر ان چیزوں کا فائدہ اس طرح اٹھایا جائے جو اللہ کے حکم کے مطابق ہو۔

انسان کو دنیوی زندگی میں کام آنے والی تمام چیزیں مہیا کر دی گئی ہیں۔ یہ چیزیں خوب سے خوب تر ہیں۔ انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ضرورت کی چیزوں کو استعمال کرے مگر سلیقے کے ساتھ۔ ان چیزوں کی حسن و خوبی میں اللہ تعالیٰ نے بڑی کشش رکھی ہے۔ اور یہی انسان کا امتحان ہے کہ اللہ کے حکم کی اطاعت کرتا ہے یا دنیا کی چمک دمک اور نقد فوائد میں نتائج کو بھول جاتا ہے۔ اس بات کی بار بار یاد دہانی کرائی گئی ہے کہ تم دنیا کی اس زندگی میں بامقصد برپا کیے گئے ہو۔ تمہارے یہاں کے اعمال تمہاری اگلی زندگی میں تمہیں فائدہ دیں گے یا تمہیں عذاب کا مستحق بنائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے:



{خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ} (الملک:۲)

''(اللہ تعالیٰ نے) موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔''

دنیوی زندگی لطف اٹھانے کے لیے نہیں' بلکہ یہ وہ وقفہ ہے جس میں محنت کر کے انسان نے اگلی ناختم ہونے والی زندگی بنانی ہے۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے: ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے' نہ ناری ہے !

زندہ انسان کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے معاشی جدوجہد کرنا ہوتی ہے۔ دن اسی لیے بنایا گیا ہے کہ انسان اس میں روزی کمانے کا کوئی پیشہ اختیار کرے۔ مگر اس کام میں مشغول اس طرح نہ ہو جائے کہ بس اسے دنیا کی زندگی سنوارنے ہی کی فکر لگی رہے' بلکہ روزی کی اس تگ و دو میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کو ہرگز نہ بھولے۔ جو کام بھی کرے وہ جائز ہو ۔مثال کے طور پر دکاندار ہے تو تول پورا رکھے' ملاوٹ نہ کرے' بیچتے وقت چیزوں کے عیب نہ چھپائے' گاہک کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھائے۔ اسی طرح ملازم ہے تو اپنے فرائض کو پوری دیانت داری سے ادا کرے۔ ذمہ داری اور دیانت داری سے کام کرے' رشوت نہ لے۔ علیٰ ہذا القیاس جو بھی ذریعہ آمدن اختیار کرے اس میں اللہ کے احکام کو یاد رکھے۔ اگر ایسا کرے گا تو روزی کمانے کی یہ جدوجہد اس کے لیے قدم قدم پر ثواب کا باعث ہوگی اور یہی اس کا امتحان ہے۔

اس زندگی میں اللہ کو یاد رکھتے ہوئے معاشی جدوجہد کرنے والے کے شب و روز بھی درست ہو جائیں گے۔ وہ جھوٹ نہیں بولے گا' وعدہ خلافی نہ کرے گا ' کسی بھی انداز سے دوسرے انسانوں کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ گویا وہ ایک اچھا انسان بن جائے گا جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے لوگ امن میں رہیں گے۔ مگر آزاد اور نفسانی خواہشات کے پیچھے لگنے والے خدافراموش لوگ انتہائی گھاٹے میں رہیں گے۔ جب انہیں ان کے اعمالِ بد کی سزا ملے گی اور وہ آگ میںڈالے جائیں گے تو وہاں واویلا کریں گے کہ ہمیں دوزخ سے ایک دفعہ باہر نکال دیجیے اور پھر دنیا والی زندگی عطا کر دیجیے' ہم اچھے کام کریں گے اور صالح انسان بن جائیں گے۔ مگر اُس وقت کا ان کا یہ واویلا ہرگز نہ سنا جائے گا' بلکہ کہا جائے گا کہ یہ بدلہ ہے



تمہارے ان اعمال کا جو تم نے یادِ خدا سے غفلت کر کے کمایا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:
{وَ لَوۡ تَرٰۤی اِذِ الۡمُجۡرِمُوۡنَ نَاکِسُوۡا رُءُوۡسِہِمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ رَبَّنَاۤ اَبۡصَرۡنَا وَ سَمِعۡنَا فَارۡجِعۡنَا نَعۡمَلۡ صَالِحًا اِنَّا مُوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۲﴾}(السجدۃ)
''اور اگر آپ مجرموں کو دیکھیں جس وقت وہ اپنے پروردگار کے سامنے سر ڈالے ہوئے ہوں گے اور کہیں گے اے ہمارے ربّ ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا پس ہم کو پھر واپس (دنیا میں) بھیج دے تو ہم بھلے کام کریں گے' اب تو ہمیں یقین آگیا ہے۔''
غرض اس زندگی کو ہی مقصود بنا لینا اور اللہ اور اُس کے رسول کے احکام کی پروا نہ کرنا نری جہالت

ہے۔ اس بات کو قرآن مجید میں بارہا دہرایا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی محض دھوکا ہے۔ یہاں کا فائدہ حقیقی فائدہ نہیں اور یہاں کا نقصان حقیقی نقصان نہیں ہے۔ اس زندگی کے مفاد کے حصول میں خدافراموش زندگی گزارنا خسارے کا سودا ہے۔ ایک دن موت کا آئے گا جب یہ زندگی ختم ہو جائے گی اور دوسری اور حقیقی زندگی شروع ہو جائے گی' پھر انجام سے بے خبر زندگی گزارنا کسی طور پر جائز نہیں۔ ایک شخص دوسرے شخص کا مال غصب کر لیتا یا چوری کر لیتا ہے۔ جس کا مال گیا وہ پریشان ہوا اور جس نے مال لوٹا وہ بڑا خوش ہوا۔ دونوں اس دنیا سے چلے جائیں گے اور قیامت کے روز اللہ کے حضور پیش ہوں گے ۔ اللہ تعالیٰ انصاف فرمائیں گے اور چور کو حکم دیں گے کہ اس کا مال واپس کرو تو وہ کہاں سے کرے گا۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرتے ہوئے مال کے بدلے چور کی نیکیاں حق مانگنے والے کو دیں گے۔ اب مالک تو خوش ہوگا کہ اسے شدید ضرورت کے وقت نیکیاں مل گئیں اور چور پریشان ہوگا کہ اسے دنیا میں چرائے ہوئے مال کے بدلے نیکیاں دینی پڑیں او رعذاب کا سامنا کرنا پڑا۔ معلوم ہوا کہ دنیا کی زندگی واقعی متاعِ غرور یعنی دھوکے کا سودا ہے۔ بقول اقبال: ؎

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریب سود و زیاں ! لاَ الٰہَ اِلَّا اللہ

دنیا کا پریشان حقیقی پریشان نہیں اور نہ دنیا کا آسودہ حقیقت میں آسودہ ہے۔ آسودہ تو وہ ہے جس نے دنیا کی زندگی میں نیک کام کیے' اَطِیْعُوا اللہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ پر عمل کیا' کسی کا حق غصب نہ کیا' بلکہ دنیا کی زندگی اگلی زندگی کی تیاری میں گزار دی۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!

* * *



# انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت

اللہ تعالیٰ ساری کائنات کا خالق اور رازق ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے : {وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا} (ھود:٦) ''زمین پر چلنے پھرنے والا (یعنی جاندار) جو بھی ہے اس کا رزق اللہ کے ذمے ہے'' ۔ وہ ہر جاندار کو اس کی ضرورت کے مطابق رزق دے رہا ہے۔ پرندوں کو دانہ دنکا' چرندوں کو گھاس پات اور درندوں کو گوشت مہیا کرتا ہے۔ اسی طرح انسانوں کو روزی فراہم کرتا ہے۔ ہر جاندار تھوڑی سی محنت اور کوشش سے اپنی روزی حاصل کر لیتا ہے۔ انسانوں کو بھی حکم ہے کہ روزی کے لیے جدوجہد کریں اور عقل و شعور کے ساتھ وہ ذرائع اختیار کریں جو خالق نے ان کے لیے جائز قرار دیے ہیں۔ ناجائز ذرائع سے روزی حاصل کرنے سے منع کر دیا گیا ہے' کیونکہ اس طرح حاصل کی ہوئی روزی معاشرے میں ظلم اور فتنے کا باعث بنتی ہے۔

انسان جدوجہد کے ساتھ اسی قدر روزی حاصل کر سکتا ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقدر کر رکھی ہے۔ یہ انسان کا کام ہے کہ وہ یہ روزی جائز ذرائع سے حاصل کرتا ہے یا ناجائز ذرائع سے ۔ بہرحال رزق کی فراہمی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے' وہ جس کے لیے چاہتا ہے روزی فراخ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے اور یہ سارا کام نہایت حکیمانہ انداز میں ہو رہا ہے۔ اگر سب لوگوں کو ایک جیسی فراخی یا تنگی ہوتی تو نظامِ کائنات نہیں چل سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں دولت کے اعتبار سے مختلف سطح کے لوگ ہیں 'امیر کبیر بھی ہیں اور غریب مسکین بھی۔ دنیا میں انسان سراسر امتحان میں ہے ۔جن کی روزی کشادہ ہے اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے کہ اس پیسے سے وہ اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں یا بے جا خرچ اور فضول خرچیاں کرتے ہیں۔ پیسے کے بل بوتے پر کمزوروں اور غریبوں کا استحصال کرتے ہیں یا تنگدستوں' محتاجوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں ۔ نادار' فقیر 'مسکین اور تنگدست لوگ بھی امتحان میں ہیں کہ وہ اس تنگی ترشی کو اللہ کی رضا سمجھ کر صبر کرتے ہیں یا شکوہ و شکایت اور بے صبری کا اظہار کرتے ہیں۔



اللہ تعالیٰ نے صاحب ثروت لوگوں پر لازم کیا ہے کہ اس مال کو اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کریں۔ اپنی ضروریات بھی پوری کریں اور اس مال میں سے معاشرے کے گرے پڑے لوگوں کی مدد بھی کریں۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دولت مند لوگ سمجھیں کہ ان کے پاس جو مال و دولت ہے وہ اللہ کا عطا کردہ بلکہ اللہ کی امانت ہے ؎

ایں امانت چند روزہ نزدِ ماست
در حقیقت مالک ہر شے خداست

قرآن مجید کتاب ہدایت ہے۔ ہر طرح کے لوگ اسے پڑھیں گے مگر اس سے فائدہ صرف وہی اٹھا سکیں گے جو متقی ہوں گے' اور متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے سورۃ البقرۃ کے آغاز میں یہ الفاظ ہیں کہ: ''یہ لاریب کتاب ہے 'اور یہ ہدایت ہے ان متقی لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں اور اس مال میں سے جو ہم نے انہیں دیا ہے خرچ کرتے ہیں''۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو مال و دولت کسی کے پاس ہے وہ عطیہ خداوندی ہے اور جو شخص اس قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا خواہش مند ہو اسے اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے ' غیب پر ایمان لانے اور نماز قائم کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہوگا 'یعنی اس مال کو اس انداز میں خرچ کرنا ہوگا کہ اپنی ضروریات بھی پوری کرے اور معاشرے کے نادار لوگوں کا بھی خیال رکھے۔ جب لوگوں نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا کہ کیا خرچ کریں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا :{قُلِ الْعَفْوَ} (آیت ۲۱۹) ''ان سے کہہ دیجیے کہ جو تمہاری ضرورتوں سے زائد ہو''۔ گویا مال و دولت سے اپنی ضروریات پوری کرنے سے نہیں روکا گیا 'ہاں یہ ضرور ہے کہ زائد از ضرورت مال جمع کر کے اپنے پاس رکھنا اور ضرورت مندوں کو نہ دینا کنجوسی اور بخل ہے' جو جائز نہیں۔ آیت ۱۹۵ میں ارشاد ہے کہ ''اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے تئیں اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو''۔ اللہ کا فرمان سچا ہے ۔وہ مال دار جو اللہ کا دیا ہوا مال اللہ کے حکم کے مطابق خرچ نہیں کرتا وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے ۔ اسے دنیاوی زندگی میں اس کا احساس نہ ہو تو اور بات ہے' بالآخر آخرت میں تو وہ اپنا خسارہ دیکھ لے گا 'جب اس سے سوال ہوگا کہ میرے دیے ہوئے مال میں سے میری راہ میں اور میرے حکم کے مطابق ضرورت مندوں اور محتاجوں پر خرچ کیوں نہیں کیا؟



آیت ۲۱۵ میں فرمایا: '' وہ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ مال کیسے خرچ کریں؟ تو ان کو بتا دیجیے جو مال تم خرچ کرو وہ والدین' قریبی رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے''۔ یعنی مال کے ساتھ اپنے ماں باپ کی ضروریات پوری کرو 'ان کو نفع پہنچائو۔ قریبی رشتہ داروں کا بھی خیال رکھو 'کوئی یتیم مسکین ہے تو اس کی ضروریات پوری کرو۔ مسافر اگر دورانِ سفر مالی طور پر بے بس ہو جائے تو اس کی بھی مدد کرو۔ اس آیت کے تقاضوں پر عمل کی صورت میں کسی کے والدین بے سہارا نہ رہیں گے۔ معاشرے سے گداگری ختم ہو جائے گی' کیونکہ کسی خاندان میں اگر نادار ہوں گے تو صاحب ثروت بھی ہوں گے ۔اگر اپنے خاندان اور عزیز و اقارب کے تنگ دست لوگوں کی مدد خاندان کے امیر لوگ اپنے ذمہ لے لیں تو کسی کو بھیک مانگنے کی ضرورت نہ رہے۔ اسی طرح اپنے قرب و جوار میں بسنے والے یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کی کفالت کی ذمہ داری قریبی رشتہ دار یا قریب رہنے والے گلی محلہ کے دولت مند لوگ لے لیں تو معاشرہ جنت نظیر بن سکتا ہے 'جس میں کسی مفلس کو دربدر ہاتھ پھیلانے کی حاجت نہ رہے گی۔

اسلام مال کی محبت کو پسند نہیں کرتا ‘اسی لیے دولت مندوں پر لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنی ضروریات سے زائد مال جمع نہ کریں بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کریں اور وہ خرچ کرنا ان کے لیے آنے والی حقیقی زندگی میں بہت نفع دے گا۔ آیت ۲۵۴ میں ہے: ’’اے ایمان والو جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اُس دن کے آنے سے پہلے پہلے خرچ کر لو جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی اور نہ ہی دوستی اور سفارش (کام آئے گی)‘‘۔یعنی موت کا آنا تو برحق ہے۔ ہر شخص نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ مرنے سے پہلے پہلے ہر شخص کو موقع ہے کہ وہ اپنے مال میں سے فی سبیل اللہ خرچ کرلے۔ جس دن اس کی موت واقع ہو گئی اس کا اختیار بھی ختم ہو گیا اور وہ مال وارثوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ اب ان کی مرضی ہے خرچ کریں یا نہ کریں۔ اگر وہ نیکی کے کاموں میں خرچ کریں گے تو ثواب وہ پائیں گے ‘جو مال چھوڑ کر مر گیا اس نے تو فائدہ نہ اٹھایا۔ لہٰذا موت سے پہلے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کرلو ‘ورنہ قیامت کے دن یہی مال جس کو بندہ اپنا مال کہتا اور سمجھتا ہے اس کے لیے وبالِ جان بن جائے گا۔

اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہوا مال نشوونما پاتا ہے ‘جس کی مثال آیت ۲۶۱ میں اس طرح بیان کی گئی ہے: ’’جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے مال کی مثال اس



دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک بالی میں سو سو دانے ہوں‘ اور اللہ جس کے مال کو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے ‘وہ بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے‘‘۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک روپیہ خرچ کرنے والے کو ۷۰۰ روپے خرچ کرنے کے برابر اجر و ثواب ملے گا یا اس سے بھی زیادہ ‘جیسا کہ ایک دانہ بوئیں تو سات سو یا اس سے بھی زیادہ دانے حاصل ہوتے ہیں۔مال تو ہر شخص کی چاہت ہے۔ دنیا کی زندگی میں مال ودولت کے ساتھ آسائشیں اور سہولتیں حاصل ہوتی ہیں ‘لہٰذا مال و دولت بڑی مرغوب شے ہے ‘مگر مال کی اس محبت کے باوجود اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہی اصل نیکی ہے۔ آیت ۱۷۷ میں ارشاد ہے: ’’(نیکی تو اس شخص کی ہے) جو مال باوجود عزیز رکھنے کے ‘رشتہ داروں ‘یتیموں اور محتاجوں‘ مسافروں اور مانگنے والوں کو دے‘ اور گردنیں آزاد کرنے میں خرچ کرے‘‘۔ گویا حقیقی نیکی وہ ہے جس کا کرنا نفس امارہ کو شاق گزرے۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ میں اپنا مال کیوں اپنے سے جدا کروں مگر اللہ کی خوشنودی کے لیے مال خرچ کرنا اور اپنی پیاری اور محبوب چیز کو اللہ کی راہ میں دینا ہی اصل نیکی ہے۔

مال خرچ کرنے کے دو انداز ہو سکتے ہیں ‘ایک اعلانیہ اور دوسرے خفیہ۔ حالات کے مطابق دونوں کی اجازت ہے۔ آیت ۲۷۱ میں ہے: ’’اگر تم خیرات ظاہر کر کے دو تو وہ بھی خوب ہے ‘اور اگر پوشیدہ دو اور دو بھی اہل حاجت کو تو وہ خوب تر ہے‘ اور اس طرح کا دینا تمہارے گناہوں کو دور کر دے گا ‘اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے‘‘۔ اصول یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی اعلانیہ اور نفل کام چھپا کر کرنے بہتر ہیں ۔چنانچہ زکوٰۃ

فرض ہے ‘اس کی ادائیگی اعلانیہ ہو تو کوئی حرج نہیں ۔ اس سے دوسروں کو بدظنی بھی نہیں ہوگی کہ فلاں اتنا امیر ہے مگر زکوٰۃ نہیں دیتا۔ پھر اس کو دیکھ کر دوسرے دولت مندوں کو بھی زکوٰۃ کی ادائیگی کا جذبہ ملے گا۔ ہاں زکوٰۃ کے علاوہ جو صدقات ہیں وہ خفیہ دیے جائیں تاکہ اُن میں ریاکاری کا دخل نہ ہو اور اللہ کے ہاں ان کا بھرپور بدلہ ملے‘ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ بہترین صدقہ وہ ہے جو دائیں ہاتھ سے دیا جائے تو بائیں کو خبر نہ ہو۔گویا ایسی خیرات محض اللہ کی رضا کے لیے ہوگی جو بھرپور بدلہ پائے گی۔ بعض اوقات نفل صدقات بھی اعلانیہ مفید رہتے ہیں ‘اس میں دینے والے کی نیت کو دخل ہے۔ اگر کوئی شخص مسجد میں چندہ دیتا ہے یا کسی دوسرے نیک کام میں اعلانیہ خرچ کرتا ہے اور اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اس سے دوسروں کو ترغیب ہوگی تو ایسا کرنا بھی جائز ہے۔



اور اگر ریاکاری کا خطرہ ہو تو زکوٰۃ بھی لوگوں کی نظروں سے چھپا کر دی جائے تو اچھا ہے۔

شیطان ہر نیک کام کی راہ میں آڑ بن جاتا ہے ‘یہاں بھی وہ بڑا کارگر حملہ کرتا ہے۔ آیت ۲۶۸ میں ہے :’’شیطان تمہیں تنگدستی سے خوف دلاتا ہے اور فحاشی کے کام کرنے کو کہتا ہے ‘ جبکہ اللہ تم سے بخشش اور رحمت کا وعدہ کرتا ہے‘‘۔ شیطان وسوسہ اندازی کرتا ہے اور فی سبیل اللہ خرچ سے روکتا ہے اور کہتا ہے کہ خرچ کرو گے تو تمہارے پاس رقم کم ہو جائے گی‘ یعنی تم اپنا نقصان کر لو گے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے والے کے مال میں برکت ڈالتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا انفاق اس کے گناہوں کی معافی کا سبب بن جاتا ہے۔ اگر شیطان کا یہ ہتھیار ناکام رہے اور انسان انفاق کا ارادہ کر ہی لے تو وہ اس کے لیے نمود ونمائش کا لالچ دیتا ہے ‘پھر وہ خرچ تو کرتا ہے مگر اس سے مطلوب اپنی بڑائی کا اظہار ہوتا ہے۔ اور اس طرح کا صدقہ ضائع چلا جاتا ہے جس طرح کہ وہ صدقہ ضائع ہو جاتا ہے جس کے بعد احسان جتایا جائے یا ایذا پہنچائی جائے۔ جیسا کہ آیت ۲۶۴ میں ہے :’’ اے اہل ایمان‘ اپنے صدقات (خیرات) احسان جتا کر اور ایذا دے کر باطل نہ کر لو‘‘۔ یعنی کسی نادار یا تنگدست کی صدقہ خیرات کے ساتھ مدد کرو تو اس کو احسان جتا کر شرمندہ نہ کرو اور نہ ہی اسے زیربار سمجھ کر کسی اور طریقے سے ستاؤ۔ یہ وہ نیکی ہے کہ اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے اور اگر دنیا میں کسی بھی صورت میں اس کا بدلہ لے لیا تو آخرت میں اس کا کچھ بدلہ نہیں ملے گا۔

جب انسان خرچ کرتا ہے تو بظاہر اس کی دولت کم ہوتی ہے مگر حقیقت اس کے خلاف ہے۔ ہر کسی کا مشاہدہ ہے کہ اگر خرچ کرنے سے مال کم ہوتا ہوتو دنیا میں کوئی سخی مشہور نہ ہو‘ کیونکہ سخی تو ہر وقت ضرورت مندوں کی ضرورت میں مال خرچ کرتا ہے تو ایک دن آئے کہ اس کے پاس کچھ نہ رہے‘ مگر فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے۔ اس کا تجربہ اسی کو ہوتا ہے جو یہ راستہ اختیار کرتا ہے ۔ آیت ۲۷۶ میں ہے :’’اللہ تعالیٰ سود کو نابود (بے برکت) کرتا اور خیرات کو بڑھاتا ہے‘‘۔ حالانکہ بظاہر جو سود لیتا ہے اس کی رقم میں اضافہ

ہوتا ہے اور خیرات کرنے والا اپنے مال میں سے خرچ کرتا ہے ‘مگر آپ نے کبھی کوئی سود خور ایسا نہ دیکھا ہو گا جس کو فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی عادت ہو۔ وہ ہمیشہ پیسے کی کمی کا شکار رہتا ہے اور سود پر سود لے کر اپنی دولت کو بڑھاتا رہتا ہے اور دولت کے کم ہونے کی فکر میں گھلتا رہتا



ہے۔ جبکہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے والا مطمئن اور آسودہ رہتا ہے ‘کیونکہ اس کی نظر آخرت میں اللہ کے فضل اور بخشش پر ہوتی ہے۔

صدقہ اور خیرات کے ذریعے انسان دوسروں کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے ۔وہ کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کر دیتا ہے مگر اصل میں وہ اپنا ہی فائدہ کر رہا ہوتا ہے‘ جیسا کہ آیت ۲۷۲ میں ہے :’’اور جو کچھ تم خرچ کرو گے تو اس کا فائدہ تم ہی کو ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ تو جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کرو گے اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہو گی‘‘۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو حق تلفی کا کوئی سوال ہی نہیں ‘وہ تو احکم الحاکمین ہے اور وہ اپنی شان کے مطابق اجر مرحمت فرمائے گا۔

نماز اور زکوٰۃ ارکانِ اسلام میں سے ہیں۔ قرآن مجید میں بار بار ’’اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ‘‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں بھی ان الفاظ کو دہرایا گیا ہے۔ ان الفاظ کا معنی ہے:’’ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو‘‘۔ نماز بدنی عبادت ہے جبکہ زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ جس طرح پنجگانہ نماز ہر مسلمان پر فرض ہے اسی طرح ہر صاحب نصاب پر سال کے بعد اپنے مال سے زکوٰۃ ادا کرنا لازمی ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے سے مال پاک ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ تو فرض کے درجہ میں ہے ‘اس کے علاوہ بھلائی اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا نفلی صدقات ہیں۔ جو مالدار زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ان کے لیے سخت وعید ہے کہ ان کا مال دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا ‘پھر اس سے ان کی پیشانیاں ‘پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور ان سے کہا جائے گا) یہ وہی (مال) ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا ‘سو جو تم جمع کرتے تھے اس کا مزا چکھو۔ (التوبۃ: ۳۵)

زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم نماز کے ساتھ جمع ہو کر سورۃ البقرۃ میں بھی تین جگہ آیا ہے :آیت ۴۳‘۸۳ اور ۱۱۰۔ گویا سورۃ البقرۃ میں جہاں نفلی صدقات کا حکم اور ترغیب دی گئی ہے وہاں فرض انفاق یعنی زکوٰۃ کی اہمیت کو اس طرح واضح کیا گیا ہے کہ زکوٰۃ کو نماز کے ساتھ جوڑ کر بیان کیا گیا ہے تاکہ واضح رہے کہ جتنی اہمیت نماز پنجگانہ کی ہے اتنی ہی ضروری زکوٰۃ بھی ہے۔

* * *

# اچھے اَعمال اور غرہ

لازم ہے کہ آدمی اچھے اعمال بجا لائے اور برے کاموں سے بچتا رہے ۔ پھر اپنے اچھے کاموں کی وجہ سے اس میں عجب پیدا نہ ہو اور نہ وہ بداَعمال لوگوں سے نفرت کرے۔ بداَعمال لوگوں کی برائیوں کو پسند نہ کرے مگر ان کے انجام کو یقینی طور پر برا نہ سمجھے۔ ہوسکتا ہے وہ مرنے سے پہلے اپنی اصلاح کر لیں اور نجات حاصل کر لیں۔ بندہ اپنے نیک اعمال پر مغرور نہ ہو کیونکہ اسے اپنے انجام کی خبر نہیں۔ یہی وجہ ہے متقی اور پرہیزگار لوگ اَعمالِ خیر کے باوجود اس بات کی تمنا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی موت اچھے اعمال کرتے ہوئے آئے ‘کیونکہ کسی شخص کو خبر نہیں کہ اس کا انجام کیسا ہو گا۔ جنت اس کے لیے تیار ہے یا وہ عذاب کا نشانہ بنے گا۔ یہی مطلب ہے اس حکیمانہ قول کا کہ راہ راست امید اور بیم کے درمیان ہے۔ کوئی شخص محض اپنے نیک اعمال پر جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا اور نہ کسی بداعمال کو جہنمی کہا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’قسم ہے اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں‘ تم میں کا ایک شخص جنتی لوگوں کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اُس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے ‘لیکن آخر نوشتہ تقدیر غالب آجاتا ہے اور وہ دوزخی شخص کے سے عمل کرنے لگتا ہے اور دوزخ میں داخل ہوجاتا ہے۔ اور اسی طرح تم میں ایک شخص ساری عمر دوزخی شخص کے سے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے ‘آخر نوشتہ تقدیر غالب آتا ہے اور وہ جنتی شخص کے سے عمل کرنے لگتا ہے اور جنت میں داخل ہو جاتا ہے ۔‘‘(متفق علیہ ‘عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ)

کسی شخص کو نہ اپنے مستقبل کے حالات کا علم ہے اور نہ وہ کسی دوسرے شخص کے آئندہ کے حالات کو جانتا ہے۔ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ وہ خود کس طرح کے عمل کر رہا ہے یا اسے کسی دوسرے کے اعمال کیسے نظر آرہے ہیں۔ لیکن حال کے اعمال پر نتیجے کا فیصلہ کرنا کسی کے بس میں نہیں‘ نہ اپنے بارے میں نہ کسی دوسرے کے بارے میں ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’دین کی راہ پر



سیدھے رہو اور اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو اور جان لو کہ کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپؐ بھی نہیں؟ فرمایا: ’’میں بھی نہیں‘ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو اپنی رحمت اور فضل

کے ساتھ ڈھانپ لے۔'' (صحیح مسلم عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

اس سے واضح ہوا کہ بخشش اور نجات بس اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگرچہ اس بات سے انکار نہیں کہ اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے' وہ نہ کسی پر ظلم کرتا ہے اور نہ کرے گا' نیک اعمال کرنے والے کو نجات کی امید رکھنی چاہیے' مگر اللہ تعالیٰ سے دست بدعا رہنا چاہیے کہ وہ مرتے دم تک اسے ایسے کام کرنے کی توفیق دے جو اُس کو پسند ہوں۔ جنت یا جہنم میں داخل کرنے کا اختیار تو بس اللہ ہی کو ہے۔ یہی مطلب ہے ان الفاظِ قرآنی کا: {فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ} (البقرۃ:۲۸۴) ''پس وہ بخش دے گا جس کو چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا''۔ نتیجہ وہی ہے کہ کوئی شخص اپنے نیک اعمال کی بدولت جنت کو لازم نہ سمجھے اور کسی بداعمال کے لیے دوزخ کا حکم نہ لگائے۔

اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہے۔ جس طرح ذات میں اس کا کوئی ثانی نہیں' اسی طرح اُس کی صفات بھی بے مثل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے ماننے میں راہِ راست سے بھٹکنے کا نام شرک ہے۔ پس شرک سے بچنا بخشش کے لیے اوّلین شرط ہے: {اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ} (النسائ:۴۸) ''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور وہ بخش دے گا اس کے علاوہ (دوسرے گناہ) جس کے لیے چاہے گا۔'' پس شرک کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا کہ وہ نہیں بخشے گا۔ اور اس کے علاوہ کوئی بڑے سے بڑا گناہ بھی ایسا نہیں جو نہ بخشا جا سکتا ہو۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس جبریل آئے تھے' کہتے تھے جو شخص آپؐ کی اُمت میں سے ایسی حالت میں مرے گا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو تو وہ جنت میں داخل ہو گا''۔ یہ سن کر ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا: اگرچہ وہ زنا کرے اور چوری کرے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں اگرچہ وہ زنا کرے اور چوری کرے۔'' (متفق علیہ عن ابی ذر رضی اللہ عنہ) رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے اور کچھ دیگر احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے گا بخشش کا فیصلہ کرے گا خواہ اُس کے اعمال کیسے ہی ہوں۔ {اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ} ''یقینا اللہ تعالیٰ ہر چیز



پر قدرت رکھتا ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایک بندے کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مال عطا فرمایا تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا: دنیا میں تو نے کیا عمل کیے؟ آپؐ نے فرمایا: چونکہ بندے اللہ تعالیٰ سے کوئی بات چھپا نہیں سکتے' لہٰذا اُس نے (صاف صاف) عرض کیا: اے میرے رب! تو نے اپنے پاس سے جو مال مجھے دیا تھا میں اس کا لوگوں سے لین دین کرتا تھا۔ درگزر کرنا میری عادت تھی' جو مال دار ہوتا اس سے نرمی کرتا اور جو تنگدست ہوتا' اس کو معاف بھی کر دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں ایسا کرنے کا تجھ سے زیادہ مستحق ہوں۔ (اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہا) میرے اس بندے سے درگزر کرو''۔ (صحیح مسلم' عن حذیفہ رضی اللہ عنہ)

بخشش کے بارے میں یہی اصول ہے کہ جن کو نام لے کر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یا رسول اللہ ﷺ کے ذریعے جنتی یا دوزخی فرمایا ہے بس ان کو ہی جنتی یا دوزخی کہا جا سکتا ہے' کسی اور کو نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے خائف رہنا بندے کی بخشش کا سبب بن جاتا ہے۔ صحیح راستہ بیم و رجا کے درمیان ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَسْرَفَ رَجُلٌ عَلٰی نَفْسِہٖ، فَلَمَّا حَضَرَہُ الْمَوْتُ اَوْصٰی بَنِیْہِ اِذَا مَاتَ فَحَرِّقُوْہُ ثُمَّ اذْرُوْا نِصْفَہٗ فِی الْبَرِّ وَنِصْفَہٗ فِی الْبَحْرِ، فَوَ اللّٰہِ لَئِنْ قَدَرَ اللّٰہُ عَلَیْہِ لَیُعَذِّبَنَّہٗ عَذَابًا لَا یُعَذِّبُہٗ اَحَدًا مِنَ الْعَالَمِیْنَ، فَلَمَّا مَاتَ فَعَلُوْا مَا اَمَرَھُمْ، فَاَمَرَ اللّٰہُ الْبَحْرَ فَجَمَعَ مَا فِیْہِ وَاَمَرَ الْبَرَّ فَجَمَعَ مَا فِیْہِ ثُمَّ قَالَ لَہٗ لِمَ فَعَلْتَ ھٰذَا؟ قَالَ: مِنْ خَشْیَتِکَ یَارَبِّ وَاَنْتَ اَعْلَمُ، فَغَفَرَ لَہٗ))(متفق علیہ)

''ایک شخص نے اپنے نفس پر بڑی زیادتی کی (اور بڑا ظلم کیا' یعنی غفلت سے اللہ کی نافرمانی والی زندگی گزارتا رہا) جب اُس کی موت کا وقت آیا تو (اپنی پچھلی زندگی کو یاد کر کے اس پر اللہ کے خوف کا بہت زیادہ غلبہ ہوا' اور آخرت کے برے انجام سے وہ بہت ڈرا' یہاں تک کہ) اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی' کہ جب میں مرجاؤں تو تم مجھے جلا کر راکھ کردینا' پھر تم میری اس راکھ میں سے آدھی تو کہیں خشکی میں بکھیر دینا اور آدھی کہیں دریا میں بہا دینا (تاکہ میرا کہیں نام و نشان بھی نہ رہے' اور میں جزا و سزا کے لیے دوبارہ زندہ نہ کیا جاؤں' اُس نے کہا کہ میں ایسا گنہگار ہوں کہ) اللہ کی قسم! اگر اللہ نے مجھے پکڑ لیا تو وہ مجھے ایسا سخت عذاب دے گا جو دنیا جہان میں کسی کو بھی نہ دے گا۔



اس کے بعد جب وہ مر گیا تو اس کے بیٹوں نے اس کی وصیت پر عمل کیا (جلا کر اس کی راکھ کو کچھ ہوا میں اڑادیا' اور کچھ دریا میں بہا دیا)۔ پھر اللہ کے حکم سے خشکی اور تری سے اس کے اجزاء جمع ہوئے (اور اس کو دوبارہ زندہ کیا گیا) پھر اس سے پوچھا گیا کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ اس نے عرض کیا: اے میرے مالک! تو خوب جانتا ہے کہ تیرے ڈر سے ہی میں نے ایسا کیا تھا۔ (رسول اللہ ﷺ نے یہ واقعہ بیان فرما کر ارشاد فرمایا کہ) پس اللہ تعالیٰ نے اس بندہ کی بخشش کا فیصلہ فرما دیا۔''

پہلے زمانے کا یہ شخص اللہ ربّ العزت کی شان اور اس کی صفات سے ناواقف تھا' اس کے اعمال بھی اچھے نہ تھے' لیکن وہ ڈر گیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے ہاں پیش کیا جائے گا تو مجھے سخت سزا ملے گی۔ چنانچہ اس نے اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچنے کے لیے بہتر سمجھا کہ اسے مرنے کے بعد جلا کر راکھ کر دیا جائے' چنانچہ وہ مر گیا تو اسے جلا دیا گیا۔ اگرچہ اس کا یہ عمل مشروع نہ تھا مگر خوفِ خدا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پر رحم کیا اور اس کی بخشش کر دی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

{قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ط اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ط اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿ ۵۳ ﴾}(الزمر)

''(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے: اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ بے شک اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو بخش دے گا۔ بے شک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ ''

جب بندہ اپنے گناہوں پر شرمسار ہو کر اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی اور بے بسی کے ساتھ جھک جاتا ہے اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو بندے کا یہ انداز اچھا لگتا ہے ۔ وہ اپنے فرشتوں سے کہتا ہے دیکھو یہ میرا بندہ جانتا ہے کہ میں ہی اس کے گناہوں کو بخشنے والا ہوں' پس میں نے اسے بخش دیا۔ بخشش کے بارے میں اللہ تعالیٰ مختارِ مطلق ہے مگر اس کا رجحان مغفرت کی طرف ہے ۔وہ نیکیوں کا بدلہ دینے میں وسعت سے کام لیتا ہے اور گناہوں کی گرفت میں سختی سے کام نہیں لیتا۔ وہ گناہگار کو مہلت دیتا ہے کہ پشیمان ہو اور مغفرت طلب کرے 'اگر وہ خلوص سے بخشش کا طالب ہو گا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اسے ڈھانپ لے گی۔پس کسی بدعمل کو دوزخی نہیں کہہ سکتے اور کسی تقویٰ شعار کو حتمی طور پر جنتی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ کوئی انسان کسی عابد و زاہد یا کسی بدعمل و بدکردار کے ایمان کو نہیں جانتا۔ صرف اللہ جانتا ہے کہ اس



متقی کے تقویٰ کی حقیقت کیا ہے اور یہ بدکردار تو ہے مگر اس نے اللہ کی رحمت کی امید پر موت سے پہلے معافی مانگ لی ہے۔

ایک عبادت گزار خاتون تھی' حضرت حسن بصریؒ کی عقیدت مند اور شاگردہ تھی۔ اس کا ایک بچہ ہوا تو وہ جوانی میں بیوہ ہو گئی۔ بیٹے کی خاطر اس نے دوسری شادی نہ کی۔ وہ بیٹے کا ہر طرح سے خیال رکھتی۔بیٹا بڑا ہوا تو بری صحبت میں پڑ گیا۔ اُس کی ماما سے حسن بصریؒ کے پاس لے گئی ۔ انہوں نے نصیحت کی مگر لڑکے پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اسی طرح بچے کو سمجھاتی رہی اور حسن بصریؒ کے پاس بھی لے جاتی مگر بے سود۔ جب بھی بچہ گھر آتا تو ماں اس سے پیار کرتی سمجھاتی مگر بچے کے کان پر جوں نہ رینگتی۔ اللہ کی شان کہ وہ لڑکا برے کاموں اور بری صحبت میں اس طرح پڑ گیا کہ اس کی صحت تباہ ہو گئی اور بستر پر پڑ گیا۔ وہ اتنا کمزور ہو گیا کہ اسے آخرت کا سفر سامنے نظر آنے لگا۔ ڈاکٹروں نے اس کو لاعلاج قرار دے دیا۔ ماں اس کو سمجھاتی کہ بیٹا اب بھی توبہ کر لو ! وہ کہتا امی میری ساری زندگی نافرمانیوں میں گزری' میں نے بڑے بڑے گناہ کیے' اب میں کیا توبہ کروں؟ ماں چاہتی تھی کہ بیٹے کو حسن بصریؒ کے پاس لے جائے' مگر نہ تو بیٹا چل سکتا تھا اور نہ ہی وہ اسے اٹھا سکتی تھی۔ چنانچہ وہ خود حسن بصریؒ کے پاس جانے لگی۔بیٹا زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ اُس نے ماں سے کہا امی ! اگر تمہارے واپس آنے سے پہلے مر جائوں تو حضرت کو کہنا کہ میرا جنازہ پڑھا دیں۔ ماں نے حضرت کو بتایا کہ لڑکے کا آخری وقت ہے۔وہ نہ چل کر آپ کے پاس آسکتا ہے نہ میں اسے اٹھا کر لا سکتی ہوں۔ آپ میرے گھر چلیں اور اسے توبہ کروا دیں۔ حضرت نے کہا کہ اب میں

نہیں جا سکتا' میں اسے سالوں سے سمجھا رہا ہوں لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اب تو وہ مر جائے تو میں اس کا جنازہ بھی نہیں پڑھائوں گا۔

ماں آنسو بہاتی ہوئی واپس آئی' بیٹے نے ماں کو روتے ہوئے دیکھا تو اس کا دل موم ہوگیا۔ ماں سے کہنے لگا امی ! میری سانس اُکھڑ رہی ہے 'میں چند لمحوں کا مہمان ہوں' میری ایک وصیت سن لیجیے' جب میں مر جائوں تو اپنا دوپٹہ میرے گلے میںڈالنا اور میری لاش کو مرے ہوئے کتے کی طرح گلیوں میں گھسیٹنا تاکہ دنیا والوں کو معلوم ہو جائے کہ ماں کے نافرمان کا انجام ایسا ہوتا ہے ۔اور امی ! دوسری بات یہ ہے کہ مجھے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہ کرنا

---



تاکہ میرے گناہوں کی وجہ سے قبرستان کے مردوں کو تکلیف نہ پہنچے۔ اللہ کی شان کہ نوجوان کی ٹوٹے ہوئے دل سے عاجزی کی دعا نکلی تو پروردگار کو پیاری لگی۔ لڑکا فوت ہو گیا۔ ماں اس کی آنکھیں بند کر رہی تھی کہ باہر دروازے پر دستک ہوئی ۔ ماں نے دروازہ کھولا تو دیکھا حضرت حسن بصریؒ تھے۔ عورت نے پوچھا حضرت آپ کیسے؟ لڑکا تو فوت ہو گیا۔ حضرت نے فرمایا : میں اس کا جنازہ پڑھانے آیا ہوں۔ عورت بولی آپ نے تو جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ حضرت کہنے لگے :مجھے اللہ تعالیٰ کا حکم الہام ہوا کہ تو میرا کیسا ولی ہے کہ میرے ایک ولی کا جنازہ پڑھانے سے انکار کرتا ہے ! میں سمجھ گیا کہ مرنے سے پہلے بچے کی پر خلوص توبہ رب تعالیٰ نے قبول کر لی ہے۔ چنانچہ آپؒ نے جنازے کی نماز پڑھائی اور لڑکا دفن کر دیا گیا ۔ (تلخیص بکھرے موتی 'بحوالہ دوائے دل)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کتنا مہربان ہے' وہ خوفِ خدا سے نکلے ہوئے ایک آنسو سے بھی دوزخ کی آگ بجھا دیتا ہے۔ اس واقعے سے یہ سبق ملا کہ کسی کے گناہوں کا چرچا ہرگز نہ کرنا چاہیے۔ کیا پتا جسے ہم بدکردار دیکھتے ہیں وہ مرنے سے پہلے اپنے پر خلوص آنسوئوں سے اپنے پروردگار کی رحمت اور اس کا پیار حاصل کر کے مغفرت پا چکا ہو۔ لہٰذا کسی بدکردار مسلمان کے برے کاموں سے تو نفرت بجا' مگر اُس کے انجام کے متعلق برا حکم لگانا درست نہیں۔

* * *

---



# رزقِ حلال کی اہمیت

دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے ہر شخص کو معاشی جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور اس کے لیے ہر انسان ایک پیشہ اختیار کرتا ہے۔ پیشے کے انتخاب میں سمجھ بوجھ سے کام لینا انتہائی ضروری ہے' کیونکہ اگر ایسا پیشہ اختیار کر لیا جائے جس کے ذریعے حرام یا مشکوک روزی ملتی ہو تو اس سے بڑا خسارے کا سودا اور کوئی نہیں۔ آدمی جو کماتا ہے اس سے اپنے اور اپنے خاندان کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات کی چیزیں فراہم کرتا ہے۔ جس طرح ہر چیز کی اپنی مخصوص تاثیر ہوتی ہے اسی طرح حلال روزی سے جو شخصیت نشوونما پاتی ہے 'اس کے لیے نیکی اور بھلائی کے کام کرنے آسان ہو جاتے ہیں' جبکہ حرام خور شخص کا جھکاؤ برے کاموں کی طرف رہتا ہے اور نیک کاموں کی طرف اس کا دل آمادہ نہیں ہوتا' یا نیکی کے کام اسے آسان ہونے کے باوجود مشکل نظر آتے ہیں۔ بقول غالب : ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی !

ایک صاحب متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے 'ان کی اولاد نیک 'پارسا اور خوش اطوار تھی۔ لوگ ان سے پوچھتے تھے : کیا وجہ ہے کہ آپ کے تمام بچے نماز روزے کے پابند' تعلیم میں سب سے آگے اور اخلاق و عادات میں قابل تعریف ہیں؟ ان صاحب کا جواب یہ ہوتا تھا کہ اس میں میری کوئی خاص جدوجہد نہیں 'بس اتنا ضرور ہے کہ میں رزقِ حلال پر اکتفا کرتا ہوں اور بچوں کو جائز اور حلال آمدنی سے کھلاتا پلاتا' لباس پہناتا اور دوسری ضروریات پوری کرتا ہوں۔ سچ ہے کہ جیسے پانی پیاس کو مٹاتا اور کھانا بھوک کو ختم کرتا ہے ----- پانی اور کھانے کی یہ تاثیر مسلم ہے اور ہر شخص کے تجربے اور مشاہدے میں ہے ----- اسی طرح رزقِ حلال کی تاثیر سے نیکیاں جنم لیں تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔



جو لوگ حصولِ رزق کی جدوجہد میں احتیاط سے کام نہیں لیتے انہیں انجام کار برے نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات اتنی سچی ہے کہ جتنی آگ کی تپش یا برف کی ٹھنڈک۔ آج معاشرے میں جرائم کی کثرت اور گناہ کے کاموں کی جو بہتات نظر آتی ہے اس کی ایک بڑی اور بنیادی وجہ مالی بدعنوانیاں(corruption)ہے ۔ ایسے لوگ خال خال نظر آتے ہیں جو معاشی جدوجہد میں دیانت' صداقت اور امانت کے حامل ہیں' لیکن یہ وہ لوگ ہیں جن کو اطمینانِ قلب اور ذہنی آسودگی حاصل ہے۔ ان کا ضمیر مطمئن اور باطن پاکیزہ ہے۔ وہ tension کی بیماری سے ناآشنا ہیں۔ مگر

اکثریت کا حال یہ ہے کہ انہیں بس روزی چاہیے اور فراواں چاہیے' اس سے انہیں کوئی غرض نہیں کہ وہ جائز ذریعے سے آرہی ہے یا ناجائز ذریعے سے ۔ اس زمانے کی خبر رسول اللہ ﷺ نے بایں الفاظ دی ہے:

((یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَایُبَالِی الْمَرْئُ مَا اَخَذَ مِنْہُ اَمِنَ الْحَلَالِ اَمْ مِنَ الْحَرَامِ))(۱)

'' لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی اس بات کی پروا نہیں کرے گا کہ وہ حلال طریقے سے کما رہا ہے یا حرام طریقے سے۔ ''

حرام کمائی کی نحوست اس سے زیادہ کیا ہو گی کہ حرام کمائی اگر نیکی کے کاموں میں لگائی یا اس میں سے زکوٰۃ ادا کی یا صدقہ دیا تو وہ قبول نہ ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَکْسِبُ عَبْدٌ مَالَ حَرَامٍ فَیَتَصَدَّقُ مِنْہُ فَیُقْبَلُ مِنْہُ فَیُبَارَکُ لَہٗ فِیْہِ' وَلَایَتْرُکُہٗ خَلْفَ ظَھْرِہٖ اِلَّاکَانَ زَادَہٗ اِلَی النَّارِ' اِنَّ اللّٰہَ لَایَمْحُو السَّیِّئَ بِالسَّیِّئِ وَلٰکِنْ یَمْحُو السَّیِّئَ بِالْحَسَنِ' اِنَّ الْخَبِیْثَ لَایَمْحُو الْخَبِیْثَ))(۲)

''ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی بندہ کسی ناجائز طریقے سے مال کمائے اور اس میں سے فی سبیل اللہ صدقہ کرے تو اس کا صدقہ قبول ہو' اور اس میں سے خرچ کرے تو اس میں برکت ہو۔ اور جو شخص حرام مال (مرنے کے بعد) پیچھے چھوڑ کے جائے گا تو وہ اس کے لیے جہنم کا توشہ ہی ہو گا۔ یقینا اللہ تعالیٰ بدی کو بدی سے نہیں مٹاتا بلکہ بدی کو نیکی سے مٹاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ گندگی گندگی کو نہیں دھو سکتی۔ ''

چونکہ حرام کمائی اللہ کی مقرر کردہ حدود و قیود کو توڑتے ہوئے حاصل کی جاتی ہے' لہٰذا وہ ناپاک ہوتی ہے۔ گندی چیز تو اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:



((اِنَّ اللّٰہَ طَیِّبٌ لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّبًا)) (۳)

''بے شک اللہ پاک ہے اور وہ صرف پاک چیز ہی کو قبول کرتا ہے۔ ''

حرام روزی کمانے والے کی روزی سے صدقہ دیا جائے گا تو وہ عند اللہ قبول نہ ہو گا' البتہ ناجائز کاموں میں وہ خوب خرچ ہو گا۔ ایک فارسی محاورہ ہے: ''مالِ حرام بود بجائے حرام رفت'' کہ حرام سے کمایا ہوا مال تھا حرام جگہ خرچ ہو گیا۔ آج دیکھئے شادی بیاہ کی فضول رسموں پر کس فراخدلی کے ساتھ مال خرچ کیا جاتا ہے۔ موسیقی اور گانے بجانے کی محفلیں سجتی ہیں' بدکار عورتوں پر دولت نچھاور کی جاتی ہے۔ کیا رزقِ حلال میں یہ خاصیت ہے کہ وہ ایسی جگہوں پر خرچ ہو؟ یہ سراسر حرام کمائی ہے جو جوئے اور شراب پر خرچ ہوتی ہے۔ سالِ نو عیسوی کی رات ہو یا بسنت کا تہوار' ویلنٹائنز ڈے ہو یا میراتھن دوڑ' کیا ان منحوس تقریبات کے انعقاد میں کسی متقی پرہیزگار اور حلال خور کا پیسہ خرچ ہوتا ہے؟ ہرگز نہیں ۔ ان ناجائز کاموں میں ان شتر بے مہار' آزاد منش' رشوت خور اور جرائم پیشہ لوگوں کا مال خرچ ہوتا ہے جنہوں نے حقوق العباد تلف کر کے' ڈاکے ڈال کر' لوٹ مار کر کے یا کسی دوسرے ناجائز ذریعے

سے روپیہ اکٹھا کیا ہوتا ہے اور وہ عاقبت کی فکر سے آزاد زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں ۔ایسے لوگ نسلی مسلمان ہیں اور انہیں اپنے اسلام کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے دین سے وفادار ہوں اور ان کا آخرت پر پختہ یقین ہو تو وہ ایسا کیوں کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ وَکُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ کَانَتِ النَّارُ اَوْلٰی بِہٖ))(۴)

''وہ گوشت جنت میں نہ جا سکے گا جس کی نشوونما حرام مال سے ہوئی ہو اور ہر گوشت (جسم) جو حرام مال سے پلا بڑھا ہے دوزخ اس کی زیادہ مستحق ہے ۔''

اوّل تو حرام خور کو نیکی کی توفیق نہ ہو گی اور اگر وہ کوئی نیک کام کرے گا بھی تو حرام کی نحوست سے وہ شرفِ قبولیت سے محروم رہے گا ۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

((مَنِ اشْتَرٰی ثَوْبًا بِعَشَرَۃِ دَرَاھِمَ وَفِیْہِ دِرْھَمٌ حَرَامٌ لَمْ یَقْبَلِ اللّٰہُ لَہٗ صَلٰوۃً مَا دَامَ عَلَیْہِ))(۵)

''جس شخص نے دس درہم میں کوئی کپڑا خریدا اور اس میں ایک درہم حرام کا تھا تو جب



تک وہ کپڑا اس کے جسم پر رہے گا اس کی کوئی نماز اللہ کے ہاں قبول نہ ہو گی۔''

حرام مال سے بچنا اس قدر ضروری ہے کہ جس مال میں حرمت کا شک ہے اس کو بھی چھوڑنے کی تاکید کی گئی ہے' کیونکہ اگر شک درست ہو تو حرام مال کے برے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الْحَلَالَ بَیِّنٌ ' وَاِنَّ الْحَرَامَ بَیِّنٌ ' وَبَیْنَھُمَا اُمُوْرٌ مُشْتَبِھَاتٌ لَا یَعْلَمُھُنَّ کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ' فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُھَاتِ فَقَدِ اسْتَبْرَأَ لِدِیْنِہٖ وَعِرْضِہٖ ' وَمَنْ وَقَعَ فِی الشُّبُھَاتِ وَقَعَ فِی الْحَرَامِ ' کَالرَّاعِی یَرْعٰی حَوْلَ الْحِمٰی یُوْشِکُ اَنْ یَّرْتَعَ فِیْہِ ' اَلَا وَاِنَّ لِکُلِّ مَلِکٍ حِمًی ' اَلَا وَاِنَّ حِمَی اللّٰہِ مَحَارِمُہٗ))(٦)

''یقیناً حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے' اور ان کے درمیان مشتبہ امور ہیں' جن کے بارے میں اکثر لوگ نہیں جانتے (کہ یہ حلال میں سے ہیں یا حرام میں سے؟) پس جو ان مشتبہات سے بچا رہا اس نے اپنے دین اور عزت کو بچا لیا اور محفوظ رہا۔ اور جو شخص ان مشتبہات میں پڑ گیا وہ حرام میں پڑ گیا۔ (اس کی مثال ایسے ہی ہے) جیسے ایک چرواہا (اپنے جانوروں کو کسی) چراگاہ کے قریب چراتا ہے' قریب ہے کہ وہ جانور اس میں گھس جائیں۔ سن لو! ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی چراگاہ اُس کے حرام کردہ امور ہیں۔''

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ سچے جاں نثار تھے' اس لیے وہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو دل و جان سے نہ صرف تسلیم کرتے تھے بلکہ ان پر عمل کرتے تھے۔ جب انہوں نے حرام کی مذمت رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن لی تو پھر اس کے خلاف کرنے کا تو کوئی سوال نہ

تھا۔ ہاں یہ خیال ہر وقت غالب رہتا کہ کسی بھی انداز سے کوئی ناجائز چیز ان کے پیٹ میں نہ چلی جائے۔

ہم مسلمان رسول اللہ ﷺ کے امتی اور ''مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِی'' کے ماننے والے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے جب رزق حرام کی مذمت ہم تک پہنچ گئی اور اصحاب ِرسولؐ کا طرزِ عمل بھی ہم نے جان لیا تو اب نافرمانی کی گنجائش تو ختم ہو گئی' اور صرف اپنا جائزہ لینا ہی باقی رہ گیا۔ اگر اپنے لین دین اور کاروبار میں کہیں حقوق العباد کی حق تلفی 'شعوری یا غیر شعوری طور پر ہو رہی ہو تو اس کو چھوڑنا ہو گا۔

---



اس ضمن میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنی اولاد کو کسی ایسے پیشے میں نہیں ڈالنا جہاں سے حرام رزق آتا ہو۔ مثال کے طو رپر ایک پیشہ ایسا ہے جس میں سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کیا جاتا ہے اور اس کام کا معاوضہ لیا جاتا ہے' کیا اس طرح آنے والا روپیہ حلال ہو سکتا ہے؟ اسی طرح دوسرے تمام پیشے اور ان کی کمائی ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ صاف ستھرے کام میں بھی بددیانتی کی جاسکتی ہے' لہٰذا اپنی اولاد کو روزگار پر لگنے کے بعد اس بات کی تلقین ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ حرام خوری سے دور رہا جائے' تھوڑی روزی ملتی ہو تو اس پر اکتفا کیا جائے اور بری روزی کما کر اپنی عاقبت کو خراب کرنا کسی طور پر بھی مناسب نہیں۔ اگر والدین اپنی اولاد کو جان بوجھ کر ایسا پیشہ اختیار کرواتے ہیں جس میں حرام روزی یا رشوت سے پیسہ آتا ہے تو اس سے بڑی عاقبت نااندیشی بلکہ حماقت کوئی نہیں 'کیونکہ اولاد حرام کمائے گی تو نہ صرف اولاد کی آخرت برباد ہو گی' بلکہ حرام کمانے کے کام پر لگانے کے جرم میں والدین بھی ماخوذ ہوں گے۔

## حواشی

(۱) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب من لم یبال من حیث کسب المال ۔

(۲) مسند احمد' کتاب مسند المکثرین من الصحابۃ' ح ۳۴۹۰۔ راوی : عبداللّٰہ بن جابررضی اللہ عنہ۔

(۳) صحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب قبول الصدقۃ من الکسب لاطیب وتربیتھا۔

(۴) مسند احمد' کتاب باقی مسند المکثرین ' باب مسند جابر بن عبداللّٰہ رضی اللہ عنہ۔ وسنن الدارمی' کتاب الرقاق' باب فی اکل السحت۔

(۵) رواہ احمد فی المسند' والبیھقی فی شعب الایمان۔

(۶) صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب الحلال بین والحرام بین وبینھما مشتبہات۔ وصحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب اخذ الحلال وترک الشبہات۔واللفظ لہ۔

* * *



# اِنَّ الکَذِبَ یُھلِکُ

جھوٹ ایک اخلاقی کمزوری ہی نہیں بلکہ کبیرہ گناہ ہے ،مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ جس کی سنگینی کا بالعموم احساس نہیں کیا جاتا۔ بڑے بڑے معاملات میں خلافِ حقیقت بات کو تو جھوٹ سمجھ لیا جاتا ہے ،مگر معمولی سے مفاد کی خاطر جھوٹ بولنے کو گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا ۔اگر عدالتوں کا رخ کریں تو وہاں پیشہ ور جھوٹ بولنے والے مل جائیں گے۔بیان حلفی تیار کرنا ہو تو جھوٹ پر مبنی تحریر پر تصدیقی مہر لگوانا کوئی کام ہی نہیں ۔کچھ بھی لکھ کر لے جائیں، اوتھ کمشنر فیس لے کر تصدیق کر دے گا ۔ شکایت کی جاتی ہے کہ عدالتی فیصلے اکثر وبیشتر حقائق کے خلاف ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے جج تو گواہوں کے بیانات کی روشنی میں فیصلہ دے گا ،جب گواہ جھوٹ بول رہے ہوں اور حلفیہ بیان ریکارڈ کرا رہے ہوں تو فیصلہ انصاف پر کیسے ہو گا ؟ اپنا کوئی معاملہ وکیل کے پاس لے جائیں، وکیل کو اپنی فیس سے غرض ہے۔ وہ جانتے بوجھتے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ بازاروں میں جائیں تو وہاں دکاندار جھوٹ بول کر گاہکوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے یہ چیز جتنے میں خریدی ہے اسی قیمت پر آپ کو دے رہے ہیں ،لیکن یہ سراسر جھوٹ ہوتا ہے۔ اپنی چیز کو فروخت کرنے کے لیے طرح طرح کے جھوٹ بولے جاتے ہیں۔ ناخالص چیز کو خالص کہہ کر بیچنا بھی جھوٹ ہے۔ یہ دھوکہ دہی ہے۔ دھوکہ بھی

جھوٹ کی ایک شکل ہے۔ تاجروں کے ہاں یہ چیز بھی رائج ہے کہ کسی چیز کا نرخ طے کر لیا مگر جب وہ چیز دینے کا وقت آیا تو ناقص چیز دے دی۔

چونکہ بازاروں میں لین دین ہوتا ہے' دکاندار زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لیے اکثر جھوٹ بولتے اور دھوکہ دیتے ہیں' پرانے مال کو تازہ بتا کر بیچتے ہیں' بیچتے وقت مال کا نقص چھپاتے ہیں' نقلی مال کو اصلی بتا کر گاہک کو دھوکہ دیتے ہیں' صرف منافع کمانے کے چکر میں ہوتے ہیں اور خوفِ خدا نہیں کرتے اور اس طرح اپنی روزی میں جھوٹ شامل کر کے حرام خوری کا ارتکاب کرتے ہیں' اس لیے رسول اللہ ﷺ نے بازاروں کو بدترین جگہیں اور مسجدوں



کو بہترین جگہیں فرمایا ہے۔ کیونکہ بازاروں میں جھوٹ عام ہوتا ہے اور جھوٹ گناہ کبیرہ ہے' جبکہ مسجدوں میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے اور نماز باجماعت ادا ہوتی ہے۔

بازار کے اس ناپسندیدہ ماحول میں اگر کوئی تاجر جھوٹ نہیں بولتا' دھوکہ نہیں کرتا' جھوٹی قسمیں نہیں کھاتا اور غلط بیانی نہیں کرتا 'بلکہ اپنی چیزیں فروخت کرنے میں دیانت داری سے کام لیتا ہے تو اس کے اس کردار کو بہت اچھا کہا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سچا اور امانت دار تاجر انبیائ' صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔'' (جامع ترمذی' عن ابی سعید خدریؓ) یہ اس واسطے کہ ناسازگار ماحول میں نیکی پر قائم رہنا مشکل ہے۔ چنانچہ جو اس برے ماحول میں راستی پر قائم رہے گا اس کو نیک ترین لوگوں کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔

جو لوگ بے محابا جھوٹ بولتے ہیں ان کا عمل بتاتا ہے کہ ان کا آخرت پر ایمان نہیں ہے' یا ہے تو صرف زبان کی حد تک 'نیز وہ اس بات پر بھی یقین نہیں رکھتے کہ روزی رساں اللہ ہے۔ وہ کسی کو روزی فراخ دینا چاہے تو کوئی اسے روک نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ رازق ہے۔ ہر ایک کی روزی کی مقدار معین ہے۔ ہر شخص امتحان میں ہے کہ وہ اپنی مقدر روزی حرام سے کماتا ہے یا حلال سے۔ وہ شخص عقل مند نہیں ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ میں جھوٹ اور بددیانتی سے اپنی روزی میں اضافہ کر لوں گا۔ اضافہ تو نہیں کر سکے گا 'البتہ گناہ ضرور کما لے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تاجر لوگ قیامت کے دن بدکار اٹھائے جائیں گے 'سوائے ان تاجروں کے جنہوں نے اپنی تجارت میں تقویٰ' نیکی' حسن سلوک اور سچائی کو اختیار کیا ہوگا۔'' (جامع ترمذی' عن عبید بن رفاعہ عن والدہ)

آخرت کے اعتبار سے جھوٹ بول کر روزی کمانا بدترین سزا کو دعوت دینا ہے۔ اسلامی اخلاق میں جھوٹ بولنا کسی طرح بھی درست نہیں ۔ہاں اگر وقت کی نزاکت کے پیش نظر ذو معنی بات کر کے جھوٹ سے بچا جا سکے تو بھی جھوٹ نہ بولا جائے۔ سفر ہجرت میں رسول اللہ ﷺ اپنے ہم سفر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ جا رہے تھے۔ کسی نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا یہ کون ہیں؟ جواب میں صاف الفاظ میں ''محمد رسول اللہ'' کہنا

مصلحت کے خلاف تھا۔ چنانچہ آپ نے کہا: ''یہ میرے راہنما ہیں''۔ پوچھنے والا سمجھا کہ یہ راستہ بتانے والے ہیں ‘جبکہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپؐ کو ہدایت کا راستہ بتانے والے کہہ رہے تھے۔

ہندوستان میں انگریز کی حکومت تھی۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ حکومت کے زیر عتاب



تھے۔ پولیس ان کو گرفتار کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ ایک سپاہی پوچھتے پوچھتے آپ ہی کے پاس پہنچ گیا اور آپ سے پوچھنے لگا: محمود حسن کہاں ملیں گے؟ آپ چند قدم پیچھے ہٹ گئے اور کہنے لگے :ابھی تو یہیں تھا۔ وہ ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ اتنی دیر میں آپ روپوش ہو گئے۔ گویا انہوں نے ایسے الفاظ استعمال کیے ‘جن میں ذرہ برابر جھوٹ نہ تھا۔ آپ نے ایسے نازک موقع پر بھی جھوٹ بولنا گوارا نہ کیا۔جھوٹ اور خیانت ایمان کے منافی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مؤمن کی طبیعت اور فطرت میں ہر خصلت کی گنجائش ہے‘ سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔'' (مسند احمد عن ابی امامہ باہلیؓ)اس کا یہ مطلب نہیں کہ مؤمن کے لیے خیانت اور جھوٹ کے علاوہ دوسری برائیوں اور کمزوریوں کی گنجائش ہے ‘بلکہ یہ بات خیانت اور جھوٹ کی شدید مذمت کے طور پر کہی گئی ہے۔ جھوٹ اور خیانت تو منافقانہ عادتیں ہیں جو ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''چار چیزیں ایسی ہیں کہ جس کسی میں وہ چاروں جمع ہو جائیں تو وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان چاروں میں سے کوئی ایک خصلت ہو تو گویا اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے‘ جب تک کہ وہ اس عادت کو چھوڑ نہ دے ۔(وہ چاروں عادتیں یہ ہیں) جب اس کو کسی امانت کا امین بنایا جائے تو اس میں خیانت کرے اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے اور جب معاہدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب کسی سے جھگڑا اور اختلاف کرے تو بدزبانی کرے''۔ (متفق علیہ ‘عن عبداللہ بن عمروؓ)

والدین اپنی اولاد کی تربیت کے ذمہ دار ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو اچھے اخلاق کی تربیت دیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کی اولاد ان کے لیے صدقہ جاریہ بن جائے گی۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا بلکہ اپنے بچوں کو برائیوں سے نہ روکا تو بچے برائیاں کرتے رہیں گے‘ خود گناہگار ہوں گے اور ماں باپ کو بھی گناہ پہنچے گا۔ بچے ماں باپ سے اچھا برا سبق لیتے ہیں۔ ایک شخص گھر میں موجود ہے۔ اس کا ملاقاتی آتا ہے جس کو وہ ملنا نہیں چاہتا تو وہ اپنے بچے کو کہتا ہے کہ اسے کہہ دو ابا گھر نہیں ہیں۔ وہ جا کر یہی بات کہہ دیتا ہے اور ملاقاتی چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے باپ نے جھوٹ بولا اور گناہ کمایا ۔دوسرا بڑا گناہ یہ کمایا کہ بیٹے کو جھوٹ بولنے کا سبق سکھایا۔ اس معاملے میں والدین پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ اولاد کے سامنے کوئی ایسا کام نہ کریں جو ناجائز ہو۔

حضرت عبد اللہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن ہمارے گھر بیٹھے ہوئے تھے (میں کم سن تھا) میری ماں نے مجھے بلایا اور کہا کہ ادھر آئو میں تمہیں کچھ دوں گی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے میری ماں سے پوچھا کہ تم نے اسے کیا دینے کا ارادہ کیا ہے؟ میری ماں نے عرض کیا کہ میں اسے ایک کھجور دوں گی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تو (اسے کچھ دینے کا وعدہ کر کے پھر) اسے کچھ نہ دیتی تو تیرے خلاف ایک جھوٹ لکھ لیا جاتا ۔ (ابوداؤد) مائیں بچوں کو بہلانے کی خاطر یا انہیں کوئی بات ماننے پر مائل کرنے کے لیے ایسی باتیں کہہ جاتی ہیں جو درست نہیں ہوتیں اور ایسے وعدے کر لیتی ہیں جنہیں پورا نہیں کرنا ہوتا اور پھر ایسے افعال کو جھوٹ بھی نہیں سمجھا جاتا۔ اس حدیث سے بات واضح ہو گئی کہ معمولی سے معمولی بات جو سچی نہ ہو وہ یقینا جھوٹ ہی ہے۔ مائوں کو اس بات سے بچنا چاہیے۔ اسی طرح ہنسی مذاق میں بھی یا دوسروں کو ہنسانے کے لیے خلاف ِواقعہ یا جھوٹی بات کہہ دینے کی بھی اجازت نہیں۔ جھوٹ تو بہرحال جھوٹ ہی ہے اور جھوٹ کبیرہ گناہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص لوگوں کو ہنسانے کے لیے اپنے بیان میں جھوٹ بولے اس پر افسوس' اس پر افسوس''۔ (ترمذی 'عن بہز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ)

جھوٹ کی شناعت بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کی بدبو کے باعث اس شخص سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔'' (ترمذی 'عن ابن عمرؓ) جھوٹ کی بدانجامی سے آگاہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا: ''بندہ جب جھوٹ بولتا رہتا ہے تو اس کے دل پر ایک کالا نقطہ بن جاتا ہے (اور وہ پھیلتا رہتا ہے) یہاں تک کہ سارا دل کالا ہوجاتا ہے اور وہ شخص اللہ کے ہاں جھوٹوں میں لکھ لیا جاتا ہے''۔ (مؤطا 'عن عبداللہؓ بن مسعود) دل جسم کا اہم ترین حصہ ہے 'اگر یہ خراب ہو گیا تو اس میں اچھی بات قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رہے گی اور برائیاں کرنے میں اسے کوئی خوف نہ ہوگا۔ اکثر ملازم لوگ عام جھوٹ بولتے ہیں 'انہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا (الا ماشاء اللہ)۔ کسی ملازم نے چھٹی لینی ہو لیکن چھٹی مشکل سے ملتی ہو تو طرح طرح کے بہانے بناتے ہیں اور جھوٹ بولتے ہیں۔ ایک ملازم نے چھٹی مانگی اور درخواست میں لکھا کہ اس کی والدہ فوت ہو گئی ہے۔ چونکہ وہ پہلے بھی والدہ کی وفات کے عذر پر چھٹی لے چکا تھا 'اس لیے افسر نے درخواست پڑھی تو کہا کیا یہ



تمہاری دوسری والدہ فوت ہوئی ہے؟ چھٹی مانگنے والا نادم ہوا۔ یہ تو ایک مثال ہے۔ دفاتر میں سارا دن جھوٹ ہی چلتا ہے۔

انکم ٹیکس بچانے کے لیے اصل آمدن ظاہر نہیں کی جاتی بلکہ خود ساختہ جھوٹ پر مبنی دستاویز تیار کی جاتی ہے۔ چونکہ اس طرح کرنا عام ہے اس لیے محکمہ انکم ٹیکس کے افسران ہر گوشوارے کو جھوٹا سمجھتے ہیں' خواہ کچھ

لوگ اپنے گوشوارے میں صحیح آمدن ظاہر کریں۔ چھوٹے چھوٹے مفادات کی خاطر جھوٹ بولنا عام ہے۔ لوگ نہیں جانتے کہ خلافِ واقعہ کوئی چیز بیان کرنا جھوٹ ہی ہے خواہ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو' اس میں نقصان ہو رہا ہو یا فائدہ۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے : {وَ تَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّ هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ﴿۱۵﴾} (النور) ''تم اس کو معمولی یا ہلکی بات سمجھتے ہو حالانکہ اللہ کے نزدیک وہ بہت سنگین اور بہت بڑی بات ہے۔''

جھوٹ بولنے کی عادت کو ترک کرنے کے لیے آخرت کی جواب دہی کا شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ تو بے دینوں کا خیال ہے کہ مر کے مٹی ہو جانا ہے اور دوبارہ نہیں اٹھنا۔ مگر مسلمان کا تو آخرت پر ایمان ہے۔ اسے یقین ہے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہے جس میں اس دنیا میں کیے گئے اعمال کا حساب دینا ہے۔ وہ یوم التغابن ہے۔ اس دن کی ناکامی اصل خسارہ ہے۔ اُس وقت آدمی اپنے گناہوں کا اعتراف کرے یا معافی چاہے تو بے سود ہو گا' کیونکہ عمل کرنے کا وقت گزر چکا ہو گا اور اب تو محاسبے کا وقت ہو گا۔

جھوٹ بولنا ایمان بالآخرۃ کی کمزوری کی نشانی ہے۔ ہر شخص کو ہر روز اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے کہ اس نے کہیں جھوٹ تو نہیں بولا۔ اس کو آخرت کی جواب دہی کا ہر دم احساس ہو اور اس بات سے آگاہ ہو کہ اس دنیا کی زندگی میں جھوٹ بول کر کوئی فائدہ حاصل کر لیا تو یہ جھوٹ بولنا حقیقی اور دائمی زندگی میں نقصان اور خسارے کا باعث ہو گا۔ انسان کے چھوٹے بڑے اعمال کا ریکارڈ تیار کیا جا رہا ہے۔ یہی اس کا نامۂ اعمال ہو گا اور اسی کی بنا پر وہ انعام کا حق دار ہوگا یا سزا پائے گا۔ ایمان بالآخرۃ مضبوط ہو گا تو سچ کو اپنانا اور جھوٹ کو ہر قیمت پر چھوڑنا آسان ہو جائے گا۔

* * *



# حسد ۔ ایک اخلاقی برائی

دنیا میں انسان گوناگوں صلاحیتیں لے کر پیدا ہوا ہے۔ کسی کے پاس مال و دولت ہے تو کسی کے پاس حسن و جمال' کسی کو عزت کا مقام و مرتبہ ملا ہے تو کسی کے پاس عیش و آرام کی سہولت ہے' کوئی صحت مند

ہے تو دوسرے نے سخاوت میں شہرت پائی ہے۔ اسی طرح دنیا میں کمتر حیثیت کے لوگ بھی ہیں اور مال و دولت اور عیش و عشرت سے محروم بھی ۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ بڑی حیثیت کے لوگ اپنے سے کم حیثیت کے لوگوں کے ساتھ ہمدردی رکھیں' ان کی مالی اور اخلاقی مدد کریں' اور کم حیثیت کے افراد اچھی حیثیت کے لوگوں کی خوشحالی دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے بھی ان جیسی بہتری و خوشحالی کے لیے دعا گو ہوں۔ یوں تمام لوگ بھائی بھائی بن کر رہیں اور اس طرح ایک پُرسکون معاشرہ تشکیل پائے ۔ مگر کیا کیا جائے کہ نفس ِامارہ انسان کو اچھائیوں سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کم حیثیت کے لوگ صبر و شکر کا رویہ اختیار کرنے کی بجائے دوسروں کی خوشحالی دیکھ کر اندر ہی اندر جلنے لگتے ہیں اور ان کے زوالِ نعمت کی خواہش کرتے ہیں۔ اس رویے ّسے بغض اور کینہ جنم لیتا ہے ،جس کے نتیجہ میں انسان دوسروں کا دشمن بن جاتا ہے۔ اسی کانام حسد ہے۔ّ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے فرمایا:

((اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔ اَوْ قَالَ الْعُشْبَ)) (۱)

''تم حسد کے مرض سے بہت بچو۔ حسد (آدمی کی) نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ ایندھن کو کھا جاتی ہے ۔'' یا فرمایا: ''خشک گھاس کو۔''

حسد کرنے والا جس کی بدخواہی کرتا ہے اُس کی طرف سے اپنے دل میں بغض و عناد پالتا ہے' اور اُس کی غیبت کرتا ہے تو گویا اپنی نیکیاں ضائع کرتا ہے۔ یوں حسد کے روگ میں بتلا شخص نیکیوں سے محروم ہو کر خسارہ اٹھانے والوں میں شامل ہو جاتا ہے۔



حسد کی برائی اس وجہ سے ہے کہ حاسد اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو پسند نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے کمزور رکھتا ہے۔ وہی روزی میں وسعت دیتا ہے اور وہی روزی ماپ تول کر دیتا ہے۔ وہی صحت دیتا ہے اور اسی کی طرف سے بیماری ہے۔ تو جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے وافر نعمتوں سے نوازا ہے اُس کے لیے زوالِ نعمت کی خواہش کرنے والا حقیقت میں خدائی فیصلے پر معترض ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی کام پر اعتراض کی گنجائش نہیں ،کیونکہ وہ سب سے بڑا حکیم ہے اور اس کا ہر فیصلہ صحیح اور درست ہے۔ اس کی حکمت ہر جگہ کارفرما ہے۔چونکہ حاسد جہاں دوسروں کے زوالِ نعمت کی تمنا رکھتا ہے وہاں وہ

حتی المقدور محسود کو نقصان پہنچانے کی کوشش بھی کرتا ہے اور اس کی یہ حرکت نتیجہ خیز بھی ہو سکتی ہے' چنانچہ اس کا علاج یہ بتایا گیا کہ انسان اللہ تعالیٰ سے دعا گو رہے کہ وہ اسے حاسد کے شر سے محفوظ رکھے۔ اس ضمن میں قرآن مجید کی آخری دو سورتیں ''معوذتین'' بہت اہم ہیں ،جن میں حاسد کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنے کی

استدعا ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ کو کسی شخص کے حق میں زوالِ نعمت منظور نہ ہو تو حاسد اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے گا بلکہ کینہ اور بغض دل میں رکھ کر خود اندر ہی اندر جلتا بھنتا رہے گا ؎

حاسد حسد کی آگ میں خود ہی جلا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے !

رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو قرآن مجید میں رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ کہا گیا ہے ‘یعنی وہ آپس میں ایک دوسرے کے حق میں شفیق اور مہربان تھے ۔ اللہ تعالیٰ کے خاص لطف و کرم نے ان کے دل ملا دیے تھے اور وہ پرانے جھگڑوں کو بھول کر آپس میں بھائی بھائی ہو گئے تھے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((دَبَّ اِلَیْکُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَکُمْ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ ھِیَ الْحَالِقَۃُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعَرَ وَلٰکِنْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ)) (۲)

’’ اگلی اُمتوں کی مہلک بیماری یعنی حسد و بغض تمہاری طرف چلی آ رہی ہے۔ یہ بالکل صفایا کر دینے والی ہے۔ میرے اس کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ بالوں کو مونڈنے والی ہے بلکہ یہ مونڈتی ہے اور بالکل صفایا کر دیتی ہے دین کا۔‘‘



گویا حسد و بغض انسان کی نیکیوں کا صفایا کر دیتا ہے۔ یہی مطلب ہے متذکرہ بالا حدیث کا جس میں فرمایا گیا : ’’تم حسد سے بچو‘ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ ایندھن کو کھا جاتی ہے ‘‘یا فرمایا ’’خشک گھاس کو ۔ ‘‘

اسلام ہماری قدم قدم پر راہنمائی کرتا ہے اور بہترین اخلاقی تعلیم دیتا ہے۔ حضرت واثلہ بن الاسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((لَا تُظْھِرُ الشَّمَاتَۃَ لِاَخِیْکَ فَیَرْحَمَہُ اللّٰہُ وَیَبْتَلِیْکَ)) (۳)

’’تم اپنے کسی بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار مت کرو‘ ہو سکتا ہے اللہ اس پر رحم فرمائے (یعنی اُسے تو اس مصیبت سے نجات دے دے )اور تم کو اس میں مبتلا کر دے ۔ ‘‘

جب دو آدمیوں میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے تو وہ بڑھتے بڑھتے دشمنی اور عداوت تک پہنچ جاتا ہے۔ اس طرح ایک شخص دوسرے کا بدخواہ اور دشمن ہو جاتا ہے اور اسے مصیبت میں دیکھنے کی تمنا کرنے لگتا ہے ‘اور اگر وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو اسے خوشی ہوتی ہے۔ اسے شماتت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بسا اوقات دنیا میں اس کی سزا اس طرح دیتے ہیں کہ مصیبت زدہ کو مصیبت سے نجات دے دیتے ہیں اور اس پر خوش ہونے والے کو

بتلائے مصیبت کر دیتے ہیں ۔ فارسی ضرب المثل ہے ''چاہ کن را چاہ درپیش''۔ یعنی جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود اُس میں گرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے جب پوچھا گیا کہ لوگوں میں سب سے افضل کون ہے؟ تو اس کے جواب میں آپؐ نے ایسے شخص کا ذکر فرمایا جس کا دل صاف ہو یعنی نہ اس میں کینہ ہو نہ حسد۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: لوگوں میں سب سے افضل کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہر صاف دل اور سچی زبان والا''۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ سچی زبان والے کو تو ہم پہچانتے ہیں مگر صاف دل کون ہوتا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ((هُوَ التَّقِيُّ النَّقِيُّ لَا اِثْمَ فِيهِ وَلَا بَغْيَ وَلَا غِلَّ وَلَا حَسَدَ)) (۴) ''وہ پرہیز گار اور پاک دل شخص جس (کے دل) میں نہ گناہ ہے نہ بغاوت ‘نہ کینہ ہے اور نہ حسد''۔

آج ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے جرائم کے اسباب میں سب سے بڑا سبب یہی حسد ہے ‘اس کی وجہ سے دوستوں اور رشتہ داروں حتیٰ کہ حقیقی بھائیوں کے مابین بھی دُوری پیدا



ہو چکی ہے‘محبت اور مودّت کی فضا رخصت ہو چکی ہے۔ یہ روحانی مرض اخلاق کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے اور معاشرے میں عداوتیں اور دشمنیاں جنم لے رہی ہیں۔

حسد سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ راضی برضائے رب رہنے کا انداز اختیار کیا جائے‘ صبر و شکر کا طریقہ اپنایا جائے۔ جن کو اللہ تعالیٰ نے زیادہ دیا ہے ان کی بدخواہی نہ کرنی چاہیے ‘بلکہ اسے اللہ کا فیصلہ سمجھ کر برداشت کرنا چاہیے اور اپنے لیے اللہ تعالیٰ سے فضل مانگتے رہنا چاہیے ۔جس کو کسی سے حسد کا خطرہ ہو اسے چاہیے کہ معوذتین کا ورد کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ سے حاسد کے شر سے پناہ مانگتا رہے۔ بڑی حیثیت کے لوگوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے کمزور عزیز و اقارب کو بڑے بن کر نہ دکھائیں بلکہ ان کے ساتھ مل جل کر رہیں اور اُن کے سامنے اپنی برتری جتا کر ان کی انا کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔ ان کے سامنے نرم خوئی کا اظہار کریں اور ہمدردی کا رویہ اختیار کریں۔ مشکل اور مصیبت میں دیکھیں تو ان کی امداد کریں۔

حواشی

(۱) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الادب‘ باب فی الحسد۔

(۲) سنن الترمذی‘ کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع عن رسول اللہ ﷺ۔ ومسند احمد‘ کتاب مسند العشرۃ المبشرین بالجنۃ‘ باب مسند الزبیر بن العوام۔

(۳) سنن الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع عن رسول اللہﷺ۔

(۴) سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد، باب الورع والتقویٰ۔



# بخل اور اس کا انجام

رازق تو بس اللہ عزوجل ہے ۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :{اَللّٰہُ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖ وَ یَقۡدِرُ لَہٗ ؕ}(العنکبوت:٦٢)''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تھوڑی مقدار میں دیتا ہے''۔یوں دولت مند بھی آزمائش میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق خرچ کرتا ہے یا اسے مادی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ عیش و عشرت میں پڑ کر فضول خرچ کرتا ہے اور ضرورت مند اور سوالیوں کی مدد کرنے کی بجائے اپنے مال کو سینت سینت کر رکھتا ہے۔ اسی طرح مفلس بھی آزمائش میں ہے کہ اپنی تنگدستی میں صبر کرتا ہے یا دوسروں کی خوشحالی دیکھ کر حسد میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اپنی کم آمدنی پر کڑھتا رہتا ہے۔ اگر دولت مند اپنی دولت کا استعمال اللہ کی رضا کے مطابق کرتا ہے تو کامیاب ہے اور مفلس اپنی مفلسی صبر اور سیر چشمی میں گزارتا ہے تو کامیاب ہے۔

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت کو سنبھال سنبھال کر رکھنا ' اسے گنتے رہنا اور اسے زیادہ کرنے کی فکر میں لگے رہنا اللہ کو پسند نہیں۔ ایسے لوگوں کی قرآن مجید میں مذمت کی گئی ہے:

{وَیۡلٌ لِّکُلِّ ہُمَزَۃٍ لُّمَزَۃِۣ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡ جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ ۙ﴿۲﴾ یَحۡسَبُ اَنَّ مَالَہٗۤ اَخۡلَدَہٗ ۚ﴿۳﴾ کَلَّا لَیُنۡۢبَذَنَّ فِی الۡحُطَمَۃِ ۖ﴿۴﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡحُطَمَۃُ ؕ﴿۵﴾ نَارُ اللّٰہِ الۡمُوۡقَدَۃُ ۙ﴿۶﴾ }(الہمزۃ)

''خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے عیب چننے والے کی 'جس نے مال سمیٹا اور گن گن کر رکھا۔ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال سدا اُس کے ساتھ رہے گا ۔ہرگز نہیں 'وہ پھینکا جائے گا حُطَمَہ میں۔ اور تمہیں کیا معلوم کہ حُطَمَہ کیا ہے؟ وہ ایک آگ ہے اللہ کی سلگائی ہوئی۔''

گویا مال کے ساتھ از حد محبت کرنے والے کو عذاب کی وعید ہے۔زائد از ضرورت مال کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنا ضروری ہے 'جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: {وَیَسۡـَٔلُوۡنَکَ مَاذَا

يُنْفِقُوْنَط قُلِ الْعَفْوَط}(البقرۃ:۲۱۹)''اور(اے نبی ﷺ !) وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ تو ان کو بتا دیجیے کہ جو تمہاری ضروریات سے زائد ہے''۔دولت مند کے پاس جو مال ہے وہ اللہ کا دیا ہوا ہے اور وہ آزاد نہیں ہے کہ جس طرح مرضی خرچ کرے ‘بلکہ اگر فضول کاموں‘ رسموں اور رواجوں میں خرچ کرے گا تو فضول خرچ کہلوائے گا اور فضول خرچوں کو اللہ تعالیٰ شیطانوں کا بھائی قرار دیتا ہے:{اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ط} (بنی اسرائیل:۲۷)''یقینا فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں'' ---- شیطان تو مردود اور لعین ہے ‘اس کا بھائی بند قرار دیا جانا تو بدترین ناکامی ہے۔

دولت کو بے جا اڑانا اور حاجت مندوں اور سوالیوں سے بچا بچا کر رکھنا اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ مالدار جس مال کو اپنا مال سمجھتا ہے وہ حقیقت میں اُس کا نہیں ‘بلکہ وہ مال تو اللہ کا ہے اور اس مالدار کے پاس اللہ کی امانت ہے ۔ کسی نے سچ کہا ہے ؎

ایں امانت چند روزہ نزد ماست  در حقیقت مالک ہر شے خدا است

اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اپنے دیے ہوئے مال میں سے فی سبیل اللہ خرچ کرنے کو کہتا ہے اور اسے اپنے ذمہ قرض گردانتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ وہ اس مال کو بے انتہا اضافے کے ساتھ واپس کرے گا۔ جیساکہ سورۃ التغابن میں فرمایا:{اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ط وَ اللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ ﴿۱۷﴾ }''اگر قرض دو اللہ کو اچھی طرح قرض دیناتو وہ دوگنا کر دے گا اس کو تمہارے لیے اور تمہیں بخش دے گا ۔اور اللہ بہت قدر دان ہے‘ تحمل والا''۔ پس اللہ کادیا ہوا وافر مال اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہی عقل مندی اور دانائی ہے‘ کیونکہ جو مال انسان نے دنیا میں اپنی ضروریات میں خرچ کیا وہ تو اجر کے بغیر رہااور جو فضول اور ناجائز کاموں میں لوٹایا وہ وبالِ جان بنے گا۔ اسی لیے سورۃ الحشرمیں فرمایا : {یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ لْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ } ''اے ایمان والو ! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ہر شخص دیکھے کہ اُس نے کل (قیامت) کے لیے کیا آگے بھیجا ہے۔ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو‘ بے شک اللہ خبردار ہے اُس سے جو کام تم کرتے ہو''۔ معلوم ہوا کہ ہر وقت یہ خیال رہنا چاہیے کہ میں نے اپنی کمائی میں سے کتنا مال اپنی ضروریات میں خرچ کر لیا ‘ کتنا فضول کاموں میں گنوایا اور کتنا آگے بھیجا ہے ‘یعنی آخرت کے خزانہ میں جمع

کرایا جس کا وافر اجر اُس وقت ملے گا جب اجر کی انتہائی ضرورت ہو گی۔

رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل ہمیں بتاتا ہے کہ آپ دُنیوی زندگی کے عیش و آرام اور دولت مندی کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ آپ انفاق فی سبیل اللہ کو اولیت دیتے تھے۔ آپؐ نے اپنے خاندان سمیت کئی کئی دن فاقے میں گزارے ،مگر جب بھی آپ ؐ کے پاس درہم و دینار آئے تو آپؐ نے فوراً اللہ کی راہ میں خرچ کیے۔ اس لیے کہ آپؐ جانتے تھے کہ وہی چیز کام آئے گی جو آدمی فی سبیل اللہ خرچ کر کے اپنی حقیقی زندگی کے لیے جمع کر لے گا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک بکری ذبح کی گئی اور اس کا گوشت تقسیم کر دیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور آپؐ نے دریافت فرمایا کہ بکری میں سے کیا باقی بچا؟ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کہ بس اس کی ایک کتف (دستی) باقی رہ گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اس دستی کے علاوہ جو اللہ کے لیے تقسیم کر دیا گیادراصل وہی باقی ہے اور کام آنے والا ہے(یعنی آخرت میں ان شاء اللہ اس کا اجر ملے گا) ۔''(جامع ترمذی)

دولت مندی اور سرمایہ داری بظاہر بڑی نعمت ہے مگر یہ کڑی آزمائش ہے ،کیونکہ دولت کو فی سبیل اللہ خرچ کرنا نفس پر شاق گزرتا ہے ۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ آدمی مال و دولت اپنے عیش و عشرت پر خرچ کرے اور اپنے مال سے دُنیوی فوائد حاصل کرے۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو آپؐ نے دیکھا تو فرمایا: ''ربِّ کعبہ کی قسم ! وہ لوگ بڑے خسارے میں ہیں''۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے عرض کیا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ! کون لوگ ہیں جو بڑے خسارے میں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ لوگ جوبڑے دولت مند اور سرمایہ دار ہیں۔ان میں سے وہی لوگ خسارے سے محفوظ ہیں جو اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں اپنی دولت کشادہ دستی کے ساتھ (خیر کے کاموں میں) خرچ کرتے ہیں ،مگر دولت مندوں اور سرمایہ داروں میں ایسے بندے بہت کم ہیں۔'' (صحیح بخاری و صحیح مسلم) پس دولت جیسی آزمائش میں وہی شخص کامیاب ہو گا جو دُنیا سے دل نہ لگائے بلکہ اس کے نزدیک دولت کو فی سبیل اللہ خرچ کرنا اوّلین ترجیح ہو۔مال جمع کرنا اور گن گن کر رکھنا اور اس سے صدقہ و خیرات نہ کرنا حقیقت میں نقصان ہی نقصان ہے۔ جو مال دار شخص اس معاملے میں شیطان کے ہتھے چڑھ گیا وہ برباد ہو گیا۔ سورۃ القلم میں باغ والوں



کا قصہ مذکور ہے ۔باغ کا مالک اپنے باغ کی پیداوار سمیٹتا تو وہاں غریب اور مسکین لوگ بھی اکٹھے ہو جاتے ۔ وہ باغ کی پیداوار میں سے ان کو بھی دیتا۔ ایک وقت آیا کہ وہ شخص فوت ہوگیا۔ اس کے بیٹے باغ کے مالک بنے۔ بیٹوں نے سوچا کہ ہمارا باپ خواہ مخواہ باغ کی پیداوار کا ایک حصہ غریبوں' مسکینوں میں بانٹ دیا کرتا تھا۔ ہم ایسا نہیں کریں گے اور باغ کی ساری پیداوار خود ہی حاصل کریں گے۔ چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ باغ کا پھل اتارنے کے

لیے منہ اندھیرے باغ میں جائیں گے تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی اور ہم باغ کی ساری پیداوار خود ہی سمیٹ لیں گے۔ اگلے دن وہ صبح سویرے باغ کی طرف چل دیے مگر باغ تو اللہ کے عذاب کا شکار ہو چکا تھا۔ اوّل وہ سمجھے کہ رات کے اندھیرے میں وہ راستہ بھول گئے ہیں' مگر جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ باغ آفت کا شکار ہو گیا ہے۔ اب لگے پچھتانے' مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ انہوں نے باغ کی پیداوار کا ایک حصہ غریبوں' مسکینوں سے روکا تو اس بخل کی پاداش میں ان کا پورا باغ ہی تباہ ہو گیا۔ ایسا ہی ایک قصہ سورۃ الکہف میں ہے۔ اگرچہ یہ دنیا دارالعمل ہے 'یہاں نہ نیکیوں پر صلہ ملتا ہے نہ برائیوں کی سزا' مگر کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اس کے خلاف بھی کر دیتا ہے تاکہ لوگوں کے لیے عبرت کا باعث ہو'اگرچہ اصل صلہ تو دارالجزا میں ہی ملے گا۔

شیطان کو قرآن مجید میں بڑا دھوکے باز کہا گیا ہے 'اس لیے کہ وہ برائیوں کو مزین کر کے دکھاتا ہے اور انسان اس کے پھندے میں آکر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والے کام کر گزرتا ہے۔ شیطان انسان کو ڈراتا ہے کہ فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے مال کم ہو جاتا ہے:{اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ وَ یَاۡمُرُکُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ ۚ وَ اللّٰہُ یَعِدُکُمۡ مَّغۡفِرَۃً مِّنۡہُ وَ فَضۡلًا ؕ} (البقرۃ:۲۶۸) ''بے شک شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ اور اللہ (فی سبیل اللہ خرچ کرنے پر) تم سے بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے''۔مگر شیطان کے دھوکے سے بچنا بس خوفِ خدا رکھنے والوں ہی کا کام ہے 'کیونکہ شیطان تو برائی کو خوبصورتی کے ساتھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ انسان بخل کو تو مفید سمجھنے لگتا ہے اور فی سبیل اللہ خرچ کو تاوان سمجھ لیتا ہے۔

سورۃ التوبہ (آیات ۷۵ تا ۷۷) میں ان لوگوں کا ذکر ہے جنہوں نے اللہ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ہمیں اپنے فضل سے نواز دے گا تو ہم خوب صدقہ و خیرات کریں گے اور نیک بن



جائیں گے۔ پھر جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز کر غنی کر دیا تو انہوں نے اس مال و دولت کے ساتھ بخل کیا اور اعراض کرتے ہوئے پیٹھ موڑ لی۔ چنانچہ اللہ نے سزا کے طور پر ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا اُس دن تک جس دن یہ لوگ اللہ سے ملاقات کریں گے ... روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ میرے حق میں دولت مند ہوجانے کی دعا فرما دیجیے۔ آپؐ نے اسے نصیحت کی کہ وہ تھوڑی چیز اچھی ہے جس پر تو اللہ کا شکر ادا کرے اس زیادہ چیز سے جس کے تو حقوق ادا نہ کر سکے۔ اُس شخص نے اپنی بات پر اصرار کیا اور وعدہ کیا کہ اگر اللہ مجھ کو مال دے گا تو میں پوری طرح اس کے حقوق ادا کروں گا۔ آخر رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی۔ چنانچہ اس کی بکریوں میں اس قدر برکت ہوئی کہ مدینہ کے باہر ایک گائوں میں رہنے لگا۔ مال اتنا بڑھا کہ اس میں مشغول ہو کر رفتہ رفتہ جمعہ و جماعات بھی ترک کرنے لگا۔ اس طرح مرضِ نفاق نے اس

کے دل میں ڈیرہ جما لیا۔ کچھ دنوں بعد حضور ﷺ کی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے والے پہنچے تو کہنے لگا کہ زکوٰۃ تو جزیہ کی بہن معلوم ہوتی ہے۔ پہلے تو اس طرح کہہ کر ٹالتا رہا ‘پھر زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔ آپ ﷺ اس کے اس رویے پر خفا ہوئے کہ خود ہی دولت کے لیے اصرار کیا اور دولت کا حق ادا کرنے کا وعدہ کیا‘ مگر جب دولت ملی تو وعدہ بھول گیا۔ بعد ازاں وہ خود بادلِ نخواستہ مالِ زکوٰۃ لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے تیری زکوٰۃ قبول کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ یہ سن کر اس نے بہت واویلا کیا ‘کیونکہ حضور ﷺ کا زکوٰۃ قبول نہ کرنا اس کے لیے بڑی عار کی بات تھی۔ بدنامی کے تصور سے سر پر خاک ڈالتا تھا مگر دل میں نفاق چھپا ہوا تھا۔ پس اس کی زکوٰۃ قبول نہ ہوئی۔ حضور ﷺ کے بعد وہ زکوٰۃ لے کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا ‘انہوں نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں زکوٰۃ پیش کی‘ ان دونوں نے بھی انکار کر دیا۔ ہر ایک نے یہی کہا کہ جو چیز نبی کریم ﷺ نے رد کر دی ہم اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ آخر اسی حالت نفاق میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں مر گیا۔ مال کا حق ادا نہ کرنا منافقت کا نتیجہ ہے۔ اس شخص نے اصرار کر کے حضور ﷺ سے دولت مندی کی دعا کرائی اور انفاق فی سبیل اللہ کا وعدہ کیا ‘مگر حرص و لالچ میں پڑ کر وعدہ بھول گیا۔ چنانچہ اس بخل کی یہ



سزا ملی کہ اس کی موت نفاق پر ہی واقع ہوئی۔ (بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

انفاق فی سبیل اللہ کا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کو دنیا میں بھی خوشحالی اور سکون ملتا ہے‘ جبکہ عاقبت کا ثواب تو مسلّم ہے۔ اس کے برخلاف بخیل کو دنیا میں بھی ذلت ملتی ہے اور آخرت کی سزا کی وعید تو ہے ہی۔ سورۂ محمد کی آخری آیت کے الفاظ ہیں: {ہَآ اَنۡتُمۡ ہٰٓؤُلَآءِ تُدۡعَوۡنَ لِتُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۚ فَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یَّبۡخَلُ ۚ وَ مَنۡ یَّبۡخَلۡ فَاِنَّمَا یَبۡخَلُ عَنۡ نَّفۡسِہٖ ؕ} (آیت ۳۸) ’’تم وہ لوگ ہو کہ تمہیں بلایا جا رہا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ پس تم میں سے کوئی وہ بھی ہے جو بخل سے کام لیتا ہے ‘اور جو کوئی بھی بخل کرتا ہے وہ درحقیقت اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے‘‘۔ یعنی اگر وہ بخل نہ کرتا تو اس کا فائدہ ہوتا ‘مگر اب بخل کیا‘ یعنی مال کو سنبھال سنبھال کر اپنے پاس رکھا اور فی سبیل اللہ خرچ نہ کیا تو گویا آخرت کے فائدے سے خود ہی محروم رہا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اور اس کو بندوں کے مال کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ تو بندوں کو فی سبیل اللہ خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے تاکہ وہ دنیا میں عزت اور آخرت میں ثواب حاصل کریں۔ بخیل آدمی مال سمیٹ سمیٹ کر رکھتا ہے اور خوش ہوتا رہتا ہے کہ اس کے پاس اتنی دولت جمع ہو گئی۔ لیکن وہ اسی حال میں مر جاتا ہے تو اپنی دولت یہیں چھوڑ جاتا ہے۔ اس کے وارث اس دولت کو جیسے چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں ۔ اگر وہ نیکی میں خرچ کریں گے تو ثواب پائیں گے مگر دولت چھوڑ کر مرنے والے کو اس کا کچھ ثواب نہیں ملے گا ‘بلکہ فی سبیل اللہ خرچ نہ کرنے کی بنا پر سزا پائے گا ۔ سورۃ التوبہ میں

ارشاد ہے:

{ وَ الَّذِیۡنَ یَکۡنِزُوۡنَ الذَّہَبَ وَ الۡفِضَّۃَ وَ لَا یُنۡفِقُوۡنَہَا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ۙ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۳۴﴾ یَّوۡمَ یُحۡمٰی عَلَیۡہَا فِیۡ نَارِ جَہَنَّمَ فَتُکۡوٰی بِہَا جِبَاہُہُمۡ وَ جُنُوۡبُہُمۡ وَ ظُہُوۡرُہُمۡ ؕ ہٰذَا مَا کَنَزۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ فَذُوۡقُوۡا مَا کُنۡتُمۡ تَکۡنِزُوۡنَ ﴿۳۵﴾ }

''اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو ان کو خوشخبری سنا دیجیے ایک دردناک عذاب کی ۔جس دن اس مال کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کے چہرے اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی۔ (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے جمع کر رکھا تھا اپنے واسطے ،پس اب مزا چکھو اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا۔''

---



اللہ تعالیٰ چاہتا تو ناداروں کو بھی فراخ روزی دیتا ،مگر اُس نے دولت مندوں کو یہ اعزاز دیا کہ وہ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے ناداروں کو دیں۔ سورۃ الذاریات میں یہاں تک بتا دیا گیا ہے کہ امیروں کی دولت میں غریبوں کا حصہ شامل کردیا گیا ہے:{وَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۱۹﴾ }۔ پس جو مالدار غریبوں میں دولت تقسیم کرتا ہے وہ ان پر احسان نہیں کر رہا ہوتا بلکہ ان کا مال ہی انہیں دے رہا ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص بھوکے کو کھانا کھلا رہا ہوتا ہے تو وہ بھوکے کا کھانا ہی اس کو دے رہا ہوتا ہے' اپنی طرف سے کچھ نہیں دے رہا ہوتا۔ سورۃ الماعون میں اسی لیے طعامُ المِسْکِیْنِ (مسکین کا کھانا) کے الفاظ آئے ہیں۔

نفاق نفس کی ایک قبیح بیماری ہے اور اس کا علاج ''اِنفاق'' ہے۔ جو شخص انفاق فی سبیل اللہ پر قادر ہو گیا وہ نفاق سے بچ گیا۔اس بارے میں فرمایا گیا: { وَ مَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۶﴾ }(الحشر:۹' التغابن:۱۶)''اور جو شخص اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں''۔صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین وہ پاکیزہ شخصیات تھے کہ اللہ تعالیٰ بھی ان کی تعریف کرتا ہے۔ ان کے سیرت و کردار میں ہمیں اس قسم کے واقعات ملتے ہیں کہ وہ اپنی ضروریات پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن میں حرص و لالچ نہ تھا بلکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے فقر اور ایثار سیکھا تھا۔ اگر وہ اپنے پاس کوئی چیز نہ پاتے تھے جس سے کسی ضرورت مند کی مدد کر سکیں تو پریشان ہو جاتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ضرورت مند کی ضرورت پوری کی جائے خواہ کسی سے قرض ہی لینا پڑے۔ سورۃ الحشر میں ارشاد ہے :{ وَ یُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ وَ لَوۡ کَانَ بِہِمۡ خَصَاصَۃٌ ؕ }(آیت ۹) ''وہ ان (مہاجرین) کو اپنی جان پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود فاقے سے ہوں۔''

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انفاق فی سبیل اللہ کا حکم دیا ہے:{یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبۡتُمۡ وَ مِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَکُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۪ } (البقرۃ:۲۶۷) ''اے اہل ایمان ! خرچ کرو پاکیزہ چیزیں اپنی کمائی میں سے اور

اس میں سے جو ہم نے نکالی ہیں تمہارے لیے زمین میں سے''۔گویا مال 'درہم و دینار کی صورت میں ہو یا زمین کی پیداوار ہو اس میں سے مستحقین کو دینا فرض ہے اور اسی کا نام زکوٰۃ اور عشر ہے۔ مال سے زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو مال پاک ہو جاتا ہے۔ ہاں زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد بھی اگر وافر مقدار میں مال ہو تو



اس سے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے بے انتہا ثواب کمایا جا سکتا ہے۔

زکوٰۃ تو اسلام کا رکن ہے۔ یہ فرض ہے جس طرح نماز فرض ہے۔ جو شخص اس قدر لالچی اور بخیل ہے کہ وہ اپنے مال کی زکوٰۃ بھی ادا نہیں کرتا تو ایسا شخص دوسروں کا حق کھانے کے گناہ کا ارتکاب بھی کرتا ہے اور زکوٰۃ ادا نہ کر کے اپنے رازق کی نافرمانی بھی کرتا ہے۔ انسانیت تو یہ ہے کہ اگر کسی کو بھوکا پیاسا دیکھا جائے تو اس کی بھوک پیاس دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ انسان تو انسان ہے 'اگر کوئی جاندار بھی بھوکا پیاسا ہو تو اس کی بھوک پیاس دور کر کے اجر کی امید رکھی جائے۔

شیطان کا یہ بڑا مہلک وسوسہ ہے کہ انسان سوچتا ہے کہ ابھی میرے پاس بہت تھوڑا مال ہے لہٰذا جب زیادہ مال آئے گا تو اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا۔ جو شخص اس وسوسے میں گھر گیا وہ ہمیشہ یہی سمجھتا رہے گا کہ میرے پاس مال ابھی کم ہے۔ اس کا توڑ یہ ہے کہ انسان اس وسوسے میں نہ پڑے اور اگر اس کے پاس مال کم ہے تو اس میں سے بھی اللہ کی راہ میں دے اور اگر زیادہ ہو تو زیادہ دے۔ کسی وقت اپنے آپ کو نہ دینے والوں کی فہرست میں شامل نہ کرے۔ یہ مثبت رویہ انسان کو مال کی محبت میں گرفتار ہونے سے بچاتا ہے۔

دنیا کے مال و منال کی محبت انسان کی کمزوری ہے 'کیونکہ مال و دولت کے ساتھ دنیوی نعمتیں حاصل کی جا سکتی ہیں اور ہر شخص کا دل چاہتا ہے کہ اس کے پاس زیادہ سے زیادہ سہولتیں ہوں۔ اس طرح وہ مال و دولت کی کسی مقدار پر قناعت نہیں کرتا 'بلکہ اور زیادہ کے حصول میں منہمک رہتا ہے۔ اسی چیز کو سورۃ التکاثر میں بیان کیا گیا:{اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۙ﴿۱﴾ حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ ؕ﴿۲﴾} ''تمہیں کثرت کی خواہش نے غافل کر دیا یہاں تک کہ تم نے قبریں دیکھ لیں (کہ تم مر کر قبروں میں چلے گئے)''۔ یعنی دنیا میں لالچ کرتے کرتے اور مال جمع کرتے کرتے تم اپنی عمر ختم کر چکے۔ اب مرنے کے بعد جب آخرت کا منظر سامنے آئے گا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم نے دنیا کا مال اکٹھا کرنے میں عمر کے قیمتی لمحات کیوں ضائع کیے۔ مال کی حرص پر قابو پانا ہی مطلوب ہے' ورنہ دولت مذموم نہیں ہے۔ دولت کے ساتھ آدمی قسم قسم کے نیک کام کر سکتا ہے۔ دولت مندی اور چیز ہے اور دولت کی حرص دوسری شے ہے۔ دولت کا صحیح استعمال آدمی کو نیک بناتا ہے۔ حضرت سید عبدالقادر جیلانی' امام اعظم ابوحنیفہ' حضرت عبداللہ

بن مبارک رحمہم اللہ بہت دولت مند لوگ تھے۔ انہوں نے اپنی دولت کو فی سبیل اللہ پانی کی طرح بہایا اور دولت کے ساتھ پیار نہ کیا' یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ بطور دولت مند مشہور نہ ہوئے بلکہ لوگ انہیں اللہ کے فرمانبردار بندوں کی حیثیت سے جانتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ دولت کو جمع کر کے رکھنے کو سخت ناپسند کرتے تھے بلکہ اس کی بدانجامی سے ڈراتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر آدم کے بیٹے کے پاس سونے کی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری تلاش کرے گا۔ اور آدم کے بیٹے کے پیٹ کو تو صرف مٹی ہی بھر سکتی ہے' اور جو شخص توبہ کرے اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے''۔(عن ابن عباس' فی البخاری)۔ اس حدیث میں آپ ﷺ نے دولت اکٹھی کرنے کی بدانجامی بتا دی۔ یہ تنبیہہ آپؐ نے بار بار کی تاکہ امت کے لوگ اس مشغلے سے باز رہیں۔ جس طرح افراد بخل کا شکار ہو کر اپنی عاقبت برباد کر لیتے ہیں اسی طرح بخل کی یہ بیماری قوموں کو بھی لاحق ہو جاتی ہے اور پوری قوم دنیا میں ذلت کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی رسول اللہ ﷺ کی راہنمائی موجود ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''(غیر مسلم) اقوام تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح کھانا کھانے والے کھانے کے پیالے پر ٹوٹ پڑتے ہیں''۔ اس پر ایک صاحب نے پوچھا: کیا یہ اس لیے ہو گا کہ ہم اس زمانے میں بہت تھوڑے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں بلکہ تم لوگ اُس وقت تعداد میں بہت زیادہ ہو گے' لیکن تمہاری حیثیت اس خس و خاشاک کی ہو گی جسے سیلاب بہا کر لاتا ہے۔ اللہ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب نکال دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری پیدا کر دے گا''۔ کہنے والے نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! وہ کمزوری کیا ہو گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا کی محبت اور موت سے نفرت''۔ (عن ثوبان' فی ابوداؤد)

رسول اللہ ﷺ نے مال و دولت جمع کرنے کی مذمت اکثر مواقع پر فرمائی۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہر اُمت کے لیے ایک فتنہ ہوتا ہے اور میری امت کا فتنہ مال و دولت ہے''۔(عن کعب بن عیاض' فی الترمذی) بخل وہ فتنہ ہے جس کی شناعت آپ ؐ نے ہر طرح سے واضح کر دی۔ آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ آپؐ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ آپؐ کے پاس چند درہم و دینار ایک دن کے لیے پڑے رہیں بلکہ آپؐ کے پاس جو کچھ آتا وہ فی سبیل اللہ خرچ کر دیتے اور اپنے لیے فقر کو پسند فرماتے۔ آپؐ کے اصحاب کا رویہ بھی یہی تھا' ان میں



جو دولت مند تھے وہ اپنی دولت کو صدقات و خیرات اور دین اسلام کی سربلندی کی جدوجہد میں بے دریغ خرچ کرتے تھے۔

آج بھی دولت کے فتنے سے بچنے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جائز ذرائع سے دولت کمائی جائے۔ تاہم اس مال و دولت سے اس طرح پیار نہ کیا جائے کہ وہ حاجت مندوں اور غریبوں پر خرچ نہ

لی جائے اور اسے دین اسلام کی سربلندی کے لیے کام میں نہ لایا جائے ۔ یہ ایک مؤمن کی شان سے بعید ہے کہ اس کے پاس مال و دولت موجود ہو مگر اس کے ارد گرد غریب مسکین اور نادار موجود ہوں اور مفلسی کی تکلیف اٹھا رہے ہوں اور وہ خبر رکھنے کے باوجود ان کی مدد نہ کرے یا دین اسلام کی سربلندی کی جدوجہد ہو رہی ہو اور وہ پیسے سنبھالے ہوئے ہو۔ اللہ تعالیٰ بخل سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین !

* * *



# غیبت -- ایک لذیذ کبیرہ گناہ

زبان کا استعمال شدید احتیاط کا متقاضی ہے' اس لیے کہ اکثر گناہوں کا صدور زبان ہی سے ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے زبان کے بے محابا استعمال سے منع فرمایا ہے۔ جھوٹ' غیبت' بہتان 'چغلی 'طعنہ زنی 'گالی گلوچ یہ سب زبان کے گناہ ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ مسلمانوں میں سب سے افضل کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا :((مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ)) (متفق علیہ) ''جس شخص کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان سالم اور محفوظ رہیں''۔ پس ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ بات کرنے سے پہلے سوچ لے کہ اُس کے الفاظ کسی دوسرے مسلمان کے لیے اذیت کا باعث نہ بنیں۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے' اکثر جو بات کسی کی زبان پر آتی ہے وہ کہہ دیتا ہے' حالانکہ دانائوں کا مقولہ ہے کہ ''پہلے تولو' پھر بولو !''

کسی کے پس پشت اس کے بارے میں بری باتیں کرنا حرام ہے۔ اگر یہ باتیں جھوٹی ہوں تو بہتان اور تہمت کہلاتی ہیں اور اگر سچی ہوں تو انہیں غیبت کہتے ہیں۔ غیبت کبیرہ گناہ ہے' لیکن غیبت کرنے والا بے احتیاطی میں کسی کے بارے میں بری باتیں کہہ دیتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ برائیاں تو واقعی اس آدمی میں موجود ہیں' حالانکہ ایسا کرنے سے وہ غیبت کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:{وَ لَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ} (الحجرات:۱۲) ''تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے(یعنی اُس کی پیٹھ

پیچھے اس کی برائی بیان نہ کرے)۔ بھلا تم میں سے کوئی اس بات کو گوارا کرے گا کہ وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ یقینا تمہیں اس سے گھن آئے گی''۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے) فرمایا: کیا تم جانتے ہو کہ غیبت کیا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا :اللہ اور اس کا رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا :((ذِکرُکَ اَخَاکَ بِمَا یَکرَہُ)) ''تمہارا اپنے (مسلمان)



بھائی کے بارے میں ایسا ذکر کرنا جو اسے ناپسند ہو!'' پوچھا گیا: ''اے اللہ کے رسولؐ! اگر وہ بات واقعتا میرے بھائی میں پائی جائے تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِنْ کَانَ فِیہِ مَا تَقُولُ فَقَدِ اغْتَبْتَہُ وَاِنْ لَمْ یَکُنْ فِیہِ فَقَدْ بَہَتَّہُ)) (صحیح مسلم) ''اگر تمہاری کہی ہوئی برائی اس میں پائی جاتی ہو تو تم نے اس کی غیبت کی ہے' اور اگر وہ اس میں نہ پائی جاتی ہو تو تم نے اس پر بہتان لگایا۔'' اور بہتان تو اور زیادہ گھناؤنا جرم ہے۔

غیبت کرنے والے کو متذکرہ بالا آیت میں ایسا کہا گیا ہے کہ گویا وہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ جب کسی کی غیر حاضری میں اُس کی برائی بیان کی جائے تو اُسے اپنی صفائی کا موقع نہیں ملتا' جیسا کہ مرا ہوا شخص کہ اُس کا گوشت بھی نوچ لیا جائے تو وہ کچھ نہیں بولتا۔ اگر کسی کی یہ برائی اُس کے سامنے کی جائے تو وہ اپنے دفاع میں کچھ باتوں کی وضاحت کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کی وضاحت سے یہ معلوم ہو کہ اس میں یہ برائی نہیں تھی یا یہ کہ وہ بظاہر برائی حقیقت میں برائی نہ تھی۔

غیبت ایک لذید گناہ ہے۔ چونکہ بندہ حاضر نہیں ہوتا لہٰذا یہ خوف نہیں ہوتا کہ وہ جواب دے گا یا اپنا ردّعمل ظاہر کرے گا۔ چنانچہ غیبت کرنے والا غائب کی بلاخوف برائی بیان کیے چلا جاتا ہے اور اس کو یہ خیال ہی نہیں رہتا کہ وہ کوئی گناہ کر رہا ہے۔

کوئی معمولی سی بات بھی غیبت شمار ہوتی ہے جو کسی کے سامنے بیان کی جائے تو اُسے ناپسند ہو۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ! صفیہ (رضی اللہ عنہا) تو (ایسی عورت ہے) اور ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ ایسی ہیں' یعنی چھوٹے قد والی۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا :((لَقَدْ قُلْتِ کَلِمَۃً لَوْ مُزِجَتْ بِمَاءِ الْبَحْرِ لَمَزَجَتْہُ)) (سنن ابی داؤد) ''تم نے تو ایک ایسی بات کہہ دی ہے کہ اگر اسے سمندر کے پانی میں ملایا جاتا تو وہ بھی متغیر ہو جاتا''۔ دیکھئے یہ ایک سچی بات تھی مگر یہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے سامنے کہی جاتی تو ضرور ان کو بری لگتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے ایسی بات کو شدید کڑوا قرار دیا۔

زبان سے بہت سی باتیں کی جاتی ہیں جو بُری ہوتی ہیں اور اُن کی برائی انسان کو مصیبت میں ڈال دیتی ہے' اسی طرح غیبت بھی بڑے بڑے جھگڑوں کا باعث ہو سکتی ہے اور اُن جھگڑوں کا انجام رنجش' فساد اور قتل و غارت تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِذَا أَصْبَحَ ابْنُ آدَمَ فَإِنَّ الْأَعْضَائَ كُلَّهَا تُكَفِّرُ اللِّسَانَ فَتَقُولُ : اتَّقِ اللهَ فِيْنَا، فَإِنَّمَا نَحْنُ بِکَ، فَإِنِ اسْتَقَمْتَ اسْتَقَمْنَا وَإِنِ اعْوَجَجْتَ اعْوَجَجْنَا)) (سنن الترمذی)

''جب انسان صبح کرتا ہے تو اس کے جسم کے تمام اعضا زبان کے سامنے عاجزی کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہمارے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈر۔ اس لیے کہ ہم تیرے ساتھ ہیں' اگر تو ٹھیک رہی تو ہم بھی ٹھیک رہیں گے اور اگر تو کج روی اختیار کرے گی تو ہم بھی کج رو بن جائیں گے۔''

اسلامی اخلاق اس بات سے روکتا ہے کہ کوئی شخص سنی سنائی بات آگے بیان کر دے اور اس بات کی تحقیق و تفتیش نہ کرے کہ آیا وہ اطلاع درست ہے یا غلط۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((کَفٰی بِالْمَرْئِ کَذِبًا أَنْ یُحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ)) (صحیح مسلم) ''آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ جو بات سنے اسے آگے بیان کر دے۔'' رسول اللہ ﷺ نے زیادہ باتیں کرنے سے بھی منع فرمایا ہے 'کیونکہ اس طرح انسان بلا تحقیق باتیں زبان سے نکال دیتا ہے اور اکثر اوقات بعد میں نادم اور شرمسار ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ صَمَتَ نَجَا)) ''جو خاموش رہا وہ آفتوں سے بچ گیا''۔ (مشکوۃ) حضرت سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کس چیز کو آپ میرے لیے خوفناک خیال کرتے ہیں؟ آپؐ نے اپنی زبان کو پکڑا اور فرمایا: ''اس کو۔'' (ترمذی)

جو شخص زبان پر کنٹرول رکھنے میں کامیاب ہو گیا وہ دیگر کئی گناہوں کے علاوہ غیبت جیسے گناہ سے بھی بچ جائے گا 'جس سے بچنا خاصا مشکل نظر آتا ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم اس چیز کے ساتھ بھی مؤاخذہ کیے جائیں گے جو ہم بولتے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تجھے تیری ماں گم کرے۔ دوزخ میں آدمی اپنے چہروں کے بل اپنی زبان کی کاٹی ہوئی کھیتی کے سبب ہی تو گرائے جائیں گے''۔ (ترمذی) یعنی دوزخ کا سبب وہ باتیں بنیں گی جو بلا احتیاط زبان سے نکالی جائیں گی۔ ان باتوں میں غیبت نمایاں ہے' یعنی کسی غیر حاضر شخص کے بارے میں وہ بُری باتیں زبان سے نکالی جائیں جو واقعی اُس میں موجود ہوں۔ گویا اس گناہ کبیرہ سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ آدمی کسی دوسرے کے



بارے میں صرف اچھی باتیں ہی زبان پر لائے اور خاص طور پر اُس کی غیر حاضری میں اس کی کسی برائی کو زیر بحث نہ لائے۔ ورنہ یہ لذیذ گناہ انجامِ بد تک پہنچا کر دم لے گا۔

چند استثنائی صورتیں

اگرچہ غیبت ایک گھناؤنا جرم اور گناہ کبیرہ ہے 'مگر کچھ صورتوں میں یہ جائز ہے اور کچھ صورتوں میں

ضروری ۔ذیل میں چند ایک صورتوں کو بیان کیا جاتا ہے:

(۱) مظلوم کے لیے یہ جائز ہے کہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی شکایت قاضی کے سامنے بیان کرے یا ایسے با اختیار حاکم کو بتائے جو اُس پر ہونے والے ظلم کا ازالہ کرا سکے۔ مظلوم ظالم کی نشان دہی کرے اور ہونے والے ظلم کی وضاحت کرے۔

(۲) کوئی شخص ظالم یا بد کردار ہو تو اُس کی شکایت اُس شخص سے کرنا جو اُسے منکرات سے روک سکے ،اور یہ بات بتانے کا برائیوں کو روکنے کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ ہو۔

(۳) اگر کسی کے ساتھ اُس کی بیوی یا بھائی یا کسی اور عزیز کا رویہ درست نہ ہو تو وہ صورت حال بتا کر مفتی سے فتویٰ لے سکتا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ وہ اس استفتاء میں زیادتی کرنے والوں کے نام لینے کی بجائے اس طرح پوچھے کہ جو شخص اس طرح کرتا ہو اُس کے ساتھ کیسا رویہ رکھا جائے؟

(۴) اگر کسی آدمی کے ساتھ لین دین کیا ہو جس میں وہ راست باز ثابت نہ ہوا ہو بلکہ اُس کی بددیانتی کا تجربہ ہوا ہو تو دوسرے اُس آدمی کو اس پر مطلع کرنا درست ہے جو بے خبری میں اس کے ساتھ معاملہ کر رہا ہو۔ ایسا کرنے میں نصح و خیر خواہی کے علاوہ اور کوئی مقصد پیش نظر نہ ہو۔

(۵) اگر کوئی شخص شادی، ملازمت ،کاروبار یا دیگر معاملات میں کسی شخص کے بارے میں مشورہ پوچھے تو جانتے بوجھتے اُس کو مشورہ دینے اور صحیح بات بتانے سے گریز نہیں کرنا چاہیے ،بلکہ ایسے موقعہ پر حقیقت حال واضح کرنا واجب ہو جاتا ہے تاکہ مشورہ کرنے والا کسی دھوکے کا شکار نہ ہو جائے۔ بلکہ جس کے بارے میں مشورہ پوچھا جائے بغرضِ خیر خواہی اُس کے عیوب بیان کر دینے چاہئیں ۔

(٦) اسی طرح کوئی شخص دیکھے کہ ایک شخص کسی بد عقیدہ یا بدعتی سے علم حاصل کر رہا ہے تو اس کو



اس بات سے مطلع کر دے کہ عقیدے کے اعتبار سے وہ آدمی درست نہیں یا وہ بدعات میں بتلا ہے۔

(۷) اگر ایک حاکم با اختیار ہے تو اُس کے علم میں لانا کہ فلاں لوگوں کی سرگرمیاں ملک و ملت کے لیے نقصان دہ ہیں ،نصح و خیر خواہی کے جذبے سے نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔

(۸) کسی کارکن یا ملازم کی شکایت اُس کے افسر اعلیٰ سے کرنا کہ وہ رشوت لیتا ہے یا اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے ، جائز ہے ،تاکہ اُسے راست باز بنایا جائے اور سائلین کو اُس کے ظلم و زیادتی سے بچایا جائے۔

(۹) جو شخص اعلانیہ شرک و بدعت اور منکرات میں ملوث ہو اُس کے شر سے بچانے کے لیے لوگوں کے ہاں اُس کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔

(۱۰) اگرچہ کسی اندھے کو اندھا کہنا یا لنگڑے کو لنگڑا کہنا درست نہیں تاہم اگر کسی تعارف کرانے میں اُس کے

جسمانی عیب کا ذکر کرنا ضروری ہو جائے تو درست ہے ‘مگر کسی صورت اس سے اُس شخص کی تحقیر مقصود نہ ہو۔

(۱۱) اگر کسی آدمی کی کوئی خاص برائی عام لوگوں کے ہاں معلوم و مشہور ہو تو اُس کی برائی بھی غائبانہ جائز ہے‘لیکن اس کی تحقیر یا بدنامی مقصود نہ ہو بلکہ وہ محض خیر خواہی کے جذبے سے ہو تو جائز ہے۔

آخر میں یہ بات بھی یاد رہے کہ جس طرح غیبت بہت بڑا گناہ ہے اسی طرح کسی کی اچھی باتوں‘ نیکیوں یا احسانات کا تذکرہ اُس کی عدم موجودگی میں لوگوں کے سامنے کرنا بہت بڑی نیکی بھی ہے۔

* * *



# شُحُّ النَّفس

انسان کے لیے خواہش نفس کو کنٹرول کرنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اس اعتبار سے ہر آدمی امتحان میں ہے۔ اور جو شخص اس امتحان میں کامیاب ہوتا ہے وہی انجام کار فلاح یافتہ ہے۔ قرآن مجید میں یہ الفاظ دو مرتبہ وارد ہوئے ہیں: {وَ مَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۝ ۹ }(الحشر:۹ و التغابن:۱۶) ’’اور جو شخص حرصِ نفس سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں‘‘۔ خواہش نفس پر کنٹرول اس لیے مشکل ہے کہ انسان خود پسند واقع ہوا ہے ‘جہاں اسے اپنا نقد نفع ملتا ہے وہاں وہ اس چیز کو بھلا دیتا ہے کہ یہ کام انجام کے اعتبار سے مفید ہے یا مضر۔

انسان کا دل چاہتا ہے کہ لوگ اس کی خوبیوں کی تعریف کریں۔ گویا وہ اپنے اچھے کاموں کا نقد فائدہ چاہتا ہے ‘حالانکہ اگر نیکیوں کا دنیا ہی میں صلہ مل گیا تو آخرت کے اعتبار سے ایسی نیکیاں سود مند نہ ہوں گی۔ جب بندہ کسی نیکی کے کام میں خرچ کرتا ہے تو نفس کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں ‘حالانکہ جس صدقہ و خیرات کا اسے دنیا کی زندگی میں تعریف کی صورت میں بدلہ مل گیا اسے آخرت میں اس کا ثواب نہ ملے گا۔ ہاں اگر کوئی شخص صدقہ کرتا ہے اور لوگ اسے اچھا سمجھتے ہیں مگر خرچ کرنے والا نہ تو لوگوں سے تعریف کی امید رکھتا ہے اور نہ اس پر پھولتا ہے بلکہ وہ خواہش کرتا ہے کہ اس کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی صدقات و خیرات میں آگے بڑھیں

تو اس صورت حال میں گویا وہ خواہش نفس کو کنٹرول کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاہم حدیث میں اس صدقے کو بہترین کہا گیا ہے جو اس طرح کسی مستحق کو دیا جائے کہ دینے والے کے بائیں ہاتھ کو معلوم نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔ گویا ایسا شخص چاہتا ہے کہ میرے اس عمل کا ثواب مجھے آخرت میں چاہیے نہ کہ دنیا میں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: {اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا ہِیَ ۚ وَ اِنۡ تُخۡفُوۡہَا وَ تُؤۡتُوۡہَا الۡفُقَرَآءَ فَہُوَ



خَیۡرٌ لَّکُمۡ ؕ} (البقرۃ:۲۷۱) ''اگر تم علانیہ خیرات دو تو یہ بھی اچھی بات ہے' اور اگر اس کو چھپاؤ اور چپکے سے فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے''۔ اس میں یہی بات واضح کی گئی ہے کہ اگر تم اپنے نفس پر کنٹرول کر سکو اور نیت یہ ہو کہ دوسرے لوگ بھی آپ کو دیکھ کر صدقہ کریں تو یہ بھی اچھا ہے' لیکن اگر دینے والے کو اندیشہ ہو کہ اس طرح لوگ اس کی تعریف کریں گے' لہٰذا کہیں اس میں ریاکاری شامل نہ ہوجائے تو اس کے لیے بہتر ہے کہ اپنا صدقہ انتہائی چھپا کر دے کہ دوسروں کو کانوں کان خبر نہ ہو اور اس کام پر اس کی تعریف نہ کی جائے' تاکہ اس کی یہ نیکی اس کے لیے توشہ آخرت بن جائے۔

یہ بھی یاد رہے کہ اگر کسی نادار کی مالی مدد خواہ چھپا کر ہی کی' مگر اس نیکی پر اس نادار پر رعب جمایا' طعنہ دیا' احسان جتایا یا بلامعاوضہ اس سے خدمت لی تو گویا ایسے کرنے والے نے اپنی اس نیکی کا صلہ دنیا ہی میں لے لیا اور آخرت میں وہ اس نیکی کے ثواب سے محروم رہے گا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: {یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِکُمۡ بِالۡمَنِّ وَ الۡاَذٰی ۙ کَالَّذِیۡ یُنۡفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ} (البقرۃ:۲۶۴) ''مؤمنو! اپنے صدقات (و خیرات) احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور وہ نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ یومِ آخر پر''۔ آگے ایسے آدمی کی خیرات کی مثال اس طرح دی گئی ہے جیسے صاف پتھر پر کچھ مٹی پڑی ہو۔ پھر مینہ برسے تو وہ ساری مٹی بہہ جائے اور کچھ ہاتھ نہ لگے' یعنی بارش کا کچھ مثبت اثر نہ ہو۔ اسی طرح اگر خیرات اس طرح کی کہ فقیر سے بیگار لی یا احسان جتایا یا اسے کسی اور طرح ایذا دی تو یہ خیرات ضائع گئی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی خیرات اور فی سبیل اللہ خرچ کی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انہوں نے اعلانیہ خرچ کیا۔ اس سلسلہ میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ اُن کا یہ خرچ ریاکاری کا مظہر نہ تھا' بلکہ وہ بعد کے لوگوں کے لیے قابل تقلید مثالیں تھیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبے سے کون واقف نہیں' انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد سب سے اونچا مقام انہی کا تھا۔ انہوں نے جنگ تبوک کی تیاری کے موقع پر اپنے گھر کا تمام اثاثہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لا کر پیش کر دیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے مال کا نصف فی

سبیل اللہ دے دیا۔ اسی طرح حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنا قیمتی باغ خیرات کر دیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے یہ خرچ اس قدر ظاہر تھے کہ آج ہم ان سے واقف ہیں' مگر یہاں ریاکاری کا عنصر عنقا تھا' بلکہ اس سے اُمت کے سامنے وضاحت ہوتی ہے کہ اصحاب ِرسول انفاق فی سبیل اللہ کے معاملے میں کس قدر فراخ دل تھے۔

اسلام اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کے ساتھ اس خواہش کے تحت بھلائی کی جائے کہ اس کی طرف سے جواب میں زیادہ ملے گا۔ سورۃ المدثر میں فرمایا :{وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ﴿٦﴾ }''احسان اس طرح نہ کرو کہ بدلے میں بہت ملے ''۔ گویا اسلامی تعلیم یہ ہے کہ کسی پر احسان صرف اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے اور کسی دُنیوی مفاد کی امید نہ رکھی جائے۔ یہی مطلب ہے اس محاورہ کا کہ ''نیکی کر دریا میں ڈال''۔ یعنی نیکی صرف اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لیے کی جائے اور اس پر کسی اجر کی توقع نہ رکھی جائے۔

بڑے سے بڑا نیک عمل اگر خواہش نفس کے تحت کیا جائے 'یعنی لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کیا جائے تو وہ ثواب کی بجائے گناہ کا باعث بن جاتا ہے۔ نماز اہم ترین عبادت ہے لیکن نماز پڑھنے والے کے پیش نظر اگر اللہ کی بجائے لوگوں کی خوشنودی ہو تو یہی عمل بدترین گناہ بن جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :{فَوَيۡلٞ لِّلۡمُصَلِّينَ ﴿٤﴾ ٱلَّذِينَ هُمۡ عَن صَلَاتِهِمۡ سَاهُونَ ﴿٥﴾ ٱلَّذِينَ هُمۡ يُرَآءُونَ ﴿٦﴾ }(الماعون)''خرابی ہے ان نمازیوں کے لیے' جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں (جو دکھلاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں) جو ریاکاری کرتے ہیں۔'' یعنی وہ نمازوں کی ادائیگی اللہ کی خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کو راضی کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ ان کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ نمازی ہونے کی بنا پر لوگ ان پر اعتبار کریں 'ان کو متقی اور اچھا مسلمان سمجھیں اور وہ لوگوں کے اس اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھائیں۔

نیکی کے کام میں رضائے الٰہی کے علاوہ کسی بھی درجے میں کچھ مطلوب ہو تو وہ کام قبولیت کے درجے کو نہیں پہنچتا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہا نے ایک نادار قریبی رشتہ دار مہاجر صحابی حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کی امداد اور خبرگیری کرتے تھے۔ جب اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر بے بنیاد تہمت لگائی گئی اور اس سلسلے میں طوفانِ بدتمیزی اٹھایا گیا تو بعض مسلمان نادانی میں منافقین کے ساتھ شریک ہوگئے۔ ان میں حضرت مسطحؓ بھی تھے۔ جب قرآن مجید میں حضرت



عائشہ رضی اللہ عنہا کی براء ت پر مشتمل آیات نازل ہو گئیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت مسطحؓ پر بہت رنج ہوا اور آپؓ نے قسم کھائی کہ آئندہ مسطح کی مدد نہ کروں گا۔ اس پر سورۃ النور کی آیات نازل ہوئیں جن میں حضرت

ابوبکرؓ کے اس عمل کو ناپسند کیا گیا۔ یہ آیات آنے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مسطح کی امداد بحال کر دی بلکہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؓ نے اس کی امداد دگنی کردی۔ گویا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسطحؓ کے ساتھ ناراضگی میں یہ بات بھول گئے کہ وہ اس کے ساتھ بھلائی صرف اس کی ناداری کی وجہ سے اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی کے لیے آیات نازل کر دیں' جس سے ابوبکر صدیقؓ سمجھ گئے کہ مسطحؓ کی غربت تو ویسی ہی ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مطلوب ہے ۔ چنانچہ انہیں حضرت مسطحؓ سے جو ناراضگی پیدا ہو گئی تھی انہوں نے رب کی رضا کی خاطر اسے ختم کر دیا۔

اگر کوئی شخص نیکی کا کام کرے اور وہ پسند کرے کہ لوگ اس کی تعریف کریں تو سمجھ لیجیے کہ وہ نفس کی خواہش کا شکار ہو گیا ہے 'لیکن اگر وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے اور نہیں چاہتا کہ لوگوں میں اُس کی اس نیکی کا چرچا ہو اور نہ ہی وہ اپنی اس نیکی کی تشہیر سے خوش ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے نیکی اللہ کی رضا کے لیے کی تھی 'نہ کہ اپنے نفس کو خوش کرنے کے لیے۔ بعض لوگ اس معاملے میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں اور وہ جب لوگوں میں اپنی تعریف کے چرچے سنتے ہیں تو خوش ہونے کی بجائے ناخوش ہوتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ لوگ ان کی نیکیوں کو مشتہر کریں۔ چنانچہ وہ جان بوجھ کر لوگوں کے سامنے کوئی قابل اعتراض عمل کر دیتے ہیں تاکہ لوگ ان کا قابل اعتراض عمل دیکھ کر ان سے دور ہو جائیں ۔جب ایسا ہوتا ہے تو وہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ان کی نیکیاں بس اللہ تعالیٰ کی رضاہی کے لیے ہیں۔ وہ اپنے نیک اعمال کا بدلہ عوام النا س کی طرف سے تعریف کی صورت میں ہرگز نہیں لینا چاہتے۔

اگر ایک واعظ کی یہ خواہش ہو کہ اس کا وعظ سن کر لوگ اس کی تعریف کریں تو سمجھ لیجیے کہ وہ نفس کے لالچ کا شکار ہو گیا ہے ۔ ورنہ وہ چاہتا کہ اس کا وعظ کسی طرح کے معاوضے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا معاوضہ تو اللہ تعالیٰ کے ہاں محفوظ ہے۔اسی طرح ایک شخص شوقیہ بلامعاوضہ مسجد کی خدمت کرتا ہے 'لوگ اس کی عزت کرتے ہیں اور اس کے کام کی تعریف کرتے ہیں ۔ اب اگر وہ اپنی اس حیثیت کا کسی طو رپر بدلہ حاصل کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے تو وہ سمجھ لے کہ اس کا اجر



آخرت کے اعتبار سے کالعدم ہو گیا ۔ مسجد کی خدمت پر مامور ملازم کا معاملہ دوسرا ہے کہ وہ اس کا روزگار ہے۔ اسی طرح دین کی خدمت کا ہر کام اللہ کی رضا کے لیے ہونا چاہیے۔

مختصر یہ کہ اپنے نفس پر کڑا پہرہ رکھنا چاہیے 'ورنہ اچھے عمل نتیجے کے طور پر بے اثر ہوتے جائیں گے۔ حج جیسا عمل بھی نتیجہ خیز نہ رہے گا ۔ اگر خواہش نفس کا تقاضا یہ ہو کہ لوگ حاجی کہیں گے اور یہ حاجی اپنے حج کو نیکی اور دیانت داری کے اشتہار کے طور پر استعمال کرے گا تو ایسا حج نتیجہ خیز نہ ہو گا ۔ حج تو وہ ہے جو حاجی کے کردار

میں مثبت تبدیلی پیدا کرے‘ ورنہ یہ نمائشی حج صرف دُنیوی زندگی میں اپنا نتیجہ دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں حج مبرور تو وہ ہو گا جو صرف رضائے الٰہی کے لیے ادا کیا گیا ہو اور اس سے کسی طرح کا دنیا کا نقد منافع مطلوب نہ ہو۔ ورنہ حج بھی باقی نمائشی اعمال کی طرح ہوائے نفس کی نذر ہو جائے گا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے : {اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ } (یوسف:۵۳) ’’بے شک نفس تو برائی پر شدید اُبھارتا ہے‘‘۔ یہی مطلب ہے اس آیت کا :{وَ مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ۹ ۝ } ’’اور وہ جو نفس کے لالچ سے بچا لیے گئے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں‘‘۔ نفس کو راہِ راست پر لانا بہت مشکل کام ہے ‘مگر حقیقی کامیابی کے لیے خواہش نفس پر کنٹرول ناگزیر ہے۔ اسلام ہمیں جو جامع ‘قابل عمل اور آسان ہدایات دیتا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ سلام کو پھیلاؤ‘اس لیے کہ اس سے محبت بڑھتی ہے اور انانیت دبتی ہے۔ ہمیں درس دیا گیا ہے کہ ہم اس انتظار میں نہ رہیں کہ سامنے سے ملنے والا ہمیں سلام کرے بلکہ خود آگے بڑھ کر سلام میں پہل کریں۔ یہ نفس کی سرکشی کا آسان مگر مؤثر علاج ہے ۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلْبَادِیُ بِالسَّلَامِ بَرِیٌٔ مِنَ الْکِبْرِ)) (رواہ البیھقی) ’’سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے بری ہوتا ہے‘‘۔ کیونکہ وہ ملنے والے کو عزت دیتا ہے اور اپنی انانیت کو مٹاتا ہے۔ ہوائے نفس برتری کا زعم پیدا کرتی ہے جبکہ سلام میں پہل کرنے سے انسان خود سر نفس کو دباتا ہے۔

نفس کی سرکشی کا بڑا سبب تکبر ہے جو بڑی اخلاقی برائی ہے۔ اس برائی کو دور کرنے کے لیے انسان کو ہمہ وقت مستعد رہنا چاہیے۔ تکبر کی سنگینی کو واضح کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِنْ کِبْرٍ)) ( صحیح مسلم) ’’جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو گا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔‘‘



اسلام نمائش اور بڑائی کے اظہار کو پسند نہیں کرتا ۔اس کے برعکس عاجزی اور انکساری کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ بڑے لوگ پسند کرتے ہیں کہ جب وہ کسی جگہ جائیں تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگ ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ مگر رسول اللہ ﷺ پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کے آنے پر بیٹھے ہوئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کھڑے ہوجائیں‘ حالانکہ آپؐ ساری مخلوق سے افضل تھے۔ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرما دیا تھا کہ کسی کے آنے پر لوگ اس کی تعظیم میں کھڑے ہو جائیں۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتے تھے :

((اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا وَاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَةِ الْمَسَاکِیْنِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ)) (سنن الترمذی)

’’اے اللہ ! مجھے مسکینی کی حالت میں زندہ رکھنا‘ مسکینی کی حالت میں مجھے موت دینا اور روزِ قیامت مجھے زمرۂ مساکین میں اٹھانا۔‘‘

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ہر قسم کے نمائشی کاموں سے منع کیا گیا ہے اور اخلاقی دائرے میں رہتے ہوئے عاجزی پسندیدہ ترین شے قرار دی گئی ہے۔

* * *



# حضرت ابوبکر صدیقؓ
# مختصر حالات اور فضائل و مناقب

آپ کا نام عبداللہ ،کنیت ابوبکر تھی ،جبکہ صدیق اور عتیق لقب تھے۔ آپ کے والد کا نام عثمان اور کنیت ابوقحافہ تھی۔ یہ وہی ابوقحافہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ جب فتح مکہ کے بعد اپنے بیٹے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کے پاس قبول اسلام کے لیے حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا : ابوبکر ! انہیں کیوں تکلیف دی ، میں خود ان کے پاس پہنچ جاتا۔ ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے لمبی عمر پائی اور ۹۷ سال کی عمر میں ۱۴ھ میں فوت ہوئے۔ آپ کی وفات سے قبل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رحلت فرما چکے تھے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے بچپن کے ساتھی تھے۔ دیانت و امانت اور راست بازی آپ کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ آپ مکہ کے خوشحال تاجر تھے۔ مسلمہ منکرات سے ہمیشہ دور رہے ، اسی لیے شراب نوشی سے بھی نفرت تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اکثر میل جول رہتا ، بلکہ بعض تجارتی سفروں میں بھی آپؐ کے ہم رکاب رہے۔جب آنحضرت ﷺ کو خلعت نبوت سے سرفراز کیا گیا اور آپؐ نے اپنے رفیق خاص ابوبکر سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ اسی وقت بلاتامل حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ میل جول نے پہلے ہی آپ کو ان کے اخلاق کا گرویدہ بنا رکھا تھا ، چنانچہ آپؓ نے قبولِ اسلام میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا۔ آزاد مردوں میں آپ سب سے پہلے شخص تھے جو ایمان لائے۔ اب رسول اللہ ﷺ کا آپؓ کے گھر آنا جانا معمول بن گیا اور دوستی مزید پختہ ہو گئی۔

شروع میں اسلام قبول کرنے والے اکثر افراد نادار، مفلس اور غلام ہوتے تھے۔ چنانچہ ان بے بس غلاموں کی آزادی پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بے دریغ مال لٹانا شروع کیا۔ بلال اور عامر بن فہیرہ (رضی اللہ عنہما) کو ان کے ظالم مالکوں سے آپؓ ہی نے نجات دلائی۔

جب مکہ میں قریش نے اسلام قبول کرنے والوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تو انہیں اوّلاً



حبشہ اور پھر مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ہوا۔ مسلمان ایک ایک، دو دو کر کے مدینہ روانہ ہو رہے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اجازت چاہی مگر رسول اللہ ﷺ نے روک دیا۔ آخر جس دن آپؐ کو ہجرت کے لیے اذنِ الٰہی ہوا آپؐ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیا اور رات کی تاریکی میں ہجرت کا یہ سفر اختیار کیا۔ غارِ ثور پہلی پناہ گاہ ثابت ہوئی۔ دونوں دوست غار کے اندر داخل ہو گئے۔ ابوبکرؓ نے غار کو صاف کیا اور تمام سوراخ بند کیے۔ ایک سوراخ جو رہ گیا اس پر آپؓ نے اپنی ایڑی رکھ دی۔ اسی سوراخ سے سانپ نے آپؓ کو ڈس لیا۔ اُس وقت آنحضرت ﷺ آپؓ کے زانو پر سر رکھے محو استراحت تھے۔ درد کی شدت سے آپؓ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔ آنسو کا ایک قطرہ حضور ﷺ کے چہرۂ انور پر گرا تو آپؐ بیدار ہوئے۔ پوچھا، کیا ہوا۔ آپؓ نے بتایا کہ سانپ نے ڈس لیا ہے۔ آپؐ نے اسی وقت لعاب دہن متاثرہ ایڑی پر لگا دیا جس سے درد رفع ہو گیا۔ غارِ ثور کے اس قیام نے آپ کو ''یارِ غار'' بنا دیا اور آج یہ لفظ ہر جگری دوست کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔

اِدھر قریش کو رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کا علم ہوا تو گرفتاری کے لیے سو اونٹوں کے انعام کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ کئی دشمن تلاش میں نکلے، مگر سب ہی خائب و خاسر رہے۔ تین دن غار میں گزارنے کے بعد یہ کارواں آگے روانہ ہوا۔ راستے میں اگر کوئی ابوبکرؓ سے پوچھتا کہ یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ تو آپؓ جواب دیتے یہ میرے راہ نما ہیں۔ چلتے چلتے نبوت کے چودھویں سال ربیع الاول کی بارہ تاریخ آپ مدینہ کے قریب پہنچ گئے۔ چند روز قبا میں قیام کیا اور پھر مدینہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت اہل مدینہ کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا کہ انصار پھولے نہیں سما رہے تھے۔

مدینہ پہنچ کر آپ ﷺ نے بے سروسامان مہاجرین کے ایک ایک فرد کو ایک ایک انصاری کا بھائی بنا دیا۔ اسے مواخات کہتے ہیں۔ ہر انصاری نے اپنے مہاجر بھائی کے ساتھ نصرت اور ایثار کی وہ رسم ڈالی کہ تاریخ انسانیت اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس رشتہ مواخات میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خارجہ بن زہیر رضی اللہ عنہ کا بھائی قرار دیا گیا، جو مدینہ کے ایک معروف آدمی تھے۔ مدینہ میں اوّلین کام ایک مسجد کی تعمیر تھا جہاں اجتماعی عبادت بھی ہو اور وہ جگہ مشاورت اور تعلیم کے لیے بھی استعمال ہو۔ جو زمین اس مقصد کے لیے منتخب کی گئی، اس کی

قیمت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ادا کی۔ بعدازاں جب مسجد کی تعمیر کا مرحلہ آیا تو جہاں دوسرے مسلمانوں نے گرم جوشی دکھائی وہاں خود رسول اللہ ﷺ نے اور یارِ غارؓ نے بھی مزدوروں کی طرح کام کیا۔

رمضان ۲ھ میں غزوۂ بدر پیش آیا۔ اس میں دیگر جاں نثاروں کے ساتھ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے جو تیغ بکف آنحضور ﷺ کا دفاع کرتے رہے۔ اس جنگ میں ۳۱۳ مجاہدوں نے اپنے سے تین گنا مسلح اور تیار جنگجوئوں کو شکست فاش دی۔ کفار کے ستر افراد جن میں اکثر سردار تھے، مسلمانوں کی قید میں آئے۔ ان کے بارے میں مشاورت کی گئی تو فدیہ کی ادائیگی پر ان کو چھوڑنے کا فیصلہ ہوا۔ اکثر صحابہ کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بھی یہی رائے تھی۔

اگلے سال معرکہ اُحد پیش آیا۔ اس میں بھی ابوبکر رضی اللہ عنہ شامل تھے۔ پہاڑی درہ میں متعین تیراندازوں نے جب اپنی جگہ چھوڑی تو قریشی جنگجوئوں نے اچانک ادھر سے حملہ کر دیا جس سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور فتح شکست میں تبدیل ہوگئی۔ ایک بھگدڑ مچ گئی۔ رسول اللہ ﷺ زخمی ہو گئے، آپؐ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے۔ یہ بھی مشہور ہو گیا کہ آپؐ شہید ہوگئے ہیں۔ ایسے موقعہ پر بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپؐ کا ساتھ نہ چھوڑا بلکہ بلند آواز سے پکارتے رہے کہ آنحضرت ﷺ زندہ ہیں۔ جنگ کے خاتمہ پر جس جماعت نے بھاگتے ہوئے کفار کا تعاقب کیا ان میں ابوبکرؓ بھی شامل تھے۔ معرکہ احد کے بعد پیش آنے والے تمام معرکوں میں بھی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دیگر مجاہدین کے ساتھ برابر شریک رہے۔

٦ھ میں جب مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عمرہ کی غرض سے مکہ روانہ ہوئے تو کفار قریش مزاحم ہوئے۔ حدیبیہ کے مقام پر پڑائو ڈالا گیا۔ بات چیت کے لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر مکہ بھیجا گیا۔ اسی اثناء میں مشہور ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ والوں نے شہید کر دیا ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے تمام جاں نثاروں سے جہاد پر بیعت لی۔ اس بیعت کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ الفتح میں ہوا ہے۔ اسے بیعت رضوان کا نام دیا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں شامل تمام افراد کو جنہوں نے آپؐ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی، اپنی رضامندی کی سند عطا فرمائی۔ اس بیعت میں دیگر خوش نصیبوں کے ساتھ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

۸ھ میں آنحضرت ﷺ نے قریش کی عہد شکنی کے سبب مکہ فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ دس ہزار صحابہ کی جماعت آپؐ کے ہمراہ تھی۔ مکہ میں فاتحانہ داخل ہونے والی قدسی صفات کی حامل

اس جماعت میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ اسی موقعہ پر آپؓ کے والد ابوقحافہ نے اسلام قبول کیا جس کا ذکر اوپر ہوچکا ہے۔ فتح مکہ سے واپسی پر بنو ہوازن سے جنگ ہوئی جس میں ابوبکر رضی اللہ عنہ شامل تھے۔

آپؓ کی سیرت و کردار میں انفاق فی سبیل اللہ کا بے مثال واقعہ غزوۂ تبوک کی تیاری کے موقعہ پر پیش آیا' جب رسول اللہ ﷺ کی ترغیب پر آپ اپنے گھر گئے اور گھر کا کل اثاثہ لا کر آنحضرت ﷺ کے قدموں میں ڈال دیا۔ جب آپ ﷺ نے پوچھا کہ ابوبکر !گھر میں کیا چھوڑ آئے ہو ؟تو عرض کیا کہ گھر والوں کے لیے اللہ اور اس کا رسول کافی ہے۔ علامہ اقبال نے اس کیفیت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس !

اس موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا 'مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل ایسا تھا کہ آپ فی سبیل اللہ انفاق کرنے والوں کے سرخیل ٹھہرے۔

۹ھ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر مکہ مکرمہ روانہ فرمایا۔ اسی موقع پر سورۂ توبہ کی آیات نازل ہوئیں جن کا اعلان حج کے موقعہ پر کرنا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان آیات کے اعلان کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو ابوبکرؓ نے پوچھا: اَمِیْرٌ اَوْ مَاْمُوْرٌ ؟ یعنی کیا آپ کو امارتِ حج کی ذمہ داری سونپی گئی ہے؟ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ نہیں' امیر حج تو آپ ہی ہیں 'البتہ مجھے حج کے موقع پر سورۂ توبہ کی آیات سنانے کے لیے خصوصی طور پر بھیجا گیا ہے۔

۱۰ھ میں رسول اللہ ﷺ حجتہ الوداع کے لیے مکہ تشریف لے گئے۔ جاں نثار صحابہ کثیر تعداد میں آپؐ کے ہمراہ تھے۔ اس موقع پر میدانِ عرفات میں آپؐ نے جو خطبہ دیا وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ دیگر پند و نصائح کے علاوہ آپ ﷺ نے فرمایا : میں نہیں کہہ سکتا کہ اگلے سال پھر یہاں تم سے ملاقات ہو۔ پھر واپسی پر آپؐ نے فرمایا : اللہ نے ایک بندہ کو دنیا اور عقبیٰ کے درمیان اختیار دیا تھا لیکن اس نے عقبیٰ کو دنیا پر ترجیح دی۔ یہ سن کر ابوبکرؓ رونے لگے 'کیونکہ وہ آپ کا اشارہ سمجھ رہے تھے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ علیل ہو گئے۔ جسمانی کمزوری



بڑھتی گئی۔ جب آپ ﷺ مسجد تشریف لانے سے بھی معذور ہو گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ مسجد نبوی میں امامت کرائیں۔ تعمیل ارشاد میں آپؓ نماز پڑھانے لگے۔ اس طرح آپؓ نے آنحضرت ﷺ کے

حین حیات سترہ نمازوں کی امامت کرائی۔

۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ بروز پیر آنحضرت ﷺ نے وفات پائی۔ اس دن آپؐ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھاتے دیکھا' خوش ہوئے اور مسکرائے۔ نماز کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ اجازت لے کر مکہ سے باہر گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو چکا تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا غم و اندوہ سے برا حال تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو کسی کی زبان سے آنحضرت ﷺ کے انتقال کی خبر سننا گوارا نہ تھا' وہ تو آپ کی رحلت ہی کا انکار کر رہے تھے۔ اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا جس میں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۴ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا: ''جو کوئی محمد ﷺ کی پرستش کرتا تھا تو (وہ جان لے کہ) بے شک محمد ﷺ فوت ہو چکے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا تھا تو (وہ خاطر جمع رکھے کہ) اللہ تعالیٰ بے شک زندہ ہے' اسے کبھی موت نہ آئے گی۔'' آپؓ کی یہ پرتاثیر گفتگو سن کر حاضرین کو اطمینان ہو گیا اور انہوں نے اس صدمے کی برداشت کا حوصلہ پایا۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ساتھ ہی خلافت کا مسئلہ پیدا ہوا جسے منافقین نے فتنہ بنانا چاہا۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں پہلے انصار اکٹھے ہوئے' بعدازاں مہاجرین بھی پہنچ گئے۔ اب ان دونوں میں اختلاف ہوا۔ قریب تھا کہ معاملہ خطرناک صورت اختیار کر لے کیونکہ انصار کا اصرار تھا کہ ایک خلیفہ انصار سے ہو اور ایک مہاجرین سے۔ اسی اثناء میں ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما وہاں پہنچ گئے۔ ابوبکرؓ نے صورت حال دیکھ کر فیصلہ کن انداز میں فرمایا کہ خلیفہ تو قریش میں سے ہی ہو گا۔ اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: ((اَلْاَئِمَّۃُ مِنْ قُرَیْش)) یہ ابوعبیدہ اور عمر ہیں' جس کے ہاتھ پر چاہو بیعت کر لو۔ اس پر عمر رضی اللہ عنہ اٹھے اور کہا: اس وقت سب لوگوں سے بہتر اور رسول اللہ ﷺ کے پیارے ابوبکر ہی ہیں' میں ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہوں۔ اس رائے کو سب نے پسند کیا اور لوگ اُسی وقت آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کے لیے لپکے۔ اگلے دن مسجد نبوی میں بیعت عامہ ہوئی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پہلا خطبہ خلافت دیا جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔



آپؓ کی خلافت کا دور سوا دو سال ہے مگر اس مختصر عرصے میں آپ نے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی بنیاد رکھ دی۔ رسول اللہ ﷺ اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری ایام میں نوعمر اسامہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں مجاہدین کو شام کی طرف لشکر کشی کا حکم دے چکے تھے۔ اب حالات تبدیل ہوئے تو لوگوں نے آپؓ کو مشورہ دیا کہ اندرونی اور بیرونی خطرات درپیش ہیں' اس لیے اس لشکر کی روانگی مؤخر کر دینی چاہیے۔ مگر آپؓ نے جواب دیا کہ جس لشکر کو اللہ کے رسول ﷺ کوچ کا حکم دے چکے ہیں' ابوبکر کون ہوتا ہے کہ اس کو روک لے؟ اسی طرح کچھ لوگ نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھے۔ آپؓ نے ان کے خلاف نہایت سخت رویہ اختیار کیا اور ان کا قلع قمع کر دیا۔

کچھ لوگوں نے زکوٰۃ کو جرمانہ قرار دیتے ہوئے اس کی ادائیگی سے انکار کیا۔ آپؓ نے ان کے خلاف بھی کارروائی کا ارادہ کیا۔ بعض صحابہؓ نے مصلحتاً مشورہ دیا کہ یہ کلمہ گو مسلمان ہیں' صرف زکوٰۃ ہی کا تو انکار کر رہے ہیں' اس لیے بحالاتِ موجودہ ان کے خلاف سخت رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی یہی رائے تھی۔ مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ قائل نہ ہوئے اور ان کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ آپؓ نے فرمایا: اَیُبَدَّلُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ؟ ''کیا میرے جیتے جی دین کو بدل دیا جائے گا؟'' اس سخت رویے کا اثر یہ ہوا کہ زکوٰۃ روکنے والے خود ہی زکوٰۃ لے کر بارگاہِ خلافت میں حاضر ہو گئے۔

نبوت کا دعویٰ کرنے والوں اور مرتدین کے خلاف آپؓ نے مسلح کارروائی کی جس کے نتیجہ میں یمامہ کی خونریز جنگ لڑی گئی۔ اس جنگ میں بہت سے وہ صحابی شہید ہوگئے جو حافظ قرآن تھے۔ حضرت عمرؓ نے صورت حال کی سنگینی کا جائزہ لیتے ہوئے مشورہ دیا کہ قرآن کے عالموں کی اس طرح شہادت کے نتیجہ میں قرآن کے بہت سے اجزاء ضائع ہونے کا اندیشہ ہے' اس لیے قرآن مجید کو یکجا کر کے ترتیب کے مطابق جمع کر لینا چاہیئے۔ اوّل اوّل تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر عذر کیا کہ جو کام رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا وہ میں کیسے کر سکتا ہوں؟ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اصرار پر آپ قائل ہو گئے اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو قرآن جمع کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے کمال حزم و احتیاط کے ساتھ قرآن کے متفرق اجزاء کو یکجا کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں حضرت زید بن ثابت کی سرکردگی میں جمع ہونے والا یہ نسخہ بعدازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا' جنہوں نے اسے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے



دور میں اسی نسخہ کی نقول تیار کرائیں اور انہیں عام کیا۔

آپؓ کی خلافت کے مختصر دور میں عراق اور شام کے خلاف جنگیں لڑی گئیں جن میں دیگر سپہ سالاروں کے علاوہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے شاندار کارنامے انجام دیے۔ ان معرکوں میں بھاری مقدار میں مال غنیمت ہاتھ لگا۔ عراق اور شام کے علاوہ کئی دوسرے علاقے بھی اسلامی مملکت میں شامل ہو گئے۔

خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالے ابھی صرف سوا دو سال ہوئے تھے اور عمر ۶۳ سال تھی کہ دار فانی سے رحلت کا وقت آگیا۔ صحابہ کو بلا کر جانشینی کے متعلق مشورہ کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں رائے لی۔ کچھ صاحبان نے ان کی طبیعت کی سختی کا ذکر کیا تو کہا کہ خلافت کی ذمہ داری اس کو خود ہی نرم کر دے گی۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حق میں عہدنامہ خلافت تحریر کرا دیا۔ جب خود مسجد نہ جا سکے تو امامت کی ذمہ داری حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دی۔ جمادی الاولیٰ ۱۳ھ کو آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ غسل آپ کی اہلیہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے دیا۔ آپؓ کی وصیت کے مطابق پرانے کپڑے ہی دھو

کر آپؓ کے کفن میں استعمال کیے گیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ کے آپ یارِ غار تھے۔ اکثر اکٹھے رہتے۔ ایک دوسرے کے گھر اکثر آیا جایا کرتے۔ رسول اللہ ﷺ کو آپؓ پر بہت اعتماد تھا اور پوشیدہ سے پوشیدہ بات بھی آپؓ سے کر لیا کرتے۔ سفر ہجرت جو انتہائی رازداری کے ساتھ ہو رہا تھا اس میں خانہ صدیق کے افراد ہی ہم راز تھے۔ آپؓ خود رسول اللہ ﷺ کے ساتھی تھے۔ آپؓ' کا بیٹا عبداللہ رات کے وقت آکر حالات سے باخبر کرتا۔ آپؓ' کا خادم عامر بن فہیرہ روزانہ دودھ مہیا کرنے کے لیے بکریاں لے کر آتا اور آپ کی بیٹی اسماء (رضی اللہ عنہا) کھانا تیار کر کے بھیجتیں۔

بارگاہِ نبوت میں آپؓ کا تقرب سب سے زیادہ تھا۔ جو بات کوئی شخص آپ ﷺ سے نہیں کر سکتا تھا' وہ ابوبکر کر لیتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی میں عمرو بن ہشام (ابوجہل) کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو اس بات کو پسند نہ کیا۔ اسی دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ' کو ناراض پایا۔ اس پر وہ باہر چلے گئے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر



بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے ابوبکرؓ' کو دیکھا تو چہرہ پر خوشی کے آثار نمایاں تھے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جگر گوشہ رسول ؐ کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے اپنی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا کا پیغام دیا 'مگر ابوبکرؓ خاموش رہے۔ بعدازاں جب وہ رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں گئیں تو آپؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر واضح کیا کہ آپ کو اس وقت میری خاموشی ضرور ناگوار محسوس ہوئی ہو گی مگر میں رسول اللہ ﷺ کے ارادہ سے آگاہ تھا اور اس راز کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک دفعہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس کسی نے مجھ پر احسان کیا' میں نے اس کا بدلہ اتار دیا سوائے ابوبکرؓ کے کہ اس کے احسان کا بدلہ اللہ تعالیٰ ہی چکائے گا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسجد کے احاطہ میں کھلنے والے تمام دروازے بند کر دیے جائیں مگر ابوبکرؓ کا دروازہ کھلا رہے۔ ایک شخص کے پوچھنے پر کہ یا رسول اللہؐ' آپ کے نزدیک مردوں میں سب سے زیادہ محبوب شخصیت کون سی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ابوبکرؓ۔

اللہ تعالیٰ نے آپؓ' کو فراست' ذہانت اور نورِ بصیرت سے نواز اتھا۔ خوابوں کی تعبیر بتانے کی صلاحیت خوب رکھتے تھے۔ لوگ آپؓ کے پاس اپنے خواب بیان کرتے اور ان کی تعبیر پوچھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مستعار کے آخری دنوں میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خواب دیکھا کہ ان کے حجرے میں تین چاند

اترے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اس کی تعبیر پوچھی تو وہ خاموش رہے۔ بعدازاں جب رسول اللہ ﷺ رحلت کے بعد حجرۂ عائشہؓ میں دفن ہوئے تو آپؓ نے فرمایا: عائشہؓ یہ پہلا اور سب سے بہتر چاند ہے جو تیرے حجرہ میں اترا ہے۔

آپ گفتگو میں بہت محتاط تھے۔ سمجھتے تھے کہ زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ پر بازپرس ہو سکتی ہے' لہٰذا بات سوچ سمجھ کر کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس سفر و حضر کے ساتھی سے بہت کم احادیث مروی ہیں۔

رزقِ حلال کے معاملہ میں حد درجہ احتیاط کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپؓ کا غلام کھانے کی کوئی چیز لایا۔ خلافِ معمول آپؓ نے کھانے سے پہلے نہ پوچھا کہ کہاں سے لائے ہو؟ بعدازاں احساس ہوا تو پوچھنے پر غلام نے بتایا کہ ایام جاہلیت میں میں نے کسی کی جھوٹ موٹ فال نکالی تھی' آج اس شخص نے اسی کے صلہ میں یہ چیز دی ہے۔ یہ سن کر آپؓ نے اپنے منہ میں



انگلی ڈالی اور سب کھایا ہوا قے کر دیا۔

نام و نمود' ریاکاری اور دنیا طلبی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ امارت کو بہت بڑی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے کہا نصیحت فرمائیے' تو کہنے لگے: ''تم پر اللہ کی رحمت اور برکت ہو۔ نماز پڑھو' روزے رکھو' زکوٰۃ دیتے رہو اور حج کرو۔ نیز سب سے بڑھ کر یہ کہ کبھی امارت قبول نہ کرنا۔ دنیا میں امیر کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔ قیامت کے روز اس کی بازپرس نہایت سخت ہو گی۔''

ساری زندگی اپنا مال اللہ کی راہ میں لٹاتے رہے' جس میں غلاموں کی آزادی' غریبوں اور مسکینوں کی مالی امداد اور جہاد کی تیاری میں بے دریغ خرچ کرنا شامل ہے۔ خلافت کے دوران حال یہ ہوگیا کہ بیت المال کے مقروض ہو گئے۔ وفات کے وقت وصیت کی کہ سب سے پہلے میرا فلاں باغ بیچ کر بیت المال کا قرض اتارنا' پھر بیت المال کی جو بھی چیز گھر میں نظر آئے حضرت عمرؓ کے حوالہ کر دینا۔ زندگی میں مستحقین کی امداد اس طرح کثرت سے کرتے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

آپ تجارت پیشہ اور خوشحال سوداگر تھے۔ دوردراز کے تجارتی سفر بھی اختیار کیے اور خوب مال کمایا۔ قبولِ اسلام کے بعد انفاق فی سبیل اللہ بھی دل کھول کر کیا۔ خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد بھی کاروبار جاری رکھنا چاہا مگر اس سے عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں رکاوٹ آتی تھی۔ چنانچہ کاروبار چھوڑ دیا اور ہمہ تن عوام کی خدمت میں لگ گئے۔ گزر اوقات کے لیے معمولی سا وظیفہ بیت المال سے لینا قبول کیا۔ وظیفے کی یہ رقم اتنی کم تھی کہ گھر کے بنیادی اخراجات مشکل سے پورے ہوتے تھے۔

آپؓ انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ تکلفات سے نفرت تھی۔ سادہ لباس اور سادہ سا کھانا پسند کرتے اور جوں جوں زندگی آگے بڑھتی گئی اس سادگی میں اور اضافہ ہوتا گیا' یہاں تک کہ نئے کپڑے کا کفن بھی گوارا نہ کیا 'بلکہ وصیت کی کہ مجھے پرانے کپڑوں ہی میں کفن دے دینا' نیا کپڑا کسی زندہ کے کام آجائے گا۔

آپؓ' نہایت منکسر المزاج انسان تھے۔ خاکسارانہ رویہ اور تواضع پسند تھی۔ اپنے کام خود کر لیتے۔ جوانی میں بھیڑ بکریاں بھی چرائیں۔ آس پاس رہنے والوں کی ضروریات کا خیال



رکھتے۔ جب آپ خلیفہ ہوئے تو محلے کی ایک لڑکی کو تشویش ہوئی کہ پہلے تو ابوبکرؓ اس کی بکریوں کا دودھ دوہ دیا کرتے تھے' اب کیا ہو گا۔ آپ کو خبر ہوئی تو اسے تسلی دی کہ تمہارا کام اب بھی میں کر دیا کروں گا۔ اگر کوئی تعریف کرتا تو پسند نہ کرتے اور دعا کرتے: ''اے اللہ ! تو مجھے اس کے حسن ظن سے بہتر کر دے' میرے گناہوں کو بخش دے اور لوگوں کی بے جا تعریف کا مجھ سے مواخذہ نہ کرنا۔''

آپؓ رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کے عاشق تھے۔ کوئی کام آپؐ کے طریقے سے ہٹ کر کرنا انہیں گوارا نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر رات کو دیر تک نوافل میں مصروف رہنا آپ کا معمول تھا۔ خوفِ خدا اس حد تک تھا کہ مغفرت کی دعا کرتے کرتے داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔

آپؓ' کی چار بیویاں تھیں 'جن سے تین بیٹے عبداللہ ' عبدالرحمن اور محمد ' جبکہ تین بیٹیاں اسمائ' عائشہ اور اُم کلثوم تھیں ۔(رضی اللہ عنہم وارضاھم اجمعین!)

* * *



# حبِ رسول: حضرت زید بن حارثہؓ

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ وہ آپؐ کے محبوب صحابی تھے۔ تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان کو"حِبُّ الرَّسُوْل" اور ان کے صاحبزادے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو

''حِبُّ بْنُ حِبّ ''کہتے تھے۔ اصحابِ رسول ﷺ میں سے یہ شرف صرف زیدؓ ہی کو حاصل ہے کہ ان کا نام صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں آیا ہے۔ اسی فضیلت کی بنا پر بعض لوگوں نے حضرت زید کو ''افضل الصحابہ'' قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے تو حضور ﷺ کے بعد خلیفہ ہوتے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ قبیلہ بنو کلب کے ایک شخص حارثہ بن شرجیل کے بیٹے تھے۔ ان کی ماں سعدی بنت ثعلبہ قبیلہ طے کی شاخ بنی معن سے تھیں۔ ان کی عمر ابھی آٹھ سال تھی کہ اپنی والدہ کے ساتھ سفر پر جا رہے تھے' راستے میں قبیلہ بنی قین کے لوگوں نے حملہ کر کے لوٹ مار کی اور کچھ لوگوں کو پکڑ کر لے گئے جن میں زید بھی شامل تھے۔ زید کو عکاظ کے میلے میں حکیم بن حزام کے ہاتھ بیچ دیا گیا جو کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے تھے۔ انہوں نے یہ غلام مکہ میں لا کر اپنی پھوپھی صاحبہ کے حوالے کر دیا۔ جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نکاح آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہوا تو زید حضرت خدیجہؓ کے ہاں موجود تھے۔ آپؐ کو زید کے عادات و اطوار اس قدر پسند آئے کہ آپؐ نے انہیں حضرت خدیجہ ؓ سے مانگ لیا۔ ادھر زید کے گھر والے اس کے فراق میں غم سے نڈھال ہو رہے تھے۔ قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ بنو کلب کے چند افراد حج کے ارادے سے مکہ آئے تو زید کو دیکھ کر پہچان لیا۔ اس طرح زید کے گھر والوں کو زید کی خبر لگ گئی۔ چنانچہ زید کے والد حارثہ' چچا کعب اور بھائی بھاگے ہوئے مکہ پہنچے۔ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپؐ زید کو معاوضہ لے کر ہمارے حوالے کر دیجیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: میں بچے کو بلاتا ہوں اور اسی کی مرضی پر چھوڑے دیتا ہوں کہ وہ میرے پاس رہنا پسند کرتا ہے یا آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ اگر وہ آپ لوگوں کے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ لیے بغیر اسے آپ



کے حوالے کر دوں گا۔ آپ ﷺ کی یہ باتیں سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔ چنانچہ زید کو بلایا گیا اور اس کے باپ اور چچا کے سامنے اس کے ساتھ بات کی گئی اور دونوں صورتیں اس کے سامنے پیش کی گئیں۔ زید نے جواب دیا کہ میں آپؐ پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ میرے باپ اور چچا جو کچھ بھی ہیں آپؐ ہی ہیں۔ حارثہ یہ سن کر نہایت مضطرب ہوئے اور کہنے لگے زید کس قدر افسوس ہے کہ تو غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتا ہے اور اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے۔ زید نے جواب دیا: اس ہستی کے ساتھ رہ کر میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کے بعد دنیا و مافیہا کو اس کے سامنے ہیچ سمجھتا ہوں۔ زید کا یہ جواب سن کر باپ اور چچا بخوشی راضی ہو گئے۔ حضور ﷺ نے اسی وقت زید کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمع عام میں اعلان کر دیا کہ آپ سب لوگ گواہ رہیں آج سے زید میرا بیٹا ہے' یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے۔ حارثہ نے یہ سنا تو اور بھی خوش ہوا۔ باپ اور چچا دونوں مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔ اب وہ کبھی کبھی مکہ آتے اور زید کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر لیتے۔ چونکہ زید کو حضور ﷺ نے آزاد کر کے بیٹا بنا لیا تھا' اس لیے لوگ اب زید کو زید بن محمد

پکارنے لگے تھے۔

چالیس سال کی عمر میں جب نبی کریم ﷺ نے اعلانِ نبوت کیا تو زید کی عمر ۳۰ سال تھی۔ اعلان نبوت کے ساتھ ہی آپ ﷺ کی بیوی حضرت خدیجہ، آپ کے چچازاد بھائی حضرت علی جو آپ ہی کے گھر پرورش پا رہے تھے اور آپؐ کے دوست حضرت ابوبکر صدیق ایمان لے آئے اور ان کے ساتھ ہی زید نے بھی لبیک کہا اور یوں وہ ان چار ممتاز ہستیوں (رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں شامل ہو گئے جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔

اسلام حقیقت پسندانہ رویہ کا قائل ہے، لہٰذا حقیقت کے مقابلے میں مصنوعیت کو قبول نہیں کرتا۔ رائج الوقت دستور کے موافق متبنیٰ کی حیثیت بالکل حقیقی بیٹے کی سی تسلیم کی جاتی تھی، مگر اسلام نے اس کی اصلاح کر دی۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب میں حکم نازل ہوا:

{وَ مَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَکُمْ اَبْنَآءَکُمْ ؕ ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاہِکُمْ ؕ وَ اللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَ ہُوَ یَہْدِی السَّبِیْلَ ﴿۴﴾ اُدْعُوْہُمْ لِاٰبَآئِہِمْ ہُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰہِ ۚ...} (آیت ۵)



''اور نہ اُس نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا بنایا ہے۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو، مگر اللہ وہ بات کرتا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے اور وہی صحیح طریقے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے۔''

اس واضح ہدایت کے آجانے کے بعد مسلمان ان کو زید بن محمدؐ کے بجائے زید بن حارثہ کہنے لگے۔ جیسا کہ آغاز میں بیان کیا گیا کہ حضرت زید ہی وہ واحد صحابی ہیں جن کا نام قرآن حکیم میں مذکور ہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

چونکہ قرآن کے حکم کے موافق ان کے نام سے اس نسبت عظیمہ کا شرف جدا کر لیا گیا تھا، شاید اس کی تلافی کے لیے تمام صحابہؓ کے مجمع میں سے صرف ان کو یہ شرف بخشا گیا کہ ان کا نام قرآن میں تصریحاً وارد ہوا۔''

زیدؓ آنحضور ﷺ کے لیے گھر کے دوسرے افراد ہی کی طرح تھے۔ آپؐ نے ان کا نکاح اپنی دودھ پلائی اُمّ ایمن سے کر دیا جن کے بطن سے حضرت اسامہؓ پیدا ہوئے۔ بعدازاں آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش سے کر دیا جائے۔ چونکہ زینب ہاشمی خاندان کی چشم و چراغ تھیں اور زید بہرحال آزاد کردہ غلام تھے، لہٰذا زینب اور ان کے بھائی عبداللہ بن جحش اس عقد پر راضی نہ ہوئے۔ تب وحی الٰہی کے ذریعے ایک فیصلہ کن بات بتا دی گئی کہ جس بات کا حکم اللہ اور اس کا رسول دیں پھر اس کی خلاف ورزی کسی کے لیے جائز نہیں۔ سورۃ الاحزاب میں ارشاد فرمایا:

{وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾}

''جب اللہ اور اُس کا رسول کوئی فیصلہ کر دیں تو پھر کسی مؤمن مرد اور مؤمنہ عورت کو ان کے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا ۔اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے بلاشبہ وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔''

اس آیت کے سنتے ہی حضرت زینبؓ اور ان کے گھر والوں نے بلاتامل سراطاعت خم کردیا۔چنانچہ اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے ان کا نکاح پڑھایا۔ آپؐ نے خود حضرت زیدؓ کی جانب سے دس دینار اور ساٹھ درہم مہر ادا کیا اور کچھ کپڑے اور سامانِ خوراک گھر کے خرچ کے



لیے بھجوا دیے۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ عقد نکاح میں منسلک تو ہو گئیں مگر وہ اس احساس کو کسی طرح نہ مٹا سکیں کہ زید ایک آزاد کردہ غلام ہیں اور ان کے اپنے خاندان کے پروردہ ہیں۔ وہ عرب کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی ہونے کے باوجود اس کمتر درجے کے آدمی سے بیاہی گئی ہیں۔ اس احساس کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں انہوں نے کبھی زید کو اپنے برابر کا نہ سمجھا۔ ادھر حضرت زید رضی اللہ عنہ کو اس بات کا گہرا احساس تھا کہ وہ عرب کے معزز ترین شخص حضرت محمد ﷺ کے منہ بولے بیٹے ہیں اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا پر ان کو قوامیت کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ یہ دو متضاد ذہنیتیں تھیں جن کے سبب میاں بیوی کے درمیان محبت اور الفت کا رشتہ استوار نہ ہو سکا اور تلخیاں بڑھنے لگیں۔ حضرت زیدؓ نے کئی بار حضور اکرم ﷺ سے شکایت کی مگر حضور ﷺ انہیں سمجھاتے رہے کہ نباہ کرنے کی کوشش کرو۔ ظاہر ہے کہ حضرت زیدؓ نے حالات کو بہتر کرنے کی پوری سعی کی ہوگی مگر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی ایک سال سے کچھ ہی زیادہ مدت گزری تھی کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی اور میاں بیوی کے درمیان علیحدگی ہو گئی۔

اگرچہ اس سے قبل متبنیٰ کے بارے میں حکم آچکا تھا' تاہم اللہ تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ اس پر عمل درآمد کے لیے حضور اکرم ﷺ کی سیرت سے نمونہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اشارہ مل گیا کہ زیدؓ جب اپنی بیوی کو طلاق دے چکیں تو ان کی مطلقہ خاتون سے آپ کو نکاح کرنا ہو گا۔ یہ آنحضرت ﷺ کے لیے بہت بڑی آزمائش تھی اور بربنائے بشریت آپؐ کے قلب میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ زید زینب کو طلاق نہ دے تاکہ زینبؓ کے خاندان کی توہین بھی نہ ہو اور میں بھی منافقین اور مشرکین کے اس طعن و تشنیع سے محفوظ رہ جائوں کہ محمد(ﷺ) نے اپنے بیٹے کی بیوی کو اپنی بیوی بنا لیا ہے۔ اسی بنا پر آپ ﷺ مسلسل زید کو طلاق دینے سے باز رکھتے رہے' لیکن جب زید نے طلاق دے کر زینب کو فارغ کر دیا اور عدت گزر گئی تو بحکم

خداوندی حضور ﷺ نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کر لیا۔ اس صورت حال کو قرآن پاک میں سورۃ الاحزاب میں بیان کیا گیا ہے:

{وَ اِذۡ تَقُوۡلُ لِلَّذِیۡۤ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِ اَمۡسِکۡ عَلَیۡکَ زَوۡجَکَ وَ اتَّقِ اللّٰہَ وَ تُخۡفِیۡ فِیۡ نَفۡسِکَ مَا اللّٰہُ مُبۡدِیۡہِ وَ تَخۡشَی النَّاسَ ۚ وَ اللّٰہُ اَحَقُّ



اَنۡ تَخۡشٰہُ ؕ فَلَمَّا قَضٰی زَیۡدٌ مِّنۡہَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰکَہَا لِکَیۡ لَا یَکُوۡنَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ حَرَجٌ فِیۡۤ اَزۡوَاجِ اَدۡعِیَآئِہِمۡ اِذَا قَضَوۡا مِنۡہُنَّ وَطَرًا ؕ وَ کَانَ اَمۡرُ اللّٰہِ مَفۡعُوۡلًا ﴿۳۷﴾}

''اور (اے نبی ﷺ!) وہ وقت قابل ذکر ہے جب آپؐ اس شخص سے کہتے تھے جس پر اللہ نے اور آپ نے انعام کیا کہ اپنی بیوی کو روکے رکھ (اور طلاق نہ دے) اور اللہ سے ڈر' اور صورت حال یہ تھی کہ آپ اپنے جی میں اس بات کو چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور آپ لوگوں (کے طعن و تشنیع) سے ڈرتے تھے' جبکہ اللہ زیادہ مستحق ہے کہ اس سے خوف کیا جائے۔ سو جب زید اپنی حاجت پوری کر چکا (اور اس نے طلاق دے دی) تو ہم نے اس (زینب) کا نکاح آپ سے کرا دیا تاکہ آئندہ مسلمانوں پر یہ تنگی نہ رہے کہ وہ اپنے منہ بولے بیٹے کی بیویوں سے نکاح نہ کر سکیں جب کہ ان کے منہ بولے بیٹے اپنی حاجت پوری کر لیں (یعنی طلاق دے دیں) اور اللہ کا یہ حکم اٹل ہے۔''

رسول اللہ ﷺ کی زوجیت میں آکر حضرت زینب رضی اللہ عنہا بجا طور پر امہات المومنین سے کہا کرتی تھیں کہ تمہارے نکاح تو زمین پر ہوئے مگر میرا نکاح آسمان پر ربّ العزت نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا۔ اور واقعی یہ وہ شرف ہے جو حضرت زینبؓ کے لیے حقیقتاً وجہ افتخار ہے۔ اس طرح حضرت زینبؓ بھی خوش ہو گئیں اور متبنیٰ کی بیوی کے ساتھ نکاح کا جواز بھی ثابت ہو گیا۔ بلکہ کفار و مشرکین کی طرف سے اٹھائے گئے طوفان کا جامع جواب بھی قرآن پاک میں نازل ہو گیا کہ محمد ﷺ کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ پس زینبؓ تو زید بن حارثہؓ کی بیوی تھی نہ کہ آپؐ کے بیٹے کی۔ فرمایا:

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِکُمۡ وَ لٰکِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰہِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ (الاحزاب:۴۰)

''محمد تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔''

رسول اکرم ﷺ کو زیدؓ کے ساتھ بے حد محبت تھی۔ طبقات ابن سعد کے مطابق حضرت زیدؓ کو آپ ﷺ نے نو دفعہ سپہ سالار بنا کر بھیجا۔ آپ ؓ نے تقریباً تمام معروف معرکوں میں شرکت کی۔ غزوۃ المریسیع میں آپؓ شامل نہ ہوئے' کیونکہ آنحضرت ﷺ نے آپ کو مدینہ

میں اپنے جانشین کی حیثیت سے چھوڑا تھا۔ حضرت زیدؓ تیر اندازی میں انتہائی مہارت رکھتے تھے اور اس فن میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔

رسول اللہ ﷺ کو حضرت زید کے بیٹے اسامہ رضی اللہ عنہما سے بھی بہت پیار تھا۔ جس طرح آپ ﷺ اپنے نواسوں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو گود میں بٹھاتے اسی طرح اسامہ کو بھی بٹھاتے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسامہ کا وظیفہ میرے وظیفہ سے زیادہ مقرر کیا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو حضرت عمرؓ نے کہا: اے بیٹے! اسامہ آنحضرت ﷺ کو تجھ سے زیادہ پیارا تھا اور اس کا باپ تیرے باپ سے زیادہ آپ ﷺ کو محبوب تھا۔

آنحضرت ﷺ کے سفیر حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ قیصر روم کے نام آپؐ کی طرف سے نامۂ مبارک لے جا رہے تھے کہ شرحبیل بن عمر وغسانی نے انہیں شہید کر دیا۔ آپ ﷺ کو اس بدعہدی پر بڑا رنج ہوا۔ آپؐ نے تین ہزار مجاہدین اسلام کو حارث کا انتقام لینے کے لیے روانہ کیا اور سپہ سالار حضرت زید رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا اور فرمایا کہ اگر زید شہید ہو جائیں تو جعفر طیارؓ کو اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ کو سپہ سالار بنایا جائے۔ یہ معرکہ جمادی الاولیٰ ۸ ہجری کو موتہ کے مقام پر ہوا۔ اس جنگ میں حضرت زید رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی' بعدازاں حضرت جعفر طیار اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہما بھی شہید ہوئے۔ ان کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں یہ معرکہ سر ہوا۔ جب آپ ﷺ نے حضرت زیدؓ کی شہادت کی خبر سنی تو بڑے رنجیدہ ہوئے اور وفورِ جذبات سے آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ آپ ﷺ کو اپنے وفاشعار غلام کی مفارقت کا اس قدر غم تھا کہ حجۃ الوداع سے واپسی پر ان کے صاحبزادے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں ایک فوج کو انتقام کے لیے مامور فرمایا۔ اس وقت حضرت اسامہؓ نہایت کم عمر تھے۔ بعض لوگوں نے اس پر اعتراض بھی کیا' مگر آپ ﷺ نے فرمایا: خدا کی قسم زید امارت کے لائق اور محبوب ترین شخص تھا اور اس کے بعد اسامہ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔ یہ مہم ابھی روانہ نہ ہوئی تھی کہ آفتابِ رسالت غروب ہو گیا' لیکن خلیفہ اوّل نے ہجوم مصائب اور صعوبات گوناگوں کے باوجود اس لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اپنے باپ کے قاتلوں سے انتقام لے کر غیر معمولی کامیابی کے ساتھ مدینہ واپس آئے۔

* * *

# حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اُن ممتاز صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں شامل ہیں جنہیں رسول اللہ ﷺ نے نام بنام حین حیات جنت کی بشارت دی۔ اس بشارت سے بڑھ کر کسی بشارت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان دس اصحاب کو ''عشرۂ مبشرہ'' کہا جاتا ہے ۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر جنتی ہیں' عمر جنتی ہیں' عثمان جنتی ہیں' علی جنتی ہیں' طلحہ جنتی ہیں' زبیر جنتی ہیں' عبدالرحمن بن عوف جنتی ہیں' سعد بن ابی وقاص جنتی ہیں' سعید بن زید جنتی ہیں اور ابوعبیدہ بن الجراح جنتی ہیں۔ ''(جامع ترمذی) رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ! اگرچہ ان کے علاوہ اور بھی کچھ حضرات ہیں جن کو مختلف مواقع پر آپ ﷺ نے جنت کی بشارت دی ہے' مگر ان دس حضرات کو دوسرے تمام صحابہ کے مقابلے میں امتیاز حاصل ہے۔

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ ۵۸۴ء میں پیدا ہوئے' اس طرح وہ رسول اللہ ﷺ سے عمر میں تقریباً ۱۳ سال چھوٹے تھے۔ ان کا نام عامر تھا اور کنیت ابوعبیدہ تھی ۔آپ کی کنیت اس قدر مشہور ہو گئی کہ نام نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ آپ ؓ کے والد کا نام عبد اللہ تھا مگر آپ کی کنیت آپ کے دادا کے نام سے ہوئی۔ آپ ؓ کے والد عبد اللہ ایمان نہ لائے اور کفر کی حالت میں ہی قتل ہوئے۔ البتہ آپ کی ماں امیمہ بنت غنم رضی اللہ عنہا نے اسلام قبول کر لیا اور صحابیات میں شامل ہوئیں۔

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دوست تھے۔ چنانچہ انہی کی ترغیب پر انہوں نے ۲۹ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ یہ اسلام کی دعوت کا ابتدائی زمانہ تھا۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے ابتدائی دور میں ایمان لانے والوں کو ''السابقون الاولون'' کہا جاتا ہے۔ ان سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جنت کا وعدہ کیا ہے۔ حضرت ابوعبیدہ بھی اس بشارت کے مصداق ہیں۔

جب مکہ مکرمہ میں حضور ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں پر سختیاں اور تکالیف حد سے بڑھ

لئیں توآپؐ نے انہیں حبشہ کی طرف ہجرت کی اجازت دی ‘چنانچہ حضرت ابوعبیدہ بھی ٦ نبوی میں مسلمانوں کے ایک قافلے کے ساتھ حبشہ ہجرت کر گئے اور کئی سال تک حبشہ میں رہے۔ واپس مکہ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو یثرب ہجرت کرنے کی تلقین فرمائی۔ یہ پرانا تاریخی قصبہ مکہ سے ۴۲۱ کلو میٹر دور تھا اور وہاں کے بہت سے باشندے اسلام قبول کر چکے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ بھی مکہ سے ہجرت کر گئے اور اپنے ماں باپ کو مکہ میں ہی چھوڑ گئے۔

دوسرے نوجوانوں کی طرح حضرت ابوعبیدہؓ نے بھی عسکری فنون‘ گھڑ سواری‘ نیزہ بازی‘ تیراندازی اور تلوار چلانا سیکھ لیے اور روزی کمانے کے لیے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ مدینہ میں جب رسول اللہ ﷺ نے اہل مدینہ کے ساتھ مہاجرین کی اخوت کا رشتہ قائم کیا تو حضرت ابوعبیدہ کو ابوطلحہ ( رضی اللہ عنہما)کا بھائی قرار دیا ۔ ابوطلحہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے سوتیلے باپ تھے۔

حضرت ابوعبیدہؓ بڑے جوشیلے اور بہادر تھے۔ جہاد میں شریک ہونا انہیں مرغوب تھا۔ پھر فی سبیل اللہ مال بھی کشادہ دلی کے ساتھ خرچ کرتے۔ آپؓ نے اسلام کی اشاعت میں خوب کام کیا۔ ہجرت کے دوسرے سال رمضان کے مہینے میں جنگ بدر پیش آئی۔کافر تعداد میں ایک ہزار اور خوب مسلح تھے‘ مگر مسلمان صرف ۳۱۳ تھے۔ وہ بھی تمام مسلح نہ تھے۔ یہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان پہلی جنگ تھی۔ مسلمان اس جوش اور جذبے کے ساتھ اسلام کی حمایت میں لڑے کہ کثیر التعداد کفار کے لشکر کو شکست دی ‘ستر کافروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور ستر قیدی بنا لیے۔ حضرت ابوعبیدہ کا باپ عبد اللہ کفار کے لشکر میں شامل تھا اور ابوعبیدہ لشکر اسلام کی طرف سے لڑ رہے تھے۔ اس لڑائی میں ابوعبیدہ کے ہاتھوں ان کا باپ عبد اللہ مارا گیا۔ ایسے فدائین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے جو دین اسلام کی خاطر اپنے والدین اور بھائی بندوں کو چھوڑ دیں ۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

{لَا تَجِدُ قَوۡمًا يُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ يُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ وَ لَوۡ كَانُوۡۤا اٰبَآءَهُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَهُمۡ اَوۡ اِخۡوَانَهُمۡ اَوۡ عَشِيۡرَتَهُمۡ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡاِيۡمَانَ وَ اَيَّدَهُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡهُ ؕ وَ يُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ رَضِىَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡهُ ؕ}(المجادلہ:۲۲)

’’جو لوگ قیامت کے دن پر ایمان لائے ان کو تم ایسا نہ پاؤ گے کہ وہ اللہ اور اس کے



رسول کے مخالفوں سے محبت رکھتے ہوں‘ اگرچہ وہ ان کے باپ ‘ بیٹے اور بھائی بند (خاندان کے لوگ) ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کے اندر اللہ نے ایمان پختہ کر دیا ہے اور ان کو اپنی رحمت سے مدد دی ہے۔

وہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے دامن میں نہریں بہتی ہیں ‘وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہو گا اور وہ اللہ سے راضی ہوں گے۔ ‘‘

اسلام قبول کر کے مسلمانوں میں شامل ہونے والوں کے درمیان صرف ایک رشتہ ہے‘ جو اسلام ہے ۔والدین اور بھائی بند مسلمان ہیں تو ٹھیک ہے‘ورنہ وہ دشمن اسلام ہیں۔ اُن کے ساتھ کسی مسلمان کا کوئی رشتہ نہیں۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو قتل کیا۔ حضرت علی ‘ حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ بن الحارث رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عتبہ ‘ شیبہ اور ولید بن عقبہ کو قتل کیا جو ان کے قریبی رشتہ دار تھے۔

یہ ممتاز صحابی بلند یا یہ جرنیل اور عظیم منتظم ۵۸ سال کی عمر میں بستر علالت پر فوت ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے ان کے کفن دفن کا انتظام کیا۔ نماز جنازہ پڑھائی اور ایک پر تاثیر خطبہ دیا ‘جس میں حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان کی۔

حضرت ابوعبیدہ اس درجہ منتظم تھے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے پہلے فرمایا: ’’کاش ! ابو عبیدہ آج زندہ ہوتے تو خلافت کے لیے میں ان کا نام تجویز کرتا(یعنی میرے بعد انہیں خلیفہ بنایا جائے) قیامت کے دن مجھ سے اس کے بارے میں سوال ہوتا تو میں عرض کرتا اے اللہ میں نے تیرے نبی ﷺ کو اس شخص کے بارے میں یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ اس امت کا امین ہے‘‘۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَمِیْنًا وَاِنَّ اَمِیْنَنَا اَیَّتُھَا الْاُمَّۃُ اَبُوْعُبَیْدَۃُ بْنُ الْجَرَّاح)) (متفق علیہ)’’یقینا ہر امت کے لیے ایک امین ہوتا ہے اور اے میری امت ! ہمارے امین ابوعبیدہ بن الجراح ہیں۔‘‘

امین وہ شخص ہوتا ہے کہ اپنے اوپر عائد تمام ذمہ داریوں کو بہترین انداز میں انجام دے‘ خواہ وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد۔

عہد رسالت میں آپ ؓبدر‘ احد اور خندق کی جنگوں کے علاوہ دوسرے کئی غزوات میں شامل تھے۔ رسول اللہ ﷺ ۶ ہجری ماہ ذوالقعدۃ میں عمرے کے ارادے سے مکہ کی طرف روانہ



ہوئے۔ آپ ﷺ کے ساتھ تقریباً ۱۴۰۰ صحابہ تھے۔ آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ کافروں نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ سنا تو آپ ﷺ نے مکہ سے چند میل کے فاصلے پر حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ وہاں سے کافروں کو پیغام بھیجا کہ ہم لڑنے نہیں آئے بلکہ عمرہ کر کے واپس چلے جائیں گے‘ ہمیں شہر میں داخل ہونے سے نہ روکا جائے‘ مگر وہ نہ مانے۔ آپ ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا تاکہ وہ قریش کو یقین دلائیں کہ مسلمان صرف عمرہ کے لیے آئے ہیں‘ مگر یہ سفارت بھی ناکام رہی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ دیر

تک واپس نہ آئے۔ مسلمانوں میں مشہور ہو گیا کہ کفار نے انہیں شہید کر دیا ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھ آنے والے تمام مسلمانوں سے اس بات پر درخت کے نیچے بیعت لی کہ وہ حضرت عثمان ؓ کے خون کا بدلہ لینے کے لیے آخری دم تک لڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کا یہ جذبہ بہت پسند آیا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:{لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْیُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ}(الفتح:۱۸)''بلاشبہ اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا ان مومنوں سے جب انہوں نے آپؐ سے درخت کے نیچے بیعت لی۔ ''اس بیعت کو بیعت رضوان کہتے ہیں ،کیونکہ اس میں شامل تمام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی سند مل گئی۔ اس بیعت میں حضرت ابوعبیدہ ؓ بھی شامل تھے۔ جب ۱۵ھ میں رسول اللہ ﷺ ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو ساتھ لے کر حج کے لیے مکہ گئے تو حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ بھی حجۃ الوداع میں آپ ؐ کے ساتھ تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ حضرت ابوعبیدہ ؓ بھی غم سے نڈھال ہو گئے، لیکن انہوں نے بڑے صبر اور حوصلے سے کام لیا اور کوشش کی کہ تمام مہاجرین اور انصار مل کر رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ چن لیں۔ کافی آراء کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رائے دی کہ یہاں عمر اور ابوعبیدہ( رضی اللہ عنہما) موجود ہیں ،تم ان دونوں میں سے کسی کو اپنا امیر چن لو۔ اس پر حضرت عمر ؓ اور حضرت ابوعبیدہ ؓ نے فرمایا کہ آپ کے ہوتے ہوئے ہم خلافت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ پھر دونوں نے بڑھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی۔ اس کے بعد سب مسلمانوں نے بھی بیعت کر لی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے پہلے خلیفہ بن گئے۔

حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے جہادی مہموں میں خوب حصہ لیا اور کامیابیاں حاصل کیں۔ تمام صحابہ کرام ؓ حضرت ابوعبیدہ ؓ کی بہت عزت



کرتے تھے ،کیونکہ اُن کو رسول اللہ ﷺ کا تقرب حاصل تھا۔ آپؐ کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ بے انتہا محبت تھی۔ اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ بھی ان کو بہت عزیز جانتے تھے اور ان پر شفقت فرماتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن شفیق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ نبی اکرم ﷺ کے نزدیک صحابہ میں سب سے زیادہ محبوب کون تھا؟ حضرت عائشہ نے فرمایا :ابوبکر ؓ۔ میں نے پوچھا پھر کون؟ فرمایا :عمر ؓ۔ میں نے پھر پوچھا پھر کون؟ فرمایا ابوعبیدہ بن جراح ؓ۔ میں نے چوتھی دفعہ پوچھا پھر کون؟ اس پر وہ خاموش ہو گئیں۔ (ترمذی)

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کا شمار ممتاز صحابہ میں ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تربیت

نے ان کی فطری صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ آپ کی پوری زندگی سادگی ‘زہد وتقویٰ‘ شجاعت‘ رحم دلی اور سخاوت کا نمونہ تھی۔

* * *



# سیدنا بلال رضی اللہ عنہ

حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے مشہور صحابیؓ ہیں۔ غلاموں میں آپ سب سے پہلے ایمان لائے۔ چونکہ آنحضرت ﷺ کی تبلیغ پر لبیک کہنا اُس وقت آسان بات نہ تھی‘ اس لیے آغازِ اسلام میں جس قدر تکالیف حضرت بلالؓ نے برداشت کیں‘ کسی دوسرے نے نہ کیں۔ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ پر دل و جان سے فدا تھے۔ اُن کا آقا اُن کو بری طرح پیٹتا‘ تپتی ریت پر لٹا دیتا‘ لہولہان کر دیتا‘ لڑکوں کے سپرد کر دیتا جو انہیں گلی کوچوں میں گھسیٹتے پھرتے۔ غرض جتنی تکلیف ممکن ہو سکتی‘ پہنچاتا۔ مگر حضرت بلال رضی اللہ عنہ بڑی جواں مردی کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتے اور حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ لاتے۔ ایک دفعہ وہ اَحد اَحد پکار رہے تھے اور کفار انہیں پیٹ رہے تھے کہ ادھر سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ زور زور سے نہ کہو‘ دل ہی دل میں اللہ کا نام لے لو۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے‘ مگر پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا تو بلال رضی اللہ عنہ اَحد اَحد پکار رہے تھے۔ آپؓ نے پوچھا: خاموشی سے ذکر کیوں نہیں کرتے؟ بلالؓ کہنے لگے کہ خاموشی سے ذکر کر کے دیکھا ہے‘ لذت نہیں آتی۔ پکار کر ذکر کرتا ہوں تو اس قدر لطف آتا ہے کہ بے خودی کی کیفیت میں کفار کی مار پیٹ کا بھی احساس نہیں رہتا۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا آبائی وطن حبشہ تھا‘ اس لیے وہ بلالِ حبشیؓ کے نام سے مشہور ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا ہے کہ (دین کے معاملہ میں) سبقت لے جانے والے چار ہیں۔ میں عرب میں سے سبقت کرنے والا ہوں صہیبؓ روم سے‘ سلمانؓ فارس سے اور بلالؓ حبشہ سے۔ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ عرب میں اجنبی تھے۔ جب ان کو مار پڑتی تو کوئی ان کی سفارش کرنے والا نہ ہوتا‘ اور نہ ہی

لفار کو اُن کے خویش و اقارب کی طرف سے کوئی خوف ہوتا۔ چنانچہ اُمیہ بن خلف نامراد خوب جی بھر کر انہیں ستاتا۔ ایک دن اُمیہ بن خلف اور اس کے ساتھی



حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مارپیٹ رہے تھے کہ اس طرف سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گزر ہوا۔ آپؓ نے اُمیہ بن خلف کو ملامت کی۔ اُس نے کہا: تو نے ہی اسے بگاڑا ہے' اب تو ہی اسے چھڑا لے۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں میں چھڑا لوں گا۔ میرے پاس ایک سیاہ فام غلام ہے جو بلالؓ سے زیادہ طاقتور اور تیرے دین پر پختہ ہے' اُسے ان کے بدلے میں دے دوں گا۔ اُمیہ بن خلف نے منظور کر لیا۔ پس صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنے غلام کے بدلے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خرید کر آزاد کر دیا' اور اس طرح صدیق رسول ﷺ کی بدولت اس عاشقِ رسولؐ' کو مستقل عقوبت سے نجات ملی۔ چونکہ وہ اسلام کی خاطر تکالیف برداشت کرنے میں منفرد تھے' اس لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی انہیں منفرد مقام حاصل ہوا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (معراج کے موقع پر) میں جنت میں داخل ہوا تو میں نے اپنے آگے کسی کے قدموں کی آہٹ سنی۔ میں نے جبریل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ بلالؓ ہیں۔ جب بلال رضی اللہ عنہ اس واقعہ کو یاد کرتے تو خوشی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

جب مشرکین مکہ نے مسلمانوں کا وہاں رہنا مشکل کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مدینہ ہجرت کر جانے کی اجازت دی۔ چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ چند دوسرے صحابہؓ کے ساتھ شروع میں ہی مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ بعد ازاں رسول اللہ ﷺ بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی معیت میں وہاں آ گئے۔ جب آپ ﷺ نے انصار اور مہاجرین میں مواخات قائم فرمائی تو حضرت بلالؓ مہاجر کو عبیدہ بن الحارث انصاریؓ کا بھائی بنایا۔

قریش مکہ نے مدینہ منورہ میں بھی مسلمانوں کو چین نہ لینے دیا۔ چنانچہ ہجرت کے اگلے ہی سال غزوۂ بدر کا معرکہ ہوا۔ دیگر جاں نثار صحابہ کرامؓ کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا اور خوب دادِ شجاعت دی۔ یہاں تک کہ بدبخت اُمیہ بن خلف کو قتل کیا۔ خدا کی شان دیکھئے' ایک دن وہ تھا کہ بلالؓ بے یارومددگار' اُمیہ کے ہاتھوں پٹتا تھا۔ لیکن آج اسی بلالؓ کی تلوار سے اُمیہ قتل ہو رہا ہے۔ ہر دور کے شوریدہ سر' سرکش' ظالم اور متکبر لوگوں کے لیے اُمیہ کا قتل عبرتناک واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲ھ میں نماز باجماعت کا اعلان کرنے کے لیے اذان مقرر ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے پر مامور کیا۔ اس طرح حضرت بلالؓ جن کو پکار پکار کر اَحد اَحد کہنے کا شوق تھا' کی تمنا پوری ہوئی اور وہ سید المؤذنین اور مؤذنِ رسولؐ بنے۔ یہ وہ اعزاز تھا کہ جس کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حسرت کے ساتھ کہا کرتے تھے: ''میں پچھتاتا ہوں کہ کاش رسول اللہ ﷺ سے کہہ کر حسنؓ و حسینؓ 'کو مؤذن کرا دیتا!''

حضرت بلال رضی اللہ عنہ سفر اور حضر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہتے تھے۔ اور نماز کا وقت آنے پر اذان دیتے تھے۔ یہاں تک کہ سفر میں جہاں بلال رضی اللہ عنہ اذان دیتے وہاں کے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے آنے کی اطلاع مل جاتی۔ یہ جو مشہور ہے کہ بلال رضی اللہ عنہ اذان میں ش کی بجائے س بولتے تھے بالکل غلط ہے۔ حضور ﷺ کے ارشاد پر اذان کے وقت حضرت بلالؓ اپنی شہادت کی انگلیاں کانوں میں دے لیا کرتے تاکہ آواز زیادہ بلند ہو۔

اذان کے علاوہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ' رسول اللہ ﷺ کے حکم سے بعض اعلان بھی کیا کرتے تھے' مثلاً جہاد میں جانے کے لیے' مالِ غنیمت اکٹھا کرنے کے لیے وغیرہ۔ جنگ حنین میں آنحضرت ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ کھڑے ہو کر اعلان کردیں: ''جنت میں مؤمن کے سوا کوئی داخل نہ ہو گا اور بلاشبہ اس دین کی تائید اللہ تعالیٰ بدکار آدمی کے ذریعہ بھی کریں گے!''

حضرت بلال رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے خزانچی بھی تھے۔ اگر کوئی ضرورت مند آکر سوال کرتا تو آپؐ بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیتے کہ اس کی ضرورت پوری کریں۔ چنانچہ وہ حکم کی تعمیل کرتے' خواہ قرض ہی لینا پڑے۔ ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کچھ کھجوریں اکٹھی کر لیں تاکہ آنحضرت ﷺ کے مہمانوں کے کام آئیں۔ حضور ﷺ کو معلوم ہوا تو فرمایا: ''اے بلال! خرچ کیے جاؤ اور عرش والے کی طرف سے کم ہو جانے کا خوف مت کرو!'' مال کے جمع کرنے سے آپ ﷺ سخت پرہیز کرتے تھے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً اس ضمن میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ہدایات دیتے رہتے۔ ایک دفعہ کچھ مال مسجد نبوی میں جمع ہو گیا اور سارا دن تقسیم کرنے کے باوجود بچ رہا۔ آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو بلالؓ سے وجہ پوچھی۔ انہوں نے کہا کہ کوئی اور سائل نہ آیا اور مال پڑا رہا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں مال کی موجودگی میں گھر نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ رات مسجد میں بسر کی۔ اگلے دن جب بلال رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ تمام مال تقسیم ہو چکا ہے تو پھر آپ ﷺ 'گھر تشریف لے گئے۔ ایک دفعہ حضرت بلالؓ سے فرمایا: ''اے بلالؓ! تنگ دست



ہو کر مرنا اور مالدار ہو کر مت مرنا!''

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو نبی مکرم ﷺ سے حد درجہ محبت تھی۔ اس لیے آپؐ 'کی ہر ادا ان کو

بھاتی تھی۔ آنحضرت ﷺ کئی کئی دن تک بھوک اور پیاس برداشت کرتے۔ چنانچہ بلال رضی اللہ عنہ بھی فاقے سے رہتے۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر تیس دن رات ایسے گزرے ہیں کہ میرے اور بلالؓ کے کھانے کے لیے جاندار کی خوراک میں سے صرف اتنی چیز تھی جو بلالؓ کی بغل میں چھپی ہوئی تھی۔

ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ بارگاہِ نبوت میں صبح کے وقت حاضر ہوئے۔ آنحضرت ﷺ کھانا نوش فرما رہے تھے۔ آپؐ نے بلال رضی اللہ عنہ کو کھانے میں شریک ہونے کو کہا۔ انہوں نے جواب دیا: اللہ کے رسول! میرا روزہ ہے۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہم اپنا رزق کھا رہے ہیں اور بلال کا رزق جنت میں محفوظ ہے!'' پھر آپ ﷺ نے بلال سے فرمایا: ''بلالؓ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ روزہ دار کی ہڈیاں تسبیح میں مشغول رہتی ہیں اور اس کے لیے فرشتے استغفار کرتے ہیں، جب تک اُس کے پاس کھایا جاتا رہے۔''

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، حضرت بلال رضی اللہ عنہ سفر اور حضر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ آپؐ کے ہر قول و فعل کو غور سے دیکھتے تھے اور اس کی پیروی کرتے تھے۔ تمام غزوات میں وہ آپ کے ساتھ رہے۔ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ حضرت بلالؓ کے اس امتیاز پر رشک کرتے تھے۔ ایک دفعہ عید کی نماز کے موقع پر آپ ﷺ خطبہ ارشاد کرنے کھڑے ہوئے تو حضرت بلالؓ کو اپنے برابر کھڑا کر لیا اور ان کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بارگاہِ رسالت میں کس قدر قرب حاصل تھا۔

ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اعلیٰ قسم کی کھجوریں لے کر آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا: یہ کہاں سے آئی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میرے پاس خراب کھجوریں تھیں، میں نے اُن کے دو صاع کے بدلے میں یہ اچھی کھجوریں ایک صاع لے لی ہیں۔ یہ سنتے ہی آپ ﷺ نے فرمایا: اُف، یہ تو سراسر سود ہے، ایسا نہ کیا کرو۔ اس کی صورت یہ ہے کہ خراب کھجوروں کو کسی اور دوسری چیز کے بدلے بیچ دو۔ پھر جو چیز تم نے اپنی کھجوروں کی قیمت میں لی ہے اُس کو قیمت میں دے کر وہ اچھی کھجوریں خرید لو۔''



رسول اللہ ﷺ کی وفات ہو گئی تو بلالؓ کے لیے مدینہ میں رہنا محال ہو گیا۔ انہوں نے عمر کا باقی حصہ جہاد فی سبیل اللہ میں بسر کرنے کا ارادہ کر لیا اور ملک شام چلے گئے۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے زمانۂ خلافت میں ملک شام گئے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی۔ امیر المومنینؓ کی فرمائش پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان پڑھی۔ کہتے ہیں کہ اُس دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ زمانۂ نبویؐ کو یاد کر کے بہت روئے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ملک شام میں شادی کر لی، مگر آپؓ کی اولاد کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ملک شام میں سکونت اختیار کیے کافی عرصہ گزر گیا، تو ایک بار انہیں خواب میں رسول

اللہ ﷺ کی زیارت ہوئی اور آپؐ نے فرمایا :بلال ! یہ کیا بے وفائی ہے' کیا وہ وقت نہیں آیا کہ ہمارے پاس آئو؟ خواب سے بیدا رہوئے تو مدینہ کی طرف چل پڑے۔ قبر مبارک پر حاضر ہوئے اور جذبات پر قابو نہ پا سکے۔ اتنے میں سبطین رسولؐ (حسن اور حسین رضی اللہ عنہما) وہاں آ گئے۔ ان کو دیکھ کر ان کے ساتھ پیار و محبت کیا۔ بعد ازاں انہوں نے اذان کی فرمائش کی۔ جب بلالؓ نے فجر کے وقت اذان دی تو مدینہ میں کہرام مچ گیا۔ لوگوں نے بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سنی تو انہیں عہد نبویؐ یاد آگیا اور وہ اس قدر روئے کہ پہلے کبھی اتنا نہ روئے تھے۔

اسلام کا سچا فرزند اور رسول اللہ ﷺ کا عاشق صادق دِمشق میں ۲۰ ھ میں فوت ہو گیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر ٦٣ برس تھی۔ حضرت بلالؓ رسول اللہ ﷺ کے مؤذن اور خازن تھے۔ وہ آپؐ کے سفر اور حضر کے ساتھی اور جنگ و امن میں رفیق تھے۔ انہوں نے اسلام کی خاطر سخت سے سخت تکالیف برداشت کیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ' حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو سیدنا بلال کہہ کر پکارتے تھے !

* * *



# کھانے پینے کے آداب

اسلام چند مخصوص عبادات کا نام نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ اس میں ایک مسلمان کے لیے زندگی گزارنے کا بہترین انداز بتایا گیا ہے۔ یہ انداز جامع طو رپر واضح کرنے کے لیے ضابطہ حیات قرآن مجید کی صورت میں حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا گیا اور اس کے متن کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی۔ چنانچہ نزول کے وقت سے لے کر آج تک یہ اپنی اصلی حالت میں موجود ہے ۔ مزید برآں رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو اُسوۂ حسنہ بنایا گیا۔ اب کسی شخص کے لیے اندازِ زندگی اختیار کرنے میں کوئی مشکل نہیں 'یعنی جو اندازِ زندگی آپ ﷺ نے اپنایا ہے یا اپنانے کا حکم دیا ہے وہ معیاری' پسندیدہ اور قابل قبول ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جہاں بڑے بڑے اصول بتائے ہیں' وہاں زندگی میں پیش آنے والی ہر صورت حال میں عملی نمونہ پیش کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے جامع انداز میں حقوق اللہ اور حقوق العباد واضح کیے

ہیں۔ یہی نہیں' بلکہ پانچ بنائے اسلام کی اہمیت کے علاوہ لباس' خوراک' خوشگوار گھریلو زندگی' اخوت' لین دین' گفتگو' نشست و برخاست' فضائل ِاعمال' رذائل ِاخلاق اور صلح و جنگ کے اصولوں کا بھی عملی نمونہ پیش کر دیا ہے۔ آپ ﷺ کے پیش کردہ طریقوں میں سے یہاں کھانے پینے کے آداب کا تذکرہ مطلوب ہے۔

کھاناپیناہر شخص کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں اسلامی تعلیم یہ ہے کہ بھوک کے بغیر کھانا نہ کھایا جائے اور ابھی اشتہا باقی ہو تو کھانا چھوڑ دیا جائے۔یہ وہ اصول ہے کہ کسی کو اس میں اختلاف نہیں' بلکہ سب لوگ اس کے اچھے نتائج کے معترف ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ابن آدم کے لیے چند لقمے ہی کافی ہیں جن سے اس کی کمر سیدھی رہے۔ اگر زیادہ ہی ضروری ہو تو پھر تہائی پیٹ کھانا کھانا چاہیے۔ تہائی حصہ پانی کے لیے اور تہائی حصہ سانس لینے کے لیے ہے ۔''(مسند احمد) صاحب ِعلم دانا لوگوں کا کہنا ہے کہ صحت کے لیے تین چیزیں بہت مفید ہیں: کم بولنا' کم کھانا اور کم سونا۔

---



چھری کانٹے کی بجائے ہاتھ سے کھانا افضل ہے۔ ظاہر ہے کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے ہاتھوں کو اچھی طرح دھو لینا چاہیے تاکہ آدمی اطمینان اور نظافت کے ساتھ کھانا کھائے۔ سیدنا سلمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے تورات میں پڑھا تھا کہ کھانے کی برکت یہ ہے کہ اس سے پہلے وضوکیا جائے ۔ میں نے اس کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ سے کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''کھانے کی برکت اس میں ہے کہ کھانے سے پہلے بھی اور کھانے کے بعد بھی وضو کر لے۔ یعنی ہاتھ دھوئے اور کلی کرے۔'' (سنن ابی دائود)

اسلام کی عام تعلیم ہے کہ ہر جائز کام کے آغاز میں بسم اللہ پڑھ لی جائے۔ چنانچہ کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھ لی جائے تاکہ کھانا مسنون انداز سے شروع کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو اللہ کا ذکر کرے' یعنی بسم اللہ پڑھے۔ پس اگر شروع میں اللہ کا ذکر بھول جائے تو جب یاد آئے تو اس طرح کہے بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَاٰخِرَہٗ ۔'' (صحیح مسلم)

دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر فضیلت حاصل ہے۔ تمام ستھرے کام دائیں ہاتھ سے کرنے چاہئیں۔ اسی طرح کھانا بھی دائیں ہاتھ سے کھانا چاہیے۔ کھانے کی پلیٹ میں ادھر ادھر انگلیاں گھمانا بھی شائستگی کے خلاف ہے۔ سیدنا عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں بچہ تھا اور رسول اللہ ﷺ کے ہاں رہتا تھا۔ (کھاتے وقت) میرا ہاتھ پلیٹ میں ہر طرف پڑتا تھا ۔ (یہ دیکھ کر) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے لڑکے ! اللہ کا نام لے (یعنی بسم اللہ پڑھ)' اپنے دائیں ہاتھ سے کھا 'اور وہ چیز کھا جو تیرے قریب ہے۔'' (صحیح مسلم)

کھانا کھاتے وقت تکیہ وغیرہ کے ساتھ ٹیک بھی نہ لگائی جائے' بلکہ مستعد بیٹھ کر کھانا کھایا جائے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ '' میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔'' (سنن دارمی) اسی طرح چلتے پھرتے کھانے پینے کی ممانعت

ہے اور کھڑے ہو کر پانی پینا یا کھانا کھانا بھی مناسب نہیں۔ کھڑے ہو کر کھانا چوپایوں کا طریقہ ہے۔یہ جہاں اخلاق کے منافی ہے' وہاں کھانے کے احترام کے خلاف بھی ہے۔ نیز اس طرح کھایا ہوا کھانا صحت کے لیے مضر ہے۔

کھانا کھاتے وقت لقمہ گر جائے تو اٹھا کر کھا لینا چاہیے 'کیونکہ کھانے کو ضائع کرنا اچھا نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میںسے کسی کا لقمہ نیچے گر جائے تو اٹھا کر صاف کر کے کھا



لے اور اس لقمے کو شیطان کے لیے نہ چھوڑے' اور اپنے ہاتھ (تولیے یا رومال سے) صاف نہ کرے جب تک کہ اپنی انگلیاں چاٹ نہ لے 'کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ برکت کھانے کے کس حصے میں ہے۔''

اسلامی تعلیمات میں اجتماعیت کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ کھانا کھاتے وقت بھی اگر چند لوگ ہوں تو انہیں مل کر کھانا کھانا چاہیے۔ اس طرح کھانے میں برکت ہوتی ہے اور تھوڑے لوگوں کا کھانا زیادہ لوگوں کو کافی ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے کچھ صحابہ نے کہا: یارسول اللہ ﷺ ہم کھانا کھاتے ہیں لیکن سیر نہیں ہوتے۔ آپؐ نے فرمایا: ''شاید تم الگ الگ کھاتے ہو۔ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مل کر کھانا کھایا کرو اور کھانے کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا کرو (بسم اللہ پڑھا کرو) اللہ تعالیٰ تمہارے کھانے میں برکت ڈال دے گا۔'' (سنن ابی دائود)

بعض لوگ کوئی گرم مشروب یا پانی وغیرہ پئیں تو اس کی حدت دور کرنے کے لیے اس میں منہ سے پھونکیں مارتے ہیں۔ یہ بات تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے او رطبی نقطہ نظر سے بھی مضر ہے۔ زیادہ گرم کھانا صحت کے لیے مفید نہیں۔ اگر طعام یا مشروب گرم ہو تو منہ سے پھونکیں مارنے کی بجائے تھوڑی دیر انتظار کرنا چاہیے تاکہ کھانے کی حرارت کم ہو جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی پانی پیے تو برتن میں سانس نہ لے (اور نہ ہی پھونکیں مارے)۔'' (صحیح بخاری) آپ ﷺ کے پاس گرم کھانا لایا جاتا تو آپ اس کو اس وقت تک ڈھانپ کر رکھتے جب تک اس کا جوش ختم نہ ہو جاتا۔ (دارمی)

جب چند آدمی اکٹھے ہوںاور کھانے پینے کی کوئی چیز پیش کی جائے تو یہ آداب کے خلاف ہے کہ وہ چیز وصول کرنے والا شخص پہلے خود کھائے اور بعد ازاں دوسروں کو دے۔ مناسب یہ ہے کہ تقسیم کرنے والا پہلے دوسروں کو دے اور سب سے آخر میں خود لے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ'' لوگوں کو پلانے والا خود سب سے آخر میں پیے۔'' (صحیح بخاری)

کسی دعوت وغیرہ میں کھانا کھانے کا اتفاق ہو اور سب لوگ کھانا کھانے لگیں تو جو شخص کھانا کھا چکے وہ دستر خوان سے اٹھ کر نہ جائے۔ یہ بڑا اہم نکتہ ہے کہ اس طرح دوسرے لوگ شرمندگی محسوس کریں گے کہ لوگ تو اٹھ کر جا رہے ہیں اور ہم ابھی تک کھا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے

اس احساس سے وہ فراغت سے پہلے ہی اٹھ جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب دسترخوان لگ جائے (اور کھانا شروع ہو جائے) تو کوئی شخص اپنا ہاتھ نہ روکے اگرچہ سیر بھی ہو چکے (انتظار کرے) یہاں تک کہ سب لوگ فارغ ہوجائیں۔ اگر ضروری ہو تو عذر کر دے تاکہ اس طرح اس کے ساتھی کھاتے رہیں۔ ورنہ دوسرے اس کی وجہ سے شرمندہ ہو کر اپنے ہاتھ روک لیں گے ' حالانکہ انہیں مزید کھانے کی حاجت ہو گی۔ ''(سنن ابن ماجہ)

کھانا کھانے کے بعد انگلیوں کو چاٹ لینا چاہیے اور برتن بھی صاف کرنا چاہیے ۔ نظافت کا یہی تقاضا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کھانے کے بعد انگلیوں کو چاٹ لیا جائے اور برتن صاف کر لیا جائے۔ تم کو معلوم نہیں کہ کھانے کے کس ذرہ میں اور کس جزو میں برکت کا خاص اثر ہے۔'' ( صحیح مسلم)

کھانے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اگر کوئی کسی کے ہاں جائے اور وہ کھانا پیش کرے تو بھوک ہوتے ہوئے انکار نہ کرے ' کیونکہ بھوک مٹانا طبعی تقاضا ہے۔ جو شخص بھوک ہوتے ہوئے انکار کرتا ہے اسے ناپسند کیا گیا ہے ۔ حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کھانا لایا گیا ' پھر ہمارے سامنے کھانا لایا گیا ۔ ہم نے عرض کیا ہم کو خواہش نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: '' بھوک اور جھوٹ کو جمع نہ کرو۔'' (ابن ماجہ) حضرت اسمائؓ نے تکلفاً کہہ دیا تھا کہ ہمیں بھوک نہیں ' حالانکہ انہیں کھانے کی طلب تھی۔

جب کوئی شخص کھانا کھا لے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔ رسول اللہ ﷺ جب کھانے سے فارغ ہوتے تو یہ دعا پڑھتے : اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِیْنَ ''کل شکر اور سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں کھلایا پلایا اور ہمیں مسلمان بنایا۔'' (سنن ابی دائود) اگر کسی کے ہاں کھانا کھایا جائے تو اس کے حق میں برکت ' رحمت اور رزق کی کشادگی کی دعا کرنا چاہیے اور کہنا چاہیے : اَللّٰهُمَّ بَارِکْ لَهُمْ فِیْ مَا رَزَقْتَهُمْ وَاغْفِرْلَهُمْ وَارْحَمْهُمْ ''اے اللہ ! اس کے رزق میں برکت دے اور ان کی بخشش فرما اور ان پر رحم کر۔''

* * *



# نکاح کی ضرورت اور اہمیت

اسلام دین فطرت ہے اوراس کی تمام تعلیمات مفید اور متوازن ہیں ۔یہ اس لیے کہ اس کے تمام احکام خود خالق کے بنائے ہوئے ہیں جو انسان کی ضروریات سے خود انسان سے بھی زیادہ واقف ہے۔ جب آدم بُنائے گئے تو ان کے سکون کے لیے ان کی بیوی حوا کو تخلیق کیا گیا۔ اس طرح اس جوڑے سے نسل انسانی کا آغاز ہوا ۔آج کرۂ ارضی پر بسنے والے اربوں لوگ اسی ایک جوڑے کی اولاد ہیں۔

اسلام میں تجرد کی زندگی کو پسند نہیں کیا گیا ۔ اگرچہ بعض دوسرے مذاہب اسے باعث فضیلت قرار دیتے ہیں ،مگر ان معاشروں میں جب رہبانیت اختیار کر کے نکاح سے فرار اختیار کیا گیا تو ایسے بھیانک نتائج برآمد ہوئے کہ انسان اخلاقی اعتبار سے حیوانوں سے بھی نیچے چلا گیا۔ایسا ہونا ضروری بھی ہے ،کیونکہ جب فطرت کے ساتھ ٹکر لی جائے گی تو اس کے نتائج تباہ کن ہی ہوں گے۔فطری تقاضے پورے کرنے کے لیے نکاح ضروری بھی ہے اور پسندیدہ بھی ۔ایک مرد اور عورت نکاح کے بعد میاں بیوی کے رشتے میں منسلک ہو کر ایک خاندان کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اس طرح ایک چھوٹا سا ادارہ وجود میں آجاتا ہے۔ اس ادارے کا نظام چلانے کے لیے مرد کو سربراہ (قوام) بنایا گیا ہے ،کیونکہ ہر چھوٹے یا بڑے ادارے کے لیے ایک سربراہ کا ہونا ضروری ہے۔ سربراہی ایک اعزاز ہے مگر اس کے ساتھ ایک بھاری ذمہ داری بھی ہے۔ مسلمان خاتون گھر کے اندرونی کاموں کو انجام دے گی جبکہ مرد معیشت کی ذمہ داری نبھانے کے لیے گھر سے باہر کام کاج کے لیے جائے گا اور اپنے خاندان کی ضروریات پوری کرے گا۔ اگر میاں بیوی اپنے اپنے فرائض کو ذمہ داری سے اسلامی تعلیمات کے مطابق ادا کریں تو معاشرے کی اس بنیادی اکائی کے افراد نہ صرف خود زندگی کا حقیقی لطف اٹھائیں گے بلکہ پورے معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔

تجرد کی زندگی بے سکونی اور ذہنی انتشار پیدا کر کے انسان کی شخصیت کو توڑ پھوڑ کا شکار کر



دیتی ہے، جبکہ ازدواجی زندگی اگر اسلامی تعلیمات کے مطابق گزاری جائے تو اس میں فائدے ہی فائدے ہیں۔

مرد اور عورت کے درمیان فطری کشش ہے ،لہٰذا ان کا ایک دوسرے سے کٹ کر رہنا فطرت کی مخالفت کرنا ہے اور اس کے نتائج اچھے نہیں نکل سکتے۔ جو مرد یا عورت نکاح کی پابندی کو قبول نہیں کرتے وہ سخت مشکل میں پھنس جاتے ہیں۔ ان کی زندگی میں تلخی اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور وہ طرح طرح کی بداخلاقیوں اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں ،جبکہ نکاح کی پابندیاں اختیار کر کے مرد اور عورت جنسی خرابیوں سے محفوظ ہو جاتے ہیں ۔جب انہیں جسمانی سکون ملتا ہے تو اُن کی روحانی اور اخلاقی حالت بھی خوب تر ہو جاتی ہے۔

نکاح نسل انسانی کی بقا کا ذریعہ ہے۔ موت انسانی زندگی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ ہر شخص جو دنیا میں آتا ہے اسے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ نسل انسانی کے باقی رہنے کے لیے ضروری ہے کہ جانے والے اپنی جگہ

دوسرے انسان چھوڑ جائیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ان نئے آنے والوںکو رہائش اور خوراک کے علاوہ پرورش، تعلیم و تربیت اور شفقت میسر آئے۔ پس ان بچوں کو باپ کی شفقت اور ماں کی مامتا مل جاتی ہے ۔ ماں باپ اپنے بچوں کی پرورش اور نگہداشت کی ذمہ داریاں پوری کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بچوں کی ضروریات پوری کرتے ہوئے ماں باپ کو جو مشقت اٹھانی پڑتی ہے وہ انہیں حقیقی مسرت دیتی ہے۔ وہ پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کے بچے بڑے ہو کر اچھے انسان بنیں، خود بھی نام کمائیں اور ان کے لیے بھی عزت کا باعث بنیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس جوڑے کے ہاں اولاد نہیں ہوتی وہ اولاد کی شدید خواہش رکھتے اور اولاد کی کمی شدت سے محسوس کرتے ہیں، بلکہ بعض اوقات کسی کا بچہ گود لے کر اس کی پرورش کرتے اور فطری ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نکاح مرد اور عورت کی زندگی کی تکمیل کرتا ہے۔ نکاح کے بعد مرد اور عورت پر ذمہ داریوں کا بوجھ پڑتا ہے اور انہیں دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارنے کا سلیقہ آتا ہے۔ اس طرح ان کی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اور وہ معاشرے کا مفید حصہ بنتے ہیں ۔بچوں کی پرورش کے بعد جب ان کی شادیاں کی جاتی ہیں تو رشتہ داریوں میں اضافہ ہوتا ہے اور تعلقات بڑھتے ہیں۔

نکاح کے بعد میاں بیوی اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مصروف ہو جاتے ہیں، ان کے



پاس گزارنے کے لیے فضول وقت نہیں ہوتا۔ فارغ اور تنہا آدمی کے دماغ میں منفی سوچیں جنم لیتی ہیں۔ مشہور ہے کہ بے کار انسان کا دماغ شیطان کا مسکن ہوتا ہے، اُس کی زندگی بے مقصد ہوجاتی ہے، وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بے سہارا اور اکیلا تصور کرتا ہے اور یہ تنہائی عذاب سے کم نہیں ہوتی۔چونکہ اخروی نجات دین اسلام میں منحصر ہے اس لیے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اسلام کی اشاعت میں کردار ادا کرے تاکہ غیر مسلم اسلام قبول کر کے نجات کے امیدوار بن سکیں اور کرۂ ارض پر مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ مسلم آبادی میں اضافے کا بڑا ذریعہ نکاح ہے۔ نکاح کے ساتھ وجود میں آنے والے جوڑے کے ہاں مسلمان بچے پیدا ہوں گے جو مسلم آبادی میں اضافہ کریںگے۔ اگر ماں باپ ان کی تربیت صحیح انداز میں کریںگے تو وہ بڑے ہو کر اچھے مسلمان بنیں گے اور معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔

یہاں ایک سوال رہ جاتا ہے کہ عائلی زندگی میں طرح طرح کے مسائل بھی پیش آتے ہیں۔ اختلافات اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ بدمزگیاں اور تلخیاں جنم لیتی ہیں۔ بعض اوقات یہ خرابیاں بڑے بھیانک نتائج کا سبب بنتی ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ساری خرابیاں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب میاں بیوی دونوں یا دونوں میں سے ایک اپنے فرائض کو ادا کرنے میں کوتاہی کرے۔ اگر مرد اپنے دائرہ کار میں کام کرے اور عورت اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہو جو اسلام نے اس پر ڈالی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ خانگی زندگی میں تلخی پیدا ہو۔ عورت کو چاہیے کہ

خلوص نیت کے ساتھ مرد کی قوامیت (سربراہی) تسلیم کرے ‘اس کی اچھی مشیر بنے‘ اپنے مطالبات شوہر کی آمدنی تک محدود رکھے‘ پردے کی پابندی کرے‘ دینی کتب کا مطالعہ کرتی رہے تاکہ اسے اپنے حقوق اور فرائض سے آگاہی رہے ۔اسی طرح مرد اپنی سربراہی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے عورت پر ظلم و زیادتی نہ کرے۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ’’عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو‘‘۔ جس کے پاس اختیار ہوتا ہے اس کے لیے اعتدال پر رہنا مشکل ہوتا ہے‘ پس مرد اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے عورت کی جائز ضروریات پوری کرنے میں کوتاہی نہ کرے۔ الغرض اگر میاں بیوی اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنے اپنے فرائض انجام دیں اور حدود سے تجاوز نہ کریں تو خانگی زندگی جنت نظیر ہو سکتی ہے۔

* * *



# كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ

یہ الفاظ قرآن مجید میں بتکرار آئے ہیں۔ سورۃ العنکبوت میں ہے:{كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿ ۵۷ ﴾}’’ہر شخص موت کا ذائقہ چکھنے والا ہے۔ پھر تم ہماری طرف ہی لوٹ کر آئو گے‘‘۔ قرآنِ مجید میں بیان کردہ اس حقیقت کا مشاہدہ معمول کی بات ہے۔ ایک کے بعد دوسرا اس جہانِ فانی کو چھوڑ رہا ہے ۔ یعنی اس دنیا سے آنے والی زندگی میں منتقل ہو رہا ہے۔ موت کے بعد دوسری زندگی شروع ہوتی ہے ‘پہلے برزخ اور پھر قیامت۔ قیامت کے دن ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے اور یہ حاضری بامقصد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام کے ذریعے اور آخر میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر قرآن نازل کر کے اچھے اور برے اعمال بتا دیے ہیں۔ اس طرح انسان ہمہ وقت امتحان میں ہے‘ جس کے نتیجے کے طور پر وہ اپنے اچھے برے اعمال کی جزا اور سزا پائے گا۔ اس جزا اور سزا کا ادراک اس دنیا کی زندگی میں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگلی زندگی بے مثال ہو گی۔ وہاں کی کامیابی پر وہ نعمتیں ملیں گی جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا‘ نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی کے خیال میں گزریں۔ اور سزا کے طور پر جہنم میں داخل ہونا پڑے گا جس کی آگ دنیا کی آگ سے ستر گنا تیز ہو گی۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے نعمت عقل سے نوازا ہے جس کے ذریعے وہ اچھے برے کی پہچان کر سکتا

ہے ۔اگر وہ نافرمانی کے کام کرتا ہے تو اسے جان لینا چاہیے کہ اس کا نتیجہ اسے عذاب کی صورت میں ملے گا ‘اور اگر نیکی کے کام کرے گا تو اسے ابدی راحت کی زندگی نصیب ہوگی۔ دنیا کی زندگی میں انسان کو ہمہ وقت چوکنا رہنا چاہیے کہ اس کے اعمال اسے کس طرف لے جا رہے ہیں۔ ابلیس انسان کا دشمن ہے ۔ اس پر اللہ کی لعنت ہے ‘وہ ہر انسان کو سبزباغ دکھاتا ہے‘ نیکیوں سے دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور گناہ کے کاموں پر ڈال دیتا ہے۔ انسان یہ کام خواہش نفس کے تحت کرتا ہے ۔

---



ہر انسان کے اچھے برے اعمال لکھے جا رہے ہیں‘ بلکہ اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ بھی ریکارڈ ہو رہے ہیں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی :{مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡہِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ ﴿۱۸﴾}(قٓ)’’وہ کوئی لفظ بھی نہیں بولتا مگر اُس کے پاس ایک مستعد نگران موجود ہوتا ہے۔‘‘

یہی دستاویز اور ریکارڈ نامہ اعمال کی صورت میں انسان دیکھ لے گا۔ یہ حقیقت بھی قرآن حکیم میں کئی انداز میں بیان ہوئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:{یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ لۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ ۚ} (الحشر:۱۸)’’اے لوگو جو ایمان لائے ہو‘ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ہر شخص اس بات پر نظر رکھے کہ وہ کل یعنی اگلی زندگی کے لیے کیا آگے بھیج رہا ہے !‘‘ معلوم ہوا کہ دنیاوی زندگی میں غفلت کا انجام نرا خسارہ ہے۔ یہ دنیا دارالعمل ہے اور موت کے بعد دار الجزاء ہے۔ یعنی مرنے کے بعد کسی انسان کے پاس تھوڑا سا وقت بھی نہیں ہو گا کہ وہ اپنے ناپسندیدہ اعمال یا منہ سے نکالے ہوئے برے الفاظ کی تلافی کر سکے ‘یا معافی مانگ لے۔ کیونکہ وہ جہان نہ عمل کا ہے اور نہ استغفار کا۔ انسان نے جو کچھ کرنا ہے اس کا مقام دنیاوی زندگی کا وقفہ ہی ہے۔ جب یہ وقفہ ختم ہو گیا تو کسی قسم کی معذرت فائدہ نہ دے گی‘ بس حسرت رہ جائے گی۔ بداعمال کو پچھتاوا ہو گا کہ مہلتِ عمر میں جانتے بوجھتے نافرمانیاں کیوں کیں۔ حسرت تو نیکوں کو بھی ہو گی ‘ہر نیک آدمی اپنے ضائع کردہ وقت پر افسوس کرے گا کہ وہ اور زیادہ نیکیاں کیوں نہ کما کر لایا کہ یہاں زیادہ اچھا انجام پاتا۔

کوئی شخص اپنی موت کا سال مہینہ یا دن نہیں جانتا ‘البتہ یہ جانتا ہے کہ موت کے ساتھ ہی عمل کرنے کا وقت ختم ہو جائے گا ۔ پھر بھی اگر انسان غفلت اور نادانی کے ساتھ اپنے شب و روز گزارتا ہے ‘یعنی نہ وہ حقوق اللہ کی ادائیگی کو سنجیدگی سے لیتا ہے اور نہ حقوق العباد میں کوتاہی کے سنگین نتائج کا احساس کرتا ہے۔ شاید شیطان کے دھوکے میں آکر یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے‘ وہ سب گناہ بخش دے گا۔ شیطان یہ حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے کہ قرآن کریم جابجا نیکی کے کام کرنے اور برے کاموں سے بچنے کا حکم دیتا ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کی زندگی مسلمان کے لیے اللہ تعالیٰ نے اُسوۂ حسنہ بنائی۔ آپؐ کے اعمال و اقوال ہمارے لیے

بہترین نشان راہ ہیں۔
مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے تمام زندگی نماز کی پابندی کی۔ اللہ کے حکم کے مطابق



خود نماز پڑھتے رہے اور اپنے گھر والوں کو نماز کا پابند بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں بار بار اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کا حکم دیا۔ نماز کی بروقت اور باجماعت ادائیگی کے لیے اذان کے ذریعے اعلان کیا جاتا ہے۔ جب اس قدر اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے نماز قائم کرنے کا حکم دیا اور حضور ﷺ اس حکم کی پابندی کرتے رہے تو اب کون شخص ہے جس پر نماز کی اہمیت واضح نہ ہو؟ اگر اس کے باوجود وہ نماز کی ادائیگی سے غافل رہے تو جب محشر میں نماز کا سوال پوچھا جائے گا تو وہ کون سے عذر کا سہارا لے سکے گا؟ جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حساب کے دن پہلا سوال نماز کا ہو گا۔

یہ تو ایک مثال تھی ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:{فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ ﴿ ۷ ﴾ وَ مَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ﴿ ۸ ﴾}(الزلزال)''تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اُسے دیکھ لے گا۔'' یعنی ذرے ذرے کا حساب ہو گا اور جب نامہ ٔاعمال سر محشر رکھ دیا جائے گا تو مجرم لوگ اپنی کتابِ زندگی کے اندراجات سے لرزاں و ترساں ہوں گے اور کہیں گے :{یٰوَیْلَتَنَا مَالِ ہٰذَا الْکِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَۃً وَّ لَا کَبِیْرَۃً اِلَّاۤ اَحْصٰىہَا ۚ وَ وَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ؕ وَ لَا یَظْلِمُ رَبُّکَ اَحَدًا ﴿ ۴۹ ﴾} (الکہف)''ہائے ہماری شامت ! یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ چھوٹی بات کو چھوڑتی ہے نہ بڑی کو مگر اس کو محفوظ کر رکھا ہے ۔ اور وہ پائیں گے جو عمل بھی انہوں نے کیا ہو گا اس کو محفوظ۔ اور آپ کا رب ظلم نہیں کرے گا کسی پر بھی''۔ پھر قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا گیا :{اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿ ۱۱۵ ﴾} (المؤمنون)''کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بے کار پیدا کیا ہے اور یہ کہ تمہیں لوٹ کر نہیں جانا؟''گویا قدم قدم پر انسان کو یہ کہا گیا ہے کہ اسے دنیا میں کیے گئے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اُس وقت وہ اکیلا ہوگا:{وَ کُلُّہُمْ اٰتِیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَرْدًا ﴿ ۹۵ ﴾}(مریم)''اور ہر ایک اس کے سامنے اکیلا اکیلا حاضر ہو گا۔''کوئی اس کا فریاد رس نہ ہو گا۔

قرآنِ مجید میں سب سے زیادہ حوصلہ افزا آیت سورۃ الزمر میں ہے:{قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿ ۵۳ ﴾}''(اے پیغمبر ﷺ ! میری طرف سے لوگوں کو) کہہ دیجیے کہ اے



میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے 'اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا 'اللہ تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے' بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے''۔ لیکن یہ آیت برائیوں کے بعد توبہ کرنے والوں کے لیے بشارت ہے کہ جب بھی برائیوں کے ارتکاب سے توبہ کرکے نیک اعمال اختیار کر لیں گے' رب غفور رحیم ان کی خطاؤں اور

گناہوں کو معاف کر دے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ{فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ } (البقرۃ:۲۸۴)یعنی وہ جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔گویا کسی شخص کی بخشش کا فیصلہ فرمانا یا عذاب کے لائق گرداننا اس کا صوابدیدی اختیار ہے۔ وہ جس کو چاہے بغیر حساب بخش دے ‘کوئی نہ اعتراض کرنے والا ہوگا نہ روکنے والا ۔ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا امیدوار ہر کوئی ہے۔ لیکن ایسا کون سا شخص ہے جو جانتا ہے کہ اس کا نام بھی اس فہرست میں شامل ہے جن کی مغفرت کا فیصلہ ہو چکا ہے؟ غیب کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نیک لوگ جن کی نیک نفسی اور تقویٰ کا ایک عالم معترف ہے وہ بھی مرتے دم تک اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگتے رہے ‘اور اس بات پر مطمئن نہ ہوئے کہ وہ بخش دیے جائیں گے۔ ہاں بخشش کے لیے پرامید رہے۔ اللہ کی رحمت سے ناامید ہونا تو کسی کے لیے درست نہیں۔

خدائے غفور رحیم کے بارے میں شیطان کے دھوکے میں آنا ہرگز مفید نہیں۔ ایک شخص خادم ہے ‘اس کا آقا بہت اچھا ہے اور وہ چھوٹی موٹی کوتاہیوں کا نوٹس نہیں لیتا‘ اگر خادم سے کوئی غلطی ہوجائے یا وہ کچھ نقصان کر دے تو مالک معاف کر دیتا ہے ۔ اگر خادم مالک کے اس فراخ دلانہ رویے کو دیکھتے ہوئے اس کی نافرمانی کرنا شروع کر دے تو یہ غلام کے حق میں نہ جائز ہوگی نہ مفید۔ اللہ تعالیٰ جو خطاؤں اور گناہوں کا بخشنے والا ہے اس کی نافرمانی پر دلیر ہونا کیسے اچھا ہو سکتا ہے؟ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا : حضور ﷺ ! آپ کی اگلی پچھلی خطائیں تو معاف کر دی گئیں (الفتح) پھر آپؐ اللہ کی عبادت میں اس قدر مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ تو آپؐ نے جواب دیا :’’(اللہ کی اس قدر رحمت پر)کیا میں اُس کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟‘‘ ہر انسان پر بے حساب نعمتوں کی بارش ہے۔ پھر کون ایسا ہوگا جسے اظہارِ تشکر کے طور پر اللہ کی فرمانبرداری نہ کرنی چاہیے؟ انسان کے لیے تو لازم ہے کہ وہ ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کا شکرگزار یعنی فرمانبردار رہے اور اپنی کوتاہیوں ‘ غلطیوں اور گناہوں کی معافی چاہتا رہے ۔ قرآنِ مجید میں



ارشاد ہے : {اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکْثَرَہُمْ لَا یَشْکُرُوْنَ ﴿ ۶۰٪ ﴾ } (یونس)’’بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔‘‘

جب موت کے بعد اللہ کے حضور حاضر ہونا اور اپنے اعمال کا جواب دینا حتمی ہے تو بندہ اس حقیقت کو کسی وقت فراموش نہ کرے کہ بداعمالی اس کے لیے سزا کا باعث ہو گی۔ جبکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری نہ صرف اس کی نجات کا باعث بنے گی ‘بلکہ اس کو بے مثال آرام و راحت اور لذتیں ملیں گی ‘جن کی کیفیت بیان کرنا ممکن نہیں اور یہ حد درجہ مثالی زندگی کبھی ختم نہ ہوگی۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پوری فہرست ہر وقت انسان کے سامنے رہنی چاہیے ۔ انتہائی

محتاط زندگی بسر کرنے کے باوجود کوئی انسان گناہ اور خطا سے بچ نہیں سکتا ‘اس لیے حقوق کی ادائیگی میں کوشش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی کمیوں اور کوتاہیوں پر استغفار کرنا ضروری ہے۔ سابقہ زندگی کے گناہوں اور نافرمانیوں سے توبہ کر کے یعنی ان کو ترک کر کے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر لگ جانا چاہیے ‘تاکہ موت کے بعد آنے والی خوشگوار ابدی زندگی ملے۔ حقیقی کامیابی یہی ہے۔

* * *



# مسلم کا سفر آخرت اور زندوں کا طرزِ عمل

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

{كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۭ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿ ۵۷ ﴾} (العنکبوت)

’’ہر شخص کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ پھر تم ہماری طرف ہی لوٹائے جاؤ گے۔‘‘

دنیا میں مختلف اقوام و ملل کے لوگ ہیں جو اپنے طریقے کے مطابق مرنے والے کی لاش کو ٹھکانے لگاتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو اپنے ماں باپ یا کسی دوسرے عزیز رشتہ دار کی میت کو آگ کے الاؤ میں ڈال دیتے ہیں اور پاس کھڑے ہو کر نظارہ کرتے ہیں۔ بعض دوسرے اپنے عزیز کی نعش کو چوبی صندوق میں بند کر کے زمین میں دبا دیتے ہیں وغیرہ۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے اس کی تعلیم اس سلسلہ میں بھی جامعیت کی مظہر ہے۔

جب ایک مسلمان کی زندگی کا خاتمہ نظر آرہا ہو تو پاس موجود لوگ ذرا اونچی آواز میں کلمہ طیبہ پڑھیں تاکہ فوت ہونے والا بھی لا الٰہ الا اللہ کہنے لگے اور وہ جان جان آفریں کے سپرد کر رہا ہو تو اس کی زبان پر یہی الفاظ ہوں ‘تاکہ وہ کلمہ توحید کہتے ہوئے اس جہان سے رخصت ہو۔ جب وہ فوت ہو جائے تو اس کے کفن دفن کی تیاری شروع ہو جاتی ہے ۔ مسلمان کی میت کے احترام کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ مسلمان اپنے فوت ہوجانے والے کو غسل دیتے اور صاف ستھرا کر کے سفید لباس پہناتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :’’جب تم میں سے کوئی اپنے مرنے والے بھائی کو کفن دے تو اچھا کفن دے ‘‘۔(معارف الحدیث بحوالہ مسلم) یہ بھی آپ ﷺ نے ہدایت

فرمائی کہ کفن کا کپڑا زیادہ بیش قیمت نہ ہو ‘کیونکہ وہ جلدی ختم ہو جانے والا ہے۔ یہ صاحب استطاعت کے لیے ہے ‘ورنہ پرانے کپڑے کا بھی کفن دیا جاسکتا ہے۔ پھر اس کی نماز جنازہ پڑھتے ہیں۔ اس موقع پر پسماندگان کو صبر کی تلقین کی گئی ہے اور جزع فزع سے روکا گیا ہے اور اس صدمے کو اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کرنے کو کہا گیا ہے ‘کیونکہ صبر اجر کا باعث ہے اور بے صبری کا مظاہرہ نہ میت کو فائدہ دیتا ہے اور نہ زندوں کو۔



نماز جنازہ کیا ہے ؟ یہ اجتماعی دعا ہے جس میں میت کے لیے اور دوسرے زندہ اور مردہ مسلمانوں کے لیے اللہ رب العزت سے حسن خاتمہ اور مغفرت کی التجا کی جاتی ہے۔ نماز جنازہ فرضِ کفایہ ہے۔اس کی بڑی فضیلت ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ مرنے والے کے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا مانگنا زندوں کی ذمہ داری بھی ہے اور ثواب کا باعث بھی۔ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا :’’جب تم کسی میت کی نماز جنازہ پڑھو تو پورے خلوص کے ساتھ اس کے لیے دعا مانگو۔‘‘ (ابوداؤد‘ ابن ماجہ)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:’’ جو آدمی ایمان کی صفت کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے کسی مسلمان کے جنازے کے ساتھ جائے اور اس وقت تک جنازے کے ساتھ رہے جب تک اس پر نماز پڑھی جائے تو اس کو ایک قیراط ثواب ملے گا اور اگر اس کے دَفن سے فراغت تک ساتھ رہے ہو تو وہ ثواب کے دو قیراط لے کر واپس ہو گا جن میں سے ہر قیراط گویا اُحد پہاڑ کے برابر ہو گا ۔‘‘ (متفق علیہ)

پھر میت کو قبرستان میں لے جایا جاتا ہے۔ حکم ہے کہ میت کو گھر میں زیادہ دیر نہ روکو بلکہ جلدی سے قبرستان لے جائو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :’’جب تمہارا کوئی آدمی انتقال کر جائے تو اس کو دیر تک گھر میں مت روکو اسے قبر تک پہنچانے اور دفن کرنے میں سرعت سے کام لو۔ اور (دفن کے بعد سر کی جانب سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات (مُفْلِحُوْنَ تک) اور پائوں کی جانب اس کی اختتامی آیات (اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے ختم سورۃ تک) پڑھی جائیں‘‘۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان) پھر بڑے احترام کے ساتھ قبر میں اُتارا جاتا ہے۔ اس وقت بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ پڑھتے ہیں‘ یعنی ہم اس بندے کو اللہ کے پاک نام کے ساتھ اور اس کی مدد سے اور اللہ کے رسول ﷺ کے طریقے پر سپردِ خاک کرتے ہیں۔

قبر کے گڑھے کی چھت زمین کی سطح کے برابر رکھی جاتی ہے تاکہ میت پر مٹی نہ گرے۔ قبر زمین سے ایک بالشت سے زیادہ اونچی نہ ہو۔ قبر تیار ہو چکے تو حاضرین میں کا ہر شخص قبر پر تین لپ مٹی ڈالے اور زبان سے کہے {مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿ ۵۵ ﴾} (طٰہٰ)’’ہم نے تمہیں اسی سے تخلیق کیا اور اسی میں ہم تمہیں لوٹاتے ہیں اور اسی سے دوبارہ اٹھائیں گے۔‘‘قبر کو مٹی کے ساتھ بنائیں اور پختہ نہ کریں اور نہ ہی اس پر کوئی

عمارت کھڑی کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا قبر کو پختہ بنانے سے ' یا اس پر عمارت کھڑی کرنے سے یا اس پر بیٹھنے سے۔ (صحیح مسلم)

قبروں کا احترام ضروری ہے۔ ان کی بے حرمتی کی اخلاق بھی اجازت نہیں دیتا اور نہ یہ درست ہے کہ قبروں کو دیر پا رکھا جائے۔ حضرت عمر بن حزمؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے دیکھا کہ میں ایک قبر سے تکیہ لگائے بیٹھا ہوں تو آپؐ نے مجھ سے فرمایا: ''اس قبر والے کو تکلیف نہ دو''۔ (مسند احمد) رسول اللہ ﷺ کا واضح حکم ہے کہ قبروں کو پختہ نہ کیا جائے اور آپؐ کے عمل سے بھی یہی واضح ہے۔ آپؐ کے سامنے آپؐ کی بیٹیاں اور بیٹے فوت ہوئے ' کئی صحابہ کرامؓ شہید ہوئے ' کئی فوت ہوئے ' ان کو قبروں میں ڈالا گیا ' مگر آپؐ نے کسی کی قبر کو پختہ نہ کیا اور نہ ہی ان پر کوئی عمارت کھڑی کی۔ اس حکم اور عمل کی خلاف ورزی قرونِ اولیٰ میں نہ ہوئی۔ کچی قبر کچھ عرصے بعد معدوم ہو جاتی ہے اور پختہ قبر یا جس قبر پر عمارت بنا دی جائے وہ سالہا سال تک قائم رہتی ہے اور شرک پسند طبیعتیں اس کو پرستش گاہ بنا لیتی ہیں۔ جن صحابہ یا تابعین یا اولیاء اُمت کی قبریں شریعت کے اس حکم کے مطابق بالکل سادہ اور کچی ہیں ' وہاں کوئی خرافات اور بے ہودہ کام نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس جن بزرگوں کے مزار پختہ اور شاندار بنے ہوئے ہیں وہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ نظر آتا ہے۔ اکثر مزاروں پر نشے کا کاروبار ہوتا ہے اور مصروف اور کاروباری زندگی سے راہِ فرار اختیار کرنے والے لوگ وہاں فضول بیٹھے رہتے ہیں ۔ ضعیف الاعتقاد لوگ وہاں چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور وہاں کے مجاور اس مال کو اڑاتے ہیں۔ ان مزاروں پر عرس کے نام پر میلے لگتے ہیں ' جہاں جاہل لوگ مادر پدر آزاد حرکتیں کرتے ہیں۔ ایسے مزاروں پر نادان اور بے سمجھ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی حاضر ہوتی ہیں اور منتیں مانتی ہیں اور وہاں بیٹھے ہوئے مجاورین اور ملنگوں (مفت خوروں) کو پہنچے ہوئے بزرگ سمجھتی ہیں۔

پکی قبریں اور مقبرے تو کمائی کا بڑا ذریعہ بن گئے ہیں۔ زمانے کی بھاگ دوڑ سے فرار اختیار کرنے والے کسی موزوں جگہ پر حقیقی یا غیر حقیقی قبر بنا کر بیٹھ جاتے ہیں اور وہاں سے گزرنے والے پیدل یا سوار وہاں رک کر نذرانہ دے کر آگے چلتے ہیں۔ قرونِ اولیٰ میں اس طرح کے کاموں کی کوئی مثال نہیں ملتی ۔ نہ وہاں درگاہیں تھیں نہ آستانے ' البتہ قبرستان موجود تھے جہاں مردوں کو دفن کیا جاتا تھا اور قبروں کو سادہ اور کچا رکھا جاتا تھا۔ فطرتِ سلیمہ یہ تسلیم کرتی



ہے کہ کسی بزرگ کی عظمت اس کی قبر کے ساتھ وابستہ نہیں۔ کسی کی حقیقی عظمت اور بزرگی تو تقویٰ میں ہے۔ تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسل علیہم السلام گزرے ہیں ' ان کی قبریں تو کہیں نظر نہیں آتیں۔ چند کے سوا

دوسروں کے نام بھی محفوظ نہیں۔ لیکن اُمت کا کوئی بزرگ جو کسی خوبصورت مقبرے میں دفن ہے ان کی خاکِ پا کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اگر عظمت اور بزرگی قبر کے ساتھ وابستہ ہوتی تو انبیاء کی قبریں آج تک موجود ہوتیں۔

مزارات پر مجاور بیٹھنے والے عجیب طرح کی وضع قطع بنائے ہوتے ہیں جس سے وہ اپنی انفرادیت اور بڑائی ظاہر کرتے ہیں ‘حالانکہ ان کا لباس اور حلیہ اکثر خلافِ سنت ہوتا ہے۔ غرض صحیح بات یہی ہے کہ قبر کو کچا رکھا جائے اور اس پر کوئی عمارت نہ بنائی جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے قبرستان میں جا کر قبروں کی زیارت کرنے کی اجازت دی ہے تاکہ اس سے دنیا کی زندگی کی ناپائیداری کا احساس ہو اور اپنی موت کو یاد کر کے اگلی زندگی کو بہتر بنانے والے اعمال کرنے کا داعیہ پیدا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’میں نے تم کو زیارت قبور سے منع کر دیا تھا۔ اب (اجازت دیتا ہوں کہ) تم قبروں کی زیارت کر لیا کرو‘ کیونکہ اس سے دنیا کی بے رغبتی اور آخرت کی یاد اور فکر پیدا ہوتی ہے‘‘۔ (سنن ابن ماجہ)

قبرستان میں جانے کا طریقہ اور مردوں کے لیے بخشش مانگنے کا انداز بھی نبی اکرم ﷺ نے بتا دیا۔ آپؐ نے فرمایا: ’’جب لوگ قبرستان جائیں تو اہل قبور پر اس طرح سلام پڑھیں اور ان کے لیے دعا کریں : اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الدِّيَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُسْلِمِيْنَ، وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَلَاحِقُوْنَ، نَسْئَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ (صحیح مسلم) ’’سلام ہو تم پر ان گھر والو مؤمنوں میں سے اور مسلموں میں سے اور ان شاء اللہ ہم تم سے آملنے والے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا اور سوال کرتے ہیں اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت کا‘‘۔ (صحیح مسلم)

مرنے والے کے لواحقین کے پاس تعزیت کے لیے جانا مسنون ہے۔ وہاں جا کر یہ کہنا کہ بڑا افسوس ہے درست نہیں۔ موت اللہ کے حکم سے آتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ‘لہٰذا اس طرح کہنا چاہیے کہ اللہ کا حکم اسی طرح تھا۔ نیز لواحقین کو اس صدمہ پر صبر کی تلقین کی جائے کہ صبر اجر کا باعث ہے۔

نمازِ جنازہ اور کفن دفن کے بعد نہ کوئی دعوت ہے نہ کوئی اور رسم۔ البتہ رشتہ دار یا دیگر تعلق



دار متاثرہ خاندان کے لیے کھانے کا انتظام کریں ‘کیونکہ اہل خانہ غم کی کیفیت میں ہوتے ہیں۔ جب حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر آئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جعفرؓ کے گھر والوں کے لیے کھانا تیار کیا جائے ‘وہ اس اطلاع کی وجہ سے ایسے حال میں ہیں کہ کھانے وغیرہ کی طرف توجہ نہ کر سکیں گے‘‘۔ (جامع ترمذی‘ سنن ابن ماجہ)

مردوں کے لیے بخشش کی دعا کرنا نہ صرف جائز بلکہ فضیلت کا باعث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنے ایمان والے بندے (یا بندی) کے کسی پیارے کو جب میں اٹھالوں ‘پھر وہ ثواب کی امید پر صبر کرے تو میرے پاس اس کے لیے جنت کے سوا کوئی معاوضہ نہیں‘‘۔ (صحیح البخاری)

اس دعا کے لیے کسی تقریب کا انعقاد سنت سے ثابت نہیں۔ مغفرت کی دعا کے لیے کسی خاص وقت یا مقام کا تعین نہیں ہے اور نہ ہی اس کے لیے کوئی پر تکلف اکٹھ کی ضرورت ہے۔ بخشش کی دعا تو صرف مردوں کے لیے نہیں بلکہ زندوں کے لیے بھی کرنا چاہیے۔

زندوں کی طرف سے مردوں کے لیے بہترین تحفہ جس کی ان کو بہت زیادہ ضرورت ہے وہ استغفار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قبر میں مدفون مردے کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جو دریا میں ڈوب رہا ہو اور مدد کے لیے چیخ و پکار کر رہا ہو۔ وہ بے چارہ انتظار کرتا ہے کہ ماں باپ یا بھائی یا کسی دوست آشنا کی طرف سے دعائے رحمت و مغفرت کا تحفہ پہنچے۔ جب کسی طرف سے اس کو دعا کا تحفہ پہنچتا ہے تو وہ اسے دنیا ومافیہا سے زیادہ محبوب اور عزیز ہوتا ہے۔ اور دنیا میں رہنے بسنے والوں کی دعائوں کی وجہ سے قبر کے مردوں کو اتنا عظیم ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے جس کی مثال پہاڑوں سے دی جا سکتی ہے اور مردوں کے لیے زندوں کا خاص ہدیہ ان کے لیے دعائے مغفرت ہے''۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

* * *



# زِندوں پر مردوں کے حقوق

اسلامی اخلاقیات میں اِکرامِ مسلم پر بہت زور دیا گیا ہے اور مسلمان کو مسلمان کا بھائی کہا گیا ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کی صفت 'رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ' بیان کی گئی ہے' اس لیے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر اندیشی کا رویہ رکھے' ضرورت کے وقت اُن کی مدد کرے' رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات جوڑ کر رکھے۔ الغرض مسلمان آپس میں ایک جسم کی مانند ہوں کہ اگر جسم کے ایک حصے میں تکلیف ہو تو دوسرے اعضاء بھی اس تکلیف کو محسوس کریں۔ حدیث میں وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ:

((حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ خَمْسٌ: رَدُّ السَّلَامِ وَعِيَادَةُ الْمَرِيضِ وَاتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ وَإِجَابَةُ الدَّعْوَةِ وَتَشْمِيتُ

الْعَاطِسِ)) (۱)

''مسلمان کے مسلمان پر پانچ حقوق ہیں: سلام کا جواب دینا' بیمار کی عیادت کرنا' جنازے کے ساتھ جانا' دعوت قبول کرنا اور چھینک آئے تو یرحمک اللہ کہہ کر اس کے لیے دعائے رحمت کرنا۔''

بعض دوسری احادیث میں مزید حقوق کا بھی ذکر ہے' مثلاً کسی مسلمان بھائی کی برائی بیان کی جا رہی ہو تو بقدرِ استطاعت اُس کی مدافعت کرنا۔ اگر کسی بھائی میں کوئی برائی دیکھے تو اُس کی اصلاح کے لیے اچھے انداز میں کوشش کرنا۔ ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنا۔ مشکل میں ہو تو مدد کرنا وغیرہم۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے' جو پیدا ہوا ہے اس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ مسلمان پر لازم ہے کہ موت کو یاد رکھے' کسی کو بیمار دیکھے تو اس کی عیادت کرے اور اس کے ساتھ حوصلہ افزائی اور ہمدردی کی باتیں کرے۔ جب اس پر موت کے آثار نظر آنے لگیں تو اسے لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کی تلقین کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَقِّنُوا مَوْتَاكُمْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ)) (۲)

---



''تم اپنے قریب الموت (بھائیوں) کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کیا کرو۔''

ایک اور موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ)) (۳)

''جس شخص کا آخری کلام لا الٰہ الا اللہ ہو گا وہ جنت میں جائے گا۔''

اس کے علاوہ اس کے پاس سورۂ یٰسٓ کی تلاوت کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنے مرنے والوں پر سورۂ یٰسٓ پڑھا کرو۔'' (مسند احمد و سنن ابی داؤد)

جب بندہ فوت ہو جائے تو اس کی آنکھیں بند کر دینی چاہئیں اور مرنے والے کے متعلق کلماتِ خیر کہنے چاہئیں۔ بے صبری کے الفاظ اور جاہلیت کے جملے زبان سے ادا نہ کرنے چاہئیں' بلکہ مسلمان بھائی کی وفات کو اللہ کی رضا سمجھ کر اس پر صبر کا رویہ اختیار کرنے کا حکم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الْخُدُوْدَ وَشَقَّ الْجُيُوْبَ وَدَعَا بِدَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ)) (۴)

''جو کوئی (غمی اور موت کے موقع پر) اپنے رخساروں پر طمانچے مارے' منہ پیٹے' گریبان پھاڑے اور اہلِ جاہلیت کے طریقے پر واویلا کرے وہ ہم میں سے نہیں (یعنی وہ ہمارے طریقے پر نہیں)۔''

کسی عزیز رشتہ دار کی وفات پر غم اور صدمہ ہونا فطری تقاضا ہے جس کے نتیجہ میں پس ماندگان اور

متعلقین کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں ۔ ایسے آنسو بے صبری کے نہیں محبت کے آنسو ہیں ‘اسی لیے میت پر رونے سے نہیں روکا گیا۔ موت کے صدمے کے وقت رونے سے غم کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے اور جذبات اعتدال پر رہتے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ کے فرزند ابراہیم فوت ہو رہے تھے تو آپؐ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کسی نے پوچھ لیا کہ حضور ﷺ آپ کی بھی یہ حالت؟ اس پر آپؐ نے فرمایا: یہ شفقت اور دردمندی ہے۔ پھر دوبارہ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو بہے تو آپؐ نے فرمایا :

((اِنَّ الْعَیْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ یَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا یَرْضٰی رَبُّنَا وَاِنَّا بِفِرَاقِکَ یَا اِبْرَاھِیْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ))(۵)

’’آنکھ آنسو بہاتی ہے اور دل مغموم ہے ‘مگر زبان سے ہم وہی کہیں گے جو اللہ کو پسند ہو (یعنی انا للہ وانا الیہ راجعون) ‘ اے ابراہیم ! تمہاری جدائی کا ہمیں صدمہ ہے ۔ ‘‘

---



پس صدمے کے وقت غمگین ہونا‘ شفقت اور دردمندی کے آنسو بہانا منع نہیں ہے۔

کسی عزیز کی وفات پر چیخنا چلانا‘ واویلا کرنا اور بین کرنا منع ہے کیونکہ یہ صبر کے خلاف ہے۔ موت کے صدمے کو اللہ کی رضا سمجھ کر قبول کرنا چاہیے ‘اس صبر پر اللہ کی طرف سے اجر کا وعدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ’’اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میں اپنے ایمان والے بندے کے کسی پیارے کو اٹھا لوں پھر وہ ثواب کی اُمید میں صبر کرے ‘تو میرے پاس اس کے لیے جنت کے سوا کوئی معاوضہ نہیں ‘‘۔ ( صحیح البخاری)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا بیٹا فوت ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں تعزیت کا خط لکھا جس میں آپؐ نے فرمایا : ’’اے معاذ صبر کرو اور ایسا نہ ہو کہ جزع وفزع تمہارے قیمتی اجر کو ضائع کر دے اور پھر تمہیں ندامت ہو۔ اور یقین رکھو کہ جزع و فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا اور نہ اس سے رنج و غم دور ہوتا ہے اور اللہ کی طرف سے جو حکم اترتا ہے وہ ہو کر رہنے والا ہے بلکہ یقینا ہو چکا ہے ‘‘۔ (رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط)

جہاں دنیا کی زندگی میں دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ اِکرام کا معاملہ کرنا ہے‘ وہاں اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ فوت ہونے والے کو بھی اکرام و احترام کے ساتھ اللہ کے سپرد کیا جائے ۔ سب سے پہلے اُسے اچھی طرح سے غسل دیا جائے جس سے جسم کی میل ُکچیل اُتر جائے۔ تین دفعہ پانی بہا کر غسل دینا چاہیے اور آخری دفعہ پانی میں کافور بھی ملا لینا چاہیے جس کی خوشبو اچھی اور دیرپا ہوتی ہے۔ غسل کے بعد میت کو کفن پہنایا جائے جو سفید رنگ کا صاف ستھرا کپڑا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((اَلْبَسُوْا مِنْ ثِیَابِکُمُ الْبَیَاضَ فَاِنَّھَا مِنْ خَیْرِ ثِیَابِکُمْ وَکَفِّنُوْا فِیْھَا مَوْتَاکُمْ))(٦)

’’تم لوگ سفید کپڑے پہنا کرو‘ وہ تمہارے لیے اچھے کپڑے ہیں اور انہی میں اپنے مرنے والوں کو

لفنایا کرو۔‘‘
کفن کے بارے میں آپؐ کی یہ بھی ہدایت ہے کہ وہ زیادہ قیمتی نہ ہو۔ آپؐ نے فرمایا:
((لَا تَغَالُوْا فِی الْکَفَنِ فَاِنَّہٗ یُسْلَبُہٗ سَلْبًا سَرِیْعًا))(۷)
’’زیادہ بیش قیمت کفن استعمال نہ کرو‘ کیونکہ وہ جلدی ختم ہو جاتا ہے۔‘‘
مردوں کو کفن تین کپڑوں میں دیا جائے جبکہ عورت کے کفن میں پانچ کپڑے ہوں۔ کفن



کا کپڑا گھر والوں کی سہولت کے مطابق ہونا چاہیے۔ مجبوری کی حالت میں ایک کپڑے کا کفن بھی ہو سکتا ہے اور پرانے کپڑے کا کفن بھی دیا جا سکتا ہے۔
کفن پہنانے کے بعد میت کو نماز جنازہ کے لیے لے جایا جاتا ہے۔ جب انسان کی وفات ہو جائے تو اسے دیر تک پاس رکھنا درست نہیں بلکہ جلد از جلد اسے آگے روانہ کر دینا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
((اَسْرِعُوْا بِالْجَنَازَۃِ فَاِنْ تَکُ صَالِحَۃً فَخَیْرٌ تُقَدِّمُوْنَھَا وَاِنْ یَّکُ سِوٰی ذٰلِکَ فَشَرٌّ تَضَعُوْنَہٗ عَنْ رِقَابِکُمْ))(۸)
’’جنازے کو تیز لے جایا کرو۔ اگر وہ نیک ہے تو (قبر اس کے لیے) خیر ہے جہاں تم اس کو جلدی پہنچا دو گے اور اگر اس کے سوا کوئی دوسری صورت ہے تو ایک بُرا (بوجھ تمہارے کندھوں پر) ہے تو (تم تیز چل کر جلدی) اس کو اپنے کندھوں سے اتار دو گے۔‘‘
مسلمان بھائی کے جنازے کے ساتھ جانا مسنون اور بڑے ثواب کا کام ہے۔ رسول‘ اللہ ﷺ نے فرمایا:
((مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَۃَ مُسْلِمٍ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا وَّکَانَ مَعَہٗ حَتّٰی یُصَلّٰی عَلَیْھَا وَیَفْرُغَ مِنْ دَفْنِھَا فَاِنَّہٗ یَرْجِعُ مِنَ الْاَجْرِ بِقِیْرَاطَیْنِ کُلُّ قِیْرَاطٍ مِثْلُ اُحُدٍ‘ وَمَنْ صَلّٰی عَلَیْھَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ اَنْ تُدْفَنَ فَاِنَّہٗ یَرْجِعُ بِقِیْرَاطٍ)(۹)
’’جو آدمی ایمان کی صفت کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے کسی مسلمان کے جنازے کے ساتھ جائے اور اُس وقت تک جنازے کے ساتھ رہے جب تک کہ اُس پر نماز پڑھی جائے اور اس کے دفن سے فراغت ہو تو وہ ثواب کے دو قیراط لے کر واپس ہو گا‘ جس میں سے ہر قیراط گویا اُحد پہاڑ کے برابر ہو گا۔ اور جو آدمی صرف نمازِ جنازہ پڑھ کر واپس آجائے تو وہ ثواب کا ایک قیراط لے کر واپس ہو گا۔‘‘
نماز جنازہ فرضِ کفایہ ہے۔ یعنی اگر ایک محفل میں سے ایک آدمی جنازے کے ساتھ شامل ہو گیا تو وہ سب کی طرف سے کفایت کرے گا‘ محفل کے دوسرے لوگ گناہگار نہیں ہوں گے‘ مگر جنازے میں شرکت کا ثواب صرف جنازہ پڑھنے والے کو ہی ہو گا۔ جنازے کی نماز میں اللہ کی حمد وثنا‘ رسول اللہ ﷺ پر درود اور میت کے علاوہ دوسرے تمام مؤمنین کے لیے دعا ہوتی ہے۔ میت کی بخشش کے لیے تہہ دل سے دعا کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى الْمَيِّتِ فَاَخْلِصُوْا لَـهُ الدُّعَاءَ))(۱۰)

''جب تم کسی میت کی نماز جنازہ پڑھو تو پورے خلوص سے اس کے لیے دعا کرو۔''

نماز جنازہ میں پڑھی جانے والی دعائیں ہر مسلمان کو یاد ہونی چاہئیں بلکہ دوسروں کو بھی سکھانی چاہئیں۔ خاص طور پر اپنی اولاد کو ٗتاکہ وہ جنازے کی نماز میں شامل ہو کر بڑا ثواب حاصل کریں اور میت کے لیے بخشش کی دعا کر کے اس کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔ نمازِ جنازہ میں کثرت کے ساتھ شامل ہونا چاہیے ٗکیونکہ زیادہ تعداد کی دعا میت کے حق میں شرفِ قبولیت پائے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ مَيِّتٍ تُصَلِّيْ عَلَيْهِ اُمَّةٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ يَبْلُغُوْنَ مِائَةً كُلُّهُمْ يَشْفَعُوْنَ لَهٗ اِلاَّ شُفِّعُوْا فِيْهِ))(۱۱)

''جس میت پر مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نماز پڑھے جن کی تعداد سو تک پہنچ جائے اور وہ سب اللہ کے حضور اس میت کے لیے سفارش کریں تو ان کی یہ سفارش اور دعا ضرور قبول ہو گی۔''

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ جس مسلمان کے جنازے کی نماز چالیس ایسے آدمی پڑھیں جن کی زندگی شرک سے بالکل پاک ہو تو اللہ تعالیٰ ان کی سفارش اس میت کے حق میں ضرور قبول فرماتا ہے۔

نمازِ جنازہ میں صفوں کی تعداد طاق رکھنے کی ہدایت ہے اور کم از کم تین صفیں تو ضرور بنا لینی چاہئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ فَيُصَلِّيْ عَلَيْهِ ثَلَاثَةُ صُفُوْفٍ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ اِلاَّ اَوْجَبَ))(۱۲)

''جس مسلمان بندے کا انتقال ہو جائے اور مسلمانوں کی تین صفیں اس کی نماز جنازہ پڑھیں تو ضرور ہی اللہ تعالیٰ اس بندے کے واسطے (مغفرت اور جنت) واجب کر دیتے ہیں۔''

نمازِ جنازہ کے بعد میت کو قبر میں اتارا جاتا ہے۔ بغلی قبر بنانا اور اسے بند کرنے کے لیے کچی اینٹیں کھڑی کر دینا بہتر ہے ٗکیونکہ رسول اللہ ﷺ کی قبر اسی طرح تیار کی گئی تھی۔ (صحیح مسلم)

قبر بالکل سادہ رکھی جائے ٗ اُس کو پختہ اور خوبصورت نہ بنایا جائے ٗ نہ ہی اس پر عمارت کھڑی کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے کہ قبر کو چونے گچ سے پختہ کیا



جائے یا اس پر عمارت بنائی جائے۔ (صحیح مسلم)

رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو روندنے اور ان کی بے حرمتی کرنے سے بھی روکا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَجْلِسُوْا عَلَى الْقُبُوْرِ وَلَا تُصَلُّوْا اِلَيْهَا))(۱۳)

''نہ تو قبروں پر بیٹھو اور نہ ان کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھو۔''

قبروں پر بیٹھنے سے مراد یہ بھی ہے کہ وہاں مجاور بن کر بیٹھا جائے۔ یہ ہدایت اس لیے دی گئی کہ اُمت کو شرک کے شک و شائبہ سے بچایا جائے۔ اگر قبر کچی ہو گی' پختہ نہ ہو گی اور نہ اس پر کوئی عمارت کھڑی کی جائے گی تو وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہو جائے گی اور یہی اسلامی تعلیم' ہے۔ قبروں کو محفوظ رکھنا سنت سے ثابت نہیں۔ قبروں پر شرکیہ کام اسی وجہ سے ہوتے ہیں کہ ان پر بلند و بالا عمارتیں بنا لی جاتی ہیں اور ان کو زیارت گاہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَائِھِمْ مَسَاجِدَ))(۱۴)

''یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو' انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔''

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی کسی بیٹی' بیٹے یا کسی دوسرے رشتہ دار کی قبر نہ پختہ بنائی' نہ اُس پر عمارت بنائی اور نہ ہی اس پر کتبہ لگایا اور نہ کسی کو مجاور بنا کر بٹھایا۔ پس آپ ﷺ کا طریقہ ہی صحیح اور قابل تقلید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولیائے کرام اور اُمت کے اہلِ علم متقین اور صالحین میں سے کسی نے یہ وصیت نہیں کی کہ اس کی قبر کو پختہ کر کے اس پر عمارت کھڑی کر دی جائے تاکہ وہ مرجع خلائق بن جائے' لوگ وہاں عُرس اور میلے کی تقریب منعقد کیا کریں۔ بزرگوں کی قبروں پر خوبصورت قبے اور عبارتیں بعد کے لوگوں نے اپنی نفسانی خواہشات اور مفادات کے لیے (رسول اللہ ﷺ کے طریقے کو نظر انداز کرتے ہوئے) بنائیں۔

اسی طرح یہ بھی ثابت نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے عزیز و اقارب کی قبروں پر ہر سال مٹی ڈالی ہو اور انہیں قائم رکھنے کی کوشش کی ہو۔ پس فوت شدگان کا یہ حق ہے کہ اُن کی تدفین مسنون طریقے کے مطابق کی جائے۔ اگر زندہ لوگ یہ فرض ادا نہیں کرتے تو قبر والے کا اس میں کوئی قصور نہیں' غیر مسنون کام کرنے والے ہی عند اللہ جواب دہ ہوں گے۔ رسول' اللہ ﷺ کی قبر مبارک سادہ اور کچی بنائی گئی تھی جو پانچ سو سال تک ویسی ہی رہی۔ بعد



ازاں ناگزیر ضرورت کی بنا پر اُس پر گنبد تعمیر کر دیا گیا۔

قبر کی پہچان کے لیے اس کے سرہانے کوئی بھاری پتھر رکھ دینا جائز ہے۔ (ابن ماجہ' ابوداؤد)

تدفین سے فارغ ہونے کے بعد میت کے لیے مغفرت اور ثابت قدمی کی دعا کرنا مستحب ہے اور رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ثابت ہے۔

((کَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا فَرَغَ مِنْ دَفْنِ الْمَیِّتِ وَقَفَ عَلَیْہِ فَقَالَ اسْتَغْفِرُوْا لِاَخِیْکُمْ)) (۱۵)

''رسول اللہ ﷺ جب میت کو دفنانے سے فارغ ہوتے' تو قبر کے پاس ٹھہر کر فرماتے کہ تم اپنے بھائی کے لیے

استغفار کرو۔‘‘

قبرستان میں جانا اور وہاں اہل قبور کے لیے بخشش کی دعا کرنا مسنون ہے۔ شروع شروع میں رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو زیارتِ قبور سے روک دیا تھا۔ (یہ غالباً اس لیے تھا کہ لوگوں کو شرک اور جاہلیت سے نکلے ہوئے تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا اور اس بات کا امکان تھا کہ لوگ قبرستان میں جا کر شرک اور قبر پرستی میں ملوث ہو جائیں گے۔ بعد ازاں جب لوگوں کا توحیدی مزاج پختہ ہو گیا تو) پھر آپؐ نے اجازت دے دی اور فرمایا:

((کُنْتُ نَهَیْتُکُمْ عَنْ زِیَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا، فَاِنَّهَا تُزَهِّدُ فِی الدُّنْیَا وَتُذَکِّرُ الْآخِرَةَ))(١٦)

’’میں نے تمہیں زیارتِ قبور سے روکا تھا‘ اب تمہیں اس کی اجازت ہے۔ اس سے دنیا کی بے رغبتی اور آخرت کی یاد اور فکر پیدا ہوتی ہے۔‘‘

رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو تعلیم فرماتے تھے کہ جب وہ قبرستان جائیں تو اہل قبور پر اس طرح سلام پڑھیں اور ان کے لیے دعا کریں:

((اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَهْلَ الدِّیَارِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَاِنَّا اِنْ شَاءَ اللّٰهُ لَلَاحِقُوْنَ اَسْئَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَکُمُ الْعَافِیَةَ))(١٧)

’’سلام ہو تم پر اے گھر والو‘ مؤمنوں میں سے اور مسلموں میں سے! اور ان شاء اللہ ہم تم سے آکر ملنے والے ہیں۔ ہم اللہ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے عافیت مانگتے ہیں۔‘‘

جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کا نامۂ اعمال بند ہو جاتا ہے‘ اس لیے کہ دنیا کی زندگی اچھے برے اعمال کرنے کی مہلت ہے‘ جب انسان دار العمل سے کوچ کر گیا تو اب وہ کوئی نیک



یا برا عمل نہیں کر سکتا۔ گویا عمل کرنے کے اعتبار سے وہ انتہائی بے بس ہو جاتا ہے۔ اس بے بسی کی حالت میں اگر زندہ لوگ اس کو ایسے اعمال کا تحفہ بھیجیں جو اس کے کام آسکے تو یہ تحفہ اس کے لیے بہت بڑی نعمت ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں بخشش کی دعا بہترین تحفہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’قبر میں مدفون مردے کی مثال بالکل اُس شخص کی سی ہے جو دریا میں ڈوب رہا ہو اور مدد کے لیے چیخ و پکار کر رہا ہو۔ وہ بے چارہ انتظار کرتا ہے کہ ماں باپ یا بہن بھائی یا کسی دوست آشنا کی طرف سے دعائے رحمت اور مغفرت کا تحفہ پہنچے۔ جب کسی کی طرف سے اسے دعا کا تحفہ پہنچتا ہے تو وہ اس کو دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز اور محبوب ہوتا ہے۔ اور دنیا میں رہنے والوں کی دعاؤں کی وجہ سے قبر کے مُردوں کو اتنا عظیم ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے جس کی مثال پہاڑوں سے دی جا سکتی ہے اور یقیناً مردوں کے لیے زندوں کا خاص ہدیہ دعائے مغفرت ہے۔‘‘ (شعب الایمان للبیہقی)

وفات کے بعد جب عالم آخرت سے واسطہ پڑتا ہے تو گناہوں کی بخشش سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ اس بے

بسی کے عالم میں زندوں کا فوت شدگان کے لیے بخشش کی دعا کرنا خود زندوں کے لیے بھی بہت مفید ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بندہ عام ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگے گا اس کے لیے ہر مؤمن مرد و عورت کے حساب سے ایک ایک نیکی لکھی جائے گی۔ (معجم کبیر للطبرانی)

خود رسول اللہ ﷺ کو قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ اہل ایمان مردوں اور عورتوں کے لیے بخشش مانگیں: {وَ اسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ} (محمد:۱۹) پھر اللہ تعالیٰ نے اولاد کو حکم دیا ہے کہ وہ والدین کے لیے مغفرت طلب کرے اور اس ضمن میں دعائے مغفرت کے الفاظ بھی تعلیم فرمائے: {وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾} (بنی اسراءیل)

اسی طرح فوت شدگان کی طرف سے صدقہ، خیرات اور قربانی جیسے اعمال کر کے ان کو ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہما کی والدہ کا ان کی عدم موجودگی میں انتقال ہو گیا۔ جب وہ واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر گزارش کی کہ یارسول اللہ ﷺ! میری والدہ نے میری غیر حاضری میں وفات پائی، اگر میں ان کی طرف سے صدقہ دوں تو کیا انہیں کوئی نفع پہنچے گا؟ تو آپؐ نے فرمایا: ہاں، پہنچے گا۔ انہوں نے عرض کیا آپ



گواہ رہیں، میں نے اپنا باغ ان کی طرف سے صدقہ کیا۔ (صحیح بخاری)

اسی طرح ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ میری والدہ اچانک فوت ہو گئی اور کوئی وصیت نہ کر سکی۔ میرا خیال ہے اگر اسے بولنے کا موقع ملتا تو وہ صدقہ کی وصیت کرتی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کر دوں تو اس کا اجر اس کو ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: بے شک (صحیحین)

فوت شدگان کے لیے بخشش مانگنا، ان کی طرف سے صدقہ وخیرات کرنا اور قربانی دینا تو درست ہے، مگر قرآن خوانی اور نوافل کا ایصالِ ثواب سنت سے ثابت نہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے قرآن خوانی کی محافل منعقد نہیں کیں۔ اس قسم کی چیزیں دین میں خودساختہ اضافہ ہیں جن کی کوئی سند موجود نہیں۔ زندوں پر فرض ہے کہ وہ اپنے فوت شدہ عزیزوں کے حق میں کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگیں اور ان کی طرف سے صدقہ وخیرات اور قربانی کریں۔ یہ وہ مستند عمل ہیں جن کے کرنے سے فوت شدگان کو بے حساب نفع پہنچتا ہے اور ایصالِ ثواب کرنے والا بھی نیکیاں حاصل کرتا ہے۔

والدین کے حقوق اولاد پر بہت ہیں کہ وہ والدین کی خدمت کریں، بڑھاپے میں ان کا سہارا بنیں، ان کی ضروریات کا خیال رکھیں، انہیں کسی طرح ناراض نہ کریں۔ اگر والدین وفات پا جائیں تو بھی اولاد کا فرض ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے احسان فراموش نہ کریں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ان کے لیے بخشش کی دعا کرتے رہیں۔ ایک

شخص نے نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا: یارسول اللہ ! کیا میرے ماں باپ کے لیے کچھ ایسے بھی حق ہیں جو ان کے مرنے کے بعد مجھے ادا کرنے چاہئیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں' اُن کے لیے خیر و رحمت کی دعا کرتے رہنا' اُن کے واسطے اللہ سے مغفرت اور بخشش مانگنا' اُن کا اگر کوئی عہد و معاہدہ کسی سے ہو تو اس کو پورا کرنا' اُن کے تعلق سے جو رشتے ہوں ان کا لحاظ رکھنا اور ان کا حق ادا کرنا' اور ان کے دوستوں کا اکرام و احترام کرنا''۔ (سنن ابی دائود' سنن ابن ماجہ)

اسی طرح صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی یہ چاہے کہ قبر میں اپنے باپ کو آرام پہنچائے تو اُسے چاہیے کہ باپ کے انتقال کے بعد اس کے بھائیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔'' ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دعا کرنا جہاں ماں باپ کے لیے فائدہ مند ہے وہاں اولاد کے لیے بھی سعادت مندی 'خوش بختی اور خطاؤں اور



نافرمانیوں کی بخشش کا سبب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی آدمی کے ماں باپ کا یا دونوں میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جاتا ہے اور اولاد زندگی میں ان کی نافرمان اور ان کی رضامندی سے محروم ہوتی ہے 'لیکن یہ اولاد ان کے انتقال کے بعد (سچے دل سے) اُن کے لیے اللہ تعالیٰ سے خیر و رحمت کی دعا اور مغفرت و بخشش کی استدعا کرتی رہتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس نافرمان اولاد کو فرماں بردار قرار دے دیتا ہے''۔(پھر وہ ماں باپ کی نافرمانی کے وبال اور عذاب سے بچ جاتی ہے)۔ (شعب الایمان للبیہقی)

پس فوت شدگان کا حق ہے کہ زندہ لوگ ان کے حق میں ہمہ وقت دعائے مغفرت کرتے رہیں اور مالی عبادات کے ذریعے ان کو ایصالِ ثواب کرتے رہیں۔ اس سلسلہ میں خود ساختہ طریقوں اور بدعات سے اجتناب کریں۔

حواشی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجنائز' باب الامر باتباع الجنائز۔ وصحیح مسلم' کتاب السلام' باب من حق المسلم للمسلم رد السلام۔

(۲) سنن الترمذی'کتاب الجنائز عن رسول اللہ ﷺ باب ما جاء فی تلقین المریض عند الموت۔

(۳) سنن ابی داوٗد' کتاب الجنائز' باب فی التلقین۔

(۴) صحیح البخاری' کتاب الجنائز' باب لیس منا من ضرب الخدود۔وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب تحریم ضرب

الخدود وشق الجيوب۔

(۵) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبیﷺ انا بک لمحزونون۔ وصحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمۃ الصبیان والعیال وتواضعہ وفضل ذٰلک۔

(۶) سنن ابی داؤد، کتاب الطب، باب فی الامر بالکحل۔ وسنن الترمذی، کتاب الجنائز عن رسول اللہﷺ، باب ما یستحب من الاکفان۔

(۷) سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب کراھیۃ المغالاۃ فی الکفن۔

(۸) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب السرعۃ بالجنازۃ۔وصحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب الاسراع بالجنازۃ۔

(۹) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب اتباع الجنائز من الایمان۔ وصحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب فضل الصلاۃ علی الجنازۃ واتباعھا۔

(۱۰) سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب الدعاء للمیت۔ وسنن ابن ماجہ، کتاب ما جاء فی



الجنائز، باب ما جاء فی الدعاء فی الصلاۃ علی الجنازۃ۔

(۱۱) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب من صلی علیہ مائۃ شفعوا فیہ۔

(۱۲) سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب فی الصفوف علی الجنازۃ۔

(۱۳) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب النھی عن الجلوس علی القبر والصلاۃ علیہ۔

(۱۴) صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب ھل تنبش قبور مشرکی الجاھلیۃ ویتخذ مکانھا مساجدا۔ وصحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ ، باب النھی عن بناء المساجد علی القبور...

(۱۵) سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز، باب الاستغفار عند القبر للمیت فی وقت الانصراف۔

(۱۶) سنن ابن ماجہ، کتاب ما جاء فی الجنائز، باب ما جاء فی زیارۃ القبور۔

(۱۷) صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب ما یقال عند دخول القبور والدعاء لاھلھا۔

* * *



# ثروت مندی اور ناداری کی حقیقت

دنیا کی زندگی عارضی ‘ناپائیدار اور فانی ہے۔ اس طرح دنیا کی نعمتیں بھی حقیقی نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان خواہ امیر ہے یا غریب ‘وہ امتحان میں ہے۔ گویا زندگی امتحان کا ایک وقفہ ہے۔ یہ دنیا دارالعمل ہے جہاں سے کوچ کر کے ہر ایک کو دار الجزاء میں جانا ہے‘ جہاں اس سے دنیا کی زندگی میں کیے ہوئے کاموں کے بارے میں پوچھا جائے گا ۔اگر وہ ان سوالوں کے جواب دینے میں کامیاب ہو اتو اسے راحت و آرام کی ابدی اور حقیقی زندگی ملے گی ‘ ورنہ وہ عذاب میں جھونکا جائے گا۔

دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار نعمتیں دے رکھی ہیں ۔ مطلوب یہ ہے کہ انسان اللہ کی دی ہوئی ان نعمتوں کو اللہ کے حکم کے مطابق استعمال کرے۔ ان نعمتوں کا صحیح استعمال اُس کو اگلی اور حقیقی زندگی کی بے مثل نعمتوں سے سرفراز کرے گا ‘جبکہ ان کے غلط استعمال سے وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہو کر آگ میں ڈالا جائے گا۔

دوسری بے شمار نعمتوں کی طرح مال و دولت بھی ایک اہم نعمت ہے۔ مال و دولت سے انسان جہاں دُنیوی زندگی کے لیے سہولتیں حاصل کر لیتا ہے وہاں اپنے عیش و آرام میں مشغول ہو کر دولت کو ناجائز اور حرام کاموں میں خرچ کرنے لگتا ہے اور یہ بات بھول جاتا ہے کہ اسے دولت کے استعمال کے بارے میں جواب دہی کرنا ہو گی۔ بلکہ یہ بھی بتانا ہو گا کہ یہ مال و دولت کیسے حاصل کیا ‘حرام ذرائع سے یا حلال ذرائع سے؟چونکہ ابلیس بنی نوع انسان کا روزِ اوّل ہی سے دشمن ہے‘ لہٰذا وہ انسان کو دُنیوی زندگی کی رنگینیوں میں بتلا کر کے آخرت کے فکر سے غافل کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ انسان کو اس دھوکے میں بھی بتلا کر دیتا ہے کہ یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ نے استعمال کرنے کے لیے ہی تو دی ہیں‘ ان سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے اور ان سے فائدہ نہ اٹھانا نعمتوں کے عطیے کی ناشکری ہے۔ لوگ اس فریب میںآ کر دوسری نعمتوں کی طرح مال و

دولت کو بھی فضول خرچی اور دیگر ناجائز کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ اس طرح وہ مال و دولت کے بل بوتے پر جائز و ناجائز ہر طرح کا وہ کام کر گزرتے ہیں جس میں انہیں دُنیوی فائدہ نظر آتا ہے ‘حالانکہ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ انسان کی نظر ہمیشہ آخرت کی فلاح پر ہونی چاہیے اور دنیا کی زندگی اس طرح گزارنی چاہیے کہ ہر عمل سے آنے والی حقیقی زندگی میں کامیابی نظر آئے۔ صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے اگر اس زندگی میں تکالیف اور مشکلات پیش آئیں تو انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرے اور کبھی شیطان کے بہکاوے میں آکر وہ کام نہ کرے جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو۔ مؤمن اگر صبر کے ساتھ ہر تکلیف اور پریشانی برداشت کرے تو یہ اُخروی اجر و ثواب کا باعث ہے۔

آخرت کے مقابلے میں اس دنیا کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے دونوں مونڈھے پکڑے اور فرمایا: ((کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّکَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ)) (صحیح البخاری) ’’دنیا میں ایسے رہو جیسے کہ تم پردیسی ہو یا راستہ چلتے مسافر‘‘۔ مونڈھے پکڑنے سے مقصد یہ تھا کہ حضرت عبداللہؓ بات کی اہمیت کو سمجھیں۔ رسول اللہ ﷺ کا طرزِ زندگی مسلمانوں کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ آپ ؐ نے نہ تو کبھی دنیا کے مال و دولت کی خواہش کی اور نہ زندگی کی خوشحالی اور عیش و آرام طلب کیا‘ بلکہ مشقت اور سادگی کو پسند فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن کھجور کی چٹائی پر آرام فرما رہے تھے‘ جب سو کر اٹھے تو آپ ؐ کے جسم پر چٹائی کی بناوٹ کے نشان پڑے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر ابن مسعودؓ نے عرض کیا :میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں‘ حضورؐ! اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے لیے بستر کا انتظام کر دیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((مَا اَنَا وَالدُّنْیَا‘ اِنَّمَا اَنَا وَالدُّنْیَا کَرَاکِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَۃٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَکَھَا)) (سنن ابن ماجہ) ’’مجھے دنیا سے (یعنی دنیا کے ساز و سامان اور اس کی لذتوں اور راحتوں سے) کیا تعلق؟ میرا تو بس دنیا کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسی کوئی مسافر کچھ دیر سایہ لینے کے لیے کسی درخت کے نیچے ٹھہرا اور پھر اپنی جگہ چھوڑ کر منزل کی طرف چل دیا۔‘‘

دنیا کی زندگی اس اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ آخرت کی حقیقی اور پائیدار زندگی سنوارنے کا وقفہ ہے۔ جو شخص اس کی اہمیت سے واقف ہوا اور لہو و لعب اور عیش پرستی



میں نہ پڑا بلکہ بھلائی کے کام کرتا رہا وہ فلاح یاب ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے بار بار اس حقیقت کو اجاگر فرمایا ۔آپؐ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ کیا تو ارشاد فرمایا :’’معاذ! آرام طلبی اور خوش عیشی سے بچتے رہنا۔ اللہ کے خاص بندے آرام طلب اور خوش عیش نہیں ہوا کرتے۔‘‘ (مسند احمد) اگرچہ دنیوی نعمتوں سے جائز حد تک فائدہ اٹھانے کی اجازت ہے‘ مگر اللہ کے خاص بندوں کا مقام یہی ہے کہ وہ نازونعمت کی بجائے زندگی میں سادگی

اپنائیں۔ اسلام حرص و ہوا ' طمع اور لالچ سے روکتا ہے اور ایثار و قربانی کی تعلیم دیتا ہے ۔ دنیا کا مال کمانے میں انتہائی مشغول ہونا اور کثرت کی خواہش کا غلام بن جانا ' اس رویے کو اسلام پسند نہیں کرتا' کیونکہ ایسا رویہ رکھنے والا شخص کبھی ما ل و دولت سے سیر نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((لَوْ کَانَ لِابْنِ آدَمَ وَادِیَانِ مِنْ مَالٍ لَابْتَغَی ثَالِثًا وَلَایَمْلَأُ جَوْفَ ابْنِ آدَمَ اِلاَّ التُّرَابُ' وَیَتُوْبُ اللّٰہُ عَلٰی مَنْ تَابَ)) (متفق علیہ)

''اگر ابن آدم کے پاس مال سے بھری ہوئی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری بھی چاہے گا' اور ابن آدم کا پیٹ تو بس مٹی ہی سے بھرے گا' اور اللہ تعالیٰ اس بندے پر عنایت اور مہربانی کرتا ہے جو اپنا رخ اور اپنی توجہ اُس کی طرف کرلے۔''

گویا کثرت کی خواہش غافل بندے کو حق شناسی سے دور کر دیتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے ایام ختم کر رہا ہوتا ہے لیکن تیاری سے بے پروا رہتا ہے' یہاں تک کہ اس کی مہلت عمر کا آخری دن آپہنچتا ہے۔ سورۃ التکاثر میں ارشاد ہے کہ ''تمہیں کثرت کی خواہش نے غافل رکھا' یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پڑے۔ کاش تم جان لیتے (کہ دنیا کی زندگی غفلت میں گزارنے کا وقفہ نہیں) ''بلکہ یہاں نعمتوں کے بارے میں سوال ہو گا۔ اگر اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو بلا احتیاط نافرمانی کے کاموں میں صرف کیا تو جہنم واصل ہونا پڑے گا ۔یہاں خاص طور پر نعمت دولت کا ذکر ہے۔

چونکہ دولت کے ساتھ دنیوی سہولتیں اور آرام خریدا جا سکتا ہے تو جب انسان قوتِ خرید پاتا ہے تو غیر ضروری چیزیں بھی خرید لیتا ہے اور دولت کو بے جا خرچ کر کے اسراف اور تبذیر میں مبتلا ہو جاتا ہے ' حالانکہ قرآن مجید میں فضول خرچی کرنے والوں اور اپنی دولت اللوں



تللوں میں اڑانے والوں کو شیاطین کے بھائی کہا گیا ہے۔ دولت مندوں کی دولت میں ناداروں اور مفلسوں کا حصہ رکھ دیا گیا ہے جو انہیں دینا ضروری ہے۔ اگر اس میں کوتاہی کرتے ہیں تو نافرمانوں میں شمار ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مال کی زکوۃ ادا کرنا فرض ہے۔ دولت جمع کرنے کے شوق میں زکوۃ ادا نہ کرنا اور اپنی دولت سے ضرورت مندوں کی مدد نہ کرنا بہت بڑا جرم ہے جو عاقبت کی زندگی کے لیے سخت عذاب کا باعث ہو گا۔ قرآن مجید میں اس بات کو بایں طور واضح کیا گیا ہے:

{وَ الَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَایُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۳۴﴾ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰی بِهَا جِبَاهُهُمْ وَ جُنُوْبُهُمْ وَ ظُهُوْرُهُمْ ؕ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾} (التوبۃ)

''جو لوگ جمع رکھتے ہیں سونا اورچاندی اور اس کو خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں سو ان کو خوشخبری سنا دو دردناک عذاب کی۔ جس دن کہ آگ دہکائی جائے گی دوزخ کی اس مال پر' پھر داغ جائیں گے اس سے ان کے ماتھے 'پہلو اور پیٹھیں۔ (کہا جائے گا:) یہ ہے جو تم نے جمع کر رکھا تھا اپنے واسطے' اب چکھو مزا اس کا جو تم جمع کرتے تھے۔''

دولت مند کے لیے گناہ کے کام آسان ہو جاتے ہیں۔ وہ شراب' زنا اور جوئے میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بارے میں اُمت کو آگاہ فرما دیا۔ آپؐ نے فرمایا:

((اِنَّ لِکُلِّ اُمَّۃٍ فِتْنَۃٌ وَفِتْنَۃُ اُمَّتِی الْمَالُ)) (سنن الترمذی)

''ہر اُمت کے لیے ایک خاص آزمائش ہوتی ہے' اور میری اُمت کی خاص آزمائش مال ہے۔''

دنیا کی زندگی میں روزی کمانا اس لیے ہے کہ اس سے جسم و جان کا رشتہ قائم رہے' اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے آدمی کے پاس پیسے موجود ہوں اور اسے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں یا قرض نہ لینا پڑے۔ جس شخص کو اپنی اور بال بچوں کی خوراک' لباس' رہائش میسر ہو اور وہ صبر و شکر کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوتو وہ خوش نصیب ہے کہ اس کے پاس فضول خرچی کا موقع ہی نہیںہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بڑی مشہور حدیث ہے ۔ آپ ﷺ نے فرمایا:



''بندہ کہتا ہے میرا مال میرا مال' حالانکہ اس کے مال میں سے جو واقعی اس کا ہے وہ بس تین مدیں ہیں: ایک وہ جو اس نے کھا کے ختم کر لیا' دوسرے وہ جو اس نے پہن کر پرانا کر ڈالا اور تیسرے وہ جو اس نے راہِ خدا میں دیا اور اپنی آخرت کے واسطے ذخیرہ کر لیا 'اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ بندہ دوسروں کے لیے چھوڑ جانے والا ہے اور خود یہاں سے ایک دن رخصت ہونے والا ہے''۔ (مسلم)اسی لیے یہ پسندیدہ نہیں کہ آدمی مال اکٹھا کرتا رہے اور پھر ڈھیروں مال اکٹھا کر کے چھوڑ جائے اور خودیہاں سے رخصت ہو جائے۔ جمع شدہ مال تووارثوں کے ہاتھ لگے گا۔ اب یہ ان کا اختیار ہے کہ وہ اس مال کو اچھے کاموں میں لگا کر ثواب کمائیں یا ناجائز طو رپر خرچ کر کے گناہ حاصل کریں اور مرنے والے کے لیے صرف حسرت رہ جائے کہ کاش میں اپنا مال اکٹھا کر کے نہ رکھتا بلکہ خود اپنے ہاتھ سے اچھے کاموں میں صرف کرتا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحابؓ سے فرمایا:''تم میں کون ایسا ہے جس کو اپنے مال سے زیادہ اپنے وارث کا مال پسند ہو؟ ''لوگوں نے عرض کیا :ہم میں سے ہرایک کا حال تو یہ ہے کہ اُس کو اپنے وارثوں کے مال سے زیادہ محبوب اپنا ہی مال ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''جب یہ بات ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ آدمی کا مال بس وہی ہے جس کو اس نے آگے چلتا کیا اور جس قدر اس نے بعد کے لیے رکھا وہ اس کا نہیں ہے بلکہ اس کے وارثوں کا ہے۔''

جن لوگوں نے اس زندگی میں ساری بھاگ دوڑ اور جدوجہد دنیا کمانے میں لگا دی اور آخرت کی فکر نہ کی تو گویا مال ہی ان کا مطلوب و مقصود ہو گیا۔ وہ مال اکٹھا کرنے میں ایسا گرفتار ہوئے کہ اللہ کے احکام اور حلال و حرام کی حدود کے بھی پابند نہ رہے اور عقل و دانش کے باوجود گھاٹے میں رہے۔ ایسے لوگوں پر نبی اکرم ﷺ نے لعنت کی ہے اور انہیں درہم و دینار کا بندہ قرار دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ دنیا جہان والوں کے لیے رحمت تھے۔ آپ ﷺ نے انسانوں کو ان تمام خطرات سے آگاہ کر دیا جو ان کے لیے خسران کے باعث ہیں اور وہ تمام کام بھی بتا دیے جو ابدی خسارے کا باعث ہوں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تم پر فقر و ناداری آنے سے نہیں ڈرتا' لیکن مجھے تمہارے بارے میں یہ ڈر ضرور ہے کہ دنیا تم پر زیادہ وسیع کر دی جائے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر وسیع کی گئی تھی پھر تم اس کو بہت زیادہ چاہنے لگو جیسا کہ انہوں نے اس کو بہت



زیادہ چاہا تھا اور پھر وہ تم کو برباد کر دے جیسے کہ اس نے ان اگلوں کو برباد کیا۔'' (متفق علیہ)

حضور اکرم ﷺ کو وہ صابر بندہ پسند ہے جو مفلس اور نادار ہو' لیکن صبر کے ساتھ فقر و فاقہ کی زندگی گزار رہا ہو۔ آپ ﷺ نے خود اپنے لیے فقر و فاقہ کی زندگی کو پسند کیا اور عیش و عشرت سے دور رہے۔ مال و دولت آجانے کے باوجود بھی آپ کی زندگی میں سادگی رہی۔ جو لوگ تنگدستی میں زندگی گزار رہے ہیں ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ سکون و اطمینان کا باعث ہے۔ وہ فقر و فاقہ کی تکلیفوں میں لذت اور راحت کا سامان پاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کو اپنا وہ مؤمن بندہ بہت پیارا ہے جو غریب و نادار اور عیال دار ہو اور اس کے باوجود باعفت ہو۔'' (ابن ماجہ) یعنی جو ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے اور کسی کے سامنے اپنی ضروریات ظاہر کرنے سے پرہیز کرتا ہو۔

ہر انسان کو طبعی حاجات ہیں۔ زندہ رہنے کے لیے اسے خوراک کی ضرورت ہے' پہننے کے لیے لباس اور رہنے کے لیے چھت کی ضرورت ہے۔ پھر اپنے بیوی بچوں کی ضروریات کا بھی وہ کفیل ہے۔ چنانچہ وہ محنت کرے اور دولت کمائے۔ قرآن مجید میں بایں الفاظ اس کا حکم ہے: {وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا} (القصص:۷۷) ''اور دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولیے''۔ اپنی ضروریات کے لیے اور ہمسایوں' مہمانوں اور غریبوں کی مدد کے لیے کمانا نہ صرف جائز بلکہ فضیلت کا باعث ہے۔ حدیث میں ہے: ((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى)) (صحیح البخاری و صحیح مسلم) ''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔'' جب آدمی کے پاس ضرورت سے زائد مال ہو تو وہ ضرورت مندوں کی خبرگیری کر سکتا ہے۔ روزی کمانے کے لیے کوشش اور جدوجہد جائز طریقوں سے کرنا انسان پر لازم ہے' مگر روزی کی کمی بیشی اللہ کے ہاتھ میں ہے: {اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ

}(العنکبوت:٦٢) ''اللہ پھیلاتا ہے روزی جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اور ماپ کر دیتا ہے جس کو چاہے''۔پس جس کی روزی کشادہ ہو وہ اسے نعمت سمجھے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے ۔ خدا رسیدہ بزرگوں میں ایسے بھی ہوئے ہیں جو مالدار تھے مگر وہ اپنی دولت سے ضرورت مندوں کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی فراخ روزی میں ناداروں کا حق ہے جو انہیں ناداروں کو دینا ہے' وہ ان پر احسان نہیں کرتے بلکہ ان کا حق ان



کو دیتے ہیں ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے : {وَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۱۹﴾} (الذّٰریٰت) ''اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کے لیے حق ہے''۔ حق دار مالک ہوتا ہے۔ یوں اگر کوئی مالدار اپنے مال میں سے حق داروں کا حق ادا نہیں کرتا تو وہ خائن اور غاصب ہے۔ اسی لیے مال دار متقی اور پرہیزگار اپنی دولت کو سنبھال کر نہیں رکھتے بلکہ مستحقین کی تلاش میں رہتے ہیں کہ ان کا مال ان کے سپرد کریں۔ پس جائز طریقے سے مال کمانا اور اس میں سے فی سبیل اللہ خرچ کرنا اچھا کام ہے۔

ایک روز رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مجلس میں تشریف لائے۔ آپؐ کے سر مبارک پر اُس وقت پانی کا اثر تھا۔ ایک صاحب نے عرض کیا :یارسول اللہ ! ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت حضور کا مزاج بہت اچھا اور دل بہت خوش ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''ہاں''۔ پھر اہل مجلس دنیوی خوشحالی اور دولت مندی کا کچھ تذکرہ کرنے لگے۔ تو آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے اُس کے لیے مال داری میں کوئی مضائقہ اور کوئی حرج نہیں' اور صحت مندی صاحب تقویٰ کے لیے دولت مندی سے بھی بہتر ہے' اور خوش دلی بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہے''۔(مسند احمد) پس مالداری اور دولت مندی اگر تقویٰ کے ساتھ ہو تو اس میں کوئی خطرہ نہیں بلکہ فضیلت ہے۔ ایسا دولت مند شخص فی سبیل اللہ خرچ کر کے اپنی نیکیوں میں اضافہ کر لیتا ہے اور دولت کا اس طرح خرچ کرنا اسے جنت کے اعلیٰ درجوں تک پہنچنے کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ دولت مند صحابہؓ میں سے تھے اور انہوں نے ضرورت کے موقعوں پر بے حساب اور بے دریغ دولت لٹائی۔ دولت کے راہِ خدا میں خرچ کرنے پر رسول اللہ ﷺ نے ان کو دعائیں دیں اور بڑی بڑی بشارتیں سنائیں۔

اگر دولت مند آدمی خوفِ خدا رکھتا ہو اور فی سبیل اللہ خرچ کر کے کسی طرح کی نمائش نہ چاہتا ہو بلکہ اس کا مقصد محض رضائے الٰہی ہو تو وہ اللہ کا محبوب بندہ بن جاتا ہے ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''اللہ تعالیٰ اس متقی دولت مند سے محبت کرتا ہے جو نامعروف اور چھپا ہوا ہو۔'' (مسلم) یعنی وہ بندہ مال خرچ کر کے ناموری اور شہرت کا طالب نہ ہو بلکہ اس کا فی سبیل اللہ خرچ کرنا محض اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کے لیے ہو۔

اگر انسان نیک مقاصد کے لیے دولت حاصل کرنے کی سعی کرے اور وہ اس میں کامیاب رہے تو نہ صرف وہ خوشحالی حاصل کر لیتا ہے بلکہ اسے اعلیٰ درجے کی فضیلت حاصل ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''جو شخص دنیا کی دولت بطریق حلال اس مقصد سے حاصل کرنا چاہے تاکہ اس کو دوسروں سے سوال نہ کرنا پڑے اور اپنے اہل و عیال کے لیے روزی اور آرام و آسائش کا سامان مہیا کر سکے اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بھی وہ حسن سلوک کر سکے تو قیامت کے دن وہ اللہ کے حضور اس شان کے ساتھ حاضر ہوگا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن اور چمکتا ہوگا۔'' (رواہ البیہقی فی شعب الایمان) معلوم ہوا کہ اچھی نیت اور نیک مقاصد کے لیے دنیا کا مال حلال ذریعے سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے' اور ایسا شخص قیامت کے دن امتیازی شان کا حامل ہوگا اور اس کی خصوصی فضیلت ہوگی۔

رزق کا گھٹانا بڑھانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ کم رزق والا بھی امتحان میں ہے اور صاحب ثروت بھی۔ ان کی کامیابی کا دارو مدار ان کے رویے پر ہے۔ اگر غریب اور نادار کم روزی کے ساتھ صبر کرتا ہے 'شکوہ و شکایت نہیں کرتا اور کم مقدار کی روزی میں مشکل کے ساتھ وقت گزارتا ہے' راضی برضا کی کیفیت میں رہ کر فرائض ادا کرتا اور حقوق العباد میں بھی کوتاہی نہیں کرتا تو وہ خوش نصیب اور کامیاب ہے ۔ اور اگر دولت مند آدمی جائز ذرائع سے مال حاصل کرتا ہے اور اس مال کو حقوق العباد کی ادائیگی میں خرچ کرتا ہے' زکوٰۃ کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا تو وہ بھی خوش نصیب اور کامیاب ہے۔ اس کے برعکس نادار ہو یا دولت مند اگر رویے میں متقی نہیں تو اسے ناکامی اور حسرت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

* * *



# ۱۲ ربیع الاوّل کے جلوس کی حقیقت

حضور اکرم ﷺ مکہ میں پیدا ہوئے جو اُس وقت جہالت کا گڑھ تھا۔ چالیس سال کی عمر میں جب آپؐ پر وحی نبوت کا آغاز ہوا تو آپ ؐ نے اللہ کے حکم سے لوگوں کو راہِ حق کی طرف بلایا: ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا!

انتہائی نامساعد حالات میں آپ اللہ کا حکم لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ اس کام میں آپؐ نے سخت تکالیف اٹھائیں ‘یہاں تک کہ جو چند لوگ دین اسلام میں داخل ہو گئے مکہ میں ان کا رہنا ناممکن بنا دیا گیا۔ آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت دی اور خود بھی مکہ کو خیرباد کہہ کر مدینہ چلے گئے۔ یہاں بھی قریش مکہ نے آپ ﷺ کو چین سے نہ بیٹھنے دیا‘ مگر آپ ﷺ کی مخلصانہ اور انتھک مساعی کا نتیجہ تھا کہ مدینہ منورہ اسلام کا گہوارہ بن گیا۔ اسلام کو مٹانے کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں‘ مدینہ اسلام کی روشنی سے چمک اٹھا۔ ہجرتِ مدینہ کے آٹھویں سال مسلمان اس قابل ہو گئے کہ وہ حضور ﷺ کی قیادت میں فاتحانہ مکہ میں داخل ہو گئے۔

{کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَۃُ الۡمَوۡتِ} کے مصداق رسول اللہ ﷺ ہجرت کے ۱۰ سال بعد رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ پر دین اسلام کی تعلیم مکمل کر دی گئی تھی اور اسلام ضابطۂ حیات کے طور پر مسلمانوں میں رائج ہو چکا تھا۔ قرآن مجید میں اعلان آ چکا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی لوگوں کے لیے بہترین نمونہ ہے ۔ چنانچہ آپ ﷺ کے اصحاب نے آپؐ کی پیروی میں اپنی زندگیوں کو نہ صرف خود اسلام کے مطابق ڈھالا بلکہ آپؐ کے مشن کی تکمیل میں لگ گئے۔ آپؐ کے بعد اسلام روئے زمین پر لاکھوں مربع میل میں پھیل گیا۔

اسلامی تعلیمات پر عمل کے اعتبار سے خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا زمانہ بہترین تھا کہ دین اسلام خالص حالت میں مسلمانوں میں رائج رہا۔ لوگوں کے پیش نظر یہ فرمان رسولؐ تھا کہ لوگو تم پر لازم ہے کہ تم میرے طریقے کو اپنائو اور میرے خلفائے راشدین کا طریقہ اختیار کرو۔ نیز یہ بھی اعلان کر دیا کہ اسلامی تعلیمات کی تکمیل ہو چکی ہے اور اب اس میں کسی اضافے کی



ضرورت نہیں اور یہ تکمیل بھی خود رسول اللہ ﷺ کے حین حیات اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ ان الفاظ میں کر دی کہ: {اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا} (المائدۃ:۳) ’’آج کے دن میں نے

تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تمہارے اوپر تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام پسند کیا''۔نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ {وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ} (آل عمران:۸۵)''جو کوئی دین اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اپنائے گا وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا''۔گویا اب انسان مسلم اور کافر دو فریقوں میں تقسیم ہو گئے۔ مگر زمانے کے ساتھ ساتھ مسلمان قرآن و سنت کے راستوں کو چھوڑتے گئے اور اپنے خود ساختہ طریقے اپنانے لگے' اگرچہ رسول اللہ ﷺ یہ بھی فرما گئے تھے کہ میری اُمت کئی گروہوں میں بٹ جائے گی 'مگر ان میں ایک گروہ ایسا ہو گا جو میرے اور میرے صحابہؓ کے راستے کو ہی اپنائے گا اور وہ گروہ ہی صحیح راہ پر ہو گا۔

آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت نے دین کو بازیچہ ٔاطفال بنا رکھا ہے اور دین میں نت نئی رسموں کا اضافہ کر لیا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا واضح ارشاد موجود ہے : ((مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَھُوَ رَدٌّ)) (متفق علیہ)''جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی چیز داخل کی جو اس میں نہیں ہے تو وہ مردود ہے''۔ یعنی وہ شخص بھی مردود ہے اور وہ چیز بھی مردود ہے۔ اسی لیے خیر القرون میں دین اسلام بطور ضابطہ حیات اپنی اصل حالت میں موجود رہا اور جوں جوں مسلمان اسلامی اخلاق چھوڑتے گئے ' اپنی من پسند چیزیں دین اسلام میں داخل کرتے گئے 'تاکہ وہ جرائم بھی کرتے رہیں اور ان پر حب نبوی کا زعم بھی رہے 'حالانکہ مسلمان معاشرے میں جرائم برائے نام ہی ہوں گے 'دَور دورہ عدل و انصاف اور اخلاقی خوبیوں کا ہو گا۔

آج آپ دیکھیں 'حب ِنبوی کی آڑ میں رسول اللہ ﷺ کا میلاد زور وشور سے منایا جا رہا ہے 'مگر معاشرہ ہے کہ جرائم کا گڑھ بن چکا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمان خالص اسلام پر کاربند ہوتے اور ان اقدام کو کافی جانتے جو حقیقی محبان نبوی یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنائے تھے۔ یقینا وہ اقدام خلوص پر مبنی تھے اور عین رسول اللہ ﷺ کی منشا کے مطابق تھے' لہٰذا معاشرہ امن و سلامتی کا گہوارہ بن گیا اور جرائم اور اخلاقی برائیاں خال خال رہ گئیں۔



میلاد النبی کی آڑ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت کا دعویٰ کیا جا رہا ہے جو سراسر حقیقت کے خلاف ہے۔ جلوس نکالے جا رہے ہیں 'جن میں اخلاقی اقدار کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں۔ بڑی بڑی شاہراہوں سے جلوس اس طرح گزرتے ہیں کہ آمد و رفت گھنٹوں معطل رہتی ہے۔ ایسے جلوسوں کی قیادت علمائے کرام ہی کر رہے ہوتے ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ راستوں کا بند کرنا ہرگز جائز نہیں' اس سے عوام الناس کو تکلیف ہوتی ہے' ضرورت مند اور مریض مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں' جبکہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمان اُس کو کہا ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اس کے برعکس تکلیف دہ کسی چیز کو راہ سے ہٹانا بہت بڑی نیکی ہے تو پھر لوگوں کے لیے راہ بند کرنا کتنا بڑا جرم ہو گا' کیا اُسوۂ حسنہ میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے؟اس جلوس میں شامل

لوگ جب ان مساجد کے پاس سے گزرتے ہیں جن کے نمازی اس غیر مسنون جلوس میں شمولیت نہیں کرتے تو وہاں رک کر خوب نعرے بازی کرتے ہیں تاکہ اپنی حب نبی ﷺ کو عیاں کریں ‘اس طرح وہ ضد بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہاں بھی جلوس کے قائدین لوگوں کو یہ تعلیم نہیں دیتے کہ ان مسجدوں کے نمازی بھی مسلمان ہیں۔ انہیں بھی نبی مکرم ﷺ کے ساتھ محبت ہے ‘ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا درست نہیں‘ ان کا اس جلوس میں شامل نہ ہونے کا سبب نبی ﷺ کے ساتھ محبت کا نہ ہونا نہیں بلکہ وہ اس جلوس کو مسنون نہیں سمجھتے اس لیے اس میں شامل نہیں ہوتے۔ جلسے جلوس قائم کر کے جو لوگ محبت رسول کا دعویٰ کرتے ہیں اگر یہ لوگ اس دعوے میں سچے ہیں تو معاشرے سے جرائم ختم ہو جانے چاہئیں‘ مگر مشاہدہ یہ ہے کہ دن بدن معاشرہ بد سے بدتر جرائم اور گناہوں میں مبتلا ہوتا جا رہا ہے۔ بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ لوگ میلاد النبی ﷺ منا کر اپنے دل کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ اگر ہم جرائم بھی کریں گے تو میلاد النبی کی خوشی میں کیے ہوئے کام ان کو بے اثر کر دیں گے۔

بازاروں اور گھروں کو طرح طرح سے سجایا جاتا ہے ۔ قیمتی وقت‘ روپیہ اور محنت خرچ کی جاتی ہے۔ اسی طرح مسجدوں کو بھی جھنڈیوں اور قمقموں سے بقعہ نور بنایا جاتا ہے۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ مسجدوں کو سجانے والے تزئین کا کام کر رہے ہوتے ہیں اور مسجد میں نماز پڑھی جا رہی ہوتی ہے ۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ ُحب نبی ﷺ کا یہ کام نماز سے زیادہ اہم ہے۔ گلیوں‘ بازاروں اور مسجدوں میں روشنی کے انتظام کے لیے بجلی بھی عموماً ناجائز طور پر لی جاتی ہے۔ کیا یہ طرزِ عمل



بھی اسلامی اخلاق پر پورا اترتا ہے؟کیا جو شخص رسول اللہ ﷺ کی محبت میں سرشار ہو اسے چوری کی اجازت ہے؟ جبکہ اللہ اور رسول ؐ کے نزدیک چوری ایسا جرم ہے جس کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ایک وقت آئے گا جب لوگ وہ کام نہیں کریں گے جن کا حکم دیا گیا ہے اور وہ کام کریں گے جن کا حکم نہیں دیا گیا۔ مسلمان معاشرے کی اکثریت نماز اور نماز باجماعت ادا نہیں کرتی‘ حالانکہ نماز پنج گانہ کا تاکیدی حکم احادیث سے ثابت اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرزِ عمل سے ظاہر ہے۔ نماز رکن اسلام ہے۔ یہ آپ ﷺ کا زندگی بھر کا عمل ہے ۔کیا ہمارے معاشرے میں جو رونق عید میلاد النبی ﷺ کے جلوس میں نظر آتی ہے یہ مسجدوں میں نظر آتی ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو اور تنگی نہ کرو۔ رمضان کی راتوں کی عبادت کی بڑی فضیلت ہے ‘اسی طرح وضو کرتے ہوئے مسواک کرنا اور پھر نماز ادا کرنا ثواب کو بہت بڑھا دیتا ہے‘ مگر نہ تراویح کو فرض کا درجہ دیا گیا ہے اور نہ مسواک کو۔ صاف ظاہر ہے‘ یہ اس لیے ہوا کہ فرض ہونے کی صورت میں یہ کام اُمت کی اکثریت کے لیے دشوار ہوتا۔ لہٰذا آزادی رکھی گئی کہ جس کے لیے نیکی میں آگے بڑھنے کا جذبہ ہو اور ان اعمال کی ادائیگی میں آسانی ہو وہ انہیں اختیار کر لے اور اختیار نہ کرنے والے بھی گناہگار نہ ہوں۔

کیا اس قدر آسانیاں پیدا کرنے والے دین میں لوگوں کو مشکل میں ڈالنا جائز ہو سکتا ہے؟ چونکہ عید الفطر اور عید الاضحی کے دن بلا اختلاف معلوم ہیں اور ان کے پروگرام بھی تفصیل کے ساتھ بتا دیے گئے ہیں اس لیے یہ دونوں عیدیں منانے میں کسی طرح کا کوئی تکلیف دہ عمل نہیں ہوتا اور نہ کوئی شور شرابہ ہوتا ہے ۔یہ دن سکون و اطمینان سے گزر جاتے ہیں' جبکہ عید میلادالنبی ﷺ کا پروگرام انسانوں کا اپنا بنایا ہوا ہے۔ اس میں نہ یکسانیت ہے اور نہ ہی دوسرے لوگوں کا مفاد مدنظر ہے 'لہٰذا ان جلوسوں میں بعض جگہ گانے کی طرز پر نغمے' ڈانس اور بھنگڑے کے علاوہ طرح طرح کے خودساختہ تفریحی پروگرام بنائے جاتے ہیں' جو عام لوگوں کے امن و چین کو غارت کرنے والے ہوتے ہیں۔ کیا اس طرح کے طرزِ عمل کی اسلام جیسے ہمدردی اور سکون والے دین میں گنجائش ہو سکتی ہے؟ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''بدعت بانجھ نہیں ہوتی' بلکہ یہ نئے نئے بچے جنم دیتی رہتی ہے''۔ چنانچہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ''عید میلاد النبی ﷺ'' کے جلوسوں اور پروگراموں میں ہر سال نئے نئے اضافے وجود میں



آتے رہتے ہیں۔ اس سال ان پروگراموں میں کرسمس کی طرح کیک بھی کاٹے گئے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے بچے سڑکوں' بازاروں میں موٹر سائیکلوں' سائیکلوں اور گاڑیوں کو روک کر ان سے چندہ مانگتے ہیں۔ گویا مسلمان بچوں کو بھیک مانگنے پر لگادیا گیا ہے اور وہ معصوم اس کام کو کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔ ان کو کیا پتا کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو کسی سے سوال کرنے سے روکا ہے ۔ اگر کسی گھوڑ سوار صحابی کا تازیانہ گر جاتا تو وہ اس بات کو پسند کرتا کہ کسی کو نہ کہے بلکہ خود گھوڑے سے اتر کر اپنا چابک پکڑے۔ دُنیوی علوم میں بلاشبہ آگے بڑھنے کی اجازت ہے۔ تیر اور تلوار کے بعد بندوق اور رائفل' تانگے کے بعد موٹر کار' تیز رفتار گاڑیاں اور پھر ہوائی جہاز ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانا بالکل جائز ہے 'کیونکہ یہ دین کی چیزیں نہیں بلکہ دنیوی ایجادات ہیں۔ یہ بدعات نہیں ہیں۔ اسلام سے بہتر کوئی دین نہیں اور نہ اسلام کو مزید بہتر بنانے کی گنجائش ہے۔ اب تو صرف رسول اللہ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طریقہ ہی صواب ہے اور کامل ہے۔ جب کوئی بدعت رواج پاتی ہے تو وہ سنت کو مٹاتی ہے۔ فرض نماز کے بعد مسنون اذکار بتائے گئے ہیں' جبکہ نماز کے فوراً بعد غیر مسنون وظائف اونچی آواز میں پڑھے جائیں گے توحدیث میں مذکور مسنون اذکار کو یا چھوڑا جائے گا یا ثانوی حیثیت دی جائے گی' حالانکہ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے اذکار ہی سب سے زیادہ فضیلت والے ہیں' جس وقت کے لیے جو اذکار بتائے گئے ہیں وہی بہترین ہیں۔ اسی طرح جو عیدیں رسول اللہ ﷺ نے منائی ہیں اور منانے کا حکم دیا ہے' نیز منانے کا طریقہ بھی بتایا ہے بس وہ عیدیں کافی ہیں۔ اپنی طرف سے بنائی گئی عید حقیقی اسلام کا حصہ نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو حب رسول میں چوٹی پر تھے انہوں نے میلاد النبی ﷺ کے دن کو نہ عید بنایا اور نہ منایا۔

اسلام میں فضول خرچی کو سختی سے منع کیا گیا ہے ۔قرآن مجید میں فضول خرچی کرنے والوں کو شیاطین کے بھائی کہا گیا ہے ۔ فضول خرچی کیا ہے؟ کسی دینی یا دنیوی ضرورت کے علاوہ خرچ کرنا فضول خرچی ہے۔ مسجدوں' بازاروں اور گھروں میں ضرورت سے زیادہ روشنی فضول خرچی میں آتی ہے۔ ہاں اگر رسول اللہ ﷺ کے وقت خاص خاص موقعوں پر مسجدوں' گھروں اور بازاروں کو سجایا جاتا تھا تو یہ کام مسنون ہو گا' ورنہ بدعت جسے قرونِ اولیٰ میں اختیار نہیں کیا گیا۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ان جلوسوں کی قیادت کرنے والے علمائے کرام



ہی ہیں اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان جلوسوں سے حب نبی ﷺ کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ اس طرح محبت جتا کر رسول اللہ ﷺ کو راضی نہیں کیا جا سکتا۔ آپؐ کو راضی کرنے والے سارے کام تفصیل کے ساتھ قرآن و حدیث میں مذکور ہیں' اور پھر مسلمانوں کو ایسے کاموں میں الجھانا جو سنت سے ثابت نہیں بلکہ ان کے نقصانات اظہر من الشمس ہیں' کیسے زیب دیتا ہے کہ علمائے کرام ان کی نکیر کرنے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کریں اور خود بھی ان میں شریک ہوں؟

اس ضمن میں ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ اکثر بڑے لوگوں کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہوتی۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو کسی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ بڑا ہو کر مشہور آدمی بنے گا' لہٰذا اس کی تاریخ پیدائش کو سنجیدگی کے ساتھ نہیں لیا جاتا۔ یہی معاملہ رسول اللہ ﷺ کی تاریخ پیدائش میں پیش آیا۔ کسی کو کیا پتا تھا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ چالیس سال یونہی گزر گئے۔ آپ کے بچپن اور لڑکپن کے حالات عام طور پر زیادہ معلوم نہیں۔ نبوت کے آغاز سے آپ ﷺ کی وفات تک کا لمحہ لمحہ تحریری صورت میں موجود ہے' کیونکہ اب آپ کا تعارف ہو چکا تھا اور ہر چیز جو آپ کے متعلق تھی نوٹ ہوتی جاتی تھی۔ لہٰذا آپ کی تاریخ پیدائش بعض کے نزدیک کچھ ہے بعض کے نزدیک کچھ۔ اکثر علماء اور مؤرخین کے نزدیک آپ کی تاریخ پیدائش ۹ ربیع الاول ہے۔ تاہم یہ بھی حتمی نہیں۔ البتہ آپ کی وفات کی تاریخ ۱۲ ربیع الاول بتائی جاتی ہے ۔اس لیے آج سے تیس چالیس سال پہلے تک ۱۲ ربیع الاول کو بارہ وفات کہا جاتا تھا اور لوگ اس دن غم کا اظہار کرتے تھے۔ اب اسی ۱۲ تاریخ کو آپ ﷺ کا یومِ پیدائش کہا جاتا ہے اور یہ ایک جشن کی صورت اختیار کر گیا ہے' حالانکہ جیسا کہ ذکر کیا گیا ۱۲ ربیع الاول آپ کی حتمی تاریخ پیدائش نہیں۔ اگر تاریخ پیدائش پر کسی جشن کا اہتمام کرنا شریعت میں مطلوب ہوتا تو خدائی انتظام کے تحت تاریخ پیدائش نہ صرف صحیح بتائی جاتی بلکہ اس دن خوشی منانے کا بھی حکم دیا جاتا' جس طرح عید الفطر اور عید الاضحی کے دن نہ صرف حتمی طور پر بتائے گئے ہیں بلکہ ان عیدوں کے پروگرام بھی تفصیل کے ساتھ بتائے گئے ہیں۔ اس کے برعکس عید میلاد النبی ﷺ کے نام پر منائی جانے والی اس عید کی تاریخ حتمی نہیں اور نہ اس کا

پروگرام ہی بتایا گیا ہے ۔ معلوم ہوا یہ تقریب شریعت میں مطلوب ہی نہیں۔
اسلام میں عید الفطر اور عید الاضحی ہی مستند تقاریب ہیں۔ اس کے علاوہ اور کسی خوشی کے



موقع کی یاد منانا مسنون ہوتا تو بدر کی فتح کا دن اور فتح مکہ کا دن منائے جاتے' اور اگر غم کی یاد منانا ہوتا تو جنگ اُحد میں اللہ کے رسول ﷺ کے دندانِ مبارک کی شہادت اور طائف میں جو آپ ﷺ پر تشدد کیا گیا 'یہ دن غم کے انداز میں منائے جاتے' لیکن سب جانتے ہیں کہ ان میں کسی دن کو نہ خوشی کی تقریب کا رنگ دیا گیا نہ غمی کا' حالانکہ یہ یادگار دن خود رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں پیش آئے تھے اور کئی سال تک یہ تاریخیں آتی رہیں' مگر یہ نہ آپ ﷺ کی زندگی میں منائی گئیں اور نہ عہد خلافت راشدہ میں۔

بچوں یا بڑوں کی سالگرہ منانا کبھی مسلمانوں کا معمول نہیں رہا 'یہ خالصتاً غیر مسلموں کا کام ہے۔ مغربی غیر مسلموں کی غلامی کے دوران جس طرح بہت سے کام ہم نے ان کی نقالی میں اختیار کیے سالگرہ منانا بھی ان میں سے ایک ہے 'حالانکہ ہمیں دوسری غیر مسلم قوموں کی نقالی سے منع کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے جہاں کافروں کی نقالی سے روکا ہے وہاں یہ بھی فرمایا کہ جو مسلمان ان کی نقالی کرے گا وہ ان ہی میں شمار ہو گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جوں جوں کسی کی عمر کے سال گزرتے ہیں اُس کی طبعی عمر اتنے سال کم ہوتی جاتی ہے' گویا گزرنے والے دن اور سال انسان کی مہلت عمر کو گھٹا رہے ہیں 'نیز اُس کے لیے آخرت کی تیاری کا وقت کم ہو رہا ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ زندگی کو غنیمت جانے اور اسے نیک کاموں میں گزارے' پتا نہیں کس وقت بلاوا آجائے اور اپنی غفلت پر پچھتانا پڑے ۔ زندوں اور فوت شدگان کے دن منانے کی کوئی مثال قرونِ اولیٰ میں نہیں ملتی 'نہ صحابہ کے دور میں 'نہ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں۔

یہ حقیقت تو ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ربیع الاول کے کسی دن یا ۱۲ تاریخ کا یہ عمل نہ فرض اور سنت ہے نہ واجب اور مستحب۔ اگر اسے کسی درجہ میں خیر بھی سمجھا جائے تو اس میں شامل نہ ہونے والوں پر نکیر نہیں کی جا سکتی۔ جب فرضوں کے علاوہ نفل نماز پڑھنے والوپر کوئی اعتراض نہیں تو اس ''اضافی نیکی'' کا نہ کرنا کیسے قابل اعتراض اور نفرت کا موجب ہو سکتا ہے؟ اگر عید میلاد النبی ﷺ کے جلوس میں شامل نہ ہونے والوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو اصحابِ رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حب نبی ﷺ کے ضمن میں کس درجہ پر رکھا جائے گا' جنہوں نے اس قسم کا جلوس نہ منعقد کیا اور نہ اس میں شرکت کی ! کیا وہ بھی شافعِ محشر کی محبت کے اجر سے محروم رہے؟

* * *

# تیسری عید؟

رسول اللہ ﷺ الرفیق الاعلیٰ کی طرف مراجعت کرنے سے قبل دین اسلام اکمل صورت میں امت کے حوالے کر گئے اور دین میں کسی طرح کی کمی بیشی کا دروازہ یہ کہہ کر بند کر دیا کہ ((مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْہُ فَھُوَ رَدٌّ)) (متفق علیہ)''جس شخص نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات پیدا کی جو اس میں نہیں تو وہ نامقبول ہے''۔اسی لیے دین میں کسی طرح کا اضافہ بدعت کہلاتا ہے۔ پس ایسا کام کرنا جس کی اصل کتاب و سنت اور قرون مشہود لہا بالخیر میں نہ ہو اور اس کو دین اور ثواب کا کام سمجھ کرکیا جائے بدعت کہلاتا ہے۔ دین اسلام کی تکمیل پر اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر مہر لگا دی کہ {اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ} (المائدۃ:۳) ''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے''۔ مکمل چیز میں کسی کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر جس چیز کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ مکمل کر دے اس میں تو کسی اضافے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔جو دین کامل صورت میں رسول اللہ ﷺ اُمت کے حوالے کر گئے اس میں عیدیں دو تھیں۔ آج تیسری عید کا اضافہ دین کے مزاج کے خلاف ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی پیدائش یا وفات کے دن منانے کی کوئی نظیر سنت میں نہیں ملتی۔ یقینا رسول اللہ ﷺ کی پیدائش کا دن خوشی کا دن ہے او ر وفات کا دن غمی کا دن ہے ،مگر یہ دن آپ ﷺ کی مکی زندگی میں بھی ہر سال آتے رہے اور مدنی زندگی میں بھی ۔ مگر آپ ؐ نے نہ یہ دن منائے اور نہ اُمت کو حکم دیا۔یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد آپؐ کے خلفائے راشدین ؓ کے دور میں بھی یہ دن نہ منائے گئے۔ خلفائے راشدین رسول اللہ ﷺ کے صحیح پیروکار اور پکے سچے مسلمان تھے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَائِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ))(ابوداؤد، ترمذی)''پس تمہارے لیے لازم ہے کہ میرا طریقہ اختیار کرو اور میرے ہدایت یافتہ، راست رو خلفاء کا طریقہ اختیار کرو۔''



چونکہ تیسری عید نہ عہد رسالت میں تھی، نہ خلفائے راشدین کے دور میں ،اس لیے اس کے منانے کا طریقہ بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ کوئی جلوس نکال رہا ہے اور نعرے لگا رہا ہے،کوئی گھروں اور مسجدوں کو جھنڈیوں اور روشنیوں سے سجا رہا ہے ،کوئی راہ گیروں سے چندہ مانگ کر گلیوں بازاروں میں پہاڑیاں بنا رہا ہے۔ اس دن کے

جلوسوں کی قیادت علمائے دین کر رہے ہیں ‘جبکہ ان کے اندر خلافِ شریعت کام بھی ہو رہے ہیں‘ مثلاً جلوس کی بڑائی ثابت کرنے کے لیے راستے روکے جا رہے ہیں اور آنے جانے والوں کے لیے مشکل پیدا کی جا رہی ہے۔ کیا یہ علماء نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان نہیں جانتے کہ ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ)) (متفق علیہ) ’’مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں؟‘‘ اگر حضور ﷺ کے ساتھ محبت کا یہ انداز ہے تو کیا خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین حب نبی ﷺ سے خالی تھے؟ نعوذ باللہ ! صاف ظاہر ہے حب نبیؐ جتانے کا یہ مظاہرہ ہوائے نفس کے سوا کچھ نہیں۔ حقیقی اور خالص حب نبویؐ تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو تھی جنہوں نے عملی طور پر رسول اللہ ﷺ کے فرامین پر عمل کر کے دکھایا اور اپنی کسی پسند یاناپسند کو دین میں داخل نہ کیا۔جو عیدیں اسلام میں داخل ہیں اُن کے پروگرام متفق علیہ ہیں ‘اُن میں کوئی اختلاف نہیں ‘مگر یہ تیسری عید جب اسلام میں نہیں تو اس کا پروگرام بھی دین میں نہیں بتایا گیا ۔یہی وجہ ہے کہ منانے والے اپنی مرضی کے پروگرام بنا رہے ہیں ‘موسیقی اور ناچ گانے بھی ہو رہے ہیں۔

خوشی اور غمی کے دن منانا اسلام میں نہیں۔ بدر کی فتح کے دن کو قرآن میں ’’یوم الفرقان‘‘ کہا گیا۔ یہ دن نبی مکرم ﷺ کے حین حیات آٹھ سال تک ہر سال آتا رہا مگر کوئی تقریب نہ منعقد کی گئی۔ اسی طرح دوسرے غزوات میں کامیابی ‘ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ بہت بڑے واقعات تھے مگر ان کی یادوں کے دن نہیں منائے گئے۔ حضور ﷺ کے دندانِ مبارک کی شہادت کا دن اور طائف میں آپؐ کے ساتھ اذیت ناک سلوک‘ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دردناک واقعہ۔ ان واقعات کے دنوں میں سوگ منانے کو رواج نہیں دیا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں خوشی اور غمی کے مواقع ناگزیر ہیں۔ ان کی اتنی کثرت ہے کہ ان کو خوشی یا غمی کے تہوار کے طور پر منانا ممکن ہی نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے :{لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْ} (الحدید:۲۳) ’’تاکہ تم رنجیدہ نہ ہو اس چیز پر جو تم سے جاتی رہے اور نہ ہی اترائو اس چیز پر جو تم کو عطا ہو۔‘‘



قرآن و حدیث کا فہم نہ رکھنے والوں پر کیا افسوس ! افسوس ان علمائے کرام پر ہے جو اس عید کو نہ صرف اپنے بنائے ہوئے طریقوں سے اپناتے ہیں ‘ بلکہ اسے قرآن سے بایں طور ثابت کرتے ہیں: {قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا ... } (المائدۃ:۱۱۴) ’’عیسیٰ بن مریم نے کہا: اے اللہ‘ رب ہمارے ! اتار ہم پر خوان بھرا ہوا آسمان سے کہ وہ دن ہمارے لیے عید رہے ...‘‘ اگر اس آیت سے تیسری عید ثابت ہوتی ہے تو خود رسول اللہ ﷺ نے یہ عید کیوں نہ منائی اور اپنی امت کو اس کے منانے کا حکم کیوں نہ دیا؟ کیا آج کے یہ علماء قرآن حکیم کو رسول اللہ ﷺ سے زیادہ سمجھتے ہیں؟ یار لوگوں کا کیا کہنا ‘انہوں نے تو غیر اللہ کو سجدہ کرنے کا جواز بھی قرآن سے ڈھونڈ لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا تو کیا آدم ؑ غیر اللہ نہ

تھا؟ پس (اُن کے نزدیک) غیر اللہ کو سجدہ قرآن سے ثابت ہو گیا ! (لَا حَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ) ۔ سورۃ الکہف میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک بندے نے موسیٰ علیہ السلام کو ان باتوں کی خبر دی جو وہ نہیں جانتے تھے ۔پس (ان کے نزدیک )ثابت ہوا کہ غیرِ نبی نبی اللہ سے زیادہ فضیلت رکھ سکتا ہے ! اسی طرح میں نے ایک پڑھے لکھے شخص سے پوچھا: دوست ! آپ لوگ روتے پیٹتے کیوں ہیں؟ وہ کہنے لگا: واہ آپ نے قرآن نہیں پڑھا؟ میں نے کہا: کچھ تو پڑھا ہے ۔وہ کہنے لگا :(سورۃ الفاتحہ کے بعد) قرآن کا تو آغاز ہی ''الٓمٓ'' سے ہوتا ہے۔ ان حروفِ مقطعات ''الٓمٓ'' کو جوڑیں تو ''الم'' بنتا ہے جس کا معنی ہے دکھ' درد' رنج۔ ہمارا تو قرآن ہی الم سے شروع ہوتا ہے۔ اگر سمجھنے کا یہی انداز ہے تو قرآن سے ہر چیز ثابت ہو سکتی ہے۔قرآن حکیم میں ارشاد ہے :''سو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ پیروی کرتے ہیں متشابہات کی گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے' اور ان (متشابہات) کا حقیقی مفہوم کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے۔'' (آل عمران:۷)

کہا جاتا ہے کہ قرآن کے اعراب بھی بعد میں لگائے گئے ۔جان لینا چاہیے کہ یہ وقت کی ضرورت تھی' کیونکہ اعراب کے بغیر غیر عرب قومیں نہ قرآن کو پڑھ سکتی تھیں نہ سمجھ سکتی تھیں۔ کیا حب نبی ﷺ کی بھی اب ضرورت پڑی ہے جو یہ عید ایجاد کرنا پڑی؟ اس تیسری عید کی ایجاد سے پہلے مسلمان حب نبی ﷺ سے بے خبر تھے؟ تیسری عید کے جوازمیں خوابوں کا سہارا بھی لیا



جاتا ہے ۔عوام تو ناواقف سہی لیکن کیا یہ علماء بھی نہیں جانتے کہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کے خواب سے اُمت کے لیے کوئی حکم وضع نہیں کیا جا سکتا؟ محفل میلاد میں ایک شخص یہ اعلان کرتا ہے کہ دیکھو حضور ﷺ تشریف لے آئے ہیں ! یہ سنتے ہی سب بیٹھے ہوئے لوگ تعظیماً کھڑے ہو جاتے ہیں ۔کیا مسلمان شرکائِ محفل یہ نہیں جانتے کہ حضور ﷺ نے حین حیات اس بات کو پسند نہیں فرمایا کہ آپؐ تشریف لائیں تو لوگ کھڑے ہو جائیں 'بلکہ آپؐ نے اس بات سے منع فرما دیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ذکر ہوا کہ تمہارے لیے لازم ہے کہ میرا طریقہ اختیار کرو اور میرے ہدایات یافتہ راست رو خلفاء کا طریقہ اختیار کرو۔ چونکہ تیسری عید نہ آپؐ کے طریقہ میں تھی نہ خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں تھی' لہٰذا اس کا پروگرام بھی لوگوں کا اپنا بنایا ہوا ہے۔ اس میں طرح طرح کی تکلیف دہ چیزیں اور منکرات ہوتے ہیں' جن کو علماء جانتے بوجھتے روک نہیں سکتے' کیونکہ اس طرح شرکاء ناراض ہوتے ہیں' مثلاً جلوس کا راستے بند کر کے مسافروں کے لیے تکلیف کا باعث بننا۔ لہٰذا وہ خدا اور رسول کے حکم کی نافرمانی بادل نخواستہ قبول کر لیتے ہیں اور لوگوں کو نہیں روکتے۔ انہیں ضرور پتا ہوتا ہے کہ حجر اسود کا بوسہ لینے میں کسی دوسرے کو دھکا دینا جائز نہیں تو اور کس جگہ جائز ہے کہ دوسروں کو تکلیف میں مبتلا کیا جائے؟ فقہ کے چار معروف امام

ہیں ‘ہر ایک کے ہاں دو ہی عیدیں ہیں ‘عید الفطر اور عید الاضحی۔ تیسری عید کا کوئی تذکرہ نہیں۔ بالفرض اگر کوئی دوسرا شخص اس کا حکم دیتا ہے تو وہ اس بات کا مجاز نہیں کہ حضور ﷺ کی اُمت کو کسی تیسری عید کا پابند کرے۔ اُمت تو بس قرآن و سنت اور خلفائے راشدینؓ کے طریقے کی پابند ہے‘ کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا:

’’جو کوئی تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت سے اختلاف دیکھے گا۔ پس تم پر میری اور میرے ہدایت یافتہ راست رو خلفاء کے طریقے کی پیروی لازم ہے۔ اس کے ساتھ چمٹ جائو اور اسے اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑے رہنا اور نئے نئے کاموں سے بچتے رہنا ‘کیونکہ ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔‘‘

اس عید کے منانے میں جوش و خروش دکھانے والے اگر رسول اللہ ﷺ کی محبت میں سچے ہیں تو معاشرہ گناہوں سے پاک کیوں نہیں ہو جاتا۔ آپؐ سے محبت رکھنے والے گناہوں پر دلیر کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہم دیکھتے ہیں معاشرے میں جرائم تو بڑھتے جا رہے ہیں۔ حب



نبی ﷺ کا یہ طریقہ اپنا کر مسلمان سمجھتا ہے کہ اس نے نبی مکرم ﷺ کو خوش کر لیا ہے۔ اب اسے کوئی گناہ نقصان نہیں دے گا!

اگر تیسری عید قرآن سے ثابت ہے تو یہ بات حضور ﷺ کی نگاہ سے کیوں اوجھل رہی؟ آپ ﷺ پر تو قرآن نازل ہوتا تھا۔ آپ ﷺ نے صرف عید الفطر اور عید الاضحی ہی بتائیں اور منائیں۔ جو مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ دین اسلام میں تین عیدیں ہیں وہ نہیں جانتا کہ اس کے اس عقیدے کی زد کہاں تک پڑتی ہے۔ جہاں تک رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت یا آپؐ کی سیرت اور فضائل بیان کرنے کا تعلق ہے تو اس کے لیے سال کا کوئی ایک دن مقرر کرنے اور پھر پورا سال اس کے آنے کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ ﷺ کے ذکر خیر سے تو ہفتے کا کوئی دن بلکہ دن کا کوئی لمحہ خالی نہیں ہونا چاہیے۔

مختصر یہ کہ جو لوگ یہ تیسری عید منا رہے ہیں وہ اپنی مرضی سے منا رہے ہیں ‘اور جو اسے نہیں منا رہے وہ سنت ِرسولؐ اور سنت صحابہؓ کے طریقے پر ہیں‘ کیونکہ اس طریقے میں یہ موجود نہیں۔ آج بڑے سے بڑا مسلمان عالم دین بھی آپ ﷺ کی امت پر کوئی غیر مسنون کام لازم قرار نہیں دے سکتا۔اُمت کے لیے آپ ﷺ ہی مطاع ہیں۔ اگر آج سے دو تین صدیاں پہلے کے مسلمانوں سے پوچھا جاتا کہ اسلام میں کتنی عیدیں ہیں تو ان کا ایک ہی جواب ہوتا کہ دو ! کیونکہ یہ تیسری عید ان کے ہاں موجود ہی نہ تھی۔ یہ تو سینکڑوں سال بعد کی پیداوار ہے۔

* * *



# قرض کا لین دین

ہر انسان کو دوسرے انسانوں کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔ کسی کی ایک ضرورت دوسروں سے پوری ہوتی ہے اور کسی کو دوسری ضرورت کے لیے محتاجی ہوتی ہے۔ مالی حالت میں بھی تفاوت ہے۔ ایک شخص کی مالی حیثیت مضبوط ہے اور کوئی شخص نادار ہے۔ کوئی شخص بھی اپنی ہر ضرورت خود پوری نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات ایک شخص کے پاس اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے رقم نہیں ہوتی تو وہ اپنے عزیز ' دوست یا رشتہ دار سے قرض لیتا ہے۔ اس معاملے میں بھی اسلامی تعلیمات میں راہ نمائی موجود ہے۔ قرض کے معاملے میں تحریر لکھی جائے۔ قرض کی رقم کی واپسی کی تاریخ طے ہو۔ تحریر لکھنے والا دیانت داری کے ساتھ لکھے۔ جو قرض لے رہا ہے وہ دستاویز لکھوائے اور اس وقت دو مرد گواہ ہوں 'اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہوں۔ گواہ با اعتماد اور مسلمان ہوں۔ اگر قرض کا لین دین ان شرائط کے مطابق کیا جائے تو بعد میں کسی طرح کی الجھن پیدا ہونے کا امکان نہیں ہو گا۔ قرض دینے والا قرض کی دستاویز لکھنے میں سستی نہ کرے۔ حضرت ابو سلیمان مرعشی ؒ نے کہا کہ اس شخص کی دعا قبول نہیں ہوتی جو ایک مدت تک ادھار دیتا ہے 'نہ اس پر گواہ رکھتا ہے' نہ لکھت پڑھت کرتا ہے' پھر جب مدت گزرنے پر تقاضا کرتا ہے تو دوسرا شخص انکار کر دیتا ہے۔ اب یہ خدا سے دعا کرتا ہے' لیکن پروردگار قبول نہیں کرتا 'اس لیے کہ اس نے کام اس کے فرمان کے خلاف کیا اور اپنے رب کا نافرمان ہوا۔ (تفسیر ابن کثیر)

اگر کوئی ضرورت مند قرض مانگے تو مقتدر آدمی اُسے قرض ضرور دے' کیونکہ کسی کی ضرورت پوری کرنا بڑے ثواب کا کام ہے۔ مقروض قرض کی رقم سے اپنی ضرورت پوری کر لے اور پھر وعدے کے مطابق رقم واپس کر دے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: '' تم میں سے بہترین حضرات وہ ہیں جو قرض خوبی سے ادا کریں''۔ (بخاری) قرض دینے والا مقروض پر

احسان کرتا ہے' اس کی ضرورت پوری کرتا ہے 'اس لیے مقروض کا یہ فرض ہے کہ وہ شرائط کے مطابق قرض لے اور پھر واپس کرے ۔اگر کسی وجہ سے بر وقت واپس نہ کر سکے تو معذرت کر کے میعاد میں کچھ مہلت لے لے۔ قرض خواہ اگر تنگ دست کو مہلت دے دے تو یہ بڑی فضیلت کا عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ قیامت کی سختیوں سے اس کو محفوظ رکھے تو اس کو چاہیے کہ تنگ دست کو مہلت دے یا اپنا قرض معاف کر دے''۔ (مسلم)

مصیبت زدہ ، پریشان حال یا ضرورت مند کی مدد کرنا اور اُس کے لیے آسانی پیدا کرنا اعلیٰ اخلاقی عمل اور اللہ کی رضا کا باعث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :''جو شخص قیامت کے دن اللہ کے عرش کا سایہ چاہتا ہو تو وہ ایسے تنگی والے شخص کو یا مہلت دے یا معاف کر دے''۔(طبرانی بحوالہ تفسیر ابن کثیر البقرۃ)جو شخص کسی مفلس پر رحم کر کے اپنے قرض کی وصولی میں اُس پر سختی نہ کرے اللہ تعالیٰ بھی اُس کے گناہوں پر اسے نہیں پکڑتا یہاں تک کہ وہ توبہ کرے(طبرانی 'بحوالہ تفسیر ابن کثیر البقرۃ) حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کا قرض ایک شخص کے ذمہ تھا' وہ تقاضا کرنے کو آتے لیکن یہ چھپ رہتے اور نہ ملتے۔ ایک دن وہ آئے تو گھر سے ایک بچہ نکلا' آپ نے اس سے پوچھا تو اُس نے کہا ہاں گھر پر موجود ہیں 'کھانا کھا رہے ہیں۔ اب حضرت ابوقتادہؓ نے اونچی آواز سے اُسے پکارا اور فرمایا مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم گھر میں موجود ہو' آئو باہر آئو' جواب دو ! وہ بیچارے باہر نکلے ۔ ابوقتادہؓ نے کہا کیوں چھپ رہے ہو؟ کہا حضرت بات یہ ہے کہ میں مفلس ہوں' میرے پاس رقم نہیں' شرمندگی کی وجہ سے آپ سے نہیں ملتا۔ ابوقتادہؓ نے کہا قسم کھائو۔ اس نے قسم کھا لی۔ ابوقتادہؓ رو دیئے اور اس کا قرض معاف کرتے ہوئے فرمانے لگے: ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص کسی نادار قرض دار کو ڈھیل دے یا اپنا قرضہ معاف کر دے وہ قیامت کے دن اللہ کے عرش کے سائے میں ہو گا''۔( صحیح مسلم بحوالہ تفسیر ابن کثیر)

تنگ دست مقروض کو مہلت دینا یا اُس سے درگزر کرنا بڑی اونچے درجے کی نیکی ہے جو انسان کے گناہوں کی معافی کا سبب بن سکتی ہے۔ ایک بندہ جس کو اللہ نے (دنیا میں ) مال عطا فرمایا تھا اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا :دنیا میں تو نے کیا عمل کیے۔ کہنے لگا اللہ تعالیٰ سے تو کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ اے میرے رب ! تو نے جو مال مجھے دیا تھا



میں اس سے لوگوں کے ساتھ لین دین کرتا تھا' درگزر میری عادت تھی' جو مال دار ہوتا اس سے نرمی کرتا اور جو تنگ دست ہوتا اسے معاف کر دیتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :''میں ایسا کرنے کا تجھ سے زیادہ مستحق ہوں۔ میرے اس بندے سے درگزر کرو''۔ (مسلم)

دین اسلام میں آسانی ہے تنگی نہیں۔ قرض کے معاملے کو گواہوں کی موجودگی میں لکھ لینا اچھا

ہے، لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو بھی ادھار کا معاملہ کیا جا سکتا ہے۔ لکھ لینا استحباب کے درجہ میں ہے، اگر پورے طور پر اعتماد ہو تو لکھے بغیر بھی یہ معاملہ ہو سکتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل کے ایک شخص نے دوسرے شخص سے ایک ہزار دینار مانگے۔ اس نے کہا گواہ لائو۔ جواب دیا خدا گواہ کافی ہے۔ کہا: ضمانت لائو۔ اُس نے کہا خدا کی ضمانت کافی ہے۔ ادائیگی کی میعاد مقرر ہو گئی۔ اُس نے ایک ہزار دینار گن کر دے دیے۔ مقروض رقم لے کر بحری سفر پر چلا گیا۔ جب میعاد پوری ہونے کو آئی تو وہ سمندر کے قریب آیا کہ کوئی کشتی ملے تو بیٹھ کر جائوں اور رقم ادا کر آئوں، لیکن کوئی کشتی نہ ملی۔ جب دیکھا کہ وقت پر پہنچ نہیں سکتا تو اس نے ایک لکڑی لی اور اُسے بیچ میں سے کھوکھلا کر کے اس میں ایک ہزار دینار رکھ دیئے اور ایک پرچہ بھی رکھ دیا اور منہ بند کر دیا۔ اور خدا سے دعا کی کہ میں نے فلاں شخص سے ایک ہزار دینار قرض لیے تھے، اس نے مجھ سے ضمانت طلب کی تو میں نے تجھے ضامن بنایا۔ اس پر وہ خوش ہو گیا۔ اُس نے گواہ مانگا تو میں نے تجھے گواہ رکھا۔ وہ اس پر بھی خوش ہو گیا۔ اب جبکہ مقررہ وقت ختم ہونے کو آیا ہے تو میں نے ہر چند کشتی تلاش کی کہ جائوں اور اپنا قرض اتار آئوں، لیکن کوئی کشتی نہیں ملی۔ اب میں اس رقم کو تجھے سونپتا ہوں کہ یہ رقم اُسے پہنچا دے۔ پھر اس لکڑی کو سمندر میں ڈال دیا اور خود چلا گیا۔ لیکن پھر بھی کشتی کی تلاش میں رہا کہ مل جائے تو چلا جائوں۔ ادھر جس شخص نے قرض دیا تھا جب اس نے دیکھا کہ وقت پورا ہوا اور آج اُسے قرض واپس لینے جانا چاہیے تو وہ بھی سمندر کے کنارے آکھڑا ہوا کہ وہ آئے گا اور میری رقم مجھے دے گا یا کسی کے ہاتھ بھجوائے گا، مگر جب شام ہونے کو آئی تو یہ واپس لوٹنے لگا۔ کنارے پر ایک لکڑی دیکھی تو اُس نے اٹھا لی کہ جلانے کے کام آئے گی۔ گھر جا کر جب اس لکڑی کو چیرا تو اُس میں دینار تھے۔ گنے تو پورے ایک ہزار تھے۔ وہیں پرچے پر نظر پڑی۔ پھر ایک دن وہی شخص ایک ہزار دینار لے کر آگیا اور کہا معاف کرنا میں نے ہر چند کوشش کی کہ وعدہ خلافی نہ ہو لیکن کشتی کے نہ ملنے کی وجہ



سے مجبور ہو گیا اور دیر لگ گئی۔ آج کشتی ملی تو آپ کی رقم لے کر حاضر ہو گیا ہوں۔ اس نے کہا جو رقم تم نے لکڑی میں ڈال کر توکل علی اللہ سمندر میں ڈال دی تھی اُسے خدا نے مجھ تک پہنچا دیا ہے اور میں نے اپنی پوری رقم وصول کر لی ہے۔ (بخاری)

رسول اللہ ﷺ انسانیت کے لیے اُسوۂ حسنہ تھے۔ آپؐ نے خرید و فروخت میں ادھار کا معاملہ بھی کیا۔ آپؐ نے ایک اعرابی سے گھوڑا خریدا۔ اعرابی رقم لینے کے لیے آپؐ کے پیچھے پیچھے چلا۔ حضور ﷺ آگے نکل گئے۔ وہ آہستہ آہستہ آرہا تھا، لوگوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ گھوڑا بک گیا ہے۔ انہوں نے قیمت لگانی شروع کی۔ یہاں تک کہ جتنے داموں اس نے آپؐ کے ہاتھ بیچا تھا اُس سے زیادہ دام لگ گئے۔ اعرابی کی نیت خراب ہوئی اور اس نے آپؐ کو آواز دے کر کہا: حضرت یا تو لے لیجئے یا میں کسی اور کے ہاتھ بیچ دیتا ہوں۔ حضور ﷺ یہ

سن کر رکے اور فرمانے لگے :تم تو اسے میرے ہاتھ بیچ چکے ہو' اب تم کیا کہہ رہے ہو؟ اُس نے کہا :نہیں' اللہ کی قسم میں نے تو نہیں بیچا۔ آپؐ نے فرمایا :غلط کہتے ہو' میرے تمہارے درمیان معاملہ طے ہو چکا ہے۔ اس گنوار نے کہا :اچھا تو گواہ لائیے کہ میں نے آپ کے ہاتھ بیچ دیا۔ مسلمانوں نے ہر چند کہا کہ اے شخص آپ ﷺ تو خدا کے پیغمبر ہیں' آپؐ کی زبان سے تو حق ہی نکلتا ہے' لیکن وہ یہی کہے جا رہا تھا ۔اتنے میں حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ آگئے۔ انہوں نے اعرابی کی بات سنی تو فرمانے لگے میں گواہی دیتا ہوں کہ تو یہ گھوڑا آنحضرت ﷺ کے ہاتھ بیچ چکا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا :تم کیسے شہادت دے رہے ہو؟ حضرت خزیمہؓ نے کہا کہ آپ ﷺ کی تصدیق اور سچائی کی بنا پر۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا :''آج سے خزیمہؓ کی گواہی دو گواہوں کے برابر ہے''۔ (مسند احمد بحوالہ تفسیر ابن کثیر) کسی کو قرض دے کر اُس کو پریشانی سے نجات دلانا' اس کی مشکل آسان کرنا اور ضرورت پوری کرنا صدقہ اور خیرات کرنے سے بھی افضل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:'' جو شخص مفلس آدمی پر اپنا قرض وصول کرنے میں نرمی کرے اور اسے ڈھیل دے اُس کو جتنے دن وہ قرض کی رقم ادا نہ کر سکے اتنے دنوں تک ہر دن اتنی رقم خیرات کرنے کا ثواب ملتا ہے''۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا :''ہر دن اس سے دگنی رقم کے صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا''۔ یہ سن کر حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضور ﷺ پہلے تو آپؐ نے ہر دن اس کے مثل ثواب ملنے کا فرمایا تھا' آج دو مثل فرماتے ہیں۔ فرمایا :''ہاں جب تک میعاد ختم نہیں ہوتی



ایک مثل ثواب ہے' میعاد گزرنے کے بعد دو مثل''۔ (مسند احمد)

اوپر ذکر ہوا کہ کسی ضرورت مند کو قرض دینے والا بڑے اجر کا مستحق ہے اور یہ بھی کہ اُسے صدقہ اور خیرات کرنے سے بھی کئی گنا ثواب ملتا ہے۔ مقروض کو بھی تلقین کی گئی ہے کہ جلد از جلد قرضہ اتارنے کی کوشش کرے۔ پھر جو ضرورت مند قرض لیتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ جلدی قرضہ اتار دے تو اللہ تعالیٰ اُس کی مدد کرتا ہے اور وہ جلد ہی اپنا قرضہ واپس کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جس مقروض کی نیت خراب ہو اُسے قرضہ واپس کرنے کی جلدی نہیں ہوتی اور وہ خواہ مخواہ قرضہ دینے والے کو پریشان کرتا ہے۔ قرضہ معاہدے کے مطابق ادا نہ کرنا اور قرضے کا بوجھ اٹھائے ہوئے قبر میں چلے جانا بڑا گناہ کا کام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فی سبیل اللہ شہید ہونے والے کے بارے میں بھی فرمایا کہ وہ جنت میں نہیں جائے گا جب تک اُس کا قرض ادا نہ ہو گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا :''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں محمد(ﷺ) کی جان ہے 'اگر کوئی فی سبیل اللہ شہید ہو اور وہ شہادت کے بعد پھر زندہ ہو جائے اور پھر جہاد میں شہید ہو جائے' اس کے بعد پھر زندہ ہو جائے اور پھر راہ خدا میں شہید ہو جائے اور پھر زندہ ہو اور اس کے ذمہ قرض ہو تو وہ اس وقت تک جنت میں نہ جا سکے گا جب تک اُس کا قرض ادا نہ ہو جائے''۔(مسند احمد)

آپ ﷺ کا معمول تھا کہ جنازہ پڑھنے سے پہلے دریافت فرما لیتے کہ مرنے والے کے ذمہ کوئی قرض تو نہیں؟ اگر ہوتا تو اُس کی ادائیگی کا انتظام کرتے۔ آج بھی آپ ﷺ کے طریقہ پر عمل کرتے ہوئے نماز جنازہ پڑھانے والے میت کے لواحقین کو تلقین کرتے ہیں کہ اگر متوفی کے ذمہ قرض ہو تو وہ ادا کر دیں۔ اور لوگوں کو کہتے ہیں کہ قرضے کی رقم یا تو معاف کر دیں اور بڑا ثواب لیں یا میت کے ورثا سے وصول کر لیں۔ آپ ﷺ کو یہ بات پسند تھی کہ ممکن ہو تو قرضہ واپس کرتے وقت قرض کی رقم سے کچھ زیادہ واپس کیا جائے۔ چنانچہ اصحابِ رسول بھی اس سنت پر عمل کرتے ۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرا رسول اللہ ﷺ پر کچھ قرض تھا۔ جب آپؐ نے ادا فرمایا تو (میری واجبی رقم سے) زیادہ عطا فرمایا (سنن ابوداؤد)۔ قرض دار اگر ادائیگی کے وقت اپنی طرف سے کچھ زیادہ ادا کرے تو یہ مستحب اور سنت ہے' یہ ربا نہیں' بلکہ تبرع اور احسان ہے۔ اس مسنون عمل کو رواج دینے کی ضرورت ہے۔

* * *

379

# تقسیم وراثت کی اہمیت

جب کوئی شخص فوت ہو جاتا ہے تو اس کا چھوڑا ہوا مال اسی لمحے وارثوں کی ملکیت میں آجاتا ہے۔ البتہ اس مال میں سے اس کے کفن دفن کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اس کے ذمے قرض ہو تو وہ بھی ادا کیا جائے گا۔ مرنے والے کو چھوڑے ہوئے مال کے تیسرے حصے تک کی وصیت کرنے کی اجازت ہے' وہ بھی ادا کردی جائے گی اور بقیہ مال جائز وارثوں میں قرآن و حدیث کی روشنی میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ چونکہ وراثت کی تقسیم اللہ رب العزت کا حکم ہے اس لیے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلہ میں سورۃ النساء کے ابتدائی حصے میں تقسیم میراث کے تفصیلی احکام دیے گئے ہیں۔ ان احکام میں {یُوصِیکُمُ اللہُ} یعنی ''اللہ تمہیں وصیت کرتا ہے'' کے الفاظ ہیں۔ گویا تقسیم میراث قرآنی ہدایات کے مطابق لازم ہے۔

فوت ہونے والے کا چھوڑا ہوا مال اسی وقت شرعی وارثوں کی ملکیت میں چلا جاتا ہے' اس

لیے اس مال میں سے تمام ورثاء کی مرضی کے بغیر خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ورثاء اس کے چھوڑے ہوئے مال کا کچھ حصہ یا تمام کا تمام کسی نیک کام میں لگا دیں تو اس کا ثواب مرنے والے کو نہیں پہنچے گا ' کیونکہ وفات کے بعد یہ مال اُس کا نہیں رہا تھا۔ اب اس نیک کام کا ثواب وارثوں کو ملے گا۔

وراثت کے مال میں سے کفن دفن کے اخراجات کے علاوہ میت کے ذمہ قرض ہو تو وہ ادا کیا جائے۔ کیونکہ شہید بھی اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتا جب تک اس کا قرض نہ ادا کر دیا جائے۔ اگر مرنے والے مرد نے اپنی بیوی کو حق مہر نہ ادا کیا ہو تو وراثت کا مال تقسیم کرنے سے پہلے بیوی کو مہر ادا کیا جائے گا کیونکہ یہ بھی قرض ہے۔ پھر مرنے والے کی وصیت پوری کی جائے ' اگر وہ جائز ہو اور اس کی مقدار بھی کل وراثت کے ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو۔ اس کے بعد بقیہ مال ' تھوڑا ہو یا زیادہ ' ورثاء میں شرعی ضابطے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ سورۃ النساء



میں پہلے وراثت کے احکام بتائے گئے ہیں ' پھر شرعی قوانین پر عمل نہ کرنے والوں کے لیے سخت عذاب کی وعید بایں الفاظ سنائی ہے:

{وَ مَنۡ یَّعۡصِ اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗ وَ یَتَعَدَّ حُدُوۡدَہٗ یُدۡخِلۡہُ نَارًا خَالِدًا فِیۡہَا ۪ وَ لَہٗ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ﴿۱۴﴾} ''اور جو کوئی نافرمانی کرے اللہ کی اور اُس کے رسول کی اور نکل جائے اس کی حدوں سے ' اللہ ڈالے گا اس کو آگ میں ' ہمیشہ رہے گا اس میں ' اور اُس کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔''

اس آیت کی تفسیر میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ ''تفہیم القرآن'' میں رقم طراز ہیں:

''یہ ایک بڑی خوفناک آیت ہے ' جس میں ان لوگوں کو ہمیشگی کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قانونِ وراثت کو تبدیل کریں ... لیکن سخت افسوس ہے کہ اس قدر سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں نے بالکل یہودیوں کی سی جسارت کے ساتھ خدا کے قانون کو بدلا اور اس کی حدوں کو توڑا۔ اس قانون وراثت کے معاملہ میں جو نافرمانیاں کی گئی ہیں ' وہ خدا کے خلاف کھلی بغاوت کی حد تک پہنچتی ہیں...''

اسی طرح سید مودودی سورۃ الفجر کی آیت {وَ تَاۡکُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَکۡلًا لَّمًّا ﴿۱۹﴾} ''اور تم میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔'' کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''عرب میں عورتوں اور بچوں کو میراث سے ویسے ہی محروم رکھا جاتا تھا اور لوگوں کا نظریہ اس باب میں یہ تھا کہ میراث کا حق صرف مردوں کو پہنچتا ہے ... حق اور فرض کی کوئی اہمیت ان کی نگاہ میں نہ تھی کہ ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر حق دار کو اس کا حق دیں ' خواہ وہ اسے حاصل کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو!''

موت ایک حقیقت ہے جس کو کسی وقت بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ہر شخص کے لیے

جائز ہے کہ وہ چھوڑے ہوئے مال کے ایک تہائی میں کسی جائز اور ثواب کا کام کرنے کی وصیت کر جائے۔ ترکے کے تہائی حصہ سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں اور اگر کسی نے کر دی تو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا' کیونکہ اس طرح شرعی وارثوں کو نقصان پہنچے گا۔ مرنے والا تو چلا گیا' اب پس ماندگان کا فرض ہے کہ وہ وراثت کی تقسیم میں اللہ سے ڈرتے ہوئے شرعی ضابطے کے



مطابق عمل کریں اور قرآن میں بتائی گئی خدائی ہدایات کی نافرمانی سے بچیںاور کفار کی پیروی ہرگز نہ کریں۔ برصغیر میں ہندو رہتے تھے۔ جب یہاں اسلام آیا تو کچھ لوگ ہندو مت چھوڑ کر مسلمان ہونے لگے ۔ ہم ان ہی کی اولاد ہیں۔ یہاں کے جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا وہ ہندووانہ رسموں کو نہ چھوڑ سکے ۔ ہندوئوں میں بیٹیوں کو وراثت سے یکسر محروم رکھا جاتا تھا اور شادی کے موقع پر انہیں جہیز کی صورت میں کچھ سامان دے دیا جاتا تھا۔ مسلمان ہندوئوں کے اس طریقے کو نہ چھوڑ سکے اور بیٹیوں کو وراثت سے محروم رکھنے اور جہیز دینے کی پابندی کرنے لگے۔ عربوں کے جاہلی معاشرے میں بھی لڑکیوں کو مرنے والے کی وراثت سے قطعاً محروم رکھا جاتا تھا اور وراثت کا حق صرف لڑکوں کو دیتے تھے' وہ بھی ان کے اپنے طریقوں کے مطابق۔ مثلاً وراثت صرف اس لڑکے کو ملتی جو گھوڑے پر سواری کر سکتا ہو' جنگ میں جانے کے قابل ہو۔ اس کے علاوہ اور بھی بے ہودہ طریقے ان میں رائج تھے۔

برصغیر کے مسلمان آج بھی ہندوئوں کے طور طریقوں سے نہیں نکل سکے اور وراثت کے اسلامی اصولوں کو چھوڑے بیٹھے ہیں۔ بیٹی کو شادی کے وقت جہیز ضرور دیتے ہیں خواہ اس کے لیے قرض ہی لینا پڑے ۔بیٹیوں کو شادی کے موقع پر جہیز کی صورت میں گھریلو ضروریات کا سامان دینا ہندوئوں کی رسم ہے 'کیونکہ ان کے ہاں بیٹیوں کو وراثت نہیں دی جاتی۔اسی طرح جس گھر میں موت ہو جائے وہاں ہندوئوں کی نقالی میں طرح طرح کی ناروا ناجائز اور بے ہودہ رسموں کی پیروی کی جاتی ہے۔ ورثاء وراثت کا مال تقسیم کرنے سے قبل غیرشرعی رسومات پر خرچ کرتے ہیں۔ ان رسومات میں اکثر فضول خرچی ہوتی ہے اور شرعی احکام کی خلاف ورزی بھی۔

برصغیر کے بہت سے مسلمان بیٹیوں کو وراثت سے حصہ نہیں دیتے۔ اکثر تو جہالت کی بنا پر اور کچھ مالدار اس خیال سے کہ اگر بیٹی کو حصہ دیا تو وہ بیٹی کے سسرال میں چلا جائے گا اور ہماری ملکیت سے نکل جائے گا۔ ایسا خاص طور پر بڑے زمینداروں اور مال داروں میں عام ہے۔ وہ اپنی زرعی زمین یا دولت کا ایک حصہ دوسرے خاندان کو دینا پسند نہیں کرتے۔مال و دولت سب کو پسند ہوتا ہے۔ زمینداروں کو اپنی زمین بڑی عزیز ہوتی ہے۔ وہ اپنی زمین کی وراثت بیٹی کے سسرال میں منتقل نہیں کرنا چاہتے۔ کچھ لوگ لڑکیوں کے ذہن میں شروع ہی سے یہ خیال ڈال دیتے ہیں کہ بھائیوں سے حصہ نہیں لینا' اگر لیا تو یہ بھائیوں کے ساتھ تمہاری

عداوت ہو گی ۔ بعض بھائی اپنی بہنوں سے کہتے ہیں کہ اپنا حصہ معاف کر دیں۔ بہن بے چاری مروت کی ماری ہاں کر دیتی ہے ‘جبکہ جبر کی اس ہاں کی کوئی حیثیت نہیں۔ بہن کو اس کا حصہ ضرور دیا جائے ۔ اس کے بعد وہ اپنی آزاد مرضی سے بھائیوں کو دے دے تو ٹھیک ہے ‘مگر ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ وراثت میں بیٹی کا حصہ منصوص ہے ‘لہٰذا اگر بیٹی کو حصہ نہ دیا جائے اور وہ خود مانگ لے تو بھی اس میں کوئی برائی نہیں ‘بلکہ یہ اللہ کے حکم کی تعمیل ہو گی۔ اگر وارث بیٹیاں زیادہ ہوں تو ایسا بھی ہو گا کہ وراثت کا بڑا حصہ بیٹیاں لے جائیں گی اور بیٹوں کو یہ برداشت کرنا ہو گا‘ مثلاً مورث کا ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہوں اور وراثت تین لاکھ روپے یا تین مربع زرعی زمین ہو تو لڑکے کو ایک لاکھ روپیہ یا ایک مربعہ اراضی ملے گی اور دو لاکھ روپے یا دو مربعے اراضی لڑکیوں کے حصے میں آئے گی۔ مگر لالچ میں آ کر ایسا نہیں کیا جاتا ۔اس طرح حق داروں کو ان کے حق سے محروم کیا جاتا ہے تو یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق مسلمان کسی کافر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کوئی کافر مسلمان کی وراثت سے حصہ نہیں پا سکتا خواہ ان میں کتنی قریبی رشتہ داری ہو۔ اسی طرح اگر مورث کو کوئی وارث قتل کر دے تو وہ وراثت سے محروم رہے گا۔ بعض اوقات وارث لالچ میں اندھا ہو کر اپنے باپ کو قتل کر دیتا ہے ۔ایسا شخص باپ کے قتل کا گناہ بھی اٹھائے گا اور وراثت سے بھی محروم رہے گا۔

وراثت کی تقسیم میں اپنی مرضی کرنے کی ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ لڑکی کی شادی ہی نہیں کی جاتی‘ بلکہ اسے غیر شادی شدہ رہنا باعث فضیلت بتاتے ہیں۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے جو لڑکی کے ساتھ اس کے بھائی روا رکھتے ہیں تاکہ ماں باپ کی جائیداد کا کچھ حصہ ان کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ ایسا کرنے والے اس معاملے میں عذاب کی دھمکی سے بھی خوفزدہ نہیں ہوتے۔

وراثت کے بارے میں یہ حکم ہے کہ وراثت کا مال تھوڑا ہو یا زیادہ اس کو شرعی قانون کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ اس کا ذکر سورۃ النساء میں بھی ہے اور احادیث میں بھی۔ مسلمان اکثر وراثت کے معاملے میں گناہِ عظیم کے مرتکب اور عذاب مہین کے مستحق بن رہے ہیں۔ بعض محتاط لوگ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں ہی اپنی جائیداد اپنے بچوں میں تقسیم کر دیں۔ ایسی صورت میں یہ وراثت نہ ہو گی بلکہ یہ ہبہ ہے ‘اس لیے بیٹے کو بیٹی سے دوگنا حصہ نہیں ملے گا بلکہ بیٹی کو بھی



اتنا ہی ملے گا جتنا بیٹے کو۔

میراث کی اہمیت اس قدر ہے کہ کسی جائز وارث کو ‘بجز مورث کے قاتل کے‘ کسی عذر پر بھی میراث سے محروم نہیں کیا جا سکتا‘ حتیٰ کہ کسی مرنے والے کا کوئی شرعی وارث مورث کا نافرمان‘ بدقماش یا جرائم میں ملوث ہو تو پھر بھی وہ وراثت پائے گا۔ بعض والد اپنے نافرمان اور بدکردار بیٹے یا بیٹی کو جائیداد سے محروم کرنے کا

اشتہار شائع کر دیتے ہیں۔ اس اشتہار کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔ شرعی وارث بہرحال وراثت پائے گا۔اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی مگر عورت ابھی عدت میں ہے کہ اس کا شوہر فوت ہو گیا تو بھی یہ عورت اپنے شوہر کی وراثت میں حصہ پائے گی۔

الغرض بہنوں کو ماں باپ کی وراثت نہ لینے پر آمادہ کرنا یا جہیز کو وراثت کا قائم مقام ٹھہرانا ویسا ہی جرم ہے جیسے بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو ہفتہ کے دن مچھلیاں پکڑنے سے روکا گیا تو انہوں نے ہفتے کے دن مچھلیوں کو پابند کر کے اتوار کے دن پکڑنے کا بہانہ تراش لیا اور کہتے کہ ہم نے ہفتے کے دن تو مچھلیاں نہیں پکڑیں ۔ اس پر انہیں مسخ کا عذاب دیا گیا۔ بہنوں کو بھی بھائیوں کو بتانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے شرعی احکام نہ توڑیں ‘بلکہ ہر وارث کو اس کا مقررہ حصہ خوشی سے ادا کریں کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔

الغرض وراثت کا مال جائز وارثوں کا حق ہے۔ انہیں وراثت سے محروم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی کا مال دبا لینا ۔ اور جو کوئی ایسا کرے گا اسے حق دار کو حق دینا پڑے گا‘ ورنہ حساب کے دن اسے یہ حق اپنی نیکیوں کی صورت میں ادا کرنا پڑے گا۔ اس دن پچھتانا کسی کام نہ آئے گا۔

[اس مضمون کے اندر میراث کے تمام مسائل کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ہر شخص اپنی مخصوص صورت حال کسی مفتی کو بتا کر اس سے وارثوں کے حصے دریافت کرے اور اس پر عمل کرے۔]

* * *



# دیارِ غیر میں چند ہفتے

میری بیٹی بال بچوں سمیت کئی سال سے امریکہ کی ریاست ٹیکساس کے شہر ہیوسٹن میں مقیم ہے۔ وہ تو دو تین سال کے بعد پاکستان آجاتی تھی لیکن میں وہاں کبھی نہیں گیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ وہاں شادی کی ایک تقریب منعقد ہوئی جس میں مجھے بھی بلایا گیا۔ میں اپنے دو بیٹوں ‘ ایک بہو ‘ ایک پوتی اور دو چھوٹے بچوں کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہم بچوں سمیت کل سات افراد تھے۔ ضروری سامان ساتھ لیا اور لاہور ایئرپورٹ پر پہنچ گئے ‘ معمول کی چیکنگ کے بعد ہمارا سامان بک ہو گیا‘ ہم جہاز میں بیٹھ گئے۔ اڑھائی گھنٹے کی پرواز کے بعد ہمارا جہاز ابوظہبی ایئرپورٹ پر اترا۔ ایئرپورٹ صاف ستھرا تھا ۔وہاں سگریٹ پینا سختی کے ساتھ ممنوع ہے۔ چونکہ کچھ لوگ

بری طرح سگریٹ کے عادی ہوتے ہیں اس لیے ایئرپورٹ پر شیشے کا ایک کمرہ مخصوص کیا گیا ہے جس کا دروازہ بند کر کے لوگ سگریٹ نوشی کر سکتے ہیں ۔ ایئرپورٹ پر ضرورت کی معمولی چیزیں مل جاتی ہیں ‘لیکن وہاں نرخ کافی زیادہ ہوتے ہیں۔ وہاں معمول کی کارروائی کے بعد جہاز شکاگو کے سفر پر روانہ ہوا۔ یہ سفر لگاتار ۱۳ گھنٹے کا تھا۔ کبھی جہاز کے نیچے زمین تھی اور کہیں سمندر۔ راستے میں کئی علاقوں سے گزرنا ہوا۔ چونکہ سفر لمبا تھا اس لیے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جہاز میں کھانے پینے کے لیے کچھ نہ کچھ ملتا رہا۔ دو دفعہ تو بھرپور کھانا دیا گیا۔ کھانا معیاری تھا جو مسافروں نے رغبت کے ساتھ کھایا۔ جہاز میں سواریوں کو کمبل بھی فراہم کیے گئے کہ اگر سردی محسوس کریں تو ان سے فائدہ اٹھائیں۔ ہر سیٹ کے سامنے ایک سکرین تھی جس پر جہاز کا راستہ نمایاں تھا اور لمحہ لمحہ نظر آرہا تھا کہ جہاز کہاں پہنچ رہا ہے۔ نقشے پر یہ معلومات بھی تھیں کہ جہاز کی رفتار کیا ہے‘ یہ کتنی بلندی پر اڑ رہا ہے ‘ باہر کا درجہ حرارت کیا ہے ‘ جہاز نے کتنا سفر طے کر لیا ہے‘ جہاز کو پرواز کرتے ہوئے کتنا وقت ہو گیا ہے اور منزل پر پہنچنے کے لیے اندازاً کتنا وقت مزید لگے گا۔

ہمارا جہاز وقت کی پابندی کے ساتھ شکاگو ایئرپورٹ پر اترا جہاں مسافروں کی بھرپور

---



چیکنگ کی گئی ۔ اس کے بعد ہمیں دوسرے جہاز پر سوار ہونا پڑا۔ وہاں سے چلے تو تین گھنٹے کے بعد ہم ہیوسٹن ایئرپورٹ پر اترے۔ میرے بیٹے کو اس کے دوست کی فیملی نے کچھ سامان دیا تھا۔ راستے کے ایک ایئرپورٹ پر جب ہم نے چیکنگ کروا کر سامان دوسرے جہاز کے لیے بک کرادیا تو میرے بیٹے کا دوست اپنا سامان لینے کے لیے ہم سے آملا‘ مگر سامان تو بک ہو چکا تھا۔ ہمارا سب کا خیال تھا کہ اب تو سامان نہیں مل سکتا‘ مگر پھر خیال ہوا کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ چنانچہ متعلقہ حکام کے پاس گئے اور انہیں صورتِ حال بتا کر گزارش کی کہ ہمیں متعلقہ بیگ واپس مل جائیں تو ہم ان میں سے کچھ سامان نکال لیں گے اور بیگ دوبارہ جمع کرادیں گے۔ تھوڑی سی بات چیت کے بعد ہمیں بیگ دے دیے گئے۔ ہم نے کچھ سامان نکالا اور بیگ دوبارہ جمع کرادیے۔ جب ہم منزل پر پہنچے اور سامان وصول کیا تو وہ دو بیگ جن کو واپس لے کر ان سے سامان نکالا تھا وہ نہ ملے ۔ ایئرپورٹ پر ہمارے عزیز ہمیں لینے کے لیے آئے ہوئے تھے ۔جب ہم دو بیگ نہ ملنے پر پریشان ہوئے تو انہوں نے ہمیں تسلی دی اور کہا کہ آپ مطمئن رہیں‘ سامان مل جائے گا۔ انہوں نے ایئرپورٹ پر شکایت درج کروادی ۔ رات گزر گئی ‘ دن چڑھا تو ایئرپورٹ سے فون آیا کہ آپ کا سامان پہنچ چکا ہے ۔اپنے گھر کا راستہ بتائیے ہم سامان لے کر آپ کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ہم نے راستہ بتادیا ۔چنانچہ چند گھنٹے گزرے کہ وہ گم شدہ بیگ لے کر ہمارے پاس پہنچ گئے۔ ہم نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ سامان لانے والوں نے کسی رقم کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ اس بات پر معذرت کی کہ آپ کو تکلیف ہوئی اور شکریہ کہہ کر وہ واپس چلے گئے۔

ابھی شادی میں چند دن باقی تھے۔ ہم نے سفر کی تھکاوٹ دور کی اور ماحول کا مشاہدہ کرنے لگے۔ جس آبادی میں ہم تھے اُس میں کم آمدنی والوں کے لیے رہائش گاہیں تھیں۔ یہ چھ چھ مرلے کے مکان تھے جو انتہائی مہارت کے ساتھ ہم شکل تعمیر کیے گئے تھے۔یہاں ہر قسم کی سہولت تھی۔ رات دن AC چل رہے تھے۔ مکان قطار در قطار تھے۔ درمیان میں مناسب سائز کا پارک تھا جس کے ساتھ صاف پانی کا سوئمنگ پول تھا۔poolمیں نہانے کے لیے مردوں اور عورتوں کے الگ الگ اوقات مقرر نہیں' بلکہ ایک ہی وقت میں لڑکے اور مرد' لڑکیاں اور عورتیں انتہائی مختصر کپڑے پہنے تالاب میں نہاتے ہیں اور بالکل شرم وحیا محسوس نہیں کرتے۔

---



ان مکانوں میں مختلف مذہب و ملت کے لوگ کرائے پر رہ رہے تھے ۔ ہر مکان کے ساتھ ایک گیراج ہے ۔ گیراج کے علاوہ باہر گاڑی کھڑی کرنے کے لیے منظم جگہیں ہیں۔ مرکز خریداری اور مارکیٹیں یہاں سے دو تین میل کے فاصلے پر ہیں۔ہر فیملی کے پاس اپنی گاڑی ہے' کیونکہ گاڑی کے بغیر یہاں رہائش ممکن نہیں ۔اگر کوئی مہمان آجائے تو اُس کی ابتدائی تواضع کے لیے ہر ضروری چیز ہر وقت گھر میں رکھی ہوتی ہے۔

مسلمانوں کے لیے کچھ کچھ فاصلے پر مسجدیں ہیں' جہاں لوگ گاڑیوں پر سوار ہو کر آتے ہیں۔ جو مسجدیں ہم نے دیکھیں وہ کشادہ اور خوبصورت تھیں۔ ایک مسجد تو چار ایکڑ کے قریب وسیع تھی۔ ہر مسجد میں مردوں کے علاوہ عورتوں کے نماز پڑھنے کا بھی انتظام ہے۔ ساتھ مدرسہ اور سکول بھی ہے۔ مسجدوں میں امام اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں 'ان میں اکثر Ph.D ہیں۔ یہاں کی مساجد کے ساتھ مینار نہیں ہیں۔ اذان بھی مسجد کے اندر ہی ہوتی ہے۔ مسجدوں میں اسلامی تقریبات منعقد کرنے کے لیے کشادہ ہال ہیں جن میں صاف ستھری کرسیاں اور صوفے لگے ہوئے ہیں۔ ہماری شادی کی دعوت بھی ایک مسجد کے کشادہ اور صاف ستھرے ہال میں ہوئی۔اس مسجد کے امام صاحب بہت بااخلاق اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں 'جو اردو' انگریزی اور عربی میں ماہر ہیں۔وہاں مسجدوں میں تبلیغی جماعت کے لوگوں کا عمل دخل بھی دیکھا جو وہاں بیٹھ کر تعلیم کرتے اور مسلمانوں کے گھروں تک پہنچ کر انہیں تبلیغ کرتے۔

میں رمضان میں وہاں تھا۔ میں نے دیکھا کہ مسجدوں میں مخیر حضرات کی طرف سے افطاری کا عام انتظام تھا۔ تراویح میں بہت لوگ آتے تھے مگر یہاں کی طرح زیادہ لوگ آٹھ تراویح پڑھ کر چلے جاتے تھے ۔ تراویح پڑھانے کے لیے یہاں حافظ عام ہیں۔ ہماری مسجد میں چار تراویح کے بعد صاف پانی کی سیل بند بوتلیں تقسیم کی جاتی تھیں جو اُس وقت روزہ دار لوگوں کی پیاس بجھانے کا بر وقت انتظام تھا۔ایک دن مسجد ابوبکر صدیقؓ میں ہندوستان کے مشہور عالم دین مولانا محمد یوسف اصلاحی تشریف لائے۔ انہوں نے مغرب کی نماز کے بعد مختصر مگر

جامع الفاظ میں خطاب کیا۔ ان کا بیان بڑا پر تاثیر تھا جسے سامعین نے بڑی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ سنا۔
یہ ملک اور یہ شہر مسلمانوں کا نہیں۔ یہاں ہر مذہب کے لوگ ہیں' البتہ پاکستانی مسلمان



کافی تعداد میں ہیں جن میں اکثر نماز روزے کے پابند ہیں ۔ ان لوگوں کی مذہب کے ساتھ وابستگی دیدنی ہے۔ رمضان میں مسجدوں میں بہت رونق ہوتی ہے ۔کسی کسی مسجد میں محفل شبینہ کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ہر مسجد میں چند لوگ رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف بھی کرتے ہیں۔ عام طور پر رمضان کی آخری راتوں میں ختم قرآن ہوتا ہے 'مٹھائی بانٹی جاتی ہے اور fund raisingکی بھرپور کوشش کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں مہمان خصوصی بلائے جاتے ہیں جو اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ بڑی تعداد میں رقم اکٹھی کی جاتی ہے جو مسجدوں کی ضروریات میں خرچ کی جاتی ہے اور نئی مساجد بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔ مسجدوں میں بچوں کو قرآن پڑھایا جاتا ہے' حفظ کا بھی انتظام ہے۔

ہماری رہائش مسجد سے تقریباً ساڑھے تین میل دور تھی (فاصلے یہاں کلومیٹر نہیں بلکہ میل کے حساب سے شمار کیے جاتے ہیں) میرا میزبان متقی آدمی تھا اور وہ مجھے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے ہر روز پانچ وقت گاڑی میں مسجد لے جاتا تھا اور اس کا اس قدر اہتمام کرتا کہ اگر قریب ترین مسجد میں جماعت نکل جانے کا اندیشہ ہوتا تو دوسری مسجد میں چلے جاتے جہاں جماعت مل جاتی۔ دیارِ غیر میں مسلمانوں کی نماز کے ساتھ ایسی وابستگی قابل تعریف ہے۔

یہاں زمین نظر نہیں آتی۔ ہر جگہ زمین گھاس سے ڈھکی ہوئی ہے۔ گھاس کی مناسب وقفے سے کٹائی ہوتی رہتی ہے۔ مٹی کہیں نہیں 'اس لیے ماحول میں آلودگی(pollution) نہیں ہے۔ سفید کپڑے ایک ہفتے تک بھی پہنے جاسکتے ہیں' میلے نہیں ہوتے' جوتوں کو پالش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہر جگہ گھاس کی وجہ سے بارش میں نہ کیچڑ ہوتا ہے اور نہ کہیں پانی کھڑا ہوتا ہے۔ مہینوں گاڑی کو کپڑے کے ساتھ صاف کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ گاڑیاں طرح طرح کے ماڈلز کی ہیں جن کی قیمت پاکستان کی نسبت بہت کم ہے۔

گھروں کے سامنے نہ نالیاں ہیں نہ گٹر۔ سیوریج سسٹم تمام کا تمام انڈر گراؤنڈ اور اعلیٰ معیار کا ہے۔ بجلی جانے کا کوئی سوال نہیں' بلکہ ضرورت سے زیادہ ہے 'مگر اس کا استعمال سلیقے سے ہے۔ ایسا نہیں کہ دن کے وقت بھی سڑکوں پر بتیاں جل رہی ہوں۔

گھروں اور مسجدوں میں چھت کے پنکھے پانچ پانچ پروں والے ہیں جو بالکل بے آواز ہیں۔ مسجد کے ہال میں دس پندرہ پنکھے چل رہے ہوں تو معمولی سی آواز بھی نہیں آتی۔ گھروں

کے ہر کمرے میں ایک ایک لائٹ اور ایک ایک پنکھا ہے۔ بڑی بڑی عمارتوں میں بھی عام طور پر مختصر سے سوئچ بورڈ ہیں۔ ہر بورڈ پر دو تین سوئچ ہیں' جو اوپر کریں تو on ہوتے ہیں' نیچے کریں تو off ہوتے ہیں۔ ہر گھر کے ساتھ گیراج ہے۔ جب گاڑی اس کے دروازے کے سامنے آتی ہے تو گیراج کا شٹر خود بخود کھل جاتا ہے۔ اسی طرح locality کا مین گیٹ بھی خود بخود کھل جاتا ہے اور گاڑی نکل جائے تو خود بخود بند ہو جاتا ہے۔

گھر کے باہر کی باڑ ہفتے میں ایک دفعہ سلیقے کے ساتھ کاٹ کر خوبصورت بنا دی جاتی ہے۔ گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے جگہیں مقرر ہیں' جن کی violation نہیں کی جا سکتی ۔ جہاں No Parking کا بورڈ لگا ہے وہاں کوئی شخص ہرگز گاڑی نہیں کھڑی کرتا۔ ہر پارکنگ میں معذور افراد کے لیے مخصوص جگہیں ہیں' جہاں وہ اپنی گاڑی کھڑی کرتے ہیں' کوئی دوسرا وہاں اپنی گاڑی ہرگز کھڑی نہیں کر سکتا۔ ٹریفک کے قواعد پر سختی سے عمل درآمد کرایا جاتا ہے ورنہ بھاری جرمانے کیے جاتے ہیں اور جرمانہ کرنے والے کو سفارش یا رشوت کے ساتھ راضی نہیں کیا جا سکتا ۔ سڑکیں ہماری موٹر وے کی طرح کشادہ اور صاف ستھری ہیں۔ اشارے ہمہ وقت کام کر رہے ہیں۔ ٹریفک بڑی منظم اور ڈرائیونگ آسان ہے۔ جانے آنے کے لیے الگ سڑکیں ہیں۔ اوورٹیکنگ کا بالکل رجحان نہیں۔ ایک سڑک پر چار چار پانچ پانچ lane ہیں۔ بڑی شاہراہ میں ایک لین پولیس کے لیے مخصوص ہے' وہ ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ اس میں عام گاڑیاں نہیں چل سکتیں ۔صرف ضرورت کے وقت پولیس کی گاڑیاں وہاں چلتی ہیں۔ کشادہ ہونے کی وجہ سے سڑکوں پر رش نہیں ہوتا مگر پھر بھی بعض مخصوص اوقات میں رش ہو جاتا ہے۔ سڑکوں پر کراس کے لیے اوپر نیچے لمبے لمبے پل بنائے گئے ہیں' جو بہت خوبصورت اور مضبوط ہیں ۔ یہ overhead bridge عام ہیں اور اکثر ایک فرلانگ سے تین چار فرلانگ تک لمبے ہیں اور بڑی مہارت سے تعمیر کیے گئے ہیں۔ سڑکیں ٹوٹی پھوٹی نہیں بلکہ جدید ترین مشینوں کے ذریعے ہموار اور مضبوط بنائی گئی ہیں۔ سڑک کے دائیں بائیں ایک راستہ اس طرح چلتا ہے کہ اگر گاڑی کا ٹائر اس پر آ جائے تو گاڑی میں شور مچ جاتا ہے۔ یہ ٹریک مہارت کے ساتھ اس لیے بنایا گیا ہے کہ لمبے سفر کے دوران اگر ڈرائیور کو نیند آ جائے اور گاڑی اپنے ٹریک سے ہٹ کر نیچے آئے تو فوراً شور مچ جائے اور ڈرائیور نیند سے بیدار ہو جائے۔ گاڑی میں بیٹھ



جائیں تو سیٹ بیلٹ لگانا ڈرائیور اور دوسرے سواروں کے لیے ضروری ہوتا ہے' اگر کسی نے سیٹ بیلٹ نہ لگائی ہو تو گاڑی میں الارم بجنے لگتا ہے جس سے مطلع ہو کر جس نے سیٹ بیلٹ نہ لگائی ہو وہ بیلٹ لگا لیتا ہے۔

سائیکل اور موٹر سائیکل یہاں بالعموم نہیں چلتے' کبھی کبھار کوئی موٹر سائیکل نظر آتی ہے۔ سائیکل اور موٹر سائیکل کو دیکھ کر کار کا ڈرائیور محتاط ہو جاتا ہے کہ کہیں اس کا نقصان نہ ہو جائے۔ پیدل چلنے کا تو کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ نہ یہاں پبلک ٹرانسپورٹ ہے' نہ رکشے ٹیکسیاں' بس اپنی کار پر ہی ہر جگہ جانا ہوتا ہے۔

گھروں میں نوکر چاکروں کا بالکل رواج نہیں ۔گھر کے سارے کام خود ہی کرنے پڑتے ہیں۔ ایک دن میرے ساتھ پاکستان سے جانے والی میری بہو وہاں برتن دھو رہی تھی تو وہاں کی ایک پاکستانی عورت اُسے دیکھ کر کہنے لگی: پاکستانی رانی یہاں خودبرتن صاف کر رہی ہے ! یعنی پاکستان میں تو ایک ایک گھر میں تین تین خادم اور خادمائیں ہیں' ایک صفائی کرتی ہے' دوسری برتن صاف کرتی ہے' تیسری کپڑے دھوتی ہے ۔ اگر گاڑی ہے تو ایک ڈرائیور۔ اگر میسر ہو تو دروازے پر ایک گارڈ بھی کھڑا ہوتا ہے۔ مگر یہاں خادم یا خادمہ کا کوئی سوال نہیں' سب کام خود کرنے پڑتے ہیں۔ یہاں سکیورٹی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ گھروں کی maintenance کے کام کے لیے کارندے آتے ہیں 'ان کا دھیان رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں' وہ پوری دیانت داری اورایمان داری سے کام کرتے ہیں' بلکہ گھر کی ایک چابی ان کے پاس ہوتی ہے۔ اگر گھر والے گھر پر نہ بھی ہوں تو وہ دروازہ کھول کر مرمت وغیرہ کا کام کر جاتے ہیں۔

مشہور ہے کہ یہ تیزی اور جلدی کا زمانہ ہے۔یہاں لوگ مصروف بہت ہیں مگر جلدی کا کوئی سوال نہیں۔ ہر کام نظم و ضبط کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ شادی کے ولیمے کا انتظام ایک عمدہ ہوٹل میں تھا جو کسی طور پر بھی ہمارے پرل کانٹی نینٹل سے کم نہ تھا۔ لوگ اطمینان سے بیٹھے تھے ۔ عورتوں کا الگ اور مردوں کا الگ انتظام تھا۔ کھانا بوفے(buffet) تھا۔ تقریباً دو سو مہمانوں کے لیے صرف ایک ٹیبل پر کھانے کی ڈِشز(dishes)ترتیب وار رکھی گئی تھیں۔ سب سے پہلے مجھے کھانے کے لیے بلایا گیا۔جب میں کھانا اپنی پلیٹ میں ڈال رہا تھا تو باقی مہمان میرے پیچھے قطار میں کھڑے تھے۔ ہر شخص اپنی باری پر اس ترتیب سے کھانا لے رہا تھا جس



ترتیب سے ڈشز پڑی تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ کھانے پر ہجوم ہو گیا ہو۔ کھانے کے بعد مفتی سلیم صاحب نے جامع الفاظ میں دعا کروائی جس میں دولہا دلہن ' ان کے خاندانوں اور سب حاضرین کے لیے خیروبرکت کی دعا کی اور لوگوں نے اس پر آمین کہا۔

یہاں قانون کی حکمرانی ہے 'چھوٹے بڑے سب کے لیے ایک قانون ہے۔ حکمرانوں کے لیے نہ کوئی خاص سواری ہے نہ پروٹوکول ۔ انہیں بھی سب کے ساتھ لائن میں لگنا ہوتا ہے اور ٹریفک کے اشاروں کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔

سب لوگ اپنے گھروں میں کمروں میں سوتے ہیں۔ جون ' جولائی میں باہر تو گرمی ہوتی ہے مگر گھر کے اندر AC کی وجہ سے ٹھنڈا ماحول ہوتا ہے اور کبھی گرم کمبل لینے پڑتے ہیں۔ چونکہ بجلی وافر ہے اس لیے لوڈشیڈنگ کا کوئی خدشہ نہیں' بلکہ اکثر گھروں میں کھانا پکانے کے لیے چولہے تک بجلی سے چلتے ہیں۔

لوگوں میں کتابیں پڑھنے کا رجحان ہے۔ جب بھی انہیں موقع ملتا ہے اپنے بیگ سے کتاب نکال کر

پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ لباس کے معاملے میں بہت آزادی ہے' ہر کوئی اپنے مذہب ' معاشرے' رواج اور ذوق کے مطابق لباس پہنتا ہے۔ کوئی کسی دوسرے کے لباس پر تنقید نہیں کرتا۔ بعض لباس تو شرمناک ہوتے ہیں' یعنی برائے نام سے۔

ایک دن گھر میں پوڑیاں تلی جا رہی تھیں کہ یکا یک گھر کے کمروں میں الارم بجنے لگا۔ میں نے اہل خانہ سے پوچھا یہ کیا ہے ؟ انہوں نے بتایا کہ یہاں ہر گھر میں یہ الارم لگے ہوئے ہیں جو گھر میں دھواں اٹھنے کی صورت میں بجنے لگتے ہیں' تا کہ جب دھواں اٹھے تو فوراً انتظام کر لیا جائے کہ آگ نہ لگ جائے۔ چونکہ گھر میں پوڑیاں تل رہے تھے جن سے ایک قسم کا دھواں اٹھ رہا تھا اس لیے الارم بجنے لگا۔ پوڑیاں تل چکے اور دھواں ختم ہو گیا تو ساتھ ہی الارم خاموش ہو گیا۔

یہاں بہت سے مسلمان خاندان رہ رہے ہیں' کاروبار کر رہے ہیں اور خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ بچوں کی تعلیم کے لیے ہر طرح کے ادارے موجود ہیں ۔دسویں تک تعلیم بالکل فری ہے' کتابیں بھی سکول سے مفت ملتی ہیں۔ اس لیے ہر خاندان کو بچے سکول بھیجنے ہوتے ہیں' ورنہ وہ حکومت کی گرفت میں آجاتا ہے۔ چائلڈ لیبر کا کوئی سوال نہیں' تاہم اس



ماحول میں تعلیم پانے اور اس آزاد معاشرے میں رہنے کی وجہ سے ان میں بے راہ روی کا بہت امکان موجود ہے۔ اگرچہ والدین پوری سنجیدگی اور فکر مندی کے ساتھ ان کی پرورش کریں مگر ماحول سے متاثر ہونا تو فطری بات ہے ۔ مسلمان بچے وہاں ڈسپلن اور manner تو سیکھ جاتے ہیں مگر اسلامی اقدار سے بے خبر رہتے ہیں۔ اس پہلو سے مسلمان خاندانوں کا وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔

رہائشی مکان اور اپارٹمنٹس تو ایک یا دو منزلہ ہوتے ہیں لیکن دفاتر کی عمارتیں درجنوں منزلوں پر مشتمل ہیں۔ ایک تجارتی مرکز وسیع وعریض رقبے پر مشتمل ہوتا ہے جس میں ہر قسم کی صاف ستھری دکانیں ہوتی ہیں۔ ایک شاپنگ مال میں داخل ہو جائیں تو ضرورت کی ہر چیز وہاں سے مل جاتی ہے۔ وہاں ادویات بھی مل جاتی ہیں۔ دوائیاں صرف ڈاکٹر کی تجویز کردہ ہی ملتی ہیں ' البتہ کچھ دوائیاں ایسی ہیں جو ڈاکٹری نسخے کے بغیر بھی مل جاتی ہیں۔ یہ وہ دوائیں ہیں جو بے ضرر اور عام چھوٹی موٹی جسمانی تکلیف کے لیے ہوتی ہیں۔ مثلاً سردرد' بدہضمی' بے خوابی' الرجی وغیرہ ۔ ڈاکٹروں کی فیسیں بہت زیادہ ہیں جو عام آدمی کی پہنچ سے دور ہیں۔ تجارتی مراکز میں دکانوں کے علاوہ بچوں کی دلچسپی کی کھیلیں اور جھولے وغیرہ بھی ہوتے ہیں' جہاں بچے اپنی پسند کی کھیلوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کسی دکان سے اگر کوئی شخص ایک چیز خرید کر لے گیا ہے اور گھر جا کر اسے وہ چیز پسند نہیں یا اس کی ضرورت کی نہیں تو وہ اس کو واپس کر دیتا ہے۔ دکاندار بڑی خوشی سے واپس لے لیتا ہے' اگرچہ وہ چیز دو تین دن کے

بعد ہی واپس کی گئی ہو۔

خریداری مراکز میں چیزوں کی قیمتیں مقرر ہیں۔ ایک ہی قیمت کی چیزیں اکٹھی رکھ دی جاتی ہیں۔ خریدار کو قیمت نہیں پوچھنی پڑتی۔گاہک خریداری مرکز میں گھوم پھر کر اپنی پسند کی چیزیں ٹرالی میں رکھ لیتا ہے اور کاؤنٹر پر بل بنوا کر رقم ادا کر دیتا ہے۔ ماہر ملازم کمپیوٹر کے ذریعے درجنوں چیزوں کا بل چند منٹوں میں بنا دیتا ہے۔ ہر خریداری مرکز والے اپنی اشیاء کی قیمتیں کاغذ پر مشتہر کر کے مختلف جگہوں پر پہنچا دیتے ہیں ۔ اگر کسی وقت گاہک اعتراض کرے کہ فلاں چیز کی قیمت یہاں زیادہ ہے اور دوسری جگہ وہ کم قیمت پر مل رہی ہے اور وہاں کا اشتہار بھی دکھا دیتا ہے تو اسے اسی کم قیمت پر وہ چیز دے دی جاتی ہے۔یہاں بھی لوگوں کو قطار میں آنا پڑتا ہے اور کوئی شخص خلاف ورزی نہیں کرتا بلکہ صبر و تحمل سے اپنی باری کا انتظار کرتا

---



ہے۔اگر خریداروں کی قطار لمبی ہو اور کسی شخص کو جلدی ہو تو وہ اپنی ٹرالی اور اس میں پڑی ہوئی چیزیں وہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور ادارے کے مالک کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ ان مراکز میں مرد اور عورتیں خریداری کرتے پھرتے ہیں۔ مرد تو کسی حد تک ملبوس ہوتے ہیں مگر اکثر عورتیں بے لباس ہوتی ہیں' جنہوں نے کپڑے کا ایک مختصر سا ٹکڑا زیرناف رکھا ہوتا ہے اور ایک ٹکڑا سینے پر باندھا ہوتا ہے۔ یہاں عورتوں میں میک اپ کا رجحان نہیں۔ کوئی ایک عورت بھی وہاں ایسی نہیں دیکھی جس نے اپنے چہرے کو کاسمیٹک کے ساتھ سجایا ہوا ہو۔ چہرہ بالکل سادہ رکھتی ہیں۔

شہر کے جس حصے کی بڑی آبادی میں ہم رہتے تھے وہاں کوئی ریڑھی والا' چھوٹی موٹی ضرورت کی اشیاء بیچنے والا نہیں آتا تھا۔ معمولی سے معمولی چیز بھی دور دراز کے تجارتی مراکز کی دکانوں سے خریدنا ہوتی ہے 'خواہ وہ بچوں کے لیے ٹافیاں 'آئس کریم یا معمولی کھلونے ہی کیوں نہ ہوں۔

یہاں ہر طرف پر سکون ماحول ہے ۔کوئی جلسہ ' جلوس ' ریلی یا احتجاجی اجتماع نہیں ہوتا۔ ہمارے دو ماہ کے قیام میں وہاں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا اور نہ ہی ہم نے کوئی جرم دیکھا ۔ پولیس بڑی مستعد نظر آتی ہے۔ ان کی گفتگو ملائم اور نرم الفاظ میں ہوتی ہے' وہ اخلاق سے گری ہوئی کوئی بات نہیں کرتے۔ اگر جرم واضح اور اس میں کسی طرح کا شک نہ ہو تو کوئی گزارش یا سفارش نہیں مانی جاتی۔ رشوت کا کوئی سوال نہیں۔ دیواروں پر اشتہار نہیں لگائے جاتے 'نہ بینر آویزاں کیے جاتے ہیں اور نہ وال چاکنگ ہوتی ہے۔ عمارتوں کی دیواریں صاف ستھری ہیں۔

یہاں محنت کرنے یا ہاتھ سے کام کرنے میں عار محسوس نہیں کی جاتی۔ ہماری طرح مزدور عام نہیں ملتے۔ ہر کسی کا معیارِ زندگی بہتر ہے۔ چھوٹے ملازموں کے پاس بھی اپنی کاریں ہیں۔ باڑ کاٹنے والا ' ڈسٹ بن

صاف کرنے والا' دفتر یا عمارت کی صفائی کرنے والا ہر کوئی اپنی کار میں آتا ہے۔ یہاں کاروں کی قیمتیں بہت کم ہیں۔ تھوڑی تنخواہ پانے والا بھی اپنی ایک مہینے کی تنخواہ میں گاڑی خرید سکتا ہے۔ ایک آدمی کئی کئی جگہوں پر کام کرتا ہے اور فراخ روزی کماتا ہے۔ کاریں یہاں لاتعداد ہیں۔ ہر طرف مختلف ماڈلز کی کاریں نظر آتی ہیں۔ شہر کی یہ آبادی سمندر سے تقریباً دس میل دور ہے۔ ہم سمندر کا کنارہ دیکھنے کے لیے نکلے۔ کنارے پر پہنچے تو وہاں بڑی رونق تھی۔ ایک بہت بڑی کشتی یہاں موجود تھی جو سیر پر آنے والوں کو سمندر میں دور



تک لے جاتی تھی' اس کو ferry کہتے ہیں۔ لوگ اپنی کاروں میں یہاں آتے ہیں۔ وہ کشتی اتنی بڑی ہے کہ لوگ اپنی کاروں سمیت کشتی کے اندر چلے جاتے ہیں۔ بیک وقت تیس کاریں اس کشتی کے اندر سوار ہو جاتی ہیں۔ فیری ان کو سمندر کے اندر ایک جزیرے میں لے جاتی ہے جہاں سمندر کا لمبا کنارہ ہے ۔لوگ مختلف جگہوں پر اترتے ہیں 'ساحل کا نظارہ کرتے ہیں اور پھر فیری میں سوار ہو کر واپس آجاتے ہیں۔

ہم فیری کے ذریعے جزیرے پر پہنچے' ایک جگہ ٹھہرے ۔وہ بے آباد سی جگہ تھی مگر وہاں بیٹھنے کے لیے لکڑی کی کرسیاں تھیں۔ ایک طرف عمدہ باتھ تھا جس میں نہانے کا بندوبست تھا' وضو بھی کر سکتے تھے۔ ساری زمین گھاس کے ساتھ ڈھکی ہوئی تھی ۔ہم نے وہاں سمندر کے کنارے مغرب کی نماز باجماعت ادا کی۔ سمندر کا پانی ٹھاٹھیں مارتا ہوا جزیرے کے کنارے کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ وہاں بیٹھ کر ہم نے کھانا کھایا۔ اس بے آباد جگہ پر بھی ڈسٹ بن پڑے تھے۔ لوگ فضول چیزیں اس میں ڈالتے ہیں۔ ہماری موجودگی میں ایک شخص عمدہ گاڑی پر سوار وہاں آیا اور ڈسٹ بن صاف کر کے لے گیا۔ ہم دوبارہ واپس آئے۔ اپنی گاڑی سمیت فیری میں سوار ہوئے اور کنارے پر آکر اترے' جہاں خوبصورت عمارتیں تھیں' ان میں ہوٹل وغیرہ اور خریداری کے مراکز تھے' ملکی اور غیر ملکی لوگ وہاں سے خریداری کرتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ فیری کی یہ سروس ہر شخص کے لیے بالکل فری ہے۔ اس تفریحی سیر کے بعد ہم چمکتی دمکتی روشنیوں میں واپس اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔

شہر سے تقریباً ۲۰۰ میل کے فاصلے پر ایک عجیب و غریب تفریحی مقام ہے' جہاں ریل کی مانند ایک سواری چکر لگاتے ہوئے فضا میں اونچی گھومتی ہے 'لوگ اس میں سوار ہوتے ہیں۔ وہ سواری اس طرح تیزی کے ساتھ چلتی ہے کہ بیٹھے ہوئے لوگ کئی بار الٹے سیدھے ہوتے ہیں۔ دیکھنے والوں کو ڈر لگتا ہے لیکن بیٹھے ہوئے لوگوں کو مضبوطی کے ساتھ سیٹوں سے باندھ لیا جاتا ہے' اس لیے گرنے کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ وہاں عجیب طریقے سے چلنے والی کئی گاڑیاں تھیں' پھر بھی لوگوں کو سوار ہونے کے لیے لائن میں لگنا پڑتا تھا اور بعض اوقات گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہاں داخلے کا ٹکٹ ٦٧ ڈالر فی کس تھا۔ ہم نے گاڑی کھڑی کی تو پارکنگ فیس پندرہ ڈالر تھی۔ ہمارے ساتھ بچے بھی تھے اور بڑے بھی۔ کچھ افراد سواری میں سوار ہوئے۔

بعدازاں وہاں کھانا کھایا اور آدھی رات کے بعد وہاں سے واپس آئے۔

اس تفریحی مقام سے واپسی کے سفر میں دیہاتی اور زرعی علاقے بھی آئے جہاں لہلہاتی فصلیں بھی تھیں۔ فصلوں کے درمیان کاشتکاروں کے مکان تھے جن کے پاس ان کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بجلی یہاں دور دوراز علاقوں کو جگ مگ کر رہی تھی۔ راستے میں کچھ کچھ فاصلے پر آرام گاہیں تھیں۔ جس آرام گاہ میں ہم رکے وہاں ہر طرح کی سہولت موجود تھی۔ صاف ستھرے ایئر کنڈیشنڈ کمرے تھے۔ نہانے دھونے کا انتظام تھا۔ وہاں زائرین کی دلچسپی کے لیے پرانی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ دو لالٹینیں جل رہی تھیں' ایک پرانی توپ بھی تھی۔ وہاں ایک خودکار مشین تھی جس میں بڑی چھوٹی مشروب کی بوتلیں تھیں۔ لوگ اس میں پیسے ڈالتے اور ضرورت کی بوتل کا اشارہ دیتے تو وہ بوتل خود بخود باہر آجاتی۔ اگر اس میں بڑا نوٹ ڈالتے تو باقی پیسے بھی واپس نکل آتے۔

جس طرح گندے پانی کے نکاس کا انتظام زیر زمین ہے اسی طرح آبادی کے اندر نہ بجلی کے پول ہیں اور نہ تاریں بکھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ بجلی کی ترسیل کا تمام نظام زیر زمین بچھی ہوئی تاروں کے ذریعے ہے۔ بجلی کے میٹر مخصوص جگہوں پر لگائے گئے ہیں جو خاص انداز میں نصب کیے گئے ہیں اور بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

جگہ جگہ کوڑے دان پڑے ہیں۔ لوگ ان میں گندی' بے کار اور ردی چیزیں ڈال دیتے ہیں۔ یہاں لوگ صرف ضرورت کی چیزیں گھر میں رکھتے ہیں' فضول چیزوں کو کوڑے دان کے حوالے کردیتے ہیں۔ ایسی چیزیں جو کوڑے دان میں نہ ڈالی جا سکیں وہ وہاں پاس رکھ دیتے ہیں۔ لوگ کوڑے دانوں کے پاس استعمال میں نہ آنے والے صوفے' کرسیاں' گدے اور اس طرح کی پرانی چیزیں چھوڑ جاتے ہیں ۔ایک جگہ ایک بڑا سا ٹیلی ویژن بھی پڑا تھا۔

یہاں کے لوگوں کی مذہب کے ساتھ وابستگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ مقامی باشندوں کے علاوہ یہاں ہر طرح کے لوگ ملتے ہیں۔ جس طرح لباس کے معاملے میں لوگ آزاد ہیں اسی طرح رسم و رواج بھی اپنے اپنے ہیں۔ کسی معاملے میں بھی ایک دوسرے پر اعتراض کرنے کا رواج نہیں ہے۔ صرف ملکی قوانین کی پابندی ہرایک پر لازمی ہے۔ ہمارے قریب ایک مسلمان کرائے کے مکان میں رہ رہا تھا 'اس کی بیوی غیر مسلم تھی۔ ان کے دو بچے تھے' وہ دونوں



بھی مسلمان نہ تھے۔ لوگ کتے اور بلیاں پالتے ہیں 'ان کے ساتھ پیار کرتے اور ان کا خیال رکھتے ہیں۔ ہر جگہ صفائی ستھرائی نظر آتی ہے' مگر غیر مسلم لوگ جسمانی صفائی کا خیال نہیں رکھتے۔ کھانے پینے کی جو چیزیں مسلمانوں کے ہاں حرام ہیں وہ چیزیں بھی عام فروخت ہوتی ہیں۔ گوشت وغیرہ خریدنے میں مسلمانوں کو بڑی احتیاط کرنا پڑتی ہے۔

یہاں پٹرول پمپ موجود ہیں مگر وہاں کوئی ملازم نہیں ہوتا جو گاڑی میں پٹرول ڈالے ۔ گاڑی والا خود گاڑی سے اترتا ہے ' ضرورت کے مطابق پٹرول اپنی گاڑی میں ڈال لیتا ہے اور وہاں پڑی ہوئی ایک مشین میں کریڈٹ کارڈ ڈالتا ہے' جس کے ذریعے قیمت ریکارڈ ہو جاتی ہے۔ پورے مہینے میں استعمال شدہ پٹرول کی رقم بینک اکائونٹ سے منہا ہوجاتی ہے۔ اسی طرح بجلی کا بل اور دوسرے بل بھی کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ادا ہو جاتے ہیں اور کسی بل کے جمع کرانے کے لیے نہ بینک میں جانا پڑتا ہے اور نہ لائن میں لگنا پڑتا ہے۔

یہاں صاف ستھرے واش روم ہیں مگر استنجا کرنے کے لیے پانی نہیں ہوتا۔ بس ٹشوپیپر موجود ہوتے ہیں جو صفائی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی صفائی پانی کے ساتھ صفائی کی طرح نہیں ہو سکتی۔ ایسی جگہوں پر جو واش بیسن لگائے گئے ہیں ان میں اکثر پانی کی ٹونٹیاں خودکار ہیں۔ ان کے نیچے ہاتھ کریں تو ان میں سے خود بخود پانی نکلتا ہے' ہاتھ ہٹا لیں تو پانی بند ہو جاتا ہے۔ وہاں تولیے نہیں ہوتے بلکہ ہاتھ صاف کرنے اور گیلے بازو خشک کرنے کے لیے مشینیں موجود ہیں جو خودکار طریقے سے ٹشوپیپر نکالتی ہیں یا گرم ہوا دیتی ہیں 'جس سے ہاتھ خشک ہو جاتے ہیں۔

یہاں چوری ڈکیتی کا کوئی ڈر نہیں۔ استعمال کی چیزیں 'بچوں کے سائیکل' جوتے اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں گھر کے دروازے کے باہر پڑی رہتی ہیں' مگر کوئی انہیں نہیں اٹھاتا۔ بچوں کا ٹرائی سائیکل ہمارے گھر کے باہر پڑا رہا' کسی نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ تمام گھر چونکہ ایک جیسے تھے' لہٰذا وہ سائیکل گھر پہچاننے میں ہمارا راہنما رہا۔ چونکہ چوری کا خطرہ نہیں ہوتا اس لیے کسی چوکیدار یا سکیورٹی گارڈ رکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ قانون پر سختی سے عمل درآمد کی وجہ سے چوری نہیں ہوتی۔

گھر کی کوئی چیز ریڈیو' ٹی وی وغیرہ خراب ہوجائے تو اسے شاذہی مرمت کرواتے ہیں'



کیونکہ مرمت کروانا بہت مہنگا ہے ۔ مزدوریاں بہت زیادہ ہیں ۔ اکثر مزدور فی گھنٹہ کے حساب سے کام کرتے ہیں۔ یہاں مہنگائی بہت زیادہ ہے مگر لوگ مہنگائی کا شکوہ نہیں کرتے' کیونکہ ان کی آمدنیاں بھی بہت ہیں۔ ملازموں کی تنخواہیں بھی بڑی بڑی ہیں ۔ کھانے پینے کی چیزیں نسبتاً سستی ہیں۔ دوسری چیزیں بہت مہنگی ہیں ۔ایک عام سی تیار قمیص تقریباً بیس ڈالر اور اچھی قمیص ساٹھ 'ستر ڈالر میں ملتی ہے۔

یہاں آوارہ کتے نہیں ہیں 'مگر یہاں کے باشندوں میں سے کچھ نے کتے پال رکھے ہیں جنہیں وہ گود میں اٹھائے پھرتے ہیں۔ ان پر ہاتھ پھیرتے اور پیار کرتے ہیں۔ باہر نکلیں تو کتا ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ مسلمان اس سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ خونخوار جانور گندا اور غلیظ ہوتا ہے۔ اگر کسی کو کاٹ جائے تو اس کا زخم بعض اوقات جان لیوا ثابت ہوتا ہے مگر یہاں کے لوگ اس بات سے غافل ہیں۔

یہاں گداگر نہیں ہیں ۔ لوگ محنت کے عادی ہیں۔ اگر کوئی شخص سخت مجبور ہوجائے تو وہ ایک گتے کے ٹکڑے پر اپنا سوال لکھ دیتا ہے اور سڑک کے کنارے کسی مناسب جگہ پر وہ گتہ پکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ اس طرح کوئی مخیر راہ گیر اس کی مدد کر دیتا ہو گا۔ مگر دو ماہ میں ہم نے ایسے آدمی صرف دو ہی دیکھے ہیں۔

سڑک کی تعمیر کے لیے اگر کوئی لین بند کرنا پڑے تو ہفتہ عشرہ پہلے ہی سڑک پر بورڈ لگا دیا جاتا ہے کہ اس سڑک کی فلاں لین تعمیر کے کام کی وجہ سے بند رہے گی ‘تاکہ اس راستے سے گزرنے والے مطلع ہو جائیں اور گاڑیوں والے متعلقہ لین بند ہونے سے پہلے متبادل راستہ اختیار کر لیں اور اچانک کسی کو لین بند نہ ملے۔یہاں ریلوے لائن پر پھاٹک نہیں ہیں‘ اس کی بجائے ٹریفک لائٹ لگی ہیں جو گاڑی گزرنے کے وقت خود کار طریقے سے روشن ہو جاتی ہیں اور راستہ بند ہو جاتا ہے۔ کوئی ملازم ریلوے کراسنگ پر مقرر نہیں جو راستہ بند کرتا ہو۔

یہاں مہنگائی بہت زیادہ ہے‘ اس لیے یہاں قیمتی چیزیں نقد خریدنے کا رجحان بہت کم ہے۔ لوگ ہر چیز قسطوں پر خریدتے ہیں اور سالہا سال تک آسان قسطیں ادا کرتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص قسطیں ادا نہ کر سکے تو اس کی ادا کی ہوئی قسطیں ضبط کر لی جاتی ہیں اور خریدی ہوئی چیز بھی واپس لے لی جاتی ہے۔

---



یہاں اکثر مکانات کی چھتیں ڈھلوان ہیں ‘شاید اس لیے کہ وہاں کبھی کبھی برفباری بھی ہوتی ہے۔ ڈھلوانی چھتوں سے برف نیچے گر جاتی ہے ‘چھت پر جمتی نہیں۔ چھتوں پر پانی کی ٹینکیاں نہیں ہیں۔ گھروں میں ہر وقت رات دن پانی آتا رہتا ہے جو گرائونڈ فلور اور فرسٹ فلور پر وافر ملتا ہے ۔

شاید یہاں سگریٹ نوشی قانوناً جرم ہے یا لوگوں میں اس کا رجحان نہیں ہے۔ ہم نے یہاں آبادی کے اندر ‘سڑکوں پر ‘گاڑیوں میں‘ خریداری کے مراکز میں‘ کہیں بھی کسی مرد یا عورت کو سگریٹ نوشی کرتے نہیں دیکھا‘ حالانکہ یہاں ہر مذہب و ملت او ر رنگ و نسل کے لوگ ملتے ہیں۔

ہم یہاں آبادی کے اندر بھی گھومے پھرے ہیں اور بڑے بڑے خریداری مراکز بھی دیکھے ہیں مگر کسی جگہ بھی نہ ریڈیو کی آواز سنی اور نہ ٹیلی ویژن چلتے ہوئے دیکھے۔یہاں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کو فروخت نہیں کی جا سکتیں‘ مثلاً سگریٹ یا شراب وغیرہ۔ اگر کوئی دکاندار ایسا کرے تو اسے سخت سزا دی جاتی ہے۔ قانون کی عمل داری کی وجہ سے یہاں جرائم کی کمی ہے اور ہر جگہ نظم و ضبط ہے۔

یہاں بہت سی پاکستانی فیملیز رہ رہی ہیں‘ جن میں اکثر وہ ہیں جنہوں نے ایمیگریشن کے ضابطے پورے نہیں کیے ہوئے اور وہ غیر قانونی طور پر رہ رہی ہیں‘ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ سالہا سال سے یہاں اپنے پاکستان میں رہنے والے عزیز و اقارب سے دور ہیں اور کمائی کے لالچ میں اتنا کرب برداشت کر رہے ہیں ۔ ایک پاکستانی عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ یہاں رہ رہی ہے‘ جبکہ اس کا شوہر پاکستان میں ہے ‘نہ اس کا شوہر یہاں آسکتا ہے اور

نہ وہ پاکستان جا سکتی ہے۔ شوہر بھی تجرد کی زندگی گزار رہا ہے اور بیوی بھی۔ جو لوگ یہاں غیر قانونی رہ رہے ہیں وہ پاکستان جائیں تو پھر واپس یہاں نہیں آسکتے۔ اس قسم کے تلخ مشاہدات یہاں کثرت سے ہیں۔

یہاں بینکوں کے باہر ATM قسم کی بڑی بڑی مشینیں ہیں۔ لوگ گاڑیوں میں رقم نکلوانے یا جمع کرانے کے لیے یہاں آتے ہیں۔ مشین کے سامنے گاڑی روکتے ہیں اور گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کارڈ مشین میں ڈالتے ہیں اور ایک منٹ میں مطلوبہ رقم مل جاتی ہے' اور اگر پیسے



جمع کرانے ہوں تو ہو جاتے ہیں ۔ اس عمل کو Drive through Banking کہا جاتا ہے۔

ہماری ایک دعوت Persian Grill میں ہوئی' جہاں ہر شخص کے سامنے menu کی کاپی رکھی جاتی ہے 'جس میں بہت ورائٹی ہوتی ہے ۔ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کھانے کی فہرست سے کھانے کا انتخاب کرتا اور وہی کھانا اس کے سامنے لا کر رکھ دیا جاتا۔

ہم نے وہاں رمضان میں تراویح کی نمازیں پڑھیں' کسی مسجد میں بیس اور کسی میں آٹھ رکعتیں پڑھی جاتی تھیں۔ ہر مسجد میں روزانہ افطاری کا انتظام ہوتا تھا' جہاں مسلمان اپنے بال بچوں سمیت آتے' افطاری کرتے' نماز مغرب پڑھتے اور پھر کھانا کھاتے۔ کھانا یہاں بھی قطاروں میں لیا جاتا۔ رمضان میں کئی مساجد میں شبینہ کا انتظام تھا۔ ہر مسجد میں چند لوگ اعتکاف میں بھی بیٹھے۔ عید الفطر کا دن آیا تو کوئی جوش و خروش نہ تھا' نہ ہی چھٹی تھی۔ مسلمان اپنے اپنے گھروں میں عید منا رہے تھے۔ مرد قریب کی مسجد میں نماز عید کے لیے حاضر ہوئے' جہاں انگریزی میں خطاب تھا۔ پھر نماز کی دو رکعت ادا کی گئیں۔ وہاں ہم نے بے رونق عید گزاری اور تین دن مزید رہ کر واپسی کا سفر اختیار کیا۔

* * *